خدابخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۶۵-۶۶

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

خدابخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۷۵

۷۶

۷۷

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر:	۳۳۴۳۳/۷۷	سالانہ:	۳۰۰ روپے (ہند)
شمارہ:	پچھتّر تا چھہتّر		۶۰ ڈالر (ایشیا)
قیمت	پچھتر روپے		۱۲۰ ڈالر (دیگر ممالک)

۱۹۹۲ء

مصطفیٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ)، دہلی میں چھپوا کر خدابخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا

فہرست

مسلمان اور سائنس

آثار قاضی عبدالودود

خدابخش

جہانِ سرسید

ممالک اسلامیہ کے سفرنامے

مراسلات

حصّہ انگریزی

محمد علی جناح

ہندستانی مسلمان

مخطوطات شناسی

OO

ادب اور تاریخ کے رشتے

○ سکّوں پر اشعار

● جناب سیّد نور محمد اکیلوی

سکوں پر اشعار

سید نور محمد اکیلوی

حرفِ آغاز

زمانۂ طالبِ علمی ہی سے مجھے قدیم سکّے جمع کرنے کا شوق تھا۔ حیدرآباد میں عام طور سے قطب شاہی اور بہمنی بادشاہوں کے سکّے دستیاب ہوا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی برید شاہی، عادل شاہی اور نظام شاہی حکمرانوں کے سکّے بھی مل جاتے ہیں۔ مجھے بھی ابتدا میں یہی سکّے ملے۔ سِکّے پڑھنا ایک دشوار امر ہے لیکن میں نے اپنے اساتذہ کی مدد سے بعض صاف اور آسان عبارت والے سِکّے پڑھنا سیکھ لیا تھا اور اپنے محدود ذخیرے کی ایک فہرست بنالی تھی۔

ہائی اسکول سے فارغ ہو کر میں نے جب عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو وہاں میری ملاقات ادبیاتِ انگریزی کے ایک پروفیسر ای۔ای۔اسپیٹ سے ہوئی۔ اُنھیں بھی قدیم سکّے جمع کرنے کا شوق تھا۔ وہ سِکّوں کے تعلق سے کافی معلومات بھی رکھتے تھے۔ اُنھوں نے مجھے اپنے سِکّے دِکھلائے اور میرے سِکّے بھی دیکھے۔ مجھے یونیورسٹی کی لائبریری میں سِکّوں کے چند کیٹلاگ بھی ملے جن کے دیکھنے سے میری معلومات میں کچھ اضافہ ہوا۔ پروفیسر اسپیٹ بھی اس سلسلے میں میری رہنمائی کرتے تھے۔ اِسی دوران مجھے کچھ اور سکّے ملے جن میں سے بعض سِکّوں کا پڑھنا میرے لیے دشوار تھا کیوں کہ ان پر کچھ ایسی عبارت تھی جو مَیں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اسی لیے میں نے وہ سِکّے پروفیسر اسپیٹ کو

دکھلائے انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ محمد قلی قطب شاہ کے سکّے ہیں اور ان پر ایک فارسی شعر درج ہے۔ یہ میرے لیے ایک حیرت انگیز انکشاف تھا۔ مجھے اس وقت تک علم ہی نہ تھا کہ سکّوں پر شعر بھی درج ہوتے ہیں۔

اس دریافت کے بعد میں ایسے سکّے جمع کرنے پر زیادہ توجہ دینے لگا جن پر اشعار درج ہوں۔ مجھے چند دن بعد محمد عادل شاہ والئ بیجاپور کے سکّے ملے جن پر شعر درج تھے پھر اورنگ زیب اور کام بخش کے سکّے دستیاب ہوئے۔ رفتہ رفتہ میرے پاس بعض مغل سلاطین اور ٹیپو سلطان نیز گجرات کے حکمرانوں کے اشعار والے سکوں کی خاصی تعداد جمع ہوگئی لیکن مجھے کوئی ایسا کیٹیلاگ نہ مل سکا جس میں اشعار والے تمام سکّے یکجا کر دیئے گئے ہوں۔ یہ کام متفرق کیٹیلاگوں میں بکھرا ہوا تھا اور کہیں کہیں تو میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ سکّوں پر مندرجہ اشعار صحت کے ساتھ پڑھے بھی نہیں گئے ہیں اس لیے میں نے یہ طے کیا کہ اس مخصوص موضوع سے متعلق ممکنہ حد تک پورا مواد جمع کر کے ایک ایسی کتاب ترتیب دوں جس میں مختلف بادشاہوں کے سکّوں پر پائے جانے والے تمام اشعار صحت کے ساتھ شایع کر دیئے جائیں۔

حُسنِ اتفاق سے ۱۹۷۳ء میں میرے ہندوستان سے باہر جانے کا پروگرام بنا۔ راستے میں چند دن کابل اور تہران میں گزارنے تھے۔ میں نے ان مقامات پر بھی اپنے موضوع کے تعلق سے کچھ مواد فراہم کر لیا۔ لندن پہونچنے کے بعد تو برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری کے بیش بہا ذخائر میرے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئے۔ لندن میں میرا قیام کسی قدر طویل رہا اور میں نے اپنی دیگر مصروفیات سے بچے ہوئے وقت میں اپنی تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا۔

لندن میں ۱۹۷۶ء میں "ورلڈ آف اسلام فیسٹول" کے انعقاد کی تیاریاں بڑے جوش و خروش سے ہو رہی تھیں۔ خصوصی نمائشوں کا اہتمام کیا جا رہا تھا کانفرنسیں ہونے والی تھیں اور سیمینار منعقد کئے جا رہے تھے۔ انہی میں ایک سیمینار اسلامی سِکّوں کے بارے میں بھی تھا۔ میں نے اِس سیمینار میں شرکت کی۔ اس میں شرکت سے مجھے

یوروپ، امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے بعض مشاہیر ماہرین مسکوکات قدیمہ سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کا موقع مل سکا۔ ان میں سے ایک امریکی اسکالر نے میرے موضوع تحقیق سے بڑی دلچسپی لی اور مجھے مشورہ دیا کہ مَیں لندن یونیورسٹی کے "اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز" سے وابستہ ہوکر اپنے کام کو باقاعدگی کے ساتھ آگے بڑھاؤں چنانچہ اُنھوں نے اس اسکول کے رجسٹرار مسٹر بشپ سے میرا تعارف کراتے ہوئے ان سے خواہش کی کہ اپنے اسکول میں ایم۔فل کے کورس میں میرے داخلے کے امکانات پر غور کریں۔ مسٹر بشپ نے بھی اس موضوع سے اپنی پوری دلچسپی ظاہر کی اور چند رسمی اُمور کی تکمیل کے بعد مجھے اکتوبر ۱۹۷۶ء میں جزو وقتی طالب علم کی حیثیت سے تین سال کے لیے ایم۔فل میں داخلہ دے دیا گیا۔

"اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز" میں میرا کام متعلقہ شعبہ کے پروفیسر ڈاکٹر اے۔ ڈی۔ ایچ بیوار کی نگرانی میں شروع ہوا۔ موصوف نے بھی سکوں پر اشعار کے موضوع سے بڑی دلچسپی ظاہر کی اور فرمایا کہ واقعتاً اب تک اس موضوع پر جامع طور سے کوئی کام نہیں ہوا ہے اور یہ کہ اس کام کی تکمیل سے اُنھیں توقع ہے کہ مسکوکات قدیمہ کے لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہوگا۔ ڈاکٹر بیوار کی رہنمائی میں میرا کام آگے بڑھتا رہا۔ انھوں نے مجھے لندن کی دو تین اہم لائبریریوں کی رکنیت حاصل کرنے کا مشورہ دیا اور ——— "رائل ایشیاٹک سوسائٹی" سے بھی مجھے منسلک کروا دیا۔ ان اداروں کے ادبی سرمایہ سے استفادہ کرکے میں نے ایک سال کی مدت ہی میں اپنے موضوع سے متعلق تقریباً پورا خام مواد جمع کرلیا۔ ڈاکٹر بیوار ہر ہفتہ میرے کام کی پیش رفت پر نظر ڈالتے اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے۔

سوءِ اتفاق سے اسکول میں داخلے کے دوسرے ہی سال میری صحت اچانک خراب ہوگئی۔ دراصل انگلستان میں کئی سال کے قیام کی وجہ سے وہاں کی سرد اور مرطوب آب و ہوا کا مُضر اثر آہستہ آہستہ میری صحت پر غیر محسوس طور سے پڑ رہا تھا اور بالآخر مَیں ۱۹۷۷ء میں آرتھرائٹس کے موذی مرض کا شکار ہوگیا۔ ابتدائی علاج کے بعد ڈاکٹروں

کے مشورے پر مجھے انگلستان کا قیام چھوڑ کر وطن واپس ہو جانا پڑا۔ اور میرا تحقیقی کام ادھورا رہ گیا۔

اِدھر کچھ عرصے سے بعض احباب کا مسلسل یہ تقاضا رہا کہ میں اس کام کو اُردو میں پایۂ تکمیل تک پہونچا دوں کیوں کہ اس زبان میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ مجھے احباب کا یہ اصرار یقیناً بڑی اہمیت کا حامل نظر آیا۔ چنانچہ میں نے اس کتاب کی ترتیب و تسوید کا کام شروع کر دیا۔ اس کے انگریزی اور فارسی ایڈیشنوں کا کام بھی جاری ہے۔ مجھے توقع ہے کہ یہ کتاب اس موضوع پر اُردو میں کام کرنے والے محققین کے لیے مفید اور باعثِ دلچسپی ثابت ہوگی۔

تاریخ کوئی جامد چیز نہیں جس کا ثبوت کسی ایک منزل پر ختم ہو جاتا ہو، بلکہ کاروانِ تحقیق آگے بڑھتا ہی رہتا ہے۔

••

تمہید

اگرچہ موضوعِ کتاب "سِکّوں پر اشعار" ہے لیکن اس کے تعارف سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سِکّوں کی ابتدا کے بارے میں مختصراً یہ بتلا دیا جائے کہ کس دور میں اور کن حالات میں ان کی اجرائی عمل میں آئی تاکہ قارئین کے ذہن میں ایک ایسا پس منظر تیار ہو جائے جس کی مدد سے انھیں سکّہ سازی کے تدریجی ارتقا کی رفتار کو سمجھنے میں آسانی ہو اور موضوعِ کتاب کے تعلق سے ایک سازگار فضا تیار ہو جائے۔

مسکوکاتِ قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے یہ جانتے ہیں کہ سِکّوں کی تاریخ صدیوں پُرانی ہے۔ سِکّوں کے رواج پانے سے قبل تجارتی کاروبار اجناس کے تبادلے کے ذریعے انجام دیا جاتا تھا۔ قرآن کریم (سورہ یوسف) میں درہموں کا ضرور ذکر مِلتا ہے مگر تاحال اس دَور کے سِکّے دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ماہرینِ مسکوکاتِ قدیمہ نے حاصل شدہ مواد کی روشنی میں اتنا تو ضرور معلوم کر لیا ہے کہ سِکّوں کا رواج میلادِ مسیح سے سات آٹھ سو سال قبل شروع ہو گیا تھا۔ اس دَور میں ہندوستان، چین، مصر اور لیڈیا میں سِکّوں کا چلن پایا گیا ہے۔

ہندوستان میں ایسے ابتدائی سِکّے عموماً چاندی کے پتّروں کے چھوٹے چھوٹے چوکور

ٹکڑے کاٹ کر بنائے جاتے تھے۔ یہ کام مقامی زرگروں (سُناروں) یا کاروباری اداروں کے سپرد تھا۔ ان پر کوئی تحریر نہیں ہوتی تھی البتہ اہلِ معاملہ کی طمانیت کے لیے بعد میں علاقے کے معتبر لوگ اپنی مہرِ توثیق کے طور پر کسی اوزار سے اِن ٹکڑوں پر اپنے اپنے نشان لگانے لگے۔ اِنہی نشانات کی وجہ سے آگے چل کر انھیں پنچ مارک سِکّے کہا جانے لگا اور ہندوستان کے طول و عرض میں صدیوں تک ان سکّوں کا چلن عام رہا۔

۳۲۶ء قبل مسیح میں ہندوستان پر سکندر اعظم کے حملے کے نتیجے میں یہاں کے فنِ سِکّہ سازی کو بعض نئی جہتیں ملیں۔ یونانی اپنے سِکّے ڈائی کے ذریعے بناتے تھے ان پر دیویوں دیوتاؤں کی شبیہیں اُتاری جاتی تھیں اور حکمرانوں کے نام بھی درج کیے جاتے تھے۔ سکندر اعظم کی واپسی کے بعد اس کے سپہ سالاروں اور ان کے جانشینوں نے ایک عرصہ تک ہندوستان کے شمال مغربی حصّے پر اپنا تسلط قایم رکھا اور اپنے سِکّے چلاتے رہے۔ ان کے زوال کے بعد ساکاؤں اور پھر کشانوں کی حکومتیں ان علاقوں میں قایم ہوئیں ـــ اِن حکمرانوں نے یونانیوں کے سِکّوں کی تقلید میں اپنے سِکّے مضروب کروائے۔

اِدھر، دوآبہ گنگ و جمن اور ہندوستان کے مشرقی علاقے میں ۳۲۰ قبل مسیح سے ہی موریا سلطنت کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اس خاندان کے حکمرانوں نے اپنے دور میں کوئی خاص سکّے مضروب نہیں کروائے حتیٰ کہ اشوک اعظم جیسے نامور حکمران نے بھی پنچ مارک سِکّوں ہی کا چلن جاری رہنے دیا البتہ ان پر بدھ مذہب کے عقائد سے ماخوذ بعض علامات کا اضافہ کیا جن سے ان سکّوں کی علٰحدہ شناخت کی جا سکتی ہے۔

۱۸۴ء قبل مسیح میں موریہ خاندان کے زوال کے بعد ان علاقوں میں کوئی مستحکم حکومت چار پانچ صدیوں تک قائم نہ ہو سکی تاآنکہ ۳۲۰ء عیسوی میں گپتا خاندان نے عنانِ اقتدار سنبھالی۔ اس خاندان کے دوسرے حکمران سمدرا گپتا کا دورِ حکومت (۳۲۶ءتا ۳۷۵ء) ہر اعتبار سے بہت شاندار رہا ہے۔ اس نے نہ صرف اپنے حدودِ مملکت کی توسیع اور ان کے استحکام کی طرف توجہ دی بلکہ رعایا کی فلاح و بہبود کے ترقیاتی کاموں کے ساتھ ساتھ ادب، شاعری، موسیقی اور دیگر تمام فنونِ لطیفہ کی

سرپرستی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سمدرا گپتا خود ایک اچھا شاعر بھی تھا اور اسی ذوقِ شعری کے نتیجے میں اس نے اپنے جشن اشوہ میدھ یگ کی تقاریب کے موقع پر وہ یادگار سکّے مضروب کروائے جن پر دنیا میں پہلی بار منظوم عبارتیں درج کی گئیں۔ سمدرا گپتا کے بعض جانشینوں نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا لیکن اس خاندان کے زوال (سنہ ۴۸۰ء) کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

اُدھر آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں عرب و ہند کے تعلقات میں ایک نیا اور خوشگوار موڑ پیدا ہوا۔ ویسے تو ہندوستان سے عربوں کے تجارتی تعلقات صدیوں پُرانے تھے۔ عرب تاجر سمندری راستوں سے ہندوستان کی تجارتی اشیاء یمن اور شام لے جاتے جہاں سے اُنھیں یوروپ کی تجارتی منڈیوں میں پہونچا دیا جاتا اور پھر انہی راستوں سے مغرب کا مال مشرق اور ہندوستان پہونچ جاتا تھا۔ لیکن عباسی خلفاء کے دورِ حکومت میں ہندوستان سے عربوں کے تہذیبی تعلقات بھی قایم ہوئے۔ بغداد میں ایک 'دارالحکمۃ' قایم کیا گیا جہاں ہندوستان سے بُلوائے گئے پنڈت، وید اور فلسفی سنسکرت زبان میں لکھی ہوئی مختلف علوم و فنون کی اہم کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں کرنے پر مامور کئے گئے تھے۔ بغداد سے بعض علماء کو ہندوستان بھی بھیجا گیا جہاں اُنھوں نے اپنے ادبی اور تہذیبی سرمایہ کو سنسکرت زبان میں منتقل کیا۔ اس تہذیبی داد و ستد کے بڑے خوشگوار نتائج برآمد ہوئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِسی دوَر میں عربوں نے اِس بات سے بھی واقفیت حاصل کرلی کہ ہندوستان میں سکّوں پر اشعار بھی درج کئے جاتے تھے چنانچہ مستند مورخین نے لکھا ہے کہ سکّوں پر عربی اشعار کا اندراج سب سے پہلے ہارون الرشید (۷۸۶ء تا ۸۰۹ء) کے عہدِ خلافت میں ہوا۔ اس کے بعد ہمیں شمالی افریقہ کے حکمران زیادۃ اللہ ثالث (۹۰۹ء) کے سکّوں پر عربی اشعار ملتے ہیں۔ پھر اصفہان کے بُویہی حکمران فخرالدولہ (۹۷۶ء تا ۹۹۷ء) کے دور میں عربی اشعار سکّوں پر مضروب کئے گئے۔ عربی اشعار کے سکّوں پر اندراج کی آخری مثال ہمیں شاہ اسمٰعیل صفوی (۱۵۰۲ء تا ۱۵۲۴ء) کے سکّوں پر مشہور دُعائے 'نادِ علی' کی شکل میں ملتی ہے۔

عربوں کے زوال کے بعد ایران، خراسان اور ترکستان میں غیر عرب حکومتیں قایم ہوگئیں

ہندوستان پر بھی جن مسلم فاتحین نے حملے کئے تھے محمد بن قاسم کے سوا سب غیر عرب تھے اسی لیے ان تمام علاقوں میں فارسی شعر و ادب حکمرانوں کی سرپرستی میں خوب پھل پھول رہا تھا لیکن ابھی تک کسی حکمران کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ سکّوں پر فارسی زبان کے اشعار بھی درج کئے جا سکتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ فارسی شعر سب سے پہلے کسی ایرانی حکمران کے سکّوں پر درج کیا جاتا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ امتیاز بھی ہندوستان ہی کے لیے مخصوص ہو چکا تھا چنانچہ گجرات کے بادشاہ محمد شاہ ثانی (۱۴۴۲ء تا ۱۴۵۱ء) نے سب سے پہلے اپنے سکّوں پر فارسی شعر مضروب کروایا۔ اس کے بعد اسی خاندان کے ایک اور حکمران بہادر شاہ (۱۵۲۶ء ۱۵۳۶ء) کے سکّوں پر بھی ہمیں فارسی شعر ملتا ہے۔ اُدھر کشمیر میں حسن شاہ اور فتح شاہ نے بھی اپنے سکّوں پر فارسی شعر مضروب کروائے تھے۔

۱۵۲۶ء میں بابر نے دہلی کو فتح کر کے سلطنت مغلیہ کی بنا ڈالی۔ بابر ادب و شعر سے بھی بہت زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اگر اس کو کچھ عرصے تک حکومت کرنے کا موقع ملتا تو شاید وہ اپنے سکّوں پر فارسی اشعار درج کرواتا مگر بابر کو بالکل مہلت نہ ملی۔ اس نے بدخشاں، قندز، پورے افغانستان، پنجاب، دوآبہ گنگ و جمن سے بہار تک اور جنوب میں راجپوتانہ پر مشتمل وسیع سلطنت چھوڑ کر ۱۵۳۰ء میں انتقال کیا۔ بابر کے بعد ہمایوں کی زندگی بھی عجیب کشمکش میں گزری۔ پہلے تو ہمایوں نے گجرات اور مالوہ کی متحدہ سلطنت کو فتح کرنے کی غرض سے گجرات کی طرف کوچ کیا۔ اور مانڈو، چاپانیر اور کھمبایت تک بہادر شاہ کا تعاقب کر کے اس کو پے در پے شکستیں دیں لیکن ہمایوں گجرات کو پوری طرح اپنے تسلط میں نہ لا پایا تھا کہ اس کو بنگال کی فوجوں کے ساتھ شیر خاں افغان کی پیش قدمی کی خبر ملی اور وہ اس کے مقابلہ کے لیے نکل پڑا۔ اور ایک طویل جد و جہد کے بعد ۱۵۴۲ء میں ہمایوں کو پسپا ہو کر سندھ میں پناہ لینی پڑی۔ اور دہلی پر شیر شاہ کا قبضہ ہو گیا۔

ہمایوں نے شیر شاہ سے شکست کھا کر سندھ کے راستے ایران کا رُخ کیا۔ اس کے ساتھ فوج کے ہزاروں سپاہی اور وفادار سردار ضرور تھے مگر وہ اس موقف میں نہ تھا کہ شیر شاہ سے مقابلہ کر کے دوبارہ دہلی کا تخت حاصل کر لے۔ وہ چاہتا تھا کہ ایران کے

حکمران شاہ طہماسپ صفوی سے امداد لے کر پورے ساز و سامان کے ساتھ پٹھانوں کا مقابلہ کرے ہمایوں اپنے اس منصوبے میں کامیاب ضرور ہوا مگر اس کو ایران پہونچتے پہونچتے کئی برس لگ گئے ابھی وہ سندھ کے علاقے ہی میں تھا کہ اسے شیر شاہ کے انتقال کی خبر ملی۔ وہ سندھ کے ریگستان سے گزرتے ہوئے کوہِ لہری کے دامن میں ایک پُر فضا مقام پر پہونچا۔ یہ مقام ہمایوں کو بہت پسند آیا اور اس نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ وہ پنجشنبہ کا دن تھا اور رمضان کی اٹھائیس تاریخ تھی۔ تمام اعیانِ دولت، سردارانِ لشکر اور سپاہیوں نے بھی اسی مقام پر قیام کیا۔ دوسرے دن ہمایوں نے سب کے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کی۔ نماز کے بعد ایک درباری شاعر نے حسب ذیل قطعہ پیش کر کے گراں قدر انعام پایا۔

تا ہمایوں نام او را سکّہ بر دل نقش کرد
مہر از مہرش دہانِ سکہ پر زر می کند
منبری کز خطبۂ القاب او زینت گرفت
مشتری گوہر نثار فرق منبر می کند[۱]

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ قطعہ ہمایوں کے سکوں پر درج کیا گیا تھا یا نہیں کیوں کہ اس کے ایسے سکّے اب تک دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ہمایوں نے شاہ ایران کی امداد حاصل کرنے کے بعد پھر ہندوستان کا رخ کیا اور ۱۵۵۵ء میں سوری خاندان کے حکمران سکندر شاہ کو شکست دے کر دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کر لیا۔ لیکن وہ اپنی بارہ سال کی جد و جہد کی تکمیل کا لُطف پوری طرح اٹھا بھی نہ سکا تھا کہ اچانک ایک بالاخانے کا زینہ ٹوٹ جانے کے حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ہمایوں کے بعد اکبر اعظم اس کا جانشین ہوا۔ یہ ہر اعتبار سے ایک بڑا ہی خوش قسمت بادشاہ تھا۔ جہاں اس کو اپنے اولوالعزم باپ دادا سے ایک عظیم سلطنت ورثے میں ملی تھی، وہیں اس نے شیر شاہ سوری جیسے مدبر حکمران کا قائم کردہ ایک مضبوط انتظامی ڈھانچہ بھی پایا

---

[۱] تاریخ سندھ تصنیف محمد معصوم المتخلص بنامی ابن سید صفائی صفحہ ۱۱۵ فارسی قلمی انڈیا آفس لائبریری۔ لندن

تھا۔ اکبر نے ان دونوں نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ایک عظیم سلطنت کی بنیادیں ایک اور صدی کے لیے مستحکم کردیں۔ اس عظیم حکمران نے نظم و نسق میں مفید اصلاحات کے ساتھ ساتھ مسکوکات کے باب میں بھی اپنی جدّت طبع کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ اکبر نے اپنے دورِ حکومت میں بہت بڑے سائز کے شاندار سکّے مضروب کروائے اور مُغلیہ خاندان میں سکّوں پر فارسی اشعار کے اندراج کا آغاز کیا جو اس خاندان کے آخری حکمران بہادر شاہ کے عہد تک برابر جاری رہا۔ بہادر شاہ کے سکّوں پر فارسی اشعار کے علاوہ اُردو اشعار کے اندراج کا ذکر بھی ملتا ہے۔

مغل اقتدار کے زوال پذیر ہوجانے پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی پشت پناہی سے اودھ کے وزراء نے اپنی علیحدہ حکومت قائم کرلی اور اپنے سِکّے چلائے۔ اِن سِکّوں پر بھی فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔ سِکّھوں نے بھی پنجاب میں اپنے اقتدار کے زمانے میں اپنے سکّے مضروب کروائے جن پر فارسی اشعار درج تھے۔ بعض دیسی ریاستوں مثلاً جموّں جودھپور، ٹونک اور آسام کے بعض علاقوں کے حکمرانوں کے سکّوں پر بھی فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔

دکن میں قلی قطب شاہ، والئ گولکنڈہ (۱۵۸۱ء تا ۱۶۱۱ء) اور محمد عادل شاہ والئ بیجاپور (۱۶۲۶ء تا ۱۶۶۰ء) کے سکّوں پر فارسی اشعار درج کئے گئے ہیں۔ البتہ ابراہیم عادل شاہ والئ بیجاپور (۱۵۷۹ء تا ۱۶۲۶ء) کے سِکّوں پر ایک بیت بزبانِ دکنی بھی ملتی ہے۔ جنوبی ہند میں ٹیپو سُلطان کے سِکّوں پر بھی فارسی اشعار مضروب ہوئے۔

اُدھر ایران میں صفوی خاندان کے حکمران اسمٰعیل شاہ ثانی (۱۵۷۸ء تا ۱۵۸۷ء) کے عہدِ حکومت میں سِکّوں پر فارسی اشعار درج کرنے کا رواج شروع ہوگیا جو اس خاندان کے آخری حکمران عباس شاہ ثالث (۱۷۳۶ء) کے دور تک جاری رہا۔ ایران میں صفویوں کے علاوہ افاغنہ (۱۷۲۲ء تا ۱۷۲۹ء) افشار (۱۷۳۶ء تا ۱۷۹۶ء) زند (۱۷۵۰ء تا ۱۷۹۴ء) اور قاچار (۱۷۷۹ء تا ۱۹۲۵ء) خاندانوں کے بعض حکمرانوں کے سِکّوں پر بھی فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔

۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد افغانوں نے احمد شاہ درّانی کی قیادت میں اپنی الگ حکومت قائم کرلی۔ اس حکمران نے ہندوستان پر بھی حملے کئے اور پنجاب اور سندھ کے بعض علاقوں کو اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ درّانی خاندان کے حکمرانوں نے بھی اپنے سِکّوں پر فارسی اشعار درج کروائے۔ درّانیوں کے زوال کے بعد افغانستان میں برق زائی خاندان جو عام طور سے بارک زائی کہلاتا ہے برسرِ اقتدار آیا۔ اس خاندان کے بعض ابتدائی حکمرانوں کے سِکّوں پر فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔ کابل کے شمال مشرق میں ماوراءالنہر کے علاقہ خوقند میں خانوں کی ایک حکومت ۱۷۰۰ء سے قایم تھی جس کا مستقر فرغانہ تھا۔ اس خاندان کے ایک حکمران محمد علی ۱۸۴۰ء کے سِکّوں پر بھی فارسی شعر درج تھا۔

اِس تمہید میں اُن حکمرانوں کا اجمالاً تذکرہ کیا گیا ہے جن کے سِکّوں پر اشعار پائے جاتے ہیں۔ ان کے ضروری حالات اور سکّوں پر مندرجہ اشعار کی تفصیلات کا ذکر آئندہ صفحات میں ملے گا۔

سکّے پڑھنا

سِکّوں پر مندرجہ اشعار کے پڑھنے میں جو دشواریاں لاحق ہوتی ہیں اُن کا ذکر کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً وہ مشکلات بیان کردی جائیں جو عام سِکّوں کے پڑھنے میں پیش آتی ہیں۔ یوں تو آج کل سِکّوں کے متعدد کیٹیلاگ دستیاب ہوتے ہیں جن کی مدد سے سِکوں کی شناخت میں سہولت ہوتی ہے لیکن ان سے استفادے کے لیے بھی سِکّوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات درکار ہوتی ہیں ورنہ غیر ضروری کیٹیلاگوں کی ورق گردانی میں تضیعِ وقت کا اندیشہ رہتا ہے۔ لہٰذا سِکّے جمع کرنے والوں کو چاہیئے کہ سب سے پہلے یہ معلوم کریں کہ جس خاص سکّے کے بارے میں انھیں تفصیلات مطلوب ہیں وہ کس علاقے کا ہے، اس کا عہد کون سا ہے اور اس پر مندرجہ عبارت کی زبان کون سی ہے اور اس کا تعلق کس حکمران خاندان سے ہے۔ یہ باتیں معلوم ہوجانے کے بعد متعلقہ کیٹیلاگ سے بآسانی مدد لی جاسکتی ہے۔

اُنیسویں صدی کے وسط سے سکوں پر تحقیقی کام بہت تیزی سے ہورہا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان کے سکوں پر بھی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جو مختلف عجائب خانوں میں محفوظ سِکوں نیز خانگی ذخیروں کی فہرستوں پر مشتمل ہیں ان کے علاوہ نیو مسمیاٹک سوسائیٹیوں کے جرائد و رسائل میں بھی معلومات افزا مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں۔ اس پورے مواد سے خاطر خواہ استفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن سکّوں کے شائقین کو بنیادی طور پر ان چند

اُمور کو پیشِ نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔

سکّے کہاں دستیاب ہوئے۔ سکّوں کا مقامِ دریافت معلوم ہونے سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ وہ سکّے کس علاقے کے ہیں۔ عموماً سکّے جس علاقے کے ہوتے ہیں وہ اُسی علاقے میں بہ کثرت دستیاب ہوتے ہیں۔ دوسرے علاقوں کے سکّے شاذ و نادر ہی مل جاتے ہیں۔ یہ ایک عمومی نقطۂ نظر ہے۔ آج کل سکّوں کی تجارت کافی ترقی کر گئی ہے اور ذرائع آمد و رفت کی سہولت کی وجہ سے ایک علاقے کے تاجر دوسرے علاقے میں جاکر سکّے خریدتے اور بیچتے ہیں مگر یہ صرف سونے کے سکّوں اور کبھی کبھی چاندی کے سکوں کے تعلق سے ہوتا ہے۔ تانبے کے سکّے جس علاقے کے ہوتے ہیں ان کی نکاسی وہیں ہو جاتی ہے۔

مقامِ دریافت کے تعین کے بعد سکّوں کی عبارت کی زبان اور رسم الخط کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ ہندوستان کے ہندو حکمرانوں کے سکّوں پر سنسکرت، کَروشتی، دیوناگری، براہمی اور پالی وغیرہ زبانوں کی عبارتیں ملتی ہیں۔ اور مُسلم حکمرانوں کے سکّوں پر عموماً عربی زبان کی عبارات اور کبھی کبھی فارسی اندراجات بھی پائے جاتے ہیں۔ البتہ مُسلم حکمرانوں کے سکّوں پہ درج شدہ اشعار فارسی زبان میں ہیں۔ اِن بادشاہوں کے سِکّوں کے تعلق سے ایک دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ایک ہی نام متعدد خاندانوں میں مشترک ملتا ہے۔ مثلاً محمد شاہ کا نام خلجیوں، گجرات کے حکمرانوں کشمیر کے سلاطین، بنگال کے بادشاہوں، بہمنیوں اور عادل شاہیوں میں پایا جاتا ہے۔ ان تمام بادشاہوں کے سِکّوں کی شناخت کے لیے ان کی مخصوص وضع و قطع اور ساخت نیز رسم الخط اور ان کے القاب اور خطابات کو پیشِ نظر رکھنا ازبس ضروری ہے۔ بعض صورتوں میں القاب وغیرہ میں مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ اگر اس پر پوری طرح غور نہ کیا جائے تو ایک خاندان کے حکمران کے سکّے کو دوسرے خاندان کے حکمران سے منسوب کرنے کی غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔

متذکرہ صدر اُمور کو پیشِ نظر نہ رکھ کر بعض محققین سے فاش غلطیاں سرزد ہو گئی ہیں۔ ہندوستان کے ایک محقق نے بہمنی خاندان کے دو سِکّوں پر المعتصم باللہ اور الواثق باللہ کے القاب دیکھ کر اُنھیں معتصم باللہ اور واثق باللہ خلفائے بغداد سے منسوب کر دیا۔[1]

[1] گنج شائیگاں مصنفہ محمد رفیع موہانی عالی مطبوعہ مراد آباد ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴۸

ایران کے ایک محقق نے محمد شاہ والیٔ گجرات کے سکّے کو محض اس بنا پر کہ اس سکّے پر بادشاہ کا نام محمد شاہ درج ہے ایران کے قاچار خاندان کے حکمران محمد شاہ کے نام سے شایع کر دیا[۱]۔

سکوں کی عبارت کی زبان سے واقفیت نہ ہو تو عبارت کے صحیح مفہوم تک رسائی ممکن نہیں اور مطلب خبط ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی مثال سلاطین مغلیہ کے سِکّوں پر مندرجہ ایک دعائیہ کلمہ کی انوکھی تعبیر کی صورت میں ملتی ہے۔ ہندوستان کے ماہر مسکوکات قدیمہ سی۔آر۔ سنگھال نے اسٹیٹ میوزیم لکھنؤ میں محفوظ مغل سلاطین کے سکّوں کے کیٹیلاگ کی ترتیب کے ضمن میں، بادشاہ ہمایوں کے سکّوں پر مندرجہ دعائیہ جملہ ——— "خلد اللہ ملکہ دولتہ وسلطانہ" کو اول تو ایک فارسی محاورہ لکھا اور پھر بتلایا کہ اب تک کسی نے اِس جملہ کا صحیح ترجمہ نہیں کیا اور غلط مطلب نکالا۔ نیز یہ کہ (مسکوکات قدیمہ کی تاریخ میں) انھوں نے پہلی بار اس جملہ کو صحیح طور سے پڑھ کر درست مطلب نکالا ہے ان کی تحقیق میں "ملکہ و سلطانہ" سے مراد مَلِکہ اور سُلطانہ یعنی کوئین یا بادشاہ بیگم ہے[۲]۔ یاللعجب۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ مُسلم حکمرانوں میں سوائے شہنشاہِ جہانگیر کے کسی نے اپنے سکّوں پر اشارۃً بھی اپنی ملکہ کا ذکر نہیں کیا، چہ جائیکہ اس کے لیے دعائیہ کلمات درج کرے۔ یہ دُعا ملک، دولت اور اقتدار کے استقلال کے لیے ہے اور یہ جُملہ فارسی نہیں بلکہ عربی زبان کا ہے۔

یہ مسئلہ ایلخانی خاندان کی ایک حکمران ساتی بیگ کے سکّے سے بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ ملکہٗ و سلطانہٗ کے الفاظ بادشاہ بیگم یا کوئین پر قطعاً دلالت نہیں کرتے کیوں کہ ساتی بیگ نے جو خود ایک عورت اور سلطان سلیمان ایلخانی کی ملکہ تھی، اپنے سکّے پر خلد اللہ ملکہا استعمال کیا ہے[۳]۔

---

[۱] کیٹیلاگ تبریز میوزیم از آقائے جمال ترابی طباطبائیؒ مطبوعہ ایران جلد سوم صفحہ ۳۴۔
[۲] کیٹیلاگ آف مغل کوائینس ان دی اسٹیٹ میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی۔ آر۔ سنگھال مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۵ء فٹ نوٹس بر صفحات ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔
[۳] کیٹیلاگ تبریز میوزیم از آقائے جمال ترابی طباطبائیؒ مطبوعہ ایران جلد سوم صفحہ ۵۱۔

انگلستان کے مشہور مورخ اور ماہرِ مسکوکات قدیمہ اسٹینلی لین پول[1] نے ملکہ نور جہاں کا نام مہر النسار کے بجائے مُہر النسار درج کر کے اس کا ترجمہ "نسوانیت پر مہر" کیا ہے۔ اسی مستشرق نے شاہ جہاں کے لڑکے مراد بخش کے سکوں پر اُس کے لقب "مُروِّج الدین" کو "مُزَوِّجُ الدین" پڑھ کر، اس کے معنی ترویج (رواج دینے، پھیلانے) سے نہیں بلکہ تزویج (شادی کرنے، وابستہ ہونے) سے نکال کر خود ہی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ یہ عجیب لقب ہے۔

بعض سکوں پر دارالضرب کا نام بھی درج ہوتا ہے چند حکمرانوں نے دارالضرب کے مخصوص لقب بھی وضع کئے تھے مثلاً قبۃ الاسلام، شہر مکرم، تخت گاہ، دارالخلافہ، حضرت وغیرہ۔ مغل سلاطین نے اس خصوص میں بڑی جدت دکھائی اور کم و بیش ہر ایک دارالضرب کو ایک علٰحدہ لقب دیا جو 'دار' سے شروع ہوتا ہے۔ جیسے دارالخیر اجمیر، دارالامان ملتان، دارالفتح اُجین، دارالسرور برہان پور اور دارالجہاد حیدر آباد وغیرہ۔ شیر شاہ کے سکوں پر بھی کچھ القاب پائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی دارالضرب کے نئے نام کے ساتھ ساتھ اس کا قدیم نام بھی بطور عرف درج کیا گیا ہے مثلاً شیر گڈھ عرف حضرت دہلی۔

شیر شاہ کے کچھ سکّے ایسے بھی ملے ہیں جن پر لفظ 'جھاپنناہ' درج ہے۔ ماہرینِ مسکوکات قدیمہ نے اس کو ایک دارالضرب سمجھ لیا۔ چنانچہ انگلستان کے یوجین لیگٹ نے اپنی مُرتبہ فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے[2]۔ ایک اور محقق کوڈرنگٹن نے بھی "جھاپنناہ" کو دارالضرب قرار دے کر اس کو دہلی سے منسوب کیا ہے[3]۔ انڈین میوزم کلکتہ، میں محفوظ سکوں کے کیٹیلاگ میں نیلسن رائٹ نے بھی اپنے پیشروؤں کی رائے سے اتفاق کر کے "جھاپنناہ" کو دارالضرب بتلایا ہے[4]۔ نیلسن رائٹ نے شیر شاہ کے متعلقہ سکوں کی عبارتیں بھی کیٹیلاگ میں درج کی ہیں۔

---

[1] دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف ہندوستان اِن دی برٹش میوزیم مرتبہ اسٹینلی لین پول مطبوعہ لندن ۱۸۹۲ء انٹروڈکشن۔

[2] منٹ ٹاونس اینڈ کوائنس آف دی محمڈنس مرتبہ یوجین لیگٹ مطبوعہ لندن ۱۸۸۵ء صفحہ ۴۰

[3] میانول آف مسلمان نیومیسماٹکس، ایشیاٹک سوسائٹی مونوگرافس جلد ۷ مرتبہ اُو۔ کوڈرنگٹن مطبوعہ لندن ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۴۹

[4] کیٹیلاگ آف دی کوائنس اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ مرتبہ ایچ۔ نیلسن رائٹ مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۰۷ء جلد ۲ صفحہ ۸۷

نیلسن رائٹ نے اپنے محولہ ایک سکّے کی عبارت اس طرح درج کی ہے۔

رُخِ ثانی		رُخِ اول	
شاہ السلطان شیر خلد اللہ ملکہ وسلطانہ ۹۴۹	دائرے میں	لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ	دائرے میں
فرید الدنیا والدین ابوالمظفر جھاپنپاہ	حاشیہ	السلطان العادل ابابکر عمر عثمان علی	حاشیہ

محقق مذکور نے مندرجہ صدر عبارت کی روشنی میں اس سکّے کو دارالضرب "جھاپنپاہ" میں مضروب قرار دیا ہے۔ اس استنباط پر سب سے پہلا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر یہاں "جھاپنپاہ" کو دارالضرب بفرضِ محال مان بھی لیا جائے تو اس کا ما قبل ابوالمظفر بے مصرف ہوجاتا ہے۔ دارالضرب کا جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے لقب تو ہوتا ہے مگر اس کی کُنیت نہیں ہوتی۔ دارالضرب کو ظفر یاب، ظفر قرین اور دارالفتح کے القاب دیئے گئے ہیں مگر کبھی کسی دارالضرب کو ابوالفتح یا ابوالمظفر کا لقب نہیں دیا گیا یہ القاب خود حکمرانوں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ جو اِشکال پیدا ہورہا ہے اس کو دور کرنے کی آسان صورت یہ نظر آتی ہے کہ سکّے کے رُخ اول اور رُخ ثانی پر مندرجہ عبارت کو سلسلہ وار پڑھا جائے ایسا کرنے سے اس کا صحیح مفہوم معلوم ہوسکتا ہے۔

اس سکّے کے رُخِ اول پر کلمہ طیبہ دائرے میں درج ہے اور حاشیہ پر خلفائے اربعہ کے نام ہیں۔ اسی رُخ پر خلفاء کے ناموں سے پہلے السلطان العادل کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جن کا کوئی تعلق خلفاء سے نہیں ہوسکتا کیونکہ خلفاء چار ہیں سُلطان بصیغۂ واحد درج کیا گیا ہے اگر خلفاء کو سُلطان کہنا مقصود ہوتا تو سلاطین بصیغۂ جمع استعمال ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ کلمۂ طیبہ اور خلفائے اربعہ کے اسماء کے اندراج کے بعد وہ مذہبی فارمولا

جو سُنّی عقیدے کے حکمران اپنے سکوّں پر درج کرواتے رہے ہیں، مکمل ہوگیا اور اس کے بعد جو الفاظ رُخِ اوّل پر درج ہیں ان کا تعلق رُخِ ثانی پر مندرجہ حکمران کے نام، اس کے القاب اور خطابات سے ہے۔ اس طرح پورے سکّے کی عبارت دو حصوں میں تقسیم کی جاکر بصورت ذیل پڑھی جائے گی۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ابا بکر عمر عثمان علی۔ السلطان العادل فرید الدنیا والدین ابوالمظفر جھانپناہ شیرشاہ السلطان خلد اللہ ملکہ و سلطانہ ۹۴۹۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "جھانپناہ" کو شیرشاہ کا لقب سمجھ لیا جائے تو اس سکّے پر دارالضرب کا نام کہاں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سکوّں پر عموماً دارالضرب کا نام درج ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک سکّے پر دارالضرب کا نام مندرج ہو۔ اُن سکوّں پر جو عام حالات میں شہروں میں مضروب ہوتے ہیں ان پر دارالضرب کا نام پایا جاتا ہے لیکن حکمران جب کبھی مہمات جنگ میں مصروف ہوتے ہیں اور انھیں فوج کے اخراجات کے لیے رقم کی ضرورت ناگہانی طور پر لاحق ہوتی ہے تو وہ برسرِ موقع سکّے مضروب کرواتے ہیں۔ مغل حکمرانوں نے تو فوج کے ساتھ ایک مستقل دارالضرب کا انتظام کر رکھا تھا جس کو انھوں نے اُردو کا نام دیا تھا۔ شیرشاہ نے بھی غالباً زیر بحث سکّے اپنی جنگی مہمات کے دوران مضروب کروائے ہوں گے اس لیے ان پر کسی مستقل دارالضرب کا نام پایا نہیں جاتا۔

ہمارے اس استدلال کے بارے میں کہ "جھانپناہ" شیرشاہ کا لقب ہے، ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ ایسی صورت میں شیرشاہ کے ان سکوّں پر بھی یہ لقب پایا جانا چاہیے جو کسی مستقل دارالضرب سے جاری ہوئے ہوں۔ اس سوال میں بڑی معقولیت ہے۔ اس سلسلے میں شیرشاہ کے دوسرے سکوّں کی تلاش کے دوران حسنِ اتفاق سے نیلسن رائٹ ہی کے کیٹلاگ میں ایک ایسا سکّہ مل گیا جس پر "جھانپناہ" کا لقب بھی موجود ہے اور دارالضرب کا نام بھی درج ہے۔ اس سکّے کے ہر دو جانب

کی عبارت حسبِ ذیل ہے۔[1]

	رُخِ اول		رُخِ ثانی
دائرے میں	لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ	دائرے میں	شاہ السلطان شیر خلد اللہ ملکہ و سلطانہ
حاشیہ	السلطان العادل ضرب اجین ابا بکر عمر عثمان علی	حاشیہ	فرید الدنیا والدین ابوالمظفر جہاں پناہ

اس سکے کو دیکھنے کے بعد کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ جہاں پناہ کو دارالضرب سمجھا جائے۔ اس طرح ایک دیرینہ غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

سکے پڑھنے کے باب میں اس قدر تفصیل میں جانے اور محققین سے جو فرد گزاشتیں ہوئی ہیں ان کی نشاندہی کرنے کا مقصد محض یہ بتلانا تھا کہ وہ لوگ جو کیٹیلاگ مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ذراسی بے احتیاطی یا بعض خاص پہلوؤں سے عدم واقفیت کی وجہ سے کیسی شدید غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں عام شائقین کے لیے غیر معمولی احتیاط ازبس ضروری ہو جاتی ہے۔ جب عام سکوں کے پڑھنے میں ایسی دشواریاں پیش آتی ہیں تو سکوں پر مندرجہ اشعار کو صحت کے ساتھ پڑھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ مستشرقین نے بھی اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے لیکن سکوں پر مندرجہ اشعار کے پڑھنے میں ان سے بھی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جنھیں آیندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔

---

[1] کیٹیلاگ آف دی کوائنس ان دی انڈین میوزیم کلکتہ مرتبہ ایچ۔ نیلسن رائٹ مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۰۷ء جلد ۲ صفحہ ۹۱

غیر معمولی سائز اور وزن کے عظیم الشان سکّے

جن سکّوں پر عربی اور فارسی زبانوں کے اشعار کے اندراج کا حوالہ ملتا ہے، ان میں سے بعض سکے غیر معمولی سائز اور وزن کے پائے گئے ہیں۔ ایسے سکّوں کے بارے میں ماہرین مسکوکات قدیمہ کی آراء میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ وہ سکّے ہیں ہی نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ "نذرانہ میڈل" ہیں۔ ایک تیسرا طبقہ انھیں سکّے ہی قرار دیتا ہے۔

ہمارے موضوع کتاب کے تعلق سے اس بحث کا تصفیہ نہ صرف دلچسپی کا حامل ہے بلکہ بے حد اہمیت بھی رکھتا ہے کیونکہ ان بڑے دیناروں، درہموں، اشرفیوں اور روپیوں کو سکّے قرار دیا جائے تب تو ان پر مندرجہ اشعار کا اس کتاب میں شامل کیا جانا درست قرار پائے گا بصورت دیگر وہ اشعار اس کتاب میں جگہ نہ پاسکیں گے۔

سب سے پہلے ہم ان ماہرین کی آراء پیش کریں گے جو ان عظیم اشرفیوں اور روپیوں کو سکّے نہیں سمجھتے۔ ان ماہرین کا خیال ہے کہ چونکہ ان کا وزن اور سائز عام سکوں کے وزن اور سائز کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے، اس لیے ان کو سکّے نہیں کہا جاسکتا۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ایسے سکوں کا وزن عام طور سے رائج سکّوں کے وزن ایک تولہ یا دو تولے کے برخلاف پانچ تولے سے ایک ہزار تولے تک بیان کیا گیا ہے۔ سکوں کے وزن میں اس غیر معمولی اضافے کے تناسب سے ان کے سائز میں بھی اضافہ ہونا لازمی تھا۔ ماہرین مسکوکات کے اس طبقے میں آر۔ بی۔ وائٹ ہیڈ[1] اور ایس۔ ایچ۔ ہوڈی والا[2] پیش پیش ہیں۔

---

[1] جرنل آف دی نیومسماٹک سوسائٹی جلد ۱۸ صفحات ۲۱۰ - ۲۱۲

[2] ہسٹاریکل اسٹڈیز ان مغل نیومسماٹکس مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۳ء صفحات ۷۹ - ۸۰

ان کی رائے یہ ہے کہ اگر یہ واقعتاً سکّے ہوتے تو تاریخوں میں ان کے چلن کا ذکر ضرور ملتا اور املاک و جائیداد کی خرید و فروخت کے دستاویزات میں ان کا تذکرہ کیا جاتا چونکہ ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی اِس لیے وہ یہ ماننے کے لیے آمادہ نہیں ہیں کہ ایسی عظیم اشرفیاں اور روپیے سکّے تھے۔ ان ماہرین نے ان سکوں کے تعلق سے یہ نظریہ بھی پیش کیا ہے کہ چونکہ حکمرانوں کے خزانوں میں سونے چاندی کے ہزاروں لاکھوں معمولاً رائج چھوٹے چھوٹے سکوں کی حفاظت ایک دشوار امر تھا، اس لیے ان حکمرانوں نے بہ نظرِ حفاظت سونے اور چاندی کی کثیر مقدار کو اِن گاٹس یا بالفاظ دیگر اینٹوں کی شکل میں ڈھال کر ان پر اپنے کچھ مخصوص علامات کندہ کرکے انھیں خزانوں میں محفوظ کر دیا۔

اِن ماہرین کا استدلال اپنے اندر ایک منفی انداز لئے ہوئے ہے۔ وہ کسی ٹھوس شہادت کی روشنی میں مثبت طور پر یہ بتلانے سے قاصر ہیں کہ زیرِ بحث اشرفیاں اور روپیے سکے نہیں ہیں۔ ان کے استدلال کا یہ پہلو بھی کہ املاک و جائیداد کی خرید و فروخت کے دستاویزات میں کہیں بھی ان عظیم سکوں کا تذکرہ نہیں ملتا کوئی مضبوط بنیاد نہیں رکھتا۔ کیونکہ ان ماہرین نے مالیات کے اس اہم پہلو کو سرے سے نظر انداز کر دیا کہ ہر دَور میں تجارتی کاروبار اور رقمی لین دین وغیرہ کے لیے اس دور کے اقل ترین سکے (جس میں ریزگاری شامل نہیں ہوتی) کو بنیادی اکائی کے طور پر تسلیم کرلیا جاتا ہے اور تمام معاملات چاہے ان کا تعلق سرکاری محاصل کی ادائیگی سے ہو یا تجارتی لین دین سے اسی بنیادی اکائی کی اساس پر انجام پاتے ہیں۔ حکومتوں کی طرف سے بجٹ کی تیاری بھی اسی بنیادی اکائی پر مبنی ہوتی ہے ملازمین اور افواج کی تنخواہوں کا تعین بھی اِسی اکائی کی اساس پر کیا جاتا ہے۔ عہدِ حاضر میں ہندوستان اور پاکستان میں روپیہ بنیادی اکائی ہے۔ بنگلہ دیش میں ٹکہ، برطانیہ میں پاونڈ اور امریکہ میں ڈالر بنیادی اکائیاں ہیں اور ان سب ممالک میں مالیات سے متعلق تمام امور انہی بنیادی اکائیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔

زمانۂ گزشتہ میں مختلف ممالک میں بنیادی اکائیاں ان کی اپنی الگ الگ رہیں۔ عرب ممالک میں ایک عرصے تک درہم و دینار کا چلن رہا۔ ایران میں تومان رائج تھے۔ اور ہندوستان میں مغلوں کے دور سے روپیہ بنیادی اکائی قرار پایا۔ اس بات کا ثبوت ہمیں بعض

تاریخی شواہد سے ملتا ہے۔ منتخب اللباب کا مصنف خافی خاں بیان کرتا ہے کہ شہنشاہ اکبر کی وفات کے وقت اس کے خزانے میں محفوظ سونے، چاندی کے ذخائر کی قیمت تین کروڑ روپیہ سے متجاوز تھی۔[1]

ڈاکٹر بینی پرشاد نے تاریخ جہانگیر میں بیان کیا ہے کہ کشمیر کے جنوب میں پنجاب کی سرحد سے ملی ہوئی چھوٹی سی ریاست کشتوار کی مہم کے کامیاب انصرام کے صلے میں دلاور خاں کو کشتوار کی ایک سال کی آمدنی دی گئی جو ایک لاکھ روپیہ تھی۔[2]

عہدِ شاہجہانی میں اللہ وردی خاں نے شاہ جی مرہٹہ سردار کو بے دخل کر کے ایک دوسرے بااثر مرہٹہ سردار ہمیر راؤ کو اپنی طرف بلا لینے کے بعد اس کو ایک ہزار سوار اور پچاس ہزار روپے دیے۔[3]

اورنگ زیب نے بلخ کے ایلچی خوشی بیگ کے رفقاء کو خلعت کے علاوہ پانچ ہزار روپے عطا کیے۔[4]

مندرجات بالا سے واضح ہو جاتا ہے کہ عہد مغلیہ میں روپیہ ہی ایک بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا تھا اور محاصل کا تعین اور انعام و اکرام سب اسی بنیادی اکائی کے بموجب انجام پذیر ہوتے تھے۔ ظاہر ہے املاک و جائداد کی خرید و فروخت کے معاملات بھی اسی بنیادی اکائی یعنی روپے کی اساس پر مبنی ہوتے تھے۔ ایسی صورت میں ان ماہرین مسکوکات کا یہ اعتراض کیسے درست ہو سکتا ہے کہ املاک و جائداد کے دستاویزات میں کہیں بھی ان عظیم اشرفیوں اور روپیوں کا ذکر نہیں ملتا۔ عہدِ حاضر میں بھی اگر کوئی شخص کسی سے اس کی جائداد مثال کے طور پر دس لاکھ روپے میں خرید کر زرِ ثمن کے طور کثیر مالیتی کرنسی نوٹ ادا کرتا ہے تو بیعنامہ کی رجسٹری کے ریکارڈ میں ان کثیر مالیتی کرنسی نوٹوں کا کہیں بھی ذکر نہیں ملے گا بلکہ صرف بنیادی اکائی کی اساس پر دس لاکھ روپے کی ادائیگی کا اندراج پایا جائے گا۔ املاک و جائداد کی خرید فروخت کے ریکارڈ میں کثیر مالیتی کرنسی نوٹوں کا ذکر نہ پا کر کیا کوئی شخص ان کے سکۂ رائج الوقت ہونے سے انکار کر سکتا ہے؟ یہ عظیم سکّے محض خزانوں میں محفوظ رکھنے کے لیے مضروب نہیں

---

[1] منتخب اللباب مصنفہ خافی خاں مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۲۴۳

[2] تاریخ جہانگیر مصنفہ ڈاکٹر بینی پرشاد مترجمہ رحیم علی الہاشمی شایع کردہ ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۷۹ء صفحہ ۳۰۷

[3] تاریخ شاہجہاں مصنفہ ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ ترجمہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین شایع کردہ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۴۲

[4] عالمگیر نامہ قلمی آندھرا پردیش گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد، مصنفہ مرزا محمد کاظم

کئے جاتے تھے۔ بلکہ وہ بادشاہوں اور امراء کی جانب سے مستحقین کو ہدیہ، تحفہ، انعام، اکرام، صلۂ خدمت یا اجرت کے طور پر بھی عطا کئے جاتے تھے اور بازار میں ان کا چلن عام تھا۔

اس سلسلے میں خلیفہ ہارون الرشید کے عہد کے ایک مشہور شاعر ابو مسلم ولید انصاری الملقب بہ صریع الغوانی کا بیان کردہ ایک واقعہ لایق ذکر ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ایک دفعہ وہ ہارون الرشید کے وزیر جعفر برمکی کی مصاحبت میں تھا کہ جعفر نے ایک مغنیہ کو طلب کر کے حکم دیا کہ بربط پر کوئی اچھی غزل سنائے۔ مغنیہ نے بربط چھیڑا اور غزل سرا ہوئی۔ مغنیہ کی سریلی آواز اور کلام کی شیرینی سے جعفر پر مدہوشی کا عالم طاری ہوگیا۔ جب غزل ختم ہوئی تو جعفر نے دریافت کیا کہ وہ کس کی غزل تھی۔ صریع الغوانی نے بتایا کہ وہ غزل اس کی اپنی تھی۔ یہ سُن کر جعفر بہت خوش ہوا۔ اور حکم دیا کہ اس غزل کے جتنے شعر تھے اتنے سو دینار صریع الغوانی کو دے دیئے جائیں۔ صریع الغوانی کہتا ہے کہ یہ سُن کر وہ دل ہی دل میں افسوس کرنے لگا کہ کاش وہ غزل جس میں صرف چار ہی شعر تھے کچھ اور طویل ہوتی تو اسے انعام اور زیادہ ملتا لیکن جب انعام کے دینار اس کے سامنے لائے گئے تو وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ ان میں سے ہر ایک دینار سو دیناروں کے برابر تھا۔ صریع الغوانی کو محو حیرت دیکھ کر جعفر نے اس سے کہا کہ چونکہ تمہاری غزل میں صرف چار ہی شعر تھے اس لیے میں نے حکم دیا کہ تمہیں چار سو بڑے دینار دیئے جائیں تاکہ تم کو کثیر رقم مل جائے[1]۔ جعفر برمکی کی اس وضاحت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسے بڑے سکّے بھی رائج الوقت تھے اور زر تبادلہ کی صورت میں ان کے معاوضے کے طور پر رقوم کی داد و ستد کا کاروبار عام تھا۔ اس طرح ان ماہرین کا یہ اعتراض کہ ان عظیم اشرفیوں کا بازار میں چلن نہیں تھا ساقط ہوجاتا ہے۔

انہی ماہرین کا دوسرا اعتراض کہ یہ عظیم اشرفیاں اور روپے سکّے نہیں تھے بلکہ یہ بڑے بڑے "ان گاٹس" یا سونے چاندی کی اینٹیں تھیں جن پر کچھ نقش و نگار بنا دیئے جاتے تھے اور عبارتیں کندہ کردی جاتی تھیں جنھیں سونے چاندی کی کثیر مقدار کی حفاظت کے لیے خاص طور سے تیار کر کے خزانوں میں محفوظ کردیا جاتا تھا۔ ان ماہرین کا خیال یہ ہے کہ معمولی سائز اور وزن کی چھوٹی چھوٹی اشرفیوں اور روپیوں کا شمار بھی آسان نہ تھا اور ان کے سرقے کا بھی امکان تھا اس لیے

---

[1] البرامکہ مصنفہ عبدالرزاق کانپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۹۰

حکمرانوں نے حفاظت کی یہ آسان تدبیر اختیار کی۔ یہ اعتراض ضرور لائق غور ہوتا بشرطیکہ کسی حکمران کے خزانے میں محفوظ سونے اور چاندی کی پوری مقدار ایسے "ان گاٹس" یا اینٹوں کی شکل میں ملتی مگر صورت حال اس سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔

منتخب اللباب کے مصنف خافی خاں کا بیان[۱] ہے کہ شہنشاہ اکبر کی وفات کے وقت اس کے خزانے میں محفوظ جواہرات کے علاوہ سو تولے سے پانچ سو تولے تک وزن کی ایک ہزار اشرفیاں موجود تھیں۔ خافی خاں آگے چل کر بیان کرتا ہے کہ ان اشرفیوں کے علاوہ دو سو بہتر من غیر مسکوک سونا اور تین سو ستر من غیر مسکوک چاندی بھی محفوظ تھی۔

خافی خاں کی بیان کردہ روایت کے مطابق سو تولے سے پانچ سو تولے وزن کی ایک ہزار اشرفیوں کا جملہ وزن اوسطاً ستر من کے قریب ہوتا ہے جبکہ غیر مسکوک سونے کی مقدار دو سو بہتر من بتلائی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہزار عظیم اشرفیاں یا بقول ان ماہرین کے "ان گاٹس" یا اینٹیں بنولنے کے باوجود مزید دو سو بہتر من سونا غیر مسکوک حالت میں رکھا ہوا تھا اور چاندی تو پوری تین سو ستر من غیر مسکوک ہی تھی۔ اس صورت حال کی موجودگی میں وائٹ ہیڈ اور ہوڈی والا کا یہ نظریہ کہ زیر بحث عظیم اشرفیاں اور روپے سکے نہیں تھے بلکہ "ان گاٹس" یا سونے چاندی کی اینٹیں تھیں کلیتاً بے بنیاد قرار پاتا ہے۔

ماہرین مسکوکات قدیمہ کا دوسرا گروہ جس میں اے۔ کننگھیم نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس خیال کا حامی ہے کہ یہ عظیم الشان سکے "نذرانہ میڈل" ہیں۔ ان ماہرین نے یہ اصطلاح جو وضع کی ہے وہ خود مجموعۂ اضداد ہے۔ اولاً یہ کہ "میڈل" انگریزی زبان کا لفظ ہے اور "نذرانہ" کے ساتھ اس کی ترکیب درست نہیں۔ ثانیاً یہ کہ اگر "میڈل" کو تمغہ کا مترادف مان بھی لیا جائے تو اس سے اس اصطلاح کے معنوی تضاد میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نذرانہ اس پیش کش کو کہا جاتا ہے جو نسبتاً کم رتبہ لوگ عالی مرتبت ہستیوں کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف میڈل یا تمغہ ایک ایسا نشانِ امتیاز ہوتا ہے جو حکمرانوں یا مقتدر اداروں کی جانب سے کسی نمایاں کارنامے کی انجام دہی یا کسی مخصوص تقریب کے موقع پر مستحقین کو عطا کیا جاتا ہے۔ ایسے میڈل سونے، چاندی یا کانسے کے بنائے جاتے ہیں۔ ان کے ایک رُخ پر بالعموم اس اہم کارنامے یا تقریب کی صراحت ہوا کرتی ہے

---

[۱] منتخب اللباب مصنفہ خافی خاں مطبوعہ کلکتہ جلد اول ص ۲۴۳ نیز ملاحظہ ہو روئیداد ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۸۳ء صفحہ ۴

جس کے سلسلے میں اس کی اجرائی عمل میں آرہی ہے تو دوسرے رُخ پر مستحقِ انعام اشخاص کے نام کندہ ہوتے ہیں، کبھی کبھی ان کے ہر دو جانب متعلقہ مہم یا تقریب کی تفصیلات درج ہوتی ہیں اور انعام یابندگان کے ناموں کی صراحت نہیں ہوتی۔ ولیم مارسڈن نے شجاع الدّولہ نواب وزیر اودھ کے اسی قسم کے ایک چاندی کے میڈل کا نقش اپنی کتاب میں دیا ہے[۱] جو اس نے روہیلوں کے سردار حافظ رحمت خاں کو شکست دینے کے بعد جاری کیا تھا۔

رخِ اول



رخِ دوم



مندرجۂ صدر عبارت سے واضح ہو جاتا ہے کہ میڈل کیسے ہوتے ہیں۔ ان کے برخلاف نذرانے کے طور پر عموماً اشرفیاں، روپے یا جواہرات پیش کئے جاتے ہیں اس لیے میڈل کو نذرانے کے ساتھ خلط ملط کر کے 'نذرانہ میڈل' جیسی 'اہمل' بے جوڑ اصطلاح وضع کرنا کسی طرح بھی درست قرار نہیں پاسکتا۔

اب رہ جاتا ہے ماہرینِ مسکوکاتِ قدیمہ کا وہ طبقہ' جو ان عظیم الشان اشرفیوں اور روپیوں کو سکّے ہی قرار دیتا ہے۔ اس گروہ کے سرکردہ مستشرقین میں' جان رچرڈسن، ولیم مارسڈن' اور جیمس گِبس کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ رچرڈسن تو مشرقی السنہ کے علماء میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ اس نے انگریزی زبان میں فارسی اور عربی زبانوں کی ایک ضخیم لغت مرتب کی ہے — جو اصطلاحات کے حوالوں کے لیے اپنا ایک خاص معیار رکھتی ہے۔ ولیم مارسڈن اور جیمس گِبس مشاہیر ماہرینِ مسکوکاتِ قدیمہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔

---

[۱] نیومسمیاٹا اورنیٹالیا السٹراٹا مطبوعہ لندن ۱۸۲۵ء جلد دوم صفحہ ۸۳۷۔

رچرڈسن نے "سکے" کی اصطلاح کے تحت اپنی لغت میں جو نوٹ لکھا ہے[۵] وہ ہمارے موضوع کے تعلق سے بڑی اہمیت کا حامل ہے جس کا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"سکہ پورے معیاری وزن کے روپے کو کہتے ہیں۔ مشرق کے بعض سکوں میں ندرت اور نفاست جس اعلیٰ درجہ پر پائی جاتی ہے، اس کی مثال یوروپ والے پیش نہیں کرسکتے۔ کچھ عرصہ قبل مجھے محض اتفاقی طور پر مغل اعظم شاہ جہاں کے ۱۶۵۲ء میں دہلی میں مضروب شدہ ایک سکے کو دیکھنے اور بعجلت اس کی نقل (کاغذ پر) اتارنے کا موقع ملا۔ میرے خیال میں یہ سکہ میری' اوپر ظاہر کردہ رائے کو کافی تقویت بخشتا ہے۔ یہاں میں اس سکے کی عبارت درج کرتا ہوں جو بعض اصحاب کے لیے ذوق تجسس کا سامان فراہم کرنے کے علاوہ' معلومات آفریں بھی ہوگی ....."

آگے چل کر رچرڈسن نے بتلایا ہے کہ یہ سکہ سونے کا ہے یعنی اشرفی ہے جو گول ہے اور اس کا وزن تقریباً ستر اونس اور قطر کم و بیش چار انچ ہے۔ یوروپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد انگریزی زبان میں یہ پہلا حوالہ ہے جو زیر بحث غیر معمولی وزن اور سائز کے سکوں کے بارے میں ہمیں ایک معیاری تصنیف میں ملتا ہے۔

ولیم مارسڈن نے مسکوکات قدیمہ کے بارے میں اپنی مشہور تصنیف[۶] میں بیان کیا ہے کہ اس نے شاہ جہاں کی ایک' دو سو تولے کی اشرفی کا میٹل کاسٹ بنواکر اپنے ذخیرۂ مسکوکات میں محفوظ رکھا ہے جس کا قطر ساڑھے پانچ انچ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں کی دو سو تولے کی اشرفیاں ایک ہی ڈائی سے مضروب نہیں ہوئیں بلکہ ان کی تیاری کے لیے ایک سے زیادہ ڈائیاں استعمال کی گئی تھیں۔ اسی لیے رچرڈسن نے جو اشرفی دیکھی اس کا قطر چار انچ تھا اور مارسڈن نے جس اشرفی کا میٹل کاسٹ تیار کروایا اس کا قطر ساڑھے پانچ انچ تھا۔ مارسڈن نے آگے چل کر مزید یہ بیان کیا ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب کا ایک روپیہ گوتھا (مشرقی جرمنی) کے نوابوں کے ذخیرہ نوادرات میں محفوظ ہے جس کا قطر چار اعشاریہ چار انچ اور جس کا وزن

---

[۵] پرشین اینڈ عربک ڈکشنری مرتبہ جان رچرڈسن مطبوعہ لندن ۱۸۰۸ء جلد اول صفحہ ۵۳۶۔
[۶] نیومسماٹا اورینٹالیا الشراٹا مصنفہ ولیم مارسڈن مطبوعہ لندن ۱۸۲۵ء جلد دوم صفحہ ۶۴۱، ۶۵۱۔

پانچ جرمن پاونڈ ہے۔

جیمس گبس بیان کرتا ہے کہ اس نے مہاراجہ سندھیا کے نوادرات کے ذخیرے میں محفوظ اورنگ زیب کی ایک سو تولے کی اشرفی مہاراجہ کی اجازت سے عارضی طور پر حاصل کرکے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے اراکین کے اجلاس میں پیش کی تھی۔ اس اجلاس کی تفصیل بھی گبس نے اس اشرفی کی تصویر کے ساتھ شایع کی ہے[۵۱]۔

جان رچرڈسن، ولیم مارسڈن اور جیمس گبس کے ان حوالہ جات سے واضح ہے کہ ان ماہرین نے زیرِ بحث اشرفیوں اور روپیوں کو سکّہ جات ہی تسلیم کیا ہے۔ رچرڈسن نے تو پوری دیانت داری کے ساتھ ان عظیم الشان سِکّوں کی ندرت اور نفاست کو سراہتے ہوئے یوروپ کی مسکوکات کے مقابلے میں ان کی برتری بھی تسلیم کی ہے۔ مارسڈن اور گبس نے ان سکّوں کو دنیائے مسکوکات کے عجائب میں شمار کیا ہے۔ لیکن ان مستشرقین کی آرا کے علاوہ تاریخی شواہد کی روشنی میں بھی ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ ایسے سِکّوں کی ابتدا کب ہوئی۔

عبدالرزاق کانپوری نے اپنی تصنیف "البرامکہ"[۵۲] میں بیان کیا ہے کہ ہارون الرشید نے ۱۷۶ھ / ۷۹۲ء میں جعفر برمکی کو مغرب (مراکش) کا حاکم مقرر کیا تھا لیکن یہ خدمت بالکل اعزازی تھی کیونکہ جعفر برمکی تو خلیفے کے پاس بغداد ہی میں رہتا تھا اور مغرب میں اس کا قائم مقام حکومت کرتا تھا نیز یہ کہ اس زمانے میں ڈاک اور دارالضرب کے محکمے بھی جعفر برمکی کے زیرِ انتظام تھے —— عبدالرزاق کانپوری نے مزید یہ بیان کیا کہ اسی زمانے میں جعفر برمکی نے وزنی دینار مضروب کروائے تھے۔

خلفائے عباسیہ کے دوَر کے ایک مورخ محمد بن عبدوس الجہشیاری نے اپنی تصنیف "کتاب الوزرار و الکتّاب" میں اپنے پیش رو مورخ حارث ابن ابی اُسامہ مصنف تاریخ الخلفار کے حوالے سے ایک روایت یہ بیان کی ہے کہ حارث ابن ابی اُسامہ نے جعفر برمکی کے مکان میں ایسے چار ہزار دینار دیکھے تھے جن میں سے ہر ایک دینار ایک سو دینار کے مساوی تھا[۵۳]۔

---

[۵۱] روئیداد ایشیاٹک سوسائٹی بنگال بابتہ مارچ ۱۸۸۵ء صفحات ۵۲، ۵۳۔
[۵۲] البرامکہ مصنفہ عبدالرزاق کانپوری مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۶۶
[۵۳] کتاب الوزرار والکتّاب مصنفہ محمد بن عبدوس الجہشیاری قلمی کتب خانہ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی ورق ۱۵۱ الف۔

متذکرہ بالا روایات کا تعلق خلفائے عباسیہ کے دور سے تھا۔ اب ہم ایک ایسی نادر کتاب سے ان عظیم الشان سِکوں کے بارے میں شہادت پیش کریں گے جس کا مصنف ٹھاکر پھیرو سلطان علاء الدین خلجی اور اس کے بیٹے سلطان قطب الدین مُبارک خلجی کے عہد میں دارالضرب دہلی کا "منٹ ماسٹر" تھا۔ ٹھاکر پھیرو نے یہ کتاب پراکرت بھاشا میں ۱۳۱۸ء میں لکھی تھی۔ اس کتاب میں ان دونوں خلجی سلاطین کے سِکوں کی پوری تفصیلات درج ہیں۔ یہ کتاب صدیوں تک پردۂ گمنامی میں رہی۔ اب تک اس کے صرف دو نسخے پائے گئے ہیں جن میں سے ایک نسخہ بیکانیر کے اگرچند نہاتا کتب خانے میں اور دوسرا جین بھنڈار کلکتہ میں محفوظ ہے۔ مقام مسرت ہے کہ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد نے اس کے اقتباسات کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر غلام یزدانی کمیموریٹیو والیوم میں شایع کروایا ہے جو ہمارے پیش نظر ہے[1]۔

اس کتاب میں ٹھاکر پھیرو نے سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان قطب الدین مبارک خلجی کے سونے اور چاندی کے سِکّوں کی جو تفصیلات بیان کی ہیں، وہ بے حد دلچسپ اور نہایت اہم ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی کے سونے کے سکے ایک تولے کے عام سِکّوں کے علاوہ پانچ تولے، دس تولے، پچاس تولے اور سو تولے وزن تک مضروب کئے جاتے تھے۔ سلطان قطب الدین مبارک خلجی کے سکوں کے بارے میں ٹھاکر پھیرو کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حکمران نے اپنی جدت طبع سے کام لے کر اپنے سِکّوں میں کچھ اور تنوع پیدا کیا تھا۔ ٹھاکر پھیرو لکھتا ہے کہ قطب الدین مبارک خلجی کے سکّے عام سونے کے سکوں کے علاوہ پانچ تولے، دس تولے، بیس تولے، تیس تولے، چالیس تولے، پچاس تولے، ساٹھ تولے، ستّر تولے، اسّی تولے، نوّے تولے سو تولے، ایک سو پچاس تولے اور دو سو تولے تک مضروب کئے جاتے تھے۔ ٹھاکر پھیرو مزید لکھتا ہے کہ متذکرہ اوزان کی گول اشرفیوں کے علاوہ انہی اوزان کی چوکور اشرفیاں بھی بنائی جاتی تھیں۔ آگے چل کر وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ان تمام اوزان کے چاندی کے سکّے بھی مسکوک ہوا کرتے تھے۔

خلجی دور حکومت میں ان عظیم الشان اشرفیوں اور روپیوں کی تکنیک کے بارے میں دارالضرب دہلی کے منٹ ماسٹر ٹھاکر پھیرو کی باوثوق شہادت کے بعد عہد مغلیہ کے نامور وزیر اور مشہور مؤرخ ابوالفضل کی بیان کردہ تفصیلات بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر غلام یزدانی کمیموریٹیو والیوم شایع کردہ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد مرتبہ ڈاکٹر وی۔ ایس۔ اگروال ۱۹۶۶ء صفحات ۸۷ تا ۱۰۱۔

وہ بیان کرتا[1] ہے کہ شہنشاہ اکبر کے عہد میں سونے کے جو بڑے سِکّے مضروب ہوئے تھے اُن میں سب سے بڑے سکے کا نام "سہنسہ" تھا جس کا وزن ایک سو ایک تولے اور نو ماشے تھا۔ اس سکے کے ایک جانب بادشاہ کا نام اس کے القاب اور ضرب دارالخلافہ آگرہ اور دوسری جانب کلمہ طیبّہ اور ایک قرآنی آیت کے علاوہ اصحاب اربعہ کے نام درج تھے۔ اس سِکّے کی ڈائی مقصودؑ مُہرکن نے تیار کی تھی۔ پھر ڈائی بنانے کا کام ملا علی احمد کے سپرد ہوا۔ اور سکّے کی عبارت میں بھی کچھ تبدیلی کی گئی۔ ابوالفضل مزید لکھتا ہے کہ بعد میں یہ سب عبارتیں موقوف کر دی گئیں اور سکّے کے ہر دو جانب ملک الشعراء فیضی کی رباعیاں درج کی جانے لگیں۔ وہ بیان کرتا ہے کہ "سہنسہ" سے چھوٹا سونے کا سکّہ "رہس" تھا جس کا وزن پچاس تولے تھا۔ اس سکّے پر بھی فیضی ہی کی رباعیوں کا اندراج ہوتا تھا۔ "رہس" کے نصف وزن کے سکے کا نام "آتمہ" تھا اور یہ سکّہ گول بھی بنایا جاتا تھا اور چوکور بھی۔

شہنشاہ جہانگیر نے اپنی عظیم الشان اشرفیوں اور روپیوں کی تفصیلات اپنی خود نوشت سوانح توزک جہانگیری میں درج کی[2] ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ "ایک مبارک ساعت میں مَیں نے یہ فرمان صادر کیا کہ مختلف اوزان کے سکّے بنائے جائیں اور ان میں سے ہر ایک کا جداگانہ نام رکھا جائے چنانچہ سو تولے کی اشرفی کا نام نور شاہی پچاس تولے کی اشرفی کا نام نور سلطانی، بیس تولے کی اشرفی کا نام نور دوست، دس تولے کی اشرفی کا نام نور کرم اور پانچ تولے کی اشرفی کا نام نور مہر رکھا جائے......"

وہ آگے چل کر بیان کرتا ہے کہ "میں نے چاندی کے سو تولے کے سکّے کا نام کوکب طالع' پچاس تولے کے سِکّے کا نام کوکب اقبال، بیس تولے کے سکّے کا نام کوکب مراد، دس تولے کے سکے کا نام کوکب بخت اور پانچ تولے کے سکے کا نام کوکب سعید رکھا......"

جہانگیر مزید صراحت کرتا ہے کہ سو تولے سے دس تولے وزن تک کی اشرفیوں پر ایک جانب کلمۂ طیبہ اور آصف خاں کی ایک بیت اور دوسری جانب مقام ضرب، سنہ ہجری سنہ جلوسی اور آصف خاں کی دوسری بیت درج ہوا کرتی تھی۔

---

[1] آئینِ اکبری مطبوعہ دہلی ۱۲۷۳ء جلد اول صفحہ ۳۰۔

[2] توزکِ جہانگیری مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۶۔

جہانگیر کے بعد شاہجہاں اور اورنگ زیب نے بھی ان عظیم اشرفیوں اور روپیوں کی تشکیل کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور ایسی اشرفیاں اور روپے حکمرانوں کی طرف سے نذر، ہدیہ، تحفہ، انعام واکرام، صلۂ خدمت یا اجرت کے طور پر مصرف میں لائے جاتے رہے، ذیل میں ہم اس قبیل کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ شہنشاہ اکبر جہانگیر کی بعض ناپسندیدہ حرکات کی وجہ سے اس سے ناراض اور دل گرفتہ تھا۔ اکبر کی ماں مریم مکانی بیگم کو جہانگیر بے حد عزیز تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ باپ کی خفگی دور ہوجائے اس سلسلے میں اس نے کوشش بھی کی لیکن وہ بقضائے الٰہی فوت ہوگئی اور اس کا منشا پورا نہ ہوسکا لیکن جہانگیر کی سوتیلی مائیں اور بہنیں بھی اس کی ہمدرد نکلیں اور انھوں نے جہانگیر کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس کی دادی کرنا چاہتی تھی۔ انہی کی کوششوں کے نتیجے میں جہانگیر معذرت خواہی کے لیے اکبر کے حضور پیش ہوا۔ اکبر نے بھی بڑی عزت اور شفقت سے جہانگیر کا استقبال کیا[۱]۔ اس طرح باپ بیٹے کا دل صاف ہوگیا۔ اسی سلسلے میں تکملۂ اکبر نامہ کے مصنف شیخ عنایت اللہ کا بیان ہے کہ جہانگیر نے شہنشاہ اکبر کی خدمت میں ایک لاکھ روپے کی مالیت کا ایک ہیرا، سو سو تولے کی دو سو اشرفیاں، پچاس پچاس تولے کی دو سو اشرفیاں، پچیس تولے کی چار اشرفیاں، بیس تولے کی تین اشرفیاں اور دو سو ہاتھی نذر گزرانے تھے[۲]۔

۲۔ شہنشاہ جہانگیر نے اپنے دورِ حکومت میں شاہِ ایران کے سفیر زنبیل بیگ کو اس کی باریابی کے موقع پر ایک اشرفی ہزار تولے کی عنایت کی[۳]۔

۳۔ شہنشاہ شاہجہاں نے اپنی لڑکی جہاں آرا کی علالت کے دوران اس کا کامیاب علاج کرنے کے صلے میں حکیم داؤد کو پانچ سو تولے کی ایک اشرفی عطا کی[۴]۔

۴۔ شہنشاہ شاہجہاں نے مرشد قلی خاں علی مردان خانی کو دو سو تولے کی اشرفی عطا کی[۵]۔

۵۔ شہنشاہ شاہجہاں نے بلخ کے شکاری کو تیس تولے کی اشرفی انعام میں دی[۶]۔

---

[۱] تاریخ جہانگیر مصنفہ ڈاکٹر بینی پرشاد مترجمہ رحم علی الہاشمی شایع کردہ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۷۹ء صفحات ۷۳ تا ۷۶
[۲] تکملۂ اکبر نامہ مصنفہ شیخ عنایت اللہ شایع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۸۶ء صفحہ ۸۳۲
[۳] تزک جہانگیری مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء جلد دوم صفحہ ۳۲۶۔
[۴] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۳۹۹۔
[۵] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۱۶۲
[۶] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۱۳۴، ۱۳۵

۶۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے شریف مکّہ کے ایلچی کے توسط سے ایک ہزار تولے کی اشرفی بطور ہدیہ گزرانی۔[۱]

۷۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے دو سو تولے کی اشرفی سبحان قلی خاں کے سفیر کو عنایت کی۔[۲]

۸۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے ایک مخصوص طرزِ تحریر کا خط پڑھنے کے صلے میں ابوالوفا کو پچاس تولے کی اشرفی عطا کی۔[۳]

جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا گیا ہے مغل شہنشاہوں کے اجرا کردہ عظیم الشان سِکّوں کے منجملہ تاحال صرف ایک سو تولے اور دو سو تولے کی اشرفیاں دریافت ہوئی ہیں لیکن مسکوکات قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ اطلاع باعثِ مسرت ہوگی کہ حال ہی میں سوئٹزرلینڈ میں نوادرات کا کاروبار انجام دینے والی ایک فرم ہیابسبرگ فیلڈ مان نے شہنشاہ جہانگیر کی ایک ہزار تولے کی اشرفی کی تصویر شایع کرکے اس کے ہراج کا اعلان کیا ہے۔ حسنِ اتفاق سے اس اشرفی پر بھی فارسی اشعار درج ہیں۔ اور اس طرح یہ ہمارے موضوع کتاب سے متعلق ایک اہم دریافت ہے جس سے توزکِ جہانگیری میں خود شہنشاہ جہانگیر کی بیان کردہ ان روایتوں کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اس نے مختلف ممالک کے سفیروں کو ایک ایک ہزار تولے کی اشرفیاں عطا کی تھیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ زیرِ بحث عظیم الشان اشرفیاں اور روپے "ان گاٹس" یا "نذرانہ میڈل" نہیں ہیں بلکہ فرمانروایانِ وقت کے احکام کی اتباع میں ایک باضابطہ عملدرآمد کے تحت اجرا کردہ سِکّے ہیں۔ لہٰذا ہم جان رچرڈسن، ولیم مارسڈن اور جیمس گبس کی آرا سے اتفاق کرتے ہوئے انھیں "سکّے" قرار دے کر ان پر مندرجہ اشعار کو شاملِ کتاب کرتے ہیں۔

---

[۱] مآثر عالمگیری صفحہ ۱۰۸

[۲] عالمگیر نامہ صفحہ ۶۲۷

[۳] مآثر عالمگیری صفحہ ۳۶۰

سِکّوں پر سنسکرت زبان کے اشعار

تمہید میں اجمالاً یہ بتلا دیا گیا ہے کہ سِکّوں پر اشعار کے اندراج کا رواج سب سے پہلے ہندوستان ہی میں شروع ہوا اور یہ کہ اس امتیاز کا سہرا گپتا خاندان کے حکمرانوں کے سر ہے۔ اب یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گپتا خاندان کے تعلق سے بھی چند ضروری باتیں بتلا دی جائیں تاکہ مسکوکات کی دُنیا میں اس حیرت انگیز اور دلچسپ پیش رفت کا ایک پس منظر سامنے آجائے۔

گپتا خاندان کا بانی سری گپتا (۲۷۰ء تا ۲۹۰ء) تھا جس کی حیثیت مگدھ کے ایک اوسط درجے کے جاگیردار سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے بعد گھٹوٹ کاچا (۲۹۰ء تا ۳۰۵ء) اپنے باپ کا جانشین ہوا لیکن وہ بھی اپنی حیثیت میں کوئی نمایاں اضافہ نہ کرسکا۔ البتہ گھٹوٹ کاچا کے بعد اس کے بیٹے چندرا گپتا اول (۳۰۵ء تا ۳۲۵ء) نے بڑا نام پیدا کیا۔ اس نے ترہت کے علاقے میں واقع ویسالی کے لچھاوی خاندان کی راجکماری سے شادی کی اور اس رِشتے سے اس کی حیثیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور بالآخر اِن دونوں خاندانوں کی حکومتوں کے انضمام کے نتیجے میں اَودھ، پریاگ اور بہار تک گنگا کی پوری وادی میں چندرا گپتا کی بالادستی تسلیم کرلی گئی۔ دراصل چندرا گپتا اول کو ہی گپتا خاندان کا حقیقی بانی قرار دیا جاسکتا ہے اس کے پیش رَو اپنی بے بضاعتی کے پیش نظر اس موقف میں نہ تھے کہ اپنے نام کے سِکّے مضروب کرواتے یہ اہم کارنامہ چندرا گپتا نے انجام دیا۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ لچھاوی خاندان سے رشتۂ ازدواج کے قیام پر بھی چندرا گپتا کو بڑا ناز تھا چنانچہ اس کے تمام سِکّوں پر اس کے نام کے ساتھ ساتھ اس کی رانی کمارا دیوی کا نام بھی مضروب پایا جاتا ہے۔

چندرا گپتا اول کے عہد کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے دور میں ایک نئے سنہ کا بھی آغاز کیا جس کا رواج ہندوستان کے شمالی اور مغربی علاقوں میں تیرھویں صدی

عیسوی تک پایا گیا ہے۔ چندرا گپتا سے قبل ہندوستان کے بیرونی نژاد حکمرانوں جیسے یونانیوں یا کُشانوں کے علاوہ کسی اور حکمران نے اپنے نام کے سونے کے سِکّے اجرا نہیں کروائے تھے حتیٰ کہ موریہ خاندان کے نامور حکمران اشوک اعظم کے بھی سونے کے دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ مقامی حکمرانوں میں یہ امتیاز بھی چندرا گپتا اول ہی کو حاصل ہوا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ چندرا گپتا کے ایسے سکّے کشان خاندان کے حکمرانوں کے سِکّوں کے نمونے پر ہی بنائے گئے تھے لیکن اپنی وضع قطع اور ساخت کے اعتبار سے یہ سِکّے کشان خاندان کے سِکّوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ ان سِکّوں پر حکمران کا نام اور دیگر عبارتیں نہایت خوبصورتی سے درج کی جاتی تھیں اور وہ اس کثرت سے مضروب کروائے جاتے تھے کہ ایک ہمعصر شاعر نے چندرا گپتا کے عہد کو "سونے کی بارش" کے عہد سے تعبیر کیا ہے[۱]۔

چندرا گپتا کی جانشینی کے بارے میں کسی قدر اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ۳۲۵ء سے ۳۳۰ء تک کے عرصے میں یعنی چندرا گپتا کی وفات سے پانچ سال تک جو سکّے اجرا ہوئے ہیں ان پر حکمران کا نام کاچا گپتا پایا جاتا ہے اور ۳۳۰ء سے ۳۷۰ء تک مضروب شدہ سکوں پر سمدرا گپتا کا نام درج ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ چندرا گپتا کی وفات کے بعد کاچا گپتا اس کا جانشین ہوا جس نے پانچ سال تک حکومت کی اور اپنے نام کے سکّے مضروب کروائے لیکن کچھ اور مورخوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ چندرا گپتا کا جانشین سمدرا گپتا ہی ہوا جس کا ابتدائی نام کاچا گپتا تھا اور پانچ سال حکومت کرنے کے بعد جب اس نے بنگال کا علاقہ فتح کر لیا اور اس کے حدود مملکت سمندر کے کناروں تک پھیل گئے تب اس نے اپنا نام سمدرا گپتا رکھ لیا۔ مورخین کے اس طبقے کی رائے قرین قیاس بھی معلوم ہوتی ہے[۲]۔

جہاں تک موضوع کتاب کا تعلق ہے کاچا گپتا کے نام سے اجرا شدہ سکّوں پر بھی سنسکرت اشعار پائے جاتے ہیں جنھیں شامل کتاب کیا جا رہا ہے۔

سمدرا گپتا علم و ادب کا دلدادہ اور شعر و موسیقی کا شیدائی تھا۔ وہ ادبار شعراء اور حکماء کا سرپرست ہونے کے ساتھ ساتھ خود ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا۔ اس حکمران نے سنسکرت زبان

---

[۱] کوائنس مصنفہ پرمیشوری لال گپتا شایع کردہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی ۱۹۶۹ء صفحہ ۵۲

[۲] کارپس آف انڈین کوائنس جلد چہارم دی کوائنیج آف گپتا ایمپائر مصنفہ اے۔ ایس۔ الٹیکر شایع کردہ نیومسمیٹک سوسائٹی آف انڈیا بنارس یونیورسٹی ۱۹۵۷ء صفحہ ۸۰۔

اور اس کے ادب و شعر میں نئی روح پھونکی۔ ان مخصوص صفات کے ساتھ ساتھ سمدرا گپتا ایک عظیم فاتح ہونے کے علاوہ ایک زبردست ماہر نظم و نسق بھی تھا۔ اس نے ضرور ایک عظیم تر ہندوستان کی مملکت کے قیام کا خواب دیکھا ہوگا لیکن اپنی دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اس نے ابتداءً اپنی سلطنت کے اطراف و اکناف کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرکے اس کی حدود میں توسیع کا آغاز کردیا۔ ان توسیعی مہمات کے دائرے میں وادیٔ گنگا کی نو ریاستیں آگئیں جن کی تفصیل الہ آباد کے تاریخی ستون پر کندہ عبارات میں ملتی ہے نیز جان ایلن نے بھی اپنی مرتبہ فہرست مسکوکات میں ان کا ذکر کیا ہے[1]۔ اس طرح چمبل ندی تک کا علاقہ سمدرا گپتا کے زیرِ اقتدار آگیا۔ پھر اس نے مشرق کا رُخ کرتے ہوئے کالنگا کے صحرائی علاقوں کے قبائلی سرداروں کو اپنا تابع فرمان بنالیا۔

متذکرہ مہمات کو سر کرنے کے بعد سمدرا گپتا نے اپنی افواج کو دکن کی طرف بڑھایا اور اس پیش قدمی کے دوران کم و بیش ایک درجن حکمرانوں کو اپنا زیرِ نگیں کرکے تاملناڈو کے علاقے سے گزرتے ہوئے پلّواؤں کے صدر مقام کنجی (موجودہ کنجی ورم) تک جا پہونچا۔ پھر وہ مغرب کی طرف مڑ کر جزیرہ نما کو عبور کرتے ہوئے ملابار میں داخل ہوا جہاں سے مغربی دکن کی سطح مرتفع کے راستے اپنی مہمات کی آخری منزلیں طے کرتے ہوئے اپنی راجدھانی اجودھیا کو واپس پہونچ گیا۔

جنوبی ہند کی ان کامرانیوں میں پورے تین سال لگ گئے۔ اس پورے عرصے میں کہیں بھی اس کو ہزیمت کا مونہہ دیکھنا نہ پڑا اِس بات کو سمدرا گپتا کی ایک خصوصیت سمجھنا چاہیئے کہ جنوبی ہند کے کسی بھی مفتوحہ علاقے کو اس نے اپنی مملکت میں ضم نہیں کیا بلکہ اس نے اس پورے علاقے کے حکمرانوں کے تابع فرمان بنے رہنے پر ہی اکتفا کیا۔ اس عرصہ مدت میں سمدرا گپتا کی سطوت اور شوکت کی داستانیں سارے ہندوستان میں پھیل چکی تھیں اور آسام، مالوہ، گجرات، پنجاب اور ہمالیائی علاقوں کے حکمرانوں نے اپنی خیر اسی میں سمجھی کہ اس کی بالادستی کو تسلیم کریں۔

دکن کی فتوحات کے نتیجے میں سونے اور جواہرات کے بیش بہا ذخائر سمدرا گپتا کے ہاتھ

---

[1] برٹش میوزیم کیٹلاگ آف گپتا گولڈ کوائنس مطبوعہ لندن ۱۹۱۴ء تمہید۔

[2] دی ڈیولپمنٹ آف انڈیا ز ہسٹری مصنفہ ٹریوڈ ایرسن بیین شایع کردہ ڈیوڈ میک کے کمپنی نیو یارک۔ ری اشو مئی ۱۹۶۴ء صفحہ ۲۳۸

آئے۔ اجودھیا واپس ہو کر سمدراگپتا نے قدیم ویدک رسم کے مطابق اشوہ میدھ جشن منانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ انہی تقاریب کے سلسلے میں اس نے سونے کے وہ عہد آفریں سکّے مضروب کروائے جن پر ایک جانب تو روایتی گھوڑے کی تصویر تھی اور دوسری جانب سنسکرت زبان کے اشعار درج تھے۔ اس انکشاف کا سہرا انگلستان کے مشہور ماہر مسکوکات جے۔ ایلن کے سر ہے جس نے اپنی تحقیق سے پہلی بار یہ ثابت کیا کہ سمدراگپتا کے سکّوں پر سنسکرت زبان کے اشعار درج ہیں[1]۔

سطور بالا میں سمدراگپتا کی شعر و موسیقی سے دلچسپی کا ذکر تو آ ہی چکا ہے۔ لیکن الہ آباد کے مشہور زمانہ ستون پر سمدراگپتا کی فتوحات کی کندہ کاری کے انچارج ہرشینا کے اس بیان سے کہ سمدراگپتا خود ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا، اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ اشوہ میدھ جشن کے موقع پر جاری کردہ تاریخ ساز اشرفیوں پر مندرجہ سنسکرت اشعار کے منجملہ کچھ تو سمدراگپتا ہی کا نتیجۂ فکر ہوں گے[2]۔

سمدراگپتا کے بعد راماگپتا اس کا جانشین ہوا۔ اس نے صرف پانچ سال یعنی ۳۷۰ء سے ۳۷۵ء تک حکومت کی۔ اس دور میں مغربی پنجاب کے کیداراکشان خاندان کے حکمران پیرو نے سر اٹھایا تھا۔ راماگپتا کی خواہش تھی کہ پیرو کی سرکوبی کر کے اپنے حدود مملکت میں توسیع کرے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا بلکہ ایک معرکہ میں تو اسے شکست کھا کر صلح پر رضامند ہونا پڑا تھا، مگر اسی مرحلے پر راماگپتا کے بھائی چندراگپتا کے حسنِ تدبیر سے وہ شکست فتح میں بدل گئی۔ راماگپتا کے جو سکّے دستیاب ہوئے ہیں ان پر تاحال اشعار کا اندراج نہیں پایا گیا ہے۔

راماگپتا کے بعد اس کا بھائی چندراگپتا ثانی مسند آرا ہوا اس کا طویل دورِ حکومت ۳۷۵ء تا ۴۱۴ء نہایت شاندار رہا۔ اس نے بنگال کے علاقے میں بعض شورشوں کا قلع قمع کر کے شمال مغرب کا رخ کیا۔ اور کیداراکشان خاندان کے حکمرانوں کو مغربی پنجاب سے کھدیڑ کر انھیں وادیٔ سندھ کی سرحدوں میں دھکیل دیا۔ اس کے بعد چندراگپتا ثانی نے مغربی ہندوستان کی طرف اپنی فوجیں بڑھائیں اور شتر پاؤں کو پے در پے شکستیں دے کر بالآخر مالوہ، گجرات اور کاٹھیاواڑ کو اپنے حدودِ مملکت

---

[1] جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (نیو سیریز) جلد دہم شمارہ ۶ بابتہ ۱۹۱۴ء صفحات ۲۵۵ تا ۲۵۶۔

[2] دی گپتا گولڈ کوائنس ان دی بیانہ ہورڈ مرتبہ اے۔ ایس۔ الٹیکر شایع کردہ نیومسماٹک سوسائٹی آف انڈیا ۱۹۵۴ء تمہید صفحہ XV

میں شامل کرلیا۔

مالوہ، گجرات اور کاٹھیاواڑ کے ساحلی علاقوں کے انضمام کے نتیجے میں گپتا سلطنت کے آگے سمندری تجارت کا ایک نیا دروازہ کھل گیا اور چینی سیاح فاہیان کے بقول اس ذریعے سے خزانے کی دولت میں بیش بہا اضافے سے مملکت کی خوشحالی کا ایک سنہرا دور شروع ہوگیا۔ اس مرفہ الحالی کے زمانے میں چندرا گپتا نے بھی اپنے پیش رو سمدرا گپتا کے نقشِ قدم پر چل کر ادب، ثقافت اور فنونِ لطیفہ کے میدانوں میں اپنی سرپرستی کے ذریعہ گپتا دورِ حکومت کا نام اور زیادہ روشن کیا۔ کہا جاتا ہے کہ شہرۂ آفاق شاعر کالی داس بھی چندرا گپتا کے دربار سے منسلک[لہ] تھا۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ کے فتح ہونے کے بعد چندرا گپتا ثانی نے اِن علاقوں میں سونے کے سِکّوں کے علاوہ چاندی کے سِکّے بھی مضروب کروائے کیونکہ وہاں کے عوام تین صدیوں سے چاندی کے سکّوں ہی میں کاروبار انجام دینے کے عادی تھے۔ چندرا گپتا ثانی کے سِکّے اپنی خوبصورتی اور نزاکت کے لحاظ سے خاص اہمیت کے حامل ہیں اور ان پر سنسکرت زبان کے اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔

چندرا گپتا ثانی کے بعد کمارا گپتا (۴۱۴ء تا ۴۵۵ء) تخت نشین ہوا۔ اِس حکمران کا طویل عہدِ حکومت امن وسکون اور صلح و آشتی کا دور تھا۔ اس نے فوجی پیشقدمیوں سے احتراز کیا اور اور اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں پائی ہوئی سلطنت پر قانع رہ کر فلاحی امور کی انجام دہی میں اپنی عمر گزار دی۔ کمارا گپتا کے سِکّوں پر بھی سنسکرت زبان کے اشعار ملتے ہیں۔

کمارا گپتا کا جانشین اسکندا گپتا ہوا۔ اس نے بھی اپنے عہد (۴۵۶ء تا ۴۶۸ء) میں فوجی اقدامات نہیں کئے البتہ کمارا گپتا کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شمال مغربی علاقوں میں ہنوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو کامیابی کے ساتھ روکا اور انھیں وسطی اور مغربی پنجاب میں دریائے ستلج کے کناروں سے آگے بڑھنے نہ دیا۔ کمارا گپتا کا یہ کارنامہ غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا کیوں کہ اس وقت تک ہنوں نے اپنی طاقت کے نقطۂ عروج پر پہونچ کر ایشیا اور یوروپ کی متعدد سلطنتوں کو روند ڈالا تھا اور اب دوآبہ گنگ وجمن میں داخل ہونے کے لیے پَر تول رہے تھے۔ ایسے میں جمنا کے کناروں سے ہنوں کو ستلج پار تک پسپا کردینا

لہ دی وِنڈر دیٹ واز انڈیا مصنف اے۔ایل۔باشم شائع کردہ روپا اینڈ کمپنی نئی دہلی ۱۹۸۷ء صفحہ ۶۶

اسکنداگپتا کی جرات و ہمت کا ایک عظیم مظاہرہ تھا اور اس شاندار کامیابی پر گپتا سلطنت کے کونے کونے میں بجا طور پر اس کی تعریف و توصیف کے گیت گائے جانے لگے۔

اسکنداگپتا نے بھی اپنے سکوّں پر اشعار درج کروائے تھے۔ لیکن اس کے جانشینوں کے سکوّں پر اشعار کا اندراج نہیں پایا جاتا۔ دراصل اسکنداگپتا کے بعد اس خاندان کی تاریخ غیر واضح روایات اور ناکافی مواد کے اندھیرے میں گم سی ہو گئی ہے۔ ارکان خاندان کی آپسی رقابتوں اور سیاسی توڑ جوڑ نے مملکت کے استحکام کو پارہ پارہ کر دیا تھا اور پھر چند کمزور حکمرانوں کی طوائف الملوکی کے بعد گپتا خاندان کے اقتدار کا چراغ ہمیشہ کے لیے گُل ہو گیا۔ ان آخری حکمرانوں کے جو سکّے دستیاب ہوئے ہیں ان پر اشعار نہیں پائے گئے۔

گپتا خاندان کے سنہرے دَور میں جہاں ہم سکوّں پر اشعار کے اندراج جیسے عہد آفریں اقدام سے روشناس ہوتے ہیں وہیں ہمیں ان حکمرانوں کے سکوّں پر بعض ایسی دلچسپ جزئیات بھی نظر آتی ہیں جن کا تعلق اس عہد کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی سے بھی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے سکوّں پر تاج و تخت، زیورات، مردانہ اور زنانہ ملبوسات، فرنیچر نیز آلات شکار کے مختلف اوضاع و اقطاع کی تصویریں پائی جاتی ہیں جن کی مثال کہیں اور مشکل ہی سے ملے گی۔

گپتا خاندان کے حکمرانوں کے سکوّں پر جو اشعار پائے گئے ہیں اُنھیں شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر یہ تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت زبان کے محولہ بالا اشعار کے اردو ورژن کے لیے میں پروفیسر ایم گوپال ریڈی صاحب صدر شعبہ سنسکرت عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد آندھرا پردیش کا رہین منت ہوں جنھوں نے ازراہ کرم ان تمام اشعار کو اردو کا جامہ پہنا کر میری مشکل آسان کر دی۔

سکّوں پر عربی زبان کے اشعار

سکّوں پر عربی زبان کے اشعار کے اندراج کی اہم پیش رفت کی تفصیل بیان کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان و ادب کی تاریخ پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ عربوں میں ادبی مذاق خصوصاً شاعری اور خطابت کا سراغ زمانۂ قدیم سے ملتا ہے۔ سامی الاصل زبانوں میں عربی زبان ایک اہم مقام کی حامل ہے۔ اِن سامی زبانوں میں نبطی، یمن کے قبیلے سبا کی زبان تھی اور حمیری قبیلے حمیر کی۔ اِن باتوں کا ثبوت ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے اِن علاقوں میں کھدائی کے دوران دستیاب شدہ کتبات سے فراہم کیا ہے۔ آخری دَور میں عربی حجاز کے قبیلے قریش کی ترقی یافتہ زبان رہی ہے۔[1]

طلوعِ اسلام سے قبل عربی زبان میں شاعری اپنے اوجِ کمال پر پہونچ چکی تھی۔ عربوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انھیں اپنے حافظے پر بڑا ناز تھا اور نسلاً بعد نسلٍ شاعری کے نادر نمونے قومی افسانے اور خطابت کے شاہکار سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے۔ عہدِ اسلام میں علمائے بصرہ اور کوفہ نے ان نوادرات کو مرتب کیا اور اس طرح یہ ذخیرہ دست بُردِ زمانہ کے ہاتھوں تلف ہونے سے بچ گیا۔

زمانۂ قبل اسلام کے، جس کو عام طور پر دورِ جاہلیت کہا جاتا ہے، مشاہیر شعرا میں امراء القیس زہیر، طرفۃ، لبید، عمرو بن کلثوم، عنترہ، نابغہ اور عبید بن الابرص وغیرہ کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔[2]

اسلامی دور کے ممتاز شعراء کی فہرست بھی کافی طویل ہے لیکن یہاں صرف چند ناموں کے ذکر پر

---

[1] البرامکہ مصنفہ محمد عبدالرزاق کانپوری شایع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۱۲

[2] تاریخ ادبیات عربی مولفہ ڈاکٹر سید ابوالفضل مطبوعہ مکتبہ فیض العلوم حیدرآباد صفحات ۲۸ تا ۳۴۔

اکتفا کیا جاتا ہے جن میں جریر، حسان بن ثابت، فرزدق، الطرماح اور اخطل زیادہ شہرت کے حامل تھے۔[1]

اسلام نے دیگر زبانوں کے حصول میں بھی کوئی تعصب نہیں برتا اور بڑی فراخدلی کے ساتھ ایسے علوم و فنون کی تحصیل کی اجازت دے دی جو خلاف مذہب نہ تھے۔ عہدِ رسالت میں ــــ زید بن ثابت کو عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ بعض صحابہ نے فارسی زبان بھی سیکھی تھی۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں جو فتوحات اور استحکامِ نظم و نسق کا زمانہ تھا، ملکی انتظام کے لیے اشاعتِ تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ عہدِ فاروقی میں جب عَمرو ابن العاص نے مصر فتح کیا تو انھوں نے مشہور عیسائی فلسفی جان کو جس کا ذکر عربی تواریخ میں یحییٰ کے نام سے کیا جاتا ہے۔ دربار میں باریاب کیا۔ اسی زمانے میں عربوں نے حکمائے یونان کے خیالات سے واقفیت حاصل کی۔

بنی اُمیّہ کے دور میں شام مرکزِ حکومت رہا۔ وہاں یہودی اور عیسائی علمار کا زور تھا اور عرب امرار ان سے مذاکراتِ علمیّہ کے دوران ان کے فلسفیانہ افکار سے آشنا ہوتے گئے۔ انہیں حکمار کو دفترِ انشا میں ممتاز عہدوں پر مامور کیا گیا تھا اور شفاخانوں کی نگرانی بھی انہیں کے سپرد کی گئی تھی۔

جہاں تک مسکوکات کا تعلق ہے، یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ طلوعِ اسلام تک عربوں کی کوئی منظم حکومت قائم نہیں ہوئی تھی، اسلام کی روشنی پھیلنے کے بعد عربوں میں اجتماعیت اور مرکزیت کا تصور پیدا ہوا۔ اس سے قبل عرب کی معاشرت قبیلہ واری نظام پر مشتمل تھی۔ ان کا اپنا کوئی الگ سکّہ نہ تھا۔ کاروبارِ تجارت میں یا تو تبادلۂ اجناس سے کام لیا جاتا تھا، یا ایران اور روم کے درہم و دینار استعمال کئے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ مروان کے بیٹے عبدالملک کے عہد تک جاری رہا۔ عبدالملک کے علم میں جب یہ بات لائی گئی کہ روم کے سکّوں پر عیسائی عقیدے کے مطابق اقانیم ثلاثہ (باپ، بیٹا، روح القدس) کا ٹھپّہ ہوتا ہے تو اُسے بڑی تشویش ہوتی ہے کہ یہ امر اسلامی عقاید کے سراسر مغائر تھا۔ عبدالملک نے قیصرِ روم کو اپنے تردّد سے مطلع کیا۔ قیصرِ روم نے جواب دیا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ

---

[1] تاریخ ادبیات عربی مولفہ ڈاکٹر سید ابوالفضل مطبوعہ مکتبہ فیض العلوم حیدرآباد دکن صفحات ۴۸ تا ۵۵

[2] البرامکہ مصنفہ محمد عبدالرزاق کانپوری شایع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی سلاہ۱۹۶ء

ہمارے ایسے سکّے اسلامی علاقوں میں پیغمبرِ اسلام نیز خلفائے اربعہ کے زمانے سے زیرِ دوراں رہے ہیں اوران اصحاب نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ عبدالملک قیصرِ روم کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوا۔ پھر اس نے امرائے دربار کے مشورے سے امام محمد باقر سے رجوع کیا۔ حضرت نے عبدالملک کو ہدایت کی کہ ایک نیا اسلامی سکّہ رائج کیا جائے جس پر کلمہ طیبہ، مقامِ ضرب اور سنہ تشکیک کا اندراج ہو۔ اس طرح ایک نئے اسلامی سکّے کا آغاز ہوا[1]۔ آہستہ آہستہ اسلامی سکّوں کی ساخت اور وضع و قطع میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوتی گئی۔ اور درہموں اور دیناروں پر کلمہ شہادت اور سورہ اخلاص بھی درج کیے جانے لگے۔

بنی امیّہ کے زوال کے بعد بنی عباس نے عنانِ اقتدار سنبھالی اور مرکزِ حکومت دمشق سے بغداد منتقل ہوگیا۔ مختلف علوم وفنون کی خاص خاص کتابوں کے ترجمے کا کام تو پہلے ہی سے شروع ہوگیا تھا لیکن بنی عباس کے دور میں اس کام میں وسعت، باقاعدگی اور سُرعت پیدا ہوئی بغداد میں ایک دارالحکمہ قایم کیا گیا جس میں اقطاعِ عالم کے علمار و حکمار اپنی اپنی زبانوں کے شاہکاروں کے ترجمے کے کام میں مصروف ہوگئے۔ اسی زمانے میں عرب، ہندوستان کے علم وحکمت سے بھی روشناس ہوئے۔ تہذیبی اور ثقافتی میدان میں اس اہم پیش رفت کا سہرا برمکی خاندان کے سر ہے۔ برمکی خاندان کی زاد بوم کے تعلق سے مورخین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ وہ ایرانی النسل تھے اور کوئی انہیں ہندی الاصل بتاتا ہے بعض مورخین کی رائے یہ ہے کہ وہ بلخ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے مورثِ اعلیٰ نے ناصاعد حالات کی بنا پر کشمیر میں پناہ لی تھی جہاں سے ان کا خاندان ایران آگیا تھا لیکن سید سلیمان ندوی اس بات پر مُصر ہیں کہ برمکی خاندان کا تعلق ہندوستان ہی سے تھا[2]۔ یہی وجہ تھی کہ اس خاندان کے ارکان اسلام قبول کرنے کے بعد جب خلفائے عباسیہ کے دربار میں اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے تو ان کی دلچسپیاں ہندوستان سے نہ صرف برقرار رہیں بلکہ انھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر تہذیبی داد و ستد کے ایک خوشگوار سلسلے کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں ہندوستان کے وید اور پنڈت بغداد جانے لگے اور عرب علمار و حکمار ہندوستان آنے لگے۔

بنی عباس کے دربار میں علمار و حکمار کی پذیرائی کے ساتھ ساتھ شعرار کو بھی ایک خاص

---

[1] گنج شایگان مصنفہ محمد رفیع موہانی عالی مطبوعہ مراد آباد ۱۹۰۳ء صفحات ۷ تا ۱۱

[2] عرب و ہند کے تعلقات مصنفہ سید سلیمان ندوی مطبع معارف اعظم گڑھ طبع جدید ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۱۴۔

مقام حاصل تھا اور وہ اپنی تخلیقات پیش کر کے گراں قدر انعام و اکرام سے نوازے جاتے تھے۔ عباسی دور کے ان شعراء میں بشار بن برد، ابو نواس، ابو العتاہیۃ، مسلم بن الولید المعروف بہ صریع الغوانی اور ابو تمام قبولیت عام کا امتیاز حاصل کر چکے تھے۔[1] یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ برمکی خاندان کے ایک گوہر نایاب جعفر بن یحییٰ برمکی نے جو خود ایک بہت اچھا شاعر تھا ہندوستان سے آئے ہوئے اہل فکر و دانش سے یہ بات معلوم کر لی تھی کہ ہندوستان کے گپتا راجاؤں کے سکوں پر چوتھی صدی عیسوی سے ہی سنسکرت زبان کے اشعار کے اندراج کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہارون الرشید (۷۸۶ء تا ۸۰۹ء) کے دربار میں جعفر برمکی کے جاہ و منزلت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی جا رہی تھی چنانچہ ۷۹۲ء میں اُس کو صوبۂ مغرب (افریقہ) کا والی مقرر کرنے کے بعد بھی خلیفہ نے اس کو اپنی مصاحبت سے دور کرنا نہ چاہا بلکہ جعفر برمکی کے قائم مقام کی حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو افریقہ بھیج دیا۔ اُسی زمانے میں برید (ڈاک) اور دارالضرب (ٹکسال) کے محکمے بھی جعفر برمکی کے سپرد کر دیے گئے۔[2]

ہارون الرشید کے عہد تک اسلامی دراہم و دنانیر کی تکنیک میں کافی حُسن پیدا ہو گیا تھا لیکن ابھی تک کسی کو یہ خیال نہ آیا تھا کہ سکوں پر اشعار بھی درج کیے جا سکتے ہیں۔ یہ امتیاز جعفر برمکی کی قسمت میں تھا چنانچہ اُس نے ہندی علماء و حکماء کے ساتھ اپنے ربط و ضبط کے ذہنی پس منظر میں خلافت عباسیہ کے مسکوکات کو ایک عہد آفریں جہت سے روشناس کرایا۔ ہندوستان کے سکوں پر سنسکرت زبان کے اشعار کے اندراج کے تتبع میں عباسی سکوں پر عربی اشعار درج کروانے کے ساتھ ساتھ جعفر برمکی نے عربوں کی بلند حوصلگی اور اُن کے حیرت انگیز تموّل کے پیش نظر دیناروں کو ان کے رائج الوقت عام وزن اور سائز کے علاوہ سو سو دیناروں اور اُسی کی مناسبت سے غیر معمولی سائز میں مضروب کروایا۔[2]

مذکرہ صدر عظیم دیناروں پر جعفر برمکی کے حکم سے ان کے ہر ایک جانب ایک ایک شعر درج کروایا گیا تھا۔ اخبار الخلفاء کا مصنف حارث بن ابی اسامہ راوی ہے کہ اُس نے بچشم خود[3] ایسے

---

[1] تاریخ ادبیات عربی مولفہ ڈاکٹر سید ابو الفضل مطبوعہ مکتبہ فیض العلوم حیدر آباد دکن صفحات ۷۰ تا ۷۳
[2] الذخائر و التحف مصنفہ قاضی ابن الزبیر مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی مطبوعہ کویت ۱۹۵۹ء صفحات ۲۲۴ تا ۲۲۵
[3] کتاب الوزراء و الکتاب مولفہ ابو عبد اللہ محمد ابن عبدوس الجہشیاری۔ قلمی۔ کتب خانہ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن۔ ورق ۱۵۱ الف۔

چار ہزار دینار جعفر برمکی کے مکان میں دیکھے تھے۔ یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ یا تو جعفر برمکی کا آفتابِ اقبال اپنی پوری تابانی کے ساتھ مملکت عباسیہ میں درخشاں تھا یا یکایک اُس کو گہن لگ گیا اور وہ ہارون رشید کا معتوب ہوکر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جہاں تک موضوع کتاب کا تعلق ہے اس عظیم سانحہ سے مملکت عباسیہ کے سکوں پر عربی اشعار کے اندراج کی روایت کو شدید دھکا پہونچا۔ جعفر برمکی کی موت کے بعد تا حال دستیاب شدہ مواد کی روشنی میں ہمیں پھر کسی عباسی سکّے پر اشعار نہیں ملتے اور یہ روایت بہ مصداق

ع خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

خود بہ خود ختم ہوگئی۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ عباسی مملکت کا مرکز بغداد کمزور پڑتا گیا اور دور دراز کے صوبوں کے حکمراں اپنے اپنے زیر اقتدار علاقوں میں علم بغاوت بلند کرنے لگے۔ اور آہستہ آہستہ اپنی با اختیار سلطنتیں قائم کرلیں لیکن بہر حال اُنھوں نے مرکز خلافت سے کلیتہً انقطاع اختیار نہیں کیا بلکہ رسماً ہی سہی اپنے علیحدہ اجرا کردہ درہموں اور دیناروں پر اپنے نام کے ساتھ خلیفۂ وقت کا بھی نام درج کرتے رہے اور خطبات میں بھی اس کے نام کو شامل رکھا۔ ایسی ہی نوزائیدہ سلطنتوں میں سے ایک سلطنت افریقہ میں بحیرۂ روم کے جنوبی سواحل پر قائم ہوئی۔ یہ وہ علاقہ تھا جو آجکل تیونس کہلاتا ہے۔ اس سلطنت کا بانی ابراہیم بن الاغلب (۸۰۰ء تا ۸۱۱ء) تھا۔ وہ اور اس کے جانشین نہایت اولوالعزم اور بڑے روشن خیال تھے۔ انھوں نے اپنی بری و بحری قوتوں کو کافی ترقی دی۔ بحیرۂ روم میں ان کے بیڑے دُور دُور تک چھاپے مارتے تھے۔ ایطالیہ، فرانس، کورسیکا، سارڈینیا کے سواحل اُن کے حملوں سے نہ بچ سکے۔ انھوں نے صقلیہ (سسلی) اور مالٹا کو فتح کرلیا تھا۔

اس اغلبی خاندان کی حکومت کم و بیش سو سال تک قائم رہی اور پھر آپسی رقابتوں اور آنے والے حکمرانوں کی نااہلی اور فاطمیینِ مصر کے حملے کے بعد ۹۰۹ء میں اس کا چراغ گل ہوگیا۔ اس خاندان کا آخری حکمران زیادۃ اللہ ثالث (۹۰۳ء تا ۹۰۹ء) تھا اس زمانے میں جب فاطمیینِ مصر کے خاندان کے بانی المہدی ابو محمد عبید اللہ نے اغلبی حکومت پر حملہ کیا تو زیادۃ اللہ نے تابِ مقاومت نہ پاکر

بغداد کے خلیفہ المکتفی باللہ کے پاس استمداد کے لئے اپنے قاصد بھیجے۔ ان قاصدوں کے ساتھ زیادۃ اللہ نے خلیفہ کی خدمت میں منجملہ دیگر بیش بہا تحائف کے ایسے ایک لاکھ دینار بھی تھے جن میں سے ہر ایک دینار کا وزن دس دینار کے مساوی تھا اور جن پر عربی زبان کے اشعار درج تھے[1]۔ اغلبی خاندان کے آخری حکمران زیادۃ اللہ ثالث کے متذکرہ صدر تحائف کے بغداد پہنچتے پہنچتے قاہرہ کی فاطمی افواج نے اغلبی خاندان کی حکومت کا تختہ الٹ کر اس کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا

اغلبی خاندان کے ان عظیم دیناروں کے بعد ایک اور عظیم الشان مثال بُویہی خاندان کے حکمران فخرالدولہ ابوالحسن علی (۹۷۶ء تا ۹۹۷ء) کے دور میں نظر آتی ہے۔ جس کی حکومت رے ہمدان، اور اصفہان کے علاقوں پر تھی۔ مشہور مورخ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ بُویہی خاندان کے ایک نہایت با اختیار وزیر صاحب ابن عباد نے یکم محرم ۳۷۸ھ م ۹۸۸ء کو ایک عظیم الشان دینار جو ایک ہزار دیناروں کے مساوی تھا اور جس کا وزن ایک ہزار مثقال تھا[2] فخرالدولہ کے حضور بطور نذر پیش کیا۔

سکوں پر عربی زبان کے اشعار کے اندراج کی آخری مثال ایران کے صفوی خاندان کے بانی اسمٰعیل اول (۱۵۰۲ء تا ۱۵۲۴ء) کے سکوں میں ملتی ہے جن پر مشہور دعا ناد علی درج تھی۔ مگر یہ سکے عام سائز اور وزن ہی کے تھے۔

---

[1] الذیل مصنفہ ابو محمد فرغانی

[2] ابن الاثیر۔ کامل۔ جلد نہم صفحہ ۴۱

سکّوں پر فارسی زبان کے اشعار کا پس منظر

پچھلے ابواب میں سکّوں پر سنسکرت اور عربی زبانوں کے اشعار کے اندراج کی تفصیلات بیان کی جا چکی ہیں۔ اب سکّوں پر فارسی زبان کے اشعار کے اندراج کے پس منظر کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسلام کی روشنی پھیلنے کے بعد ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک نیز یوروپ کے بھی کچھ حصے اقتدار اسلامی کے زیر نگیں آتے گئے لیکن مرکز اقتدار ابتداءً دمشق اور پھر بغداد ہی میں رہا۔ اس طرح اس سارے علاقے پر عربی زبان، ادب، تہذیب اور ثقافت کی چھاپ نمایاں رہی عرب حکمرانوں نے یونانی، رومی اور ہندی فلاسفہ کی تخلیقات کے عربی تراجم کے ذریعہ ان افکار تک رسائی کے لیے تمام دروازے عامۃ الناس کی خاطر پہلے ہی کھول دیئے تھے۔ مملکت اسلامی کی روز افزوں وسعت سے خود عرب مختلف ملکوں اور قومیتوں کے تہذیبی سرمائے سے روشناس ہوتے جا رہے تھے اور نتیجتاً اندر ہی اندر ایک ایسی ثقافت پرورش پاتی رہی جو عربی اور عجمی تہذیبوں کا ایک خوشگوار امتزاج تھی۔ عربوں کی رواداری اور حسن سلوک سے مختلف علاقائی عناصر میں خود اعتمادی اور آزادیٔ رائے جیسے صحتمند رجحانات پروان چڑھنے لگے۔

عرب حکمرانوں کے اس مثبت ذہنی رویّے کے نتیجے کے طور پر جہاں اسلامی یک جہتی کا ایک مخصوص رنگ نمایاں ہو رہا تھا وہیں اس کے بعض منفی اثرات بھی نمودار ہونے لگے، مختلف قومیتیں جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکی تھیں، اب اپنی ماقبل اسلام تاریخ، تہذیب، ثقافت اور ادب پر نظر ڈالنے لگیں۔ اِدھر مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ عرب مرکز اقتدار میں کمزوری پیدا ہوتی جا رہی تھی تو اُدھر قلمروئے اسلامی کے دور دراز علاقوں میں مرکز گریز تصورات جنم لے رہے تھے، چنانچہ دوسری صدی ہجری کے وسط سے پہلے ہی مغرب میں اسپین کی آزاد مسلم ریاست

قائم ہوچکی تھی۔ پھر مراقش میں ادریسیوں نے اپنی الگ حکومت کی بناڈالی جن کا جانشین تیونس کا اغلبی خاندان ہوا۔ مصر میں تیسری صدی ہجری کے اواخر میں فاطمین نے اپنا اقتدار قائم کرلیا تھا ادھر مشرق میں کردستان میں ذلفی' آذربائیجان میں ساجی' طبرستان میں علوی' خراسان میں طاہری' ایران میں صفاری' ماوراء النہر میں سامانی اور ترکستان میں ایلک خانی حکومتیں قائم ہوتی گئیں۔ سامانیوں کے بعد اُن کے غلاموں نے غزنوی خاندان کی بناڈالی اور افغانستان نیز پنجاب کے بعض علاقوں تک اپنی سلطنت کو وسعت دیدی۔

خلافت عباسیہ کے انقراض و انتشار کے جس دور میں متذکرہ بالا چھوٹی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں اُن سبھوں نے مرکز خلافت سے برائے نام ہی سہی یہ رشتہ قائم رکھا کہ اپنے اپنے سکوں پر خلیفۂ وقت کے نام کا اندراج بھی جاری رہنے دیا اور خطبہ میں بھی برابر اس کا نام لیتے رہے۔ ان کا یہ عمل اس مصلحت پر مبنی تھا کہ اپنے اپنے حدود مملکت میں بسنے والے لاکھوں مسلم عوام میں ایک احساس اطمینان قائم رکھیں جن کی عقیدتیں جذباتی طور پر ادارۂ خلافت سے وابستہ تھیں۔ اسی مصلحت اندیشی کی ایک عجیب و غریب مثال ہمیں چنگیز خاں (۱۲۰۶ء تا ۱۲۲۷ء) کے سکوں میں ملتی ہے۔ چنگیز خاں نے اپنی فتوحات کے دوران جن اسلامی علاقوں پر قبضہ کیا تھا وہاں اس نے اپنے ایسے سکّے رائج کروائے تھے جن پر ایک جانب اس کا نام اور دوسری جانب عباسی خلیفہ وقت الناصر کا نام درج تھا۔ علاوہ ازیں ہلاکو خاں نے جو چنگیز خاں کا پوتا تھا اور جس کے ہاتھوں خلافت عباسیہ کا چراغ گل ہوگیا' عباسیوں کے دارالخلافہ بغداد کو فتح کرنے کے بعد جو سکّے جاری کئے ان پر آخری عباسی خلیفہ المستعصم کے نام کا اندراج جاری رکھا۔ مخفی مباد کہ یہ دونوں منگول حکمران مسلمان نہ تھے' انہوں نے مسکوکات پر اس احتیاط کو اس لئے ملحوظ رکھا کہ ان کی فتوحات سے جو زخم مسلم رعایا کے دلوں پر لگے تھے ان کا کچھ نہ کچھ مداوا ہوجائے۔

سطور بالا میں جن متفرق ریاستوں کے قیام کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا تعلق خلافت عباسیہ کی کمزوری اور عجمیوں کی سیاسی بیداری سے تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ عجم میں ایک ادبی نشاۃ ثانیہ کی تحریک بھی زور پکڑ رہی تھی جس کا ظہور فارسی اور ترکی زبان و ادب کی نشر و اشاعت کی کوششوں سے ہوا' فتوحات اسلامی کے بعد ویسے تو عجمیوں نے عربی رسم الخط اختیار کرلیا تھا لیکن

اندر ہی اندر ان کے دلوں میں اپنی قدیم زبانوں کے احیا کی آرزو انگڑائیاں لے رہی تھیں آہستہ آہستہ فارسی زبان میں ادب و شعر نے کافی ترقی حاصل کی اور قبول عام پایا۔ بعض مذہبی اور اخلاقی کتابیں بھی فارسی میں لکھی گئیں۔ گیارھویں صدی عیسوی یا پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں تو یہ دبی چنگاریاں شعلہ بن کر بھڑکنے لگیں۔ چنانچہ عربوں سے عناد اور نفرت کے اظہار کی شدید ترین مثال کے طور پر فردوسی کے مندرجہ ذیل دو شعر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

زشیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسیداست کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اس دور میں جب کہ عربی شعر و ادب اپنی آن بان کھوتا جارہا تھا، افق عجم پر عمر خیام، خاقانی، انوری، سعدی اور رومی جیسے درخشاں ستارے طلوع ہو رہے تھے لیکن مقام حیرت ہے کہ اس عہد میں بھی کسی حکمران کو اس بات کا خیال نہ آیا کہ سکوں پر فارسی اشعار درج کروائے

ادھر مشرق میں محمود غزنوی کے حملوں کے بعد اسلامی اثر و نفوذ پھیلتا جارہا تھا اور بالآخر شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات کے نتیجے میں دہلی میں خاندان غلاماں کی ایک مستحکم اسلامی سلطنت کا قیام عمل میں آگیا، ان فاتحین کی زبانیں ترکی اور فارسی تھیں۔ علاوہ ازیں مذہبی پیشواؤں اور اولیاء اللہ کی ہندوستان میں آمد سے اُن کا ایک مخصوص مگر وسیع حلقہ اثر بھی پیدا ہوتا گیا، فارسی شعر و ادب کے میدان میں بھی مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو جیسی قدآور شخصیتیں نمودار ہو چکی تھیں امیر خسرو نے تو دہلی کے دربار میں اپنے اعلیٰ مناصب پر فائز رہتے ہوئے کم و بیش سات بادشاہوں کا زمانہ پایا، مگر اس دور میں بھی نہ تو کسی حکمران کو یہ خیال آیا کہ سکوں پر فارسی شعر درج کروائے اور نہ ہی کسی بارسوخ شاعر نے اس طرف حکمرانوں کی توجہ مبذول کروائی۔ ان تمام بادشاہوں کے سکوں پر عربی زبان ہی میں اُن کے نام، القاب، مقام ضرب اور سنہ تسکیک کا اندراج ہوا کرتا تھا تاآنکہ محمد تغلق کا دور آگیا۔

محمد تغلق (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) نے اپنی فتوحات کے ذریعہ سلطنت دہلی کو کافی

وسعت دی۔ اس نے دکن کے بہت بڑے علاقہ کو فتح کرلیا۔ اس بادشاہ کے سکّوں پر بھی، عموماً عربی عبارات کا اندراج پایا جاتا ہے، لیکن یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اس کے بعض سکوں پر فارسی عبارتیں بھی نظر آتی ہیں۔ اسلامی مسکوکات کی تاریخ میں یہ ایک خوش آیند اقدام تھا جس نے آگے چل کر سکّوں پر فارسی شعر کے اندراج کی راہیں کھول دیں۔ محمد تغلق کے ان موخرالذکر سکّوں پر فارسی زبان کی جو عبارتیں ملتی ہیں وہ نثری جملے ہیں۔ محمد تغلق کی جدت طرازیوں کے کئی واقعات مشہور ہیں جن میں سے پایۂ تخت سلطنت کی دہلی سے دولت آباد کو منتقلی سرفہرست ہے۔ محمد تغلق کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ اس نے چرمی سکّے بھی رائج کئے تھے لیکن اب تک اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا محمد تغلق خود ایک بلند پایہ شاعر تھا جس کے بعض شعر سید محمد ہاشمی فریدآبادی نے اپنی تاریخ ہند میں نقل کئے ہیں مگر حیرت ہے کہ ایسی جدّت طراز طبیعت رکھنے کے باوجود اسے یہ خیال نہ آیا کہ سکّوں پر فارسی شعر درج کروائے۔

بہرحال یہ وہ پس منظر ہے جس میں فارسی ادب و شعر دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصے میں اپنی اہمیت منواتا جارہا تھا اور وہ فضا تیار ہورہی تھی جس میں فارسی شعر نے دنیائے مسکوکات کی رونق دوبالا کردی۔

--

سلاطینِ گجرات کے سکّوں پر فارسی اشعار

سلاطینِ گجرات کے مورثِ اعلیٰ تاتار خاں نے جو فیروز شاہ تغلق کی طرف سے گجرات کا صوبہ دار تھا، ۱۴۰۳ء م ۸۰۶ھ میں علم بغاوت بلند کر کے اعلان خود مختاری کر دیا۔

سکّوں پر فارسی شعر کے اندراج کا فخر سب سے پہلے سلاطینِ گجرات کے ایک فرد محمد شاہ ثانی کو حاصل ہوا۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کی تاریخ کا بھی ایک مختصر جائزہ لیا جائے تاکہ وہ پس منظر سامنے آجائے جس میں اس حیرت انگیز روایت نے جنم لیا۔ سلطنتِ گجرات کے بانی تاتار خاں کے آباد اجداد ہندو راجپوت تھے بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان فیروز تغلق ایام شاہزادگی میں راجپوتانے کے علاقہ میں شکار کھیلنے آیا تھا۔ اسی دوران کسی مقام پر اُسے دو نوجوان راجپوت بھائی نظر آئے جن کی صورت و سیرت سے متاثر ہوکر فیروز تغلق انہیں اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔ ان دو بھائیوں میں جوہر قابل تو تھا ہی بادشاہ کی قربت اور شاہی محل میں پرورش اور تربیت سے اُن کی شائستگی میں اور نکھار پیدا ہوا۔ فیروز تغلق کے حسنِ سلوک کے زیرِ اثر ان دونوں بھائیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور بلند سے بلند تر مناصب پر فائز ہوتے جا رہے تھے ان دونوں بھائیوں میں سے ایک بھائی جس کا راجپوتی نام سہارن تھا وجیہ الملک کے خطاب سے نوازا گیا۔ وجیہ الملک کا بیٹا تاتار خاں گجرات کا صوبہ دار مقرر ہوا اور اس نے محمد شاہ کے لقب سے سلطنتِ گجرات کی بنا ڈالی۔[1]

نفسِ موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے یہ مطالعہ باعث دلچسپی ہے کہ تاتار خاں

---

[1] مسلم مانیومنٹس آف احمد آباد مولفہ ایم۔ اے۔ چغتائی مطبوعہ پونا ۱۹۴۹ء صفحہ ۲۷۔

کے آباو اجداد ہندو راجپوت تھے اور حسنِ اتفاق سے تاتار خاں کو راجپوتانے سے متصل علاقہ گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا گیا تھا۔ راجپوتانہ اور گجرات ایسے علاقے ہیں جو کسی زمانہ میں عظیم گپت مملکت میں شامل تھے اور گپتا راجاؤں کو ہی یہ امتیاز حاصل ہو چکا تھا کہ انہوں نے دنیائے مسکوکات میں سب سے پہلے اپنے سکّوں پر سنسکرت زبان کے اشعار درج کروائے تھے۔ گپتا مملکت اپنی وسعت دولت اور ثروت کی فراوانی نیز بیرونی ممالک سے تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے مشرق سے مغرب تک شہرت پا چکی تھی۔ گپتا راجاؤں کے خزانے زر و جواہر سے معمور تھے اسی لئے وہ اپنے سونے کے سکّے جن پر اشعار بھی درج ہوا کرتے تھے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں مضروب کرواتے رہے۔ چنانچہ آج تک دفینوں کی صورت میں اُن کے بے شمار سکّے برآمد ہوتے رہتے ہیں۔ اِن دفینوں میں سے کالی گھاٹ، بھر سار، جسُور، الٰہ آباد، ہلی، ٹانڈہ، کوٹوا، بستی حاجی پور اور بیانہ کے دفینے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ بیانہ کا آخرالذکر دفینہ تو اپنی نظیر آپ ہے کیونکہ اس دفینہ میں صرف گپتا راجاؤں کے دو ہزار سے زیادہ سونے کے سکّے دستیاب ہوئے۔ اس دفینے کی دریافت ۱۷ فروری ۱۹۴۶ء کو بمقام ناگرچھیلہ تعلقہ بیانہ سابق ریاست بھرت پور میں عمل میں آئی۔ ماضی قریب میں بھی دفینوں کی اس بہ کثرت دریافت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گپتا مملکت کے خاتمے کے بعد اس ڈیڑھ ہزار سال کے طویل عرصے میں ایسے کتنے ہی دفینے برآمد ہوئے ہوں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ سابقہ گپتا مملکت کے حدود میں پروان چڑھنے والی نسلیں اِن سکّوں اور اُن کے مندرجات سے نا آشنا رہی ہوں، بالخصوص اعلیٰ متوسط طبقے کے راجپوت گھرانوں کا ان عظیم روایتوں سے ایک ذہنی ورثے کے طور پر واقف رہنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ سلاطین گجرات اور ان کے آباو اجداد نے گپتا راجاؤں کے ایسے سکّے بچشم خود دیکھے ہوں۔

یہ تو تھا سلاطینِ گجرات کے سکّوں پر اشعار کے اندراج کے ایک اندرونی محرّک کا تذکرہ۔ لیکن اِس نوبت پر ایک بیرونی محرّک کا ذکر بھی از حد ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پچھلے صفحات میں عرب و ہند کے صدیوں پُرانے تعلقات کی مختصر تفصیلات بیان کی جا چکی ہیں۔ یہ تعلقات بالخصوص ہندوستان کے مغربی سواحل اور بلادِ عرب کے درمیان بہت زیادہ گہرے تھے۔ گجرات میں مسلمان حکمرانوں کے آزادانہ اقتدار کے قیام کے بعد تو اِن میں اور زیادہ ہم آہنگی پیدا ہو چکی تھی۔ ایران اور

بلاد عرب کے دانشور، علماء، حکماء اور فضلاء بڑی تعداد میں ہندوستان آرہے تھے۔ ظاہر ہے اُن کے تہذیبی ورثے کے نوادرات اور بیش بہا نمونے اُن کے زادِ سفر میں ضرور شامل رہے ہوں گے جن میں عربی فارسی اور ترکی ادب پاروں کی تعداد نمایاں مقام رکھتی ہوگی۔ اس دور تک عربی زبان کی بعض مستند تواریخ مثلاً ابوعبداللہ محمد بن عبدوس الجھشیاری کی کتاب الوزراء والکتاب اور ابن الاثیر کی الکامل فی التاریخ اسلامی ممالک میں عام ہو چکی تھیں۔ ان کتابوں میں عباسی، اغلبی اور بُویہی حکمرانوں کے دیناروں پر مندرجہ اشعار کی تفصیلات مذکور رہیں۔ ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے دارالسلطنت اِن کتابوں سے معمور تھے جیسا کہ سلاطین دہلی، سلاطین گجرات، سلاطین بہمنی وغیرہ کی علمی وادبی سرپرستیوں کے تذکروں سے مُبرہن ہوتا ہے۔ اس طرح سلاطینِ گجرات کا دنیائے مسکوکات میں سکّوں پر عربی زبان کے اشعار کے اندراج کی روایت کے آغاز سے بخوبی واقف رہنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا گجرات کے حکمرانوں نے اپنے سکّوں پر فارسی شعر کے اندراج کی جس حسین روایت کی بنا ڈالی اس کے ایک اور محرّک کے طور پر عربی اثرات کو قبول کرنے میں ہم حق بجانب ہوں گے۔

سلاطینِ گجرات میں سے ابتدائی دو بادشاہوں محمد شاہ اور مظفر شاہ کا دورِ حکومت آپسی سازشوں کی نذر ہو گیا۔ تیسرے بادشاہ احمد شاہ (سنہ ۱۴۱۰ء تا سنہ ۱۴۴۲ء م سنہ ۸۱۳ھ تا سنہ ۸۴۲ھ) کا عہدِ حکومت کافی طویل رہا اور اسی کے زمانے میں سلطنت گجرات کے حدود میں وسعت پیدا ہوئی اور دارالسلطنت احمد آباد کی بنیاد ڈالی گئی۔ مخفی مباد کہ احمد شاہ نہ صرف شعر کا ایک ستھرا مذاق رکھتا تھا بلکہ وہ خود ایک اچھا شاعر تھا۔

احمد شاہ کے بعد محمد شاہ ثانی (سنہ ۱۴۴۲ء تا سنہ ۱۴۵۱ء م سنہ ۸۴۶ھ تا سنہ ۸۵۵ھ) نے عنانِ اقتدار سنبھالی۔ اگرچہ اس بادشاہ کا زمانہ زیادہ طویل نہ رہا تاہم یہ ایک پُرسکون دَور تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بادشاہ کو مسکوکات سے زیادہ دلچسپی رہی ہوگی۔ ذوقِ شعر تو اس کو اپنے باپ احمد شاہ سے ورثے میں مل ہی چکا تھا، چنانچہ اس حکمران نے اپنے سکّوں پر فارسی شعر کے اندراج سے وہ عہد آفریں کارنامہ انجام دیا جس کی نظیر دنیائے مسکوکات میں اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔

محمد شاہ ثانی نے جو فارسی شعر اپنے سکّوں پر درج کروایا تھا وہ حسب ذیل ہے

تابدار الضرب گردوں قرص مہر و ماہ باد
سکۂ سلطان غیاث الدین محمد شاہ باد

اسی خاندان کے ایک اور بادشاہ بہادر شاہ (۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۶ء ۹۳۲ھ تا ۹۴۳ھ) کے سکوں پر بھی فارسی شعر پایا جاتا ہے جس کو درج ذیل کیا جاتا ہے۔

ھر کرا روی و روا ہے ہست بر سطح زمیں
سکۂ اقبالِ شاہ ہند دارد بر جبیں

اس شعر کو کم و بیش تمام محققین نے صحیح طور پر پڑھا ہے البتہ ان کی آراء میں اس شعر کے انتساب کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ٹیلر نے نیومسمیاٹک سپلمنٹ شمارہ XXXI میں شائع شدہ اپنے آرٹیکل میں اس سکے کو شہنشاہ بابر سے منسوب کیا ہے۔ لیکن پروفیسر ہوڈی والا نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ سکہ شہنشاہ بابر کا نہیں بلکہ بہادر شاہ والی گجرات کا ہے۔ پروفیسر مذکور نے نیومسمیاٹک سپلمنٹ کے شمارہ XL میں شائع شدہ اپنے آرٹیکل میں یہ استدلال پیش کیا ہے کہ ایسے سکے جن پر دارالضرب شہر مکرم محمد آباد (چمپانیر) اور تاریخ تسکیک ۹۳۴ھ تا ۹۴۰ھ کا اندراج ہے بہادر شاہ والی گجرات ہی کے ہیں اور کسی طرح بھی شہنشاہ بابر سے منسوب نہیں کئے جا سکتے کیونکہ بابر نے گجرات میں قدم ہی نہیں رکھا۔ پروفیسر ہوڈی والا کا یہ استدلال نہایت قوی ہے اور اس سے اختلاف کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

بہادر شاہ کا آخری دور بڑی افراتفری میں گذرا، شہنشاہ بابر یہ چاہتا تھا کہ بنگال، گجرات اور مالوہ کی ریاستوں کو مغلوب کر کے دکن میں داخل ہو لیکن موت نے اُسے مہلت نہ دی۔ بابر کے بعد ہمایوں اس کا جانشین ہوا اور اس نے اپنے باپ کی خواہش کے مطابق گجرات پر حملہ کیا۔ گجرات کا بادشاہ بہادر شاہ مغلوں کے حملے کی تاب نہ لا سکا اور سراسیمگی کے عالم میں مارا مارا پھرتا رہا اور بالآخر پرتگیزیوں نے جن کے جہاز پر اس نے پناہ لی تھی اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۵۳۶ء کا ہے۔ گجرات کی سلطنت کا چراغ وہیں گل ہو چکا ہوتا مگر ہمایوں کو یہ خبر ملی کہ شیر خاں افغان بغاوت کر کے دہلی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہمایوں نے سلطنت گجرات کی بیخ کنی کا ارادہ ترک کر کے شیر خاں افغان کی سرکوبی کے لئے اپنی فوجوں کے ساتھ بہار کا رُخ کیا اور اس طرح گجرات کی دم توڑتی ہوئی سلطنت کو سانس لینے کیلئے

کچھ اور موقع مل گیا۔ لیکن بہادر شاہ کے جانشینوں کی نااہلی اور آپسی رقابتوں کی وجہ سے اس عرصے میں حالات اور ابتر ہو گئے، تا آنکہ ۱۵۷۲ء م ۹۸۰ھ میں شہنشاہ اکبر نے اس خاندان کے آخری بادشاہ مظفر شاہ ثالث کو شکست دے کر گجرات کو سلطنت مغلیہ میں ضم کر لیا۔

گجرات کے آخری بادشاہوں میں سے کسی کو نہ اتنا وقت ملا اور نہ یہ توفیق ہوئی کہ وہ اپنے پیشرووں کی تقلید کر کے سکوں پر اشعار کے اندراج کی حسین روایت کو تازہ رکھتے۔

سلاطین کشمیر کے سکّوں پر فارسی اشعار

کشمیر میں ہندوؤں کے اقتدار کے زوال کے بعد سنہ ۱۳۳۹ء میں شاہ میر نامی ایک ذی اثر سردار نے سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کر کے اپنے خاندان کی اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی جو کشمیر پر کم و بیش دو سو سال تک حکومت کرتا رہا[1]۔ اس خاندان میں سترہ بادشاہ گذرے ہیں۔ اس خاندان کے آخری حکمران حبیب شاہ کو سنہ ۱۵۶۱ء میں غازی چک نے تخت سے اُتار دیا اور خود سلطان غازی شاہ کا لقب اختیار کر کے خاندان چک کی حکومت کی داغ بیل ڈالی[2]۔ اس دوسرے خاندان میں صرف چھ بادشاہوں نے حکومت کی۔ آخری حکمران حسین شاہ نے اپنی تخت نشینی کے چار ہی دن بعد گدی چھوڑ دی۔ بعد ازاں حسین شاہ کا پیشرو یعقوب شاہ دوسری بار برسر اقتدار آیا۔ اس کے عہد میں کشمیر میں مغلوں کی مداخلت زور پکڑنے لگی۔ لیکن کشمیر کے جغرافیائی حالات نے مغلوں کو اس کی اجازت نہ دی کہ وہ وہاں اپنے قدم بہ آسانی جما سکیں۔ بہرحال مزید دو سال کی مدت کشمیر کی اندرونی سازشوں میں گذر گئی۔ یعقوب شاہ نے بہتیری کوشش کی کہ مغلوں کو کشمیر میں فاتحانہ داخلے سے باز رکھے لیکن اندرونی پھوٹ، قوت فیصلہ کی کمی اور مخلص مشیروں کے فقدان نے فوج میں بڑھتی ہوئی بے دلی سے مل کر یعقوب شاہ کی کسی کوشش کو بار آور ہونے نہ دیا اور عسکری آنکھ مچولی کا یہ کھیل جس میں مغلوں نے بھی قابل لحاظ نقصانات برداشت کئے اکتوبر سنہ ۱۵۸۸ء میں اختتام کو پہونچا جب کہ یعقوب شاہ نے کشمیر میں شہنشاہ اکبر کے

---

[1] کشمیر سلاطین کے عہد میں مرتبہ محب الحسن مترجمہ علی حماد عباسی مطبع معارف اعظم گڈھ سنہ ۱۹۶۷ء صفحہ ۶۲، ۶۳
[2] ” ” ” ” ” صفحہ ۲۳۲

فاتحانہ داخلے کے موقع پر خود کو اس کے سامنے پیش کر دیا۔

شاہ میر اور چک خاندانوں کے ادوار حکومت میں شاہ میر خاندان کا ابتدائی عہد نسبتاً شاندار اور مستحکم رہا ہے۔ شاہ میری حکمرانوں کو زائد از دو صدی حکومت کرنے کا موقع ملا۔ علاوہ ازیں اس خاندان کے دوران حکومت میں محمد تغلق کے بعد دہلی میں بھی کوئی مستحکم حکومت قائم نہ رہی تھی جس سے کسی مداخلت کا خطرہ لاحق ہوتا۔ چنانچہ اس عہد میں شاہ میری حکمرانوں نے اپنی پوری توجہ سلطنت کے استحکام، اصلاح نظم و نسق کی طرف مبذول کر دی۔ ان حکمرانوں میں سلطان زین العابدین سر فہرست ہے جس کے زمانے میں زراعت، صنعت و حرفت اور اشاعت تعلیم کے میدان میں نمایاں ترقی ہوئی۔

جہاں تک علم و ادب کی سرپرستی اور شعر و سخن کی قدردانی کا تعلق ہے، یہ امر لائق توجہ ہے کہ شاہ میری اور چک خاندانوں کے حکمرانوں نے اس سلسلے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان میں سے بعض حکمران خود اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے کشمیر میں فارسی ادب و شعر کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سلطان زین العابدین ایک اچھا شاعر تھا۔ اس کا لڑکا حیدر شاہ بھی شاعر تھا۔ زین العابدین علم و ادب کا بڑا سرپرست تھا اور پڑھے لکھے آدمیوں کی صحبت پسند کرتا تھا۔ نیز ان سے بحث و مباحثہ کرنے کا مشتاق رہتا تھا۔ زین العابدین کے دربار میں مشہور مصور ملا جمیل اپنے کمال فن کا مظاہرہ کر رہا تھا اور تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہ اکبر کے دربار میں بھی پانچ کشمیری مصور موجود تھے۔ سلاطین کشمیر نے فن خطاطی کی بھی بڑی سرپرستی کی۔ کشمیر کی بعض مساجد اور مقبروں میں دیدہ زیب خط نسخ اور نستعلیق میں فارسی اور عربی کتبے پائے گئے ہیں۔

جہاں تک تجارتی سرگرمیوں کا تعلق ہے عہد وسطیٰ میں بھی کشمیر کی معاشی زندگی میں تجارت کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور اس سے حکومت کے مالیہ میں گراں قدر اضافہ ہوتا تھا

لہ کشمیر سلاطین کے عہد میں، مرتبہ محب الحسن، مترجم علی حماد عباسی مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۶۷ء صفحات ۲۹۳ تا ۳۰۳

کشمیری مصنوعات اندرون ہند وادی کے علاوہ بنگال اور جنوبی ہند کے سواحل تبت میں لہاسہ، چین میں پیکنگ نیز ایران اور وسط ایشیاء کے بازاروں میں مقبولیت حاصل کر چکی تھیں۔ خلافت عباسیہ کے دور میں بھی خاندان برامکہ کے تعلق سے کشمیر کے حوالے ملتے ہیں۔

موضوع کتاب کے تعلق سے یہ امر خالی از دلچسپی نہیں کہ سلاطین کشمیر کے معاصر سلاطین گجرات نے پندرھویں صدی عیسوی کے وسط ہی سے سکوں پر فارسی شعر کے اندراج کی ابتداً کر دی تھی۔ کشمیری تاجروں نے علاقۂ گجرات میں ضرور ایسے سکے دیکھے بلکہ اپنے ساتھ کشمیر لے گئے ہوں گے، جن پر فارسی شعر کا اندراج تھا اور سلاطین کشمیر نے ان سے ضرور واقفیت حاصل کی ہو گی اس کا بھی امکان ہے کہ مشرق وسطیٰ سے ثقافتی تعلقات کی بنا پر انہیں یہ بھی معلوم ہوا ہو گا کہ ہارون الرشید نیز اغلبی اور بویہی خاندانوں کے سکوں پر عربی اشعار درج کئے جاتے تھے۔ ان تمام عوامل کے پس منظر میں کشمیر کے شاہ میری خاندان کے حکمرانوں حسن شاہ اور فتح شاہ کے سکوں پر فارسی اشعار کا اندراج ایک منطقی بنیاد رکھتا ہے۔

حسن شاہ (۱۴۷۲ء تا ۱۴۸۶ء) کی اشرفیوں پر جو فارسی شعر درج ہے اس کو آر. بی. وائٹ ہیڈ[۱] نے اس طرح پڑھا ہے جو درست نہیں ہے۔

نگین ملک خاتم سلیماں
حسن شاہ ابن حیدر شاہ سلطاں

اس شعر کا تذکرہ علی حماد عباسی نے بھی کیا ہے[۲] مگر یہاں بھی اس شعر کا صرف پہلا مصرعہ غیر صحیح طور پر درج کیا گیا ہے۔ شعر کے دوسرے مصرعہ کا تو انہوں نے ذکر ہی نہیں کیا۔

صحیح شعر یوں ہے

نگین خاتم ملک سلیماں
حسن شاہ ابن حیدر شاہ سلطاں

---

[۱] نیومسیماٹک کرانیکل XIII سلسلۂ پنجم دی گولڈ کرائنس آف دی سلطانس آف کشمیر صفحہ ۲۶۳، تحریر آر. بی. وائٹ ہیڈ بشکریہ ڈاکٹر محمد ضیاالدین احمد شکیب مقیم لندن نیز ملتان ڈبلیو ایچ صدیقی صاحب، ڈائرکٹر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا۔

[۲] کشمیر سلاطین کے عہد میں مترجم علی حماد عباسی صفحہ ۴۲۹۔ اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء

فتح شاہ نامی شاہ میری خاندان ہی کے ایک اور حکمران کی اشرفیوں پر مندرجہ فارسی شعر کو بھی آر۔ بی وائٹ ہیڈ نے یوں پڑھا ہے[۱]

کبر مملکت کر مہر دولت است
سکۂ فتح شاہ سلطاں است

یہاں وائٹ ہیڈ نے شعر کے پہلے مصرعے کو پڑھنے میں غلطی کی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس نے اشرفی پر مندرجہ شعر کے الفاظ جوں کے توں نقل کر دیئے ہیں جو حسب ذیل ہیں

کر کر لت
ت و
مملکت مہر د

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے وائٹ ہیڈ نے مندرجہ صدر الفاظ کو

کبر مملکت کر مہر دولت است

پڑھا ہے۔ اس خواندگی سے نہ صرف یہ کہ مصرعہ ناموزوں ہو جاتا ہے بلکہ اس کے کوئی معنی بھی بر آمد نہیں ہوتے۔ اس اشرفی پر مندرجہ الفاظ کو بغیر کسی کمی بیشی کے صحیح طریقے سے اس طرح پڑھا جا سکتا ہے اور پورا شعر یوں ہوگا۔

مہر دولت کر مملکت گیر است
سکۂ فتح شاہ کشمیر است[۲]

وائٹ ہیڈ کی ساری غلطی لفظ "کر" کو "کبر" پڑھنے کا نتیجہ ہے جو اصل میں "کبر" نہیں بلکہ "گیر" ہے۔ مخفی مباد کہ سکوں کی ڈائی بناتے وقت مہر کن شوشوں اور مراکز کا خاص اہتمام ملحوظ نہیں رکھتے۔ الفاظ کو حسن کارانہ انداز میں جہاں چاہتے تھے ڈائی پر کندہ کر دیتے تھے۔ اس لئے سیاق وسباق کی موزونیت کے پیش نظر الفاظ کی صحیح نشست تک پہونچنے کی کوشش ضروری ہے۔

ان دونوں اشرفیوں پر مندرجہ اشعار کی تصحیح کے بعد انہیں شامل کتاب کر لیا گیا ہے۔

---

[۱] نیومسیاٹک کرانیکل XIII سلسلۂ پنجم دی گولڈ کوائنس آف دی سلطانس آف کشمیر صفحہ ۲۶۳ تحریر آر۔ بی۔ وائٹ ہیڈ

[۲] فتح شاہ کے دور حکومت کے لیے ملاحظہ ہو "کشمیر سلاطین کے عہد میں" مترجمہ علی حماد عباسی صفحہ ۲۵۳

عادل شاہی حکمرانوں کے سکّوں پر اشعار

محمد تغلق کے آخری ایام حیات میں سلطنت دہلی کے مختلف علاقوں میں باغی امراء سر اٹھانے لگے تھے اور اس طرح کئی صوبوں میں آزاد حکومتوں کے قیام کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ ان عناصر میں سب سے پہلے ابوالفتح ناصر الدین نے اسمٰعیل شاہ کا لقب اختیار کر کے دولت آباد میں اپنی آزاد حکومت کے قیام کا اعلان کیا لیکن تھوڑے ہی دن بعد ناصر الدین اسمٰعیل شاہ کو اس کے اپنے ساتھیوں میں ایک ابھرتے ہوئے نوعمر سردار حسن خاں الملقب بہ ظفر خاں کے حق میں اقتدار سے دست کش ہونا پڑا اور ظفر خاں نے علاؤالدین بھمنشاہ کا لقب اختیار کر کے ۷۴۸ھ م ۱۳۴۷ء میں دولت آباد ہی میں بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ۹۴۵ھ م ۱۵۳۸ء تک قائم رہی۔[1]

بہمنی سلطنت کا پہلا صدر مقام دولت آباد الملقب بہ فتح آباد تھا۔ بعد میں صدر مقام کو تبدیل کر کے گلبرگہ الملقب بہ احسن آباد کو مستقر بنایا گیا اور پھر گلبرگہ سے پایہ تخت بیدر کو منتقل کیا گیا جس کا نام محمد آباد رکھا گیا۔ شاہان بہمنیہ ابتداء ہی سے علم دوست رہے اور ان کے دربار میں بزرگان دین، علماء، فضلاء، حکماء، اُدبا اور شعراء کی قدر افزائی ہوتی رہی چنانچہ بہمنیوں کے عہد ہی میں مشہور بزرگ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ دہلی سے دکن آئے۔ اسی زمانے میں شارح صحیح بخاری علامہ بدر الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر اسکندریہ سے ہندوستان آئے اور پھر گجرات سے ہوتے ہوئے گلبرگہ آکر یہیں کے ہو رہے۔ دربارِ تیموریہ کے ملک الشعراء شیخ آذری نے سلاطین بہمنیہ کی ادب نوازی اور فیاضی کی شہرت سُن کر دکن کا رخ کیا اور یہیں انہوں نے سلاطین بہمنیہ کے حالات "بہمن نامۂ دکنی" کے نام سے نظم کیے۔

---

[1] ہسٹری آف میڈی ایول دکن مرتبہ پروفیسر ہارون خاں شروانی جلد اول (شجرۂ سلاطین بہمنیہ) شائع کردہ حکومت آندھرا پردیش ۱۹۷۳ء

علاوہ ازیں فارسی کے دو مایہ ناز شعراء خواجہ حافظ شیرازی اور ملا عبدالرحمٰن جامی کو بھی دربارِ بہمنیہ سے دعوت نامے بھیجے گئے تھے اور نذور بھی گزرانی گئی تھیں لیکن بوجوہ چند یہ دونوں مشاہیر دکن نہ آسکے۔ مختصراً یہ کہ بہمنی دربار میں زہد و ورع، علم و حکمت اور شعر و ادب کی خوب سرپرستی ہوتی رہی مگر موضوعِ کتاب کے تعلق سے یہ لکھتے ہوئے بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ بہمنی بادشاہوں کے سکوں پر فارسی اشعار پائے نہیں جاتے حالانکہ اُن کے معاصر سلاطینِ گجرات نے سنہ ۸۴۶ھ م سنہ ۱۴۴۲ء سے ہی سکوں پر فارسی شعر کے اندراج کی حسین روایت کی بنیاد ڈال دی تھی۔

کم و بیش دو سو سال تک دکن میں حکومت کرنے کے بعد بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور اُن کے قصرِ اقتدار کے کھنڈروں پر چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے محل تعمیر ہونے لگے۔ یہ حکومتیں سلطنت بہمنیہ کے حسب ذیل علاقوں میں قائم ہوئیں۔

۱۔ احمدنگر میں نظام شاہی
۲۔ گاویل گڑھ میں عماد شاہی
۳۔ بیدر میں برید شاہی
۴۔ بیجاپور میں عادل شاہی
۵۔ گول کنڈہ میں قطب شاہی

متذکرہ صدر حکومتوں کے منجملہ صرف عادل شاہی اور قطب شاہی حکمرانوں کے سکوں پر فارسی اشعار پائے جاتے ہیں لہٰذا ان ہی کے تذکرہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل خاں تھا جو ایران سے ترکِ وطن کر کے سمندری راستہ سے دکن کے مغربی ساحل پر واقع بندرگاہ ڈابھول پر اُترا اور پھر وہاں سے بیدر جاکر بہمنی دربار میں رسائی حاصل کی۔ یوسف عادل خاں بہمنی سلطنت کے مشہور وزیر محمود گاوان کے زیر سرپرستی اپنی اعلیٰ صلاحیتوں جرأت، ہمت اور فراست کے جوہر دکھاکر رفتہ رفتہ بیجاپور کے طرفدار (صوبہ دار) کے جلیل القدر عہدہ تک پہونچ گیا۔ محمود گاوان کے قتل کے بعد بہمنی سلطنت کے زوال کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ اور امرائے دربار کے دکنی گروپ اور ایران اور ترکستان سے آئے ہوئے آفاقیوں میں باہمی کشمکش تیز ہوگئی تھی۔ آفاقیوں کے سرخیل

یوسف عادل خاں اور سلطان قلی تھے اور دکنی عناصر کی رہنمائی ملک حسن طرفدار جُنیر (احمد نگر) کر رہا تھا بظاہر یوسف عادل خاں اور سلطان قلی نے اس کشمکش میں نمایاں حصہ لینے سے احتراز کرتے ہوئے ایک طرح کا سکوت اختیار کر لیا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ اپنے اپنے علاقوں بیجاپور اور گول کنڈہ میں اپنے اثر و نفوذ کو استحکام بخشنے کی تیاریوں میں لگے رہے۔

بالآخر یوسف عادل خاں نے ۸۹۵ھ م ۱۴۸۹ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مسلم حکمرانوں کی روایات کے مطابق یوسف عادل خاں نے یوسف عادل شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنے علاقہ بیجاپور میں اپنے نام کا خطبہ پڑھے جانے کے احکام تو صادر کر دیئے لیکن نہ جانے کیوں اُس نے اپنے نام کے سکّے جاری نہیں کئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری ضروریات اور تجارتی لین دین میں بہمنی بادشاہوں کے سکوّں کا چلن برقرار رہا اور یہ صورت حال نہ صرف یوسف عادل شاہ بلکہ اس کے بعد آنے والے تین جانشینوں اسمٰعیل عادل شاہ، ملّو عادل شاہ اور ابراہیم عادل شاہ اول کے زمانے تک قائم رہی البتہ اس سلسلہ کے پانچویں بادشاہ علی عادل شاہ اول نے اپنے نام کے سکّے جاری کئے اور اس کے بعد اُس کے جانشینوں ابراہیم عادل شاہ ثانی، محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ نے اپنے اپنے ناموں کے سکّوں کی اجرائی کا سلسلہ قائم رکھا۔

جہاں تک سکّوں پر شعر کے اندراج کا تعلق ہے ہمیں ابراہیم عادل شاہ ثانی کے سکّوں پر ایک شعر ملتا ہے۔ جو اپنی نوعیت کا واحد شعر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد تک دکن میں ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ ادھر بیجاپور میں نصرتی اور ہاشمی جیسے باکمال شعراء اس نئی زبان میں جو عربی، فارسی، اور دکن کی کنڑی، مرہٹی اور تیلگو زبانوں کے حسین امتزاج سے پروان چڑھ رہی تھی اپنے کمال فن کا مظاہرہ کر رہے تھے تو اُدھر عین اسی زمانے میں گولکنڈے کے قطب شاہوں کی سرپرستی میں اسی زبان کا ایک نیا روپ ابھر رہا تھا۔ یہ زبان دکنی کے نام سے مشہور ہوئی اور اس میں جو شاہکار تخلیق ہوئے وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی خود دکنی کا ایک بلند پایہ شاعر تھا اور اس کو شعر و ادب، موسیقی اور مصوری کا خاص ذوق ودیعت ہوا تھا، اس بادشاہ کو لفظ "نورس" سے خاص دلچسپی تھی چنانچہ اس نے اپنی ایک تصنیف کا نام جو فن موسیقی کے بارے میں ہے "نورس" رکھا تھا، بیجاپور کے نواح میں ابراہیم عادل شاہ نے ایک نیا شہر بسایا تھا جس کا نام بھی "نورس" رکھا گیا تھا۔ موضوع کتاب کے تعلق سے یہ امر

باعث دلچسپی ہے کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اپنی تین تین تولے کی سونے کی اشرفیوں کا نام نہ صرف "نورس" رکھا تھا بلکہ اِن اشرفیوں پر حسبِ ذیل شعر درج کروایا تھا۔

نورس مہر عادل شاہی
جگت گرو داد الٰہی

شہنشاہ اکبر کے ایلچی اسد بیگ نے جب بیجاپور کا دورہ کیا تھا تو اپنی واپسی پر اس نے دیگر تحایف کے علاوہ ایسی چند اشرفیاں بھی اپنے ساتھ رکھیں اور انہیں اکبر کے حضور میں پیش کیا[1]۔

ابراہیم عادل شاہ کے بعد اس کے جانشین محمد عادل شاہ نے بھی سِکّوں پر شعر کے اندراج کی روایت بر قرار رکھی لیکن اس کے سِکّوں پر مندرجہ شعر فارسی زبان کا ہے جو درجِ ذیل کیا جاتا ہے

جہاں زایں دو محمد گرفتہ زینت وجاہ
یکے محمد مرسل دوم محمد شاہ

مندرجہ بالا شعر محمد عادل شاہ کی سونے کی چھوٹی اشرفیوں نیز اس کے تانبے کے سِکّوں پر پایا جاتا ہے۔ محمد عادل شاہ کے جانشینوں میں سے کسی نے بھی اپنے سِکّوں پر اشعار درج نہیں کروائے

---

[1] ہسٹری آف میڈی ایول دکن مرتبہ پروفیسر ہارون خاں شروانی جلد دوم صفحات ۴۴۲۔ ۴۴۳ شائع کردہ حکومت آندھرا پردیش ۱۹۷۳ء

قطب شاہی حکمرانوں کے سِکّوں پر فارسی شعر

قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی تُرکوں کے "قراقویونلو" قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جس کی حکومت ترکستان (آرمینیا، اذربائجان) میں قائم تھی۔ قراقویونلو قبیلے پر جب آق قویونلو قبیلہ غالب آگیا تو مفتوح قبیلے کے ارکان منتشر ہو گئے۔ انہی میں سے سلطان قلی اور اس کے چچا اللہ قلی نے ہندوستان کا رُخ کیا اور پھر بیدر میں بہمنی دربار تک رسائی حاصل کرلی، دریں اثنا ترکستان میں قسمت نے پھر اس قبیلے کی یاوری کی اور وہاں دوبارہ قراقویونلو برسرِاقتدار آگئے۔ اللہ قلی اپنے بھتیجے کے ساتھ وطن مالوف کو لوٹ جانا چاہتا تھا لیکن سلطان قلی نے جس کو محمد شاہ ثالث بہمنی کا بھرپور اعتماد حاصل ہوچکا تھا اپنے چچا کی تجویز نہ مانی اور دکن ہی میں رہنا پسند کیا، سلطان قلی رفتہ رفتہ ترقی کرکے محمود شاہ بہمنی کے دور میں تلنگانہ بشمول گول کنڈے کا طرفدار (صوبہ دار) بن چکا تھا۔

اگرچیکہ سلطان قلی کو قطب شاہی سلطنت کا بانی قرار دیا جاتا ہے اور عملاً وہ اس سلطنت کا بانی ہے بھی لیکن اس کی رگ و پے میں سلاطین بہمنیہ کی وفاداری اس قدر رچ بس گئی تھی کہ اس نے اپنے آخر دم تک رسمی طور پر اپنی خود مختاری کا اعلان نہیں کیا۔[1] سلطان قلی قطب شاہ کے بعد جمشید، سبحان اور ابراہیم قطب شاہ اس کے جانشین ہوئے۔ چونکہ ان حکمرانوں کے آباو اجداد کا تعلق ارمینیا، اذربائجان اور ایران سے تھا اس لئے ان کو فارسی شعر و ادب سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ نیز دکن میں بہمنی سلطنت نے علم و حکمت، ادب و شعر کی جو سرپرستی کی تھی ان روایات سے

---

[1] ہسٹری آف میڈی ایول دکن مرتبہ پروفیسر ہارون خاں شروانی جلد اول صفحات ۲۱۵ء۔ ۲۱۶ م شائع کردہ حکومت آندھرا پردیش ۱۹۷۳ء۔

بھی قطب شاہی حکمرانوں کی ادب نوازی کا تانا بانا تیار ہونے میں بڑی مدد ملی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ جمشید قلی قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ نہ صرف شعر و ادب کے سرپرست بلکہ خود بلند پایہ شاعر بھی تھے[۵۲]

بیجاپور کی طرح گول کنڈے میں بھی قطب شاہوں کے زمانے میں عربی، فارسی، ترکی جیسی بیرونی زبانوں اور تیلگو، مرہٹی، کنڑی جیسی مقامی زبانوں کے امتزاج سے دکنی زبان کا ایک اور روپ ابھر رہا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ اس نومولود زبان کا نمائندہ شاعر قرار دیا جاتا ہے، چنانچہ قلی قطب شاہ کا مندرجہ ذیل شعر زبان زد خاص و عام ہے۔

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج اک پل جیا جائے نا

محمد قلی قطب شاہ کے دور ہی میں گول کنڈے میں وہ پہلا سکہ مضروب ہوا جس پر مندرجہ ذیل فارسی شعر درج ہے

تعمیر دہِ فلوس شاہی
پیوستہ بلعنت الٰہی

سلطان محمد شاہ ثانی والی گجرات (سنہ ۸۴۶ھ تا سنہ ۸۵۵ھ سنہ ۱۴۴۲ء تا سنہ ۱۴۵۱ء) نے سکوں پر فارسی شعر کے اندراج کی حسین روایت کا آغاز تو کر ہی دیا تھا لیکن کم و بیش ایک صدی تک کسی اور خانوادے میں اس روایت کی تجدید عمل میں نہیں آئی تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس زمانے میں محمد قلی قطب شاہ نے اپنے سکوں پر فارسی شعر درج کروایا عین اسی زمانے میں دہلی کے سلاطین مغلیہ میں شہنشاہ اکبر اور ایران کے صفویوں میں اسمٰعیل دوم اور محمد خدابندہ کے سکوں پر فارسی شعر کے اندراج کی ابتدا ہو چکی تھی۔ شاہانِ قطب شاہیہ میں محمد قلی قطب شاہ ہی ایک ایسا بادشاہ گزرا ہے جس کے سکوں پر فارسی شعر درج ہے لیکن اس کے جانشینوں میں سے کسی نے بھی اس روایت کو برقرار نہیں رکھا۔

---

[۵۲] تاریخ گول کنڈہ مصنفہ عبدالمجید صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد صفحات ۳۸۳ — شائع کردہ سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو شمارہ ۲۹۶ طبع دوم سنہ ۱۹۶۴ء

سلاطینِ مغلیہ کے سِکّوں پر فارسی اشعار

شہنشاہ اکبر اس کتاب کی تمہید میں یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ شہنشاہ اکبر اپنے باپ شہنشاہ ہمایوں کا جانشین ہوا، جس کا دورِ حکومت سنہ ۱۵۵۶ء تا سنہ ۱۶۰۵ء م سنہ ۹۶۳ھ تا سنہ ۱۰۱۴ھ رہا۔ اس نے باپ اور دادا ہمایوں اور بابر سے ایک مستحکم سلطنت پائی" نیز اُسے شیر شاہ سوری جیسے مُدبّر حکمران کا قائم کردہ ایک مضبوط انتظامی ڈھانچہ اور ٹوڈرمل جیسا ایک باصلاحیت وزیر بھی مِلا تھا۔ اکبر سے پہلے ہمایوں اور بابر کے سِکّے وضع قطع نیز سائز اور وزن میں ماوراءالنہر کے شاہ رُخی سِکّوں سے مماثلت رکھتے تھے۔ اُن پر ایک جانب کلمۂ طیّبہ اور چاروں خلفائے راشدین کے نام اور دوسری جانب بادشاہ کا نام، اس کے القاب، سنہ ضرب اور دارالضرب کے نام کا اندراج ہوا کرتا تھا۔ اپنے دورِ حکومت کے ابتدائی چند سال تک اکبر نے اپنے سِکّوں پر وہی اندراجات جاری رکھے، البتہ ان میں جو نمایاں تبدیلی ہوئی وہ سِکّوں کے وزن سے تعلق رکھتی ہے۔ بابر اور ہمایوں کے سِکّوں کا سائز کم و بیش ایک انچ اور ان کا وزن تقریباً دس گرین ہوا کرتا تھا۔ اکبر نے اپنے سِکّوں کا سائز تو وہی رکھا مگر ان کے وزن میں تقریباً ڈھائی گُنا اضافہ کر دیا۔ اکبر کے سِکّے بابر اور ہمایوں کے پتلے سِکّوں کے مقابلے میں کافی دبیز ہیں۔ یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ اکبر نے اپنے مسکوکات میں یہ تبدیلی شیر شاہ کے سِکّوں کے پیشِ نظر کی ہوگی۔

ابوالفضل کا بیان ہے کہ اکبر نے ایسے بڑے سِکّے بھی مضروب کروائے جن کا وزن ایک سو تولے، پچاس تولے اور پچیس تولے تھا۔ محمد ہاشم خافی خاں کا بیان ہے کہ اکبر نے سو تولے سے لے کر پانچ سو تولے تک وزن کی اشرفیاں مضروب کروائی تھیں۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق ان بڑے سکوں پر ایک جانب کلمۂ طیّبہ اور اس کے نیچے "وانَ اللّٰہ یرزق من یشاء

بغیر حساب" درج تھا اور اس کے گرداگرد خلفائے راشدین کے اسماء لکھے تھے۔ اور دوسری جانب بادشاہ کا نام اس کے القاب اور دارالضرب کا نام تھا۔ ابوالفضل یہ بھی کہتا ہے کہ ان سکوں کی ڈائی مقصود مہرکن نے تیار کی تھی وہ آگے چل کر بیان کرتا ہے کہ بعد میں جب یہ کام علی احمد مہرکن کے سپرد ہوا تو اس نے کلمۂ طیبہ کے نیچے افضل دینارٍ ینفقہ الرجل دینارٌ ینفقہ علی اصحابہ فی سبیل اللہ کا اضافہ کیا اور دوسری جانب بھی بادشاہ کے القاب میں مزید ترمیم و اضافہ کیا گیا۔ ابوالفضل یہ بھی لکھتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ سب عبارتیں موقوف کر دی گئیں اور ان کے بجائے ہر دو جانب فیضی کی ایک ایک رباعی درج کی جانے لگی، اور رباعی کے وسط میں ایک جانب "اللہ اکبر جل جلالہٗ" اور دوسری جانب کے وسط ہی میں الٰہی ماہ و سال کا اندراج کیا جانے لگا۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق سو تولے کے سکے کا نام 'سہنسہ' پچاس تولے کے سکے کا نام 'رہس' اور پچیس تولے کے سکے کا نام 'آتمہ' تھا۔ خافی خاں نے اپنے بیان کردہ سو تولے سے پانچ سو تولے تک وزن کے سکوں کے نام نہیں بتائے ہیں۔

ان عظیم الشان سکوں کی جو تفصیلات ہم تک پہونچی ہیں وہ ان بلند پایہ مورخین کی فراہم کردہ ہیں جنہوں نے بچشم خود ان سکوں کو دیکھا اور برتا تھا۔ خافی خاں مورخین کی صف میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے اور ابوالفضل تو مورخ کی حیثیت سے بہت بلند مرتبے کا حامل اور ایک دانشور مفکر، عالم، مدبر اور سیاست داں تھا۔ آئین اکبری میں نظم و نسق سلطنت اور دروبست مملکت کے تعلق سے اس کی مہیا کردہ تفصیلات آج بھی ماہرین شماریات سے خراج تحسین حاصل کرتی ہیں لیکن مقام حیرت ہے کہ مشہور ماہر مسکوکات قدیمہ اسٹنلی لین پول کی نظر میں "ابوالفضل کا کام مشرقی مورخین کی نااہلی کی ایک اور مثال ہے" اسٹنلی لین پول نے اپنے اس ناشائستہ ریمارک کے ذریعہ نہ صرف ابوالفضل بلکہ مشرق کے ایسے تمام مورخین کی توہین کی ہے جن کے کارنامے آج بھی مشرق و مغرب میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

لہ النقود الاسلامیہ، سلاطین مغلیہ کے مسکوکات عظیمہ نوشتہ حکیم سید شمس اللہ قادری، مطبوعہ تاج پریس حیدرآباد دکن صفحہ ۱۷، ۱۸۔ بحوالہ آئین اکبری۔

ابوالفضل پر اسٹینلی لین پول کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس نے اکبری عہد کے سکوں کی ایک طویل فہرست تو دے دی ہے مگر ان سکوں کی امتیازی خصوصیات کا ذکر نہیں کیا جن کے بغیر ان سکوں کی شناخت نہیں کی جا سکتی۔ اس ماہر مسکوکات نے یہ نشان دہی بھی کی ہے کہ ابوالفضل کے بیان کردہ بیشتر اقسام کے سکے کسی بھی میوزیم میں نہیں پائے جاتے نیز یہ کہ بہت سے ایسے سکے جو عجائب خانوں میں دستیاب ہیں اُن کا ذکر ابوالفضل نے نہیں کیا ہے[1]

جہاں تک اسٹینلی لین پول کے اس اعتراض کا تعلق ہے کہ "ابوالفضل کے بیان کردہ بہت سے سکے اس وقت کسی میوزیم میں نہیں پائے جاتے" اپنے اندر کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتا کیونکہ تین چار صدیوں کے اس طویل عرصہ میں ان تمام طلائی و نقروی سکوں کا بحفاظت عجائب خانوں تک پہونچنا قریب قریب ناممکن ہے۔ بالعموم ایسے سکے گلاکر زیورات میں تبدیل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ محض بخت و اتفاق کی بات ہے کہ کسی خاندان کے ذخیرۂ نوادرات میں اُن کے کچھ نمونے محفوظ رہ جائیں۔ اس لیے محض اس بنا پر کہ ابوالفضل کی دی ہوئی فہرست کے بیشتر سکے آج دستیاب نہیں ہوتے اس کے بیان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا اور اس پر غیر صحیح ہونے کا الزام عائد کرنا قرینِ انصاف نہیں ہو سکتا۔ ابوالفضل کی دی ہوئی فہرست پر اسٹینلی لین پول کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "بعض ایسے سکے بھی عجائب خانوں میں پائے جاتے ہیں، جن کا تذکرہ ابوالفضل نے نہیں کیا ہے۔ اپنے اس اعتراض کے ثبوت میں اس نے برٹش میوزیم لندن میں محفوظ پانچ تولے کی ایک اشرفی کا ذکر کیا ہے جو بقول اس کے ابوالفضل کی فہرست میں درج نہیں ہے[2] یہ امر تعجب خیز ہے کہ اسی اسٹینلی لین پول نے جس نے مشرق کے مورخین پر علی العموم اور ابوالفضل پر علی الخصوص ببانگ دُہل نا اہلی کا الزام عائد کیا ہے اپنے اس اعتراض کے ذریعہ خود اپنی بے بضاعتی کا بیّن ثبوت پیش کر دیا ہے، چونکہ ہمارے مشرقی آداب علمی تحقیق کے میدان میں کسی کی لغزش کو اس کی نا اہلی پر محمول کرنے کی اجازت نہیں دیتے اس لئے ہم جملہ مغربی محققین تو کجا خود اسٹینلی لین پول پر اس کی فروگزاشتوں کو اس کی نا اہلی قرار دینے سے اجتناب کرتے ہیں۔ لیکن بہر حال اس خصوص میں اسٹینلی لین

---

[1] دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف ہندوستان اِن دی برٹش میوزیم مرتبہ اسٹینلی لین پول انٹروڈکشن صفحہ LXXII،

[2] ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ۱۱ سکہ نمبر ۲۳

پول نے جو غلطی کی ہے اُس کی بصراحت تصحیح ازبس ضروری ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ابوالفضل نے بصراحت سو تولے کی اشرفی "سہنسہ"[1] کا ذکر کرتے ہوئے اس کی ذیلی تقسیم کی تفصیلات بھی بتلائی ہیں۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ سہنسہ کے آٹھویں حصے، دسویں حصے، بیسویں حصے اور پچیسویں حصے کے مماثل بھی اشرفیاں بنوائی گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ سو تولے کا بیسواں حصہ پانچ تولے ہی ہوگا، اور یہی وہ اشرفی ہے جو اسٹینلی لین پول نے برٹش میوزیم میں دیکھی اور جس کو اپنے مرتب کردہ کیٹلاگ میں تصویر کے ساتھ شائع کیا۔ اسٹینلی لین پول نے اگر آئین اکبری کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہوتا تو اُسے ابوالفضل پر اس بے بُنیاد الزام تراشی کی جسارت نہ ہوتی۔

اسٹینلی لین پول کے پہلے اعتراض کے اس حصے کو جس میں ابوالفضل پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ ابوالفضل نے سکوں کی ایک طویل فہرست تو دے دی لیکن اُن کی امتیازی خصوصیات کا ذکر نہیں کیا جن سے سکوں کی شناخت میں سہولت ہو سکتی ایک خاص زاویۂ نگاہ سے غور کرنے کے قابل ہے۔ اس سلسلہ میں اسٹینلی لین پول اور ابوالفضل دونوں کی حیثیتوں کو ملحوظ رکھنا ازبس ضروری ہے۔ اسٹینلی لین پول ایک ماہر مسکوکاتِ قدیمہ ہے اس نے برٹش میوزیم اور دیگر عجائب خانوں میں محفوظ سیکڑوں حکمران خاندانوں کے لاکھوں سکوں کا معائنہ کر کے ان کے درجنوں کیٹلاگ مرتب کئے ہیں۔ اسٹینلی لین پول کے عہد تک مسکوکاتِ قدیمہ کی تحقیق ایک سائنٹفک علم کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اور اس علم کی پیشرفت کے لئے نئے نئے معیارات قائم کئے جا چکے تھے۔ سکوں کی نہایت باریک بینی سے پیمائش کی جاتی تھی، اُن کی ضخامت اور ان کا وزن معلوم کیا جاتا تھا۔ سکوں میں استعمال شدہ دھاتوں کی لطافت اور کثافت کا تعین کیا جانے لگا تھا۔ الغرض مسکوکاتِ قدیمہ کی تحقیق و تفتیش میں اٹھائے جانے والے تمام ممکنہ سوالات کو حل کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ اس کے بالمقابل ابوالفضل، جس کا عہد اسٹینلی لین پول سے کم و بیش تین صدی پیشتر کا ہے کوئی ماہر مسکوکاتِ قدیمہ نہ تھا اور اس کے ذمے کسی میوزیم میں محفوظ سکوں کے کیٹلاگ کی ترتیب نہ تھی۔ وہ تو ایک مُدبّر، مُفکّر، دانشور اور مورخ تھا۔ اُسے تو شہنشاہ اکبر کی وسیع و عظیم مملکت کی تاریخ لکھنی تھی۔ ابوالفضل کا کینوس کسی عجائب خانہ کے کیبنٹ میں محفوظ سکوں تک محدود نہ تھا بلکہ

---

[1] آئین اکبری مصنفہ ابوالفضل مترجمہ سید احمد خاں جلد اول صفحہ ۱۷۔

اس کی پہنائیوں میں تو سلطنت مغلیہ کے نظم و نسق، اس کے موارد و مصادر، انتظامیہ و عدلیہ، افواج و عمال اور دیگر امور داخلہ کے علاوہ بیرونی ممالک سے مخصوص روابط بشمول تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ جیسے اہم شعبہ جات شامل تھے۔ وہ تو ابوالفضل کا احسان ہے کہ اس نے اکبری عہد میں رائج اُن سکّوں کی بھی کچھ تفصیلات مہیا کر دی ہیں جو اُس نے خود دیکھے اور برتے تھے۔ اس طرح ابوالفضل کی دی ہوئی فہرست مسکوکات پر اسٹینلی لین پول کے اعتراضات بے وزن ہو جاتے ہیں۔

شہنشاہ اکبر کے عہد میں اجراء شدہ سکّوں میں جو تدریجی تبدیلیاں آتی گئیں اُن پر بھی ایک طائرانہ نظر دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ابتداً اکبر اپنے سکوں پر اپنے باپ دادا کی تقلید میں ایک جانب کلمۂ طیبہ اور خلفائے راشدین کے اسماء اور دوسری جانب اپنا نام، لقب سنہ تسکیک اور مقام ضرب درج کرواتا رہا اور یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہا۔ بالآخر ۱۵۸۴ء م ۹۹۲ھ میں اکبر نے اپنے سکوں پر ہجری سنہ کے بجائے الٰہی سنہ کے اندراج کا حکم صادر کیا، جو اس کی تخت نشینی کی تاریخ سے حساب لگا کر شمسی سال کے مطابق انتیسواں سنہ الٰہی قرار پایا۔ اس کے بعد سکوں کے ہر دو جانب کی عبارتوں میں بھی ردّ و بدل کیا گیا۔ اب سکّوں کی ایک جانب "اللہ اکبر" اور دوسری جانب "جل جلالہ" یا ایک جانب "اللہ اکبر جل جلالہ" اور دوسری جانب الٰہی مہینہ اور سنہ درج ہونے لگے۔

سکّوں پر روایتی عبارتوں کے اندراج میں متذکرہ صدر تبدیلی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ کم و بیش پچیس تیس سال تک سلاطین ماسبق کی تقلید میں جس انداز کے سکے اجراء ہوتے رہے ان میں تغیر اچانک نہیں ہو سکتا۔ اس کا پس منظر معلوم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ شہنشاہ اکبر کے خیالات میں جو آہستہ آہستہ تبدیلی رونما ہوتی گئی اس کا جائزہ لیا جائے۔ مغل سلاطین میں اکبر ایک متنازعہ شخصیت رہا ہے۔ کسی نے اکبر کو خلیفۃ اللہ، خلیفۃ الزماں، مفترض الطاعۃ اور امام عادل لکھا ہے تو کسی نے اس کو مُرتد قرار دیا ہے۔ اکبر جس وقت اپنے باپ ھمایوں کا جانشین بنا، اس کی عمر صرف چودہ سال تھی لیکن اس کی خوش بختی تھی کہ اس کو بیرم خاں جیسا سرپرست ملا، جو مغل فوجوں کا سالار اعلیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ سلطنت مغلیہ کا وزیراعظم بھی تھا۔ اکبر کی تخت نشینی کے فوراً بعد ہندو باغی جنرل ہیمو کو پانی پت کے میدان میں شکست دینے کا سہرا بیرم خاں ہی کے سر ہے

ہمایوں کی جلاوطنی کے بارہ سال کے عرصے میں باپ سے دور رہنے کی وجہ سے اکبر باقاعدہ تعلیم و تربیت سے محروم رہا۔ اُس کے چچاؤں نے اس کو بحفاظت تو رکھا مگر اس کی ذہنی نشوونما کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا لیکن چونکہ اکبر کو مبدا رفیاض سے ذہن رسا عطا ہوا تھا اسی لئے وہ اپنی تمام کوتاہیوں پر بہ آسانی قابو پا گیا اور تعلیم سے محرومی کی تلافی کردی۔ اکبر کے بیٹے جہانگیر نے لکھا ہے کہ اگرچہ اکبر نے کبھی لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا لیکن کانوں سے سُن کر اس نے دینی اور دنیوی علوم میں وہ ملکہ حاصل کرلیا تھا کہ اکبر کے سخت ترین مخالف بھی تلاش و تحقیق کے میدان میں اس کے جوش و جذبے نیز مذاہب کے تقابلی مطالعے سے اس کی دلچسپی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اکبر نے بیرم خاں کی سرپرستی میں مملکت کے مہمات امور میں کافی درک حاصل کرلیا تھا' اور اس کی عسکری صلاحیتیں بھی منظر عام پر آنے لگی تھیں۔ اب اکبر نے عنانِ اقتدار خود ہی سنبھال لی تھی۔ اور اس کے بعد اس کی فتوحات کا ایک شاندار سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اکبر نے ۱۵۵۸ء میں گوالیار' ۱۵۵۹ء میں جون پور اور رنتھمبور' ۱۵۶۱ء میں مالوہ' ۱۵۶۲ء میں برہان پور اور ۱۵۶۷ء میں چتوڑ پر اپنی کامرانی کے علم لہرا دیئے تھے۔ بیرم خاں مسلکاً شیعہ تھا جس کا نہ صرف مغل دربار میں اچھا خاصہ حلقہ (لابی) تھا بلکہ ایران کے حکمران صفوی خاندان سے بھی اس کے خاص روابط تھے۔ ایران نے دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کرنے کی مہم میں ہمایوں کی جو مدد کی تھی اس کی وجہ سے مغل نہ صرف صفوی خاندان کے منت پذیر تھے بلکہ اس تعلق سے ایران کو مغلوں پر ایک طرح کی بالادستی حاصل تھی' چنانچہ ۱۵۵۶ء میں جب اکبر بیرم خاں کی سرپرستی میں اپنے باپ ہمایوں کا جانشین ہوا تو ایران کے حکمرانِ وقت شاہ طہماسپ اول نے اپنے ایک فرمان کے ذریعہ اکبر کی جانشینی کی توثیق کی۔ یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ اکبر اپنے موقف کے استحکام کی راہ میں بیرم خاں کو حایل سمجھ کر اس سے گلوخلاصی چاہتا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بیرم خاں نے حالات کا بدلتا ہوا رُخ دیکھ کر ہی ۱۵۶۰ء میں حج بیت اللہ کے ارادے سے روانگی کی اجازت چاہی ہو۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دارالسلطنت سے روانہ ہونے کے بعد اثنائے راہ میں علاقہ گجرات میں بیرم خاں کو قتل کردیا گیا

اکبر کے دربار میں سب سے طاقتور حلقہ سُنّی علماء کا تھا کیونکہ مغلیہ سلطنت میں مسلمانوں کی اکثریت سُنّی العقیدہ تھی۔ ان کے بعد شیعہ مجتہدین کا ایک مخصوص مقام تھا۔ جنھیں ایران

کی سرپرستی حاصل تھی۔ تیسرا حلقہ ہندوؤں کا تھا جو بظاہر بے ضرر لیکن مملکت کی عظیم اکثریت کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ اکبر ایک ہوش مند اور دور اندیش حکمران تھا اور اس کی نظر بساط سلطنت کے ہر گوشے پر نہایت گہری تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ عالم اسلام کی بالادستی حاصل کرنے کے لئے دو عجمی طاقتیں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک تھے ترک اور دوسرے ایران کے صفوی۔ ایران کے مقابلہ میں ترکوں کا پلڑ بھاری تھا۔ اور انہوں نے بلادِ عرب اور بعض آفریقی علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کرلی تھی۔ ایران میں صفوی خاندان بھی اپنی پوزیشن مستحکم کر رہا تھا' لیکن بالآخر ترک اپنے سُنّی العقیدہ ہونے کی وجہ سے مسند خلافت پر متمکن ہو گئے اور خلیفۃ المسلمین کہلانے لگے۔ ترکوں کے اثر و رسوخ میں اضافے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت خلافت کے ادارے سے ایک گہرا نفسیاتی لگاؤ رکھتی تھی۔

جہاں تک ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کا تعلق ہے انہوں نے ابتدا ہی سے خلیفۂ وقت کی بالادستی کو تسلیم کر لیا تھا چنانچہ سلطان شمس الدین التمش کے سکوں پر عباسی خلفاء الناصر اور المستنصر کے نام پائے جاتے ہیں۔ رکن الدین فیروز شاہ اور سلطانہ رضیہ کے سکوں پر بھی خلیفہ المستنصر کا نام ملتا ہے۔ علاء الدین مسعود' ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن کے سکوں پر آخری عباسی خلیفہ المستعصم کا نام پایا جاتا ہے۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ ۶۵۶ھ م ۱۲۵۸ء میں خلافت عباسیہ کا چراغ گل ہو جانے کے باوجود ہندوستان کے مسلم حکمران اپنے سکوں پر خلفائے فاطمین مصر کے نام اعزازاً درج کرواتے رہے اور خلافت سے ذہنی وابستگی کا یہ سلسلہ خلجی' تغلق' سادات اور لودھی حکمرانوں کے عہد تک بھی جاری رہا' اس کا ثبوت ان سلاطین کے سکوں پر "خلدت خلافۃ" جیسے اندراجات سے ملتا ہے۔

اس پس منظر میں شہنشاہ اکبر کے روبرو اپنے مستقبل کے تحفظ کے واسطے تین راستے تھے۔

۱۔ ترکوں کو خلیفۃ المسلمین مان کر ان کی بالادستی کو تسلیم کر لینا

۲۔ ایران کے صفوی خاندان سے تعلقات استوار کر لینا کیونکہ بابر کے ابتدائی ایامِ پریشانی میں ایران نے اُس کی مدد کی تھی اور بابر نے شاہ اسمٰعیل صفوی کے لئے اپنے اظہارِ تشکر

کے طور پر ایسے سکے بھی مضروب کروائے تھے جن پر لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ کے ساتھ علی ولی اللہ بھی درج تھا[۵] اور پھر ھمایوں کے دُبارہ دہلی کا تخت حاصل کرنے کی مہم میں اُس کی غیر معمولی امداد و اعانت ایران نے ہی کی تھی۔

۳۔ ترکوں اور ایرانیوں ہر دو طاقتوں سے دامن چھڑا کر اپنی مکمل آزادانہ شناخت کا اعلان کر دینا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے تیسری صورت کو پسند کیا لیکن اس پر عمل آوری کے لیے اُس نے ایسا طریقہ کار اختیار کیا کہ کسی بھی طاقت سے ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔ ہندوستان کی عظیم اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اکبر نے ان سے میل ملاپ بڑھانے اور خوشگوار تعلقات قایم کرنے کے لئے ایک صلح کل مسلک کو اپنایا۔ اُن سے ازدواجی تعلقات قایم کئے اور ان کی مذہبی کتابوں کے ترجمے کروائے۔ علاوہ ازیں اکبر نے عیسائیوں سے بھی ربط پیدا کیا۔ سنّی اور شیعہ علماء تو دربار میں تھے ہی۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اکبر نے ہندوؤں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے مختلف مکاتیب خیال کے علمبرداروں کو یکجا کرنے کی تدبیر کی اور عبادت خانہ کے نام سے ایک دارالمباحثہ قایم کیا۔ اس عبادت خانے میں مختلف مذہبی موضوعات پر کھُل کر مباحثے ہوا کرتے تھے ابتدائی دور میں سُنّی علماء کا پلّہ بھاری رہا اور وہ روایتی انداز میں اپنے اصولوں کی فاتحانہ مدافعت کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ اکبر نے مسلمان نوجوان دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کر لیا جس میں ابوالفضل فیضی اور عبدالقادر بدایونی کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ شروع شروع میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بدایونی اس ابھرتے ہوئے گروہ کا سرخیل ہوگا لیکن بعد میں ابوالفضل اور فیضی کی طبّاعی، فطانت اور درباری سیاست سے اُن کی کما حقہٗ آگاہی کے آگے بدایونی کو سپر ڈال دینی پڑی۔ مباحثوں کے دوران شیخ عبدالنبی اور عبداللہ سلطان پوری کو بھی بسا اوقات بے بس ہونا پڑتا تھا۔ دراصل یہ سب اکبر کے اشاروں پر ہوتا تھا۔ اکبر چاہتا تھا کہ کوئی بھی فرقہ اس کے قابو سے باہر نہ ہونے پائے۔ ہندو اور عیسائی مذاہب کے تعلق سے مباحثوں میں عمداً ایک نرم رویہ اپنایا جاتا تھا جو بعض اوقات قدامت پسند

---

[۵] دی کیٹلاگ آف پرشین کوائنس مرتبہ آر. ایس. پول. انٹروڈکشن XXV نیز صفحہ ۲۱۰

علما کو گراں گزرتا تھا۔ توازن قوت کے تحفظ کی یہ کوشش کامیاب ہوئی اور بالآخر ۱۵۷۹ء میں سب نے اکبر کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور ایک محضر کے ذریعہ اکبر کو "اعدل" "اعقل" عالم باللہ" مان کر اس کو معصوم عن الخطا قرار دے دیا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے حصول کے بعد اکبر نے نئی نئی بدعات پیدا کیں۔ درباری سلام "السلام علیکم" کے بجائے "اللہ اکبر" قرار پایا۔ سکّوں پر سے کلمۂ طیبہ اور خلفائے اربعہ کے اسماء ہٹا دیے گئے۔ ہجری سنہ کے بجائے ایک الٰہی سنہ ایجاد کیا گیا اور مہینوں کے نام بھی شمسی تقویم کے مطابق رکھے گئے۔ جہاں تک سکّوں کا تعلق ہے تجدید کی اس روش کا نقطۂ عروج اکبر کی وہ اشرفیاں[1] ہیں جن پر ایک جانب رام اور سیتا کی تصاویر اور دوسری جانب ماہ فروردین سنہ ۵۰ الٰہی درج ہے۔

شہنشاہ اکبر کے متذکرۂ صدر اقدامات کی وجہ سے اس کی شخصیت کے بارے میں متضاد رجحانات پائے جاتے ہیں۔ قدامت پسند علما دل ہی دل میں اس کو منحرف بلکہ مُرتد سمجھتے تھے۔ تجدد کے علَم برداروں کا تو اکبر ہیرو بن گیا تھا۔ ہندو اس کی وسیع المشربی سے خوش تھے اور اسے مہابلی پکارتے تھے۔ محولہ بالا محضر کے بعد ترکی خلافت اور ایرانی امامت دونوں سے خود کو اکبر نے آزاد کر لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بڑی سمجھ بوجھ سے کام لے کر اپنی شخصیت کے تحفظ کا منصوبہ بنایا تھا۔ قدرت نے جہاں اکبر کو بہت سی غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا وہیں اس نے اکبر کو ایک طویل دورِ حکومت بھی عطا کیا تھا اور اکبر نے اُن تمام نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے نصب العین کی تکمیل کی۔ دراصل اکبر کو نہ تو مذہب سے کوئی لاگ تھی اور نہ کفر سے کوئی لگاؤ اس کو تو بس اپنی ذات سے دلچسپی تھی اور اس کی راہ میں جو بھی حائل ہوتا اس کو وہ باحسن الحیل ہٹا دیتا تھا۔ اکبر کے تعلق سے اُس کی مُجدِّدانہ سرگرمیوں کے بارے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ اس سلسلے میں اکبر کے نام والیِ ترکستان عبداللہ خاں اُزبک کا مکتوب اور اکبر کا جواب توجہ طلب ہے۔ عبداللہ خاں اُزبک نے اکبر کو لکھا تھا:[2]

---

[1] دی کوائنس آف دی مغل ایمپرس آف ہندوستان ان دی برٹش میوزیم مرتبہ اسٹینلی لین پول صفحہ ۳۴ کوائن نمبر ۱۷۲ نیز لوحہ نمبر ۵ کوائن نمبر ۱۷۲

[2] دین الٰہی اور اس کا پس منظر مولفہ میر محمد خاں شہاب شائع کردہ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۷۲ء

"آپ کی نسبت پیغمبری بلکہ خدائی کے دعوے سننے میں آتے ہیں"

اکبر نے اِس خط کا جو طویل جواب عبداللہ خاں اُزبک کے پاس بھیجا اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

"فرمان آسمانی و نامۂ جاودانی را کہ فرستادۂ خدا ورسانیدۂ پیغمبرات از شاہراہ گردانیدہ برنگ دیگر وامی نمایندہ و مجملاتِ نصوص را تاویلات وتسویلات نمودہ می خواہند در فرمان روائی وکارگزاری شریک بادشاہی باشند"

"جب ان باتوں کی تحقیق اور اختلافی امور کی تفتیش کے دوران میں ظاہر بینوں کا پول کھلا اور پایۂ اعتبار سے گر گئے تو انہوں نے حسد اور عداوت سے غلط افواہیں پھیلانی شروع کیں اور ہماری (اکبر کی) نسبت نبوت و اُلوہیت کے دعوے منسوب کئے ورنہ کہاں بندۂ عاجز اور کہاں یہ دعوی"[1]

اکبر کے مندرجۂ بالا جواب سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا اصل مقصد علماؑ کی سازشوں اور ان کی ریشہ دوانیوں کے اثرات سے اقتدار سلطنت کو محفوظ رکھنا تھا۔ اور بس' چنانچہ اکبر نے عبادت خانے کی بحثوں میں معتزلہ اور سوفسطائیہ کے انداز میں قدامت پسندوں پر اپنے جوان عمر دانشوروں سے ایسے ایسے اعتراضات کروائے جن کے جواب سے بسا اوقات وہ عاجز آجاتے اور ان کی حیثیت عرفی میں کافی گراوٹ پیدا ہوجاتی تھی اور وہ اکبر کے اندیشوں کے مطابق اپنی چالوں میں ناکام ہوجاتے تھے۔ بس یہی وہ پس منظر ہے جس سے اکبری عہد کے مسکوکات کا نیا روپ ابھرتا ہے شہنشاہ اکبر کے مسکوکات کے تذکرے کے بعد اُسی عہد کے ایک باغی کے اجرا کردہ سکوں کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ مخفی مباد کہ یہ باغی کوئی راجہ یا امیر یا فوجی سردار نہیں تھا بلکہ وہ شہنشاہ اکبر کا بھائی مرزا محمد حکیم تھا جس نے بغاوت کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا' اور اپنے نام کے

---

[1] رود کوثر مصنفہ محمد اکرام طبع چہارم صفحہ ۱۱۱

سکے جاری کئے[1]۔ مرزا محمد حکیم کے اِن سکوں پر بھی فارسی کے اس شعر کا اندراج پایا جاتا ہے جو غزالی مشہدی کا نتیجۂ فکر ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وارث ملک است محمد حکیم

لیکن اکبر نے اپنی عالی ظرفی سے کام لے کر مرزا محمد حکیم کی بغاوت فرو ہونے کے بعد اس کو معافی دے دی۔

عجیب اتفاق ہے کہ اکبر ہی کے عہد میں ایک اور باغی نے اپنے نام کے سکے چلانے کی جسارت کی۔ یہ واقعہ سنہ ۹۸۹ھ کا ہے جب کہ کوہستان تبت کے علاقے میں بہادر خاں نامی ایک سردار نے جو سفید بدخشی کے بیٹے کے نام سے مشہور تھا، بغاوت کر کے اپنے نام کی اشرفیاں اور روپے چلائے جن پر خود اس کا کہا ہوا حب ذیل شعر درج تھا۔

بہادر دین سلطان آنکہ بن اسفید شہ سلطان
پدر سلطان پسر سلطان زہے سلطان بن سلطان

شہنشاہ اکبر نے اس باغی سردار کی سرکوبی کے لئے قاضی نظام بدخشی مخاطب بہ غازی خاں کو مامور کیا۔ چونکہ باغی سردار کا تعلق بدخشاں سے تھا، اور غازی خاں بھی بدخشی تھا، اس لئے دربار کے لوگ گومگو کے عالم میں یہ کہہ رہے تھے کہ

آہن بہ آہن کوفتن چہ رنگ پیدا می شود

لیکن غازی خاں بدخشی نے اپنی بہترین صلاحیت کا مظاہرہ کر کے بہادر خاں بدخشی کی بغاوت کو بہ آسانی فرو کر دیا[2]۔

---

[1] اکبر نامہ قلمی جلد سوم صفحہ ۳۰۴، مخزونہ اے پی گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد
نیز ملاحظہ ہو منتخب اللباب حصہ اول مصنفہ خافی خاں مترجمہ محمود احمد فاروقی، مطبوعہ نفیس اکیڈیمی، کراچی پاکستان صفحہ ۱۹۳

[2] دربار اکبری مصنفہ محمد حسین آزاد، شائع کردہ شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور۔ پانچواں ایڈیشن سنہ ۱۹۳۹ء صفحہ ۸۱۷

شہنشاہ جہانگیر

شہنشاہ اکبر کے بعد اُس کا بیٹا نورالدین سلیم شہنشاہ جہانگیر کے لقب سے ۱۶۰۵ء م ۱۰۱۴ھ میں تخت نشین ہوا۔ ایّام شاہزادگی میں وہ شہزادۂ سلیم کے نام سے مشہور تھا اور اس نے ورثے میں اپنے باپ اکبر اعظم سے ایک عظیم اور مستحکم سلطنت نیز مسکوکات کی ایک شاندار روایت پائی تھی۔ اکبر نے شہزادہ سلیم کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ خود سلیم ایک ذہین 'طبّاع' اور باذوق شہزادہ تھا۔ اُسے فارسی اور ترکی زبانوں پر کامل عبور حاصل تھا۔ اور وہ عربی زبان کا بھی اچھا درک رکھتا تھا۔ سلیم خود ایک اچھا شاعر بھی تھا۔ نورجہاں کے ساتھ اس کے رشتۂ ازدواج نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ نورجہاں بھی جو اس وقت تک مہرالنسأ تھی شعروادب کا بہت ستھرا مذاق رکھتی تھی۔ اور بدیہہ گوئی میں اسے یدطولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ کشمیر میں بدوران تفریح ایک ابر آلود شام کو جہانگیر نے جب یہ مصرعہ کہا کہ

ع ابر بیاراست مے بسیاری باید کشید

تو نورجہاں نے برجستہ اس مصرعہ پر مندرجہ ذیل گرہ لگائی

ع ساغرِ مے بر رُخِ گلزار می باید کشید

تو جہانگیر نے اِس کو بہت پسند کیا۔ یہاں اِس امر کا فیصلہ کرنا کسی قدر دشوار معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر اور نورجہاں کے رشتۂ ازدواج سے کس فریق کو زیادہ فائدہ پہونچا لیکن اس امر میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ اگر یہ رشتہ وقوع پذیر نہ ہوتا تو جہانگیر بہرحال شہنشاہ جہانگیر ہی رہتا مگر نورجہاں 'مہرالنسأ' سے آگے نہ بڑھ سکتی۔ ملکۂ نورجہاں کا بھائی آصف خاں بھی جو ہر وقت جہانگیر کے ساتھ ساتھ رہتا تھا ایک بلندپایہ شاعر تھا۔ ایسے ماحول میں جہانگیر نے عظیم الشان سکّوں کی اجرائی کے تعلق سے نہ صرف اپنے باپ اکبر کی روایت کو برقرار رکھا بلکہ ان کی شان وشوکت میں مزید اضافہ کیا جس کا ثبوت حال ہی میں دریافت شدہ جہانگیر کی ایک عظیم الشان اشرفی سے ملتا ہے جس کا وزن ایک ہزار تولے سے زیادہ ہے[1]۔ اس اشرفی کے بردو جانب فارسی اشعار درج ہیں۔ ایسی اشرفیوں

---

[1] دی کیٹلاگ فار دی سیل آف نوبینٹ گولڈ برس آف جہانگیر اینڈ شاہ جہاں' جینوا سوئٹزرلینڈ' بابتہ نومبر ۱۹۸۷ء صفحات ۶'۹ ۔

کا حوالہ ہمیں توزک جہانگیری میں بھی یوں ملتا ہے کہ شہنشاہ جہانگیر نے شاہ ایران کے سفیر زنبیل بیگ کو اُس کی باریابی کے موقع پر ہزار تولے کی ایک اشرفی سے سرفراز کیا[۵۱]۔ شہنشاہ اکبر نے عام وزن کی اشرفیوں کے علاوہ چار تولے، پانچ تولے، دس تولے، پچیس تولے، پچاس تولے، سو تولے، اور پانچ سو تولے کی اشرفیاں بھی مفروب کروائی تھیں۔ لیکن جہانگیر نے اپنی جدت طراز اور تنوع پسند طبیعت سے کام لے کر کئی اور مختلف اوزان کے حسب ذیل سکوں کی اجرائی کا فرمان صادر کیا، چنانچہ وہ لکھتا ہے[۵۲] کہ

"بساعت سعید فرمودم کہ سکہ بر زر زدہ از طلا و نقرہ بوزنہائے مختلف مسکوک ساختند و ہریک را جداگانہ نام نہادم، چنانچہ مہر صد تولہ را نورشاہی و پنجاہ تولہ را نورسلطانی و بست تولہ را نور دوست و دہ تولہ را نورکرم و پنج تولہ را نور مہر و یکتولہ را نورجہانی و نصف تولہ را نورانی و ربع آں را رواجی نام کردم۔ وآنچہ از جنس نقرہ سکہ شد صد تولہ را کوکب طالع و پنجاہ تولہ راکوکب اقبال و بست تولہ را کوکب مُراد و دہ تولہ را کوکب بخت و پنج تولہ را کوکب سعید و یکتولہ را جہانگیری و نصفش سلطانی و ربع را نثاری و دہم حصہ را خیر قبول نام زدکردم و برمہرہائے صد تولہ و پنجاہ تولہ و بست تولہ و دہ تولہ ابیات آصف خاں را فرمودم کہ نقش نمودند"

جہانگیر کا دورِ حکومت (۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۷ھ م ۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) چھوٹی چھوٹی مہمات سے قطع نظر عظیم فتوحات سے خالی نظر آتا ہے۔ حدودِ مملکت کم و بیش وہی رہیں جو اکبر کے عہد میں تھیں بلکہ دکن کے امراء تو کچھ زیادہ ہی سر چڑھ گئے تھے اور مرہٹوں کی آوازیں بھی پہلی بار بلند ہونے لگی تھیں۔ بنگالہ اور اودے پور باغیانہ سرگرمیوں کی آماجگاہ بن رہے تھے۔ قندھار ۱۶۲۲ء

---

[۵۱] توزک جہانگیری مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء جلد دوم صفحہ ۳۲۶

[۵۲] توزک جہانگیری طبع لکھنؤ صفحہ ۶۔

میں مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور ۱۶۳۷ء تک ایران کے صفویوں کے قبضہ میں رہا۔ کاروبارِ سلطنت کلیتہً اکبر کی بنائی ہوئی راہوں پر چل رہا تھا اور یہ کیفیت سکون سے زیادہ جمود کی سی تھی جہانگیر غرق مئے ناب ہو کر رہ گیا تھا لیکن اس کی خوش بختی تھی کہ اُسے قدرت نے نورجہاں جیسی ملکہ مہابت خاں اور آصف خاں جیسے وزراء اور خرم جیسا شہزادہ عطا کیا تھا جن کی صلاحیتوں نے سلطنت کا شیرازہ بکھرنے نہ دیا۔ حیرت ہے کہ اس زمانے میں پھر کوئی شیر شاہ پیدا نہ ہوا ورنہ سلطنت مغلیہ کا چراغ جہانگیر کے عہد ہی میں گل ہو چکا ہوتا۔

موضوع کتاب کی طرف لوٹتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ جہانگیر نے فنون لطیفہ کے اپنے ذوق سے کام لیتے ہوئے دنیائے مسکوکات کو ایسے ایسے نوادرات سے مالا مال کر دیا ہے کہ تاریخ میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ سب سے اہم قابل ذکر بات یہ ہے کہ جہانگیر نے اپنے سکوں پر از سر نو کلمۂ طیبہ اور سنہ ہجری کے اندراج کا حکم صادر کیا، البتہ سکوں پر شمسی مہینوں کے درج کرنے کا طریقہ اکبر کی تقلید میں جاری رکھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جہانگیر خود ایک اچھا شاعر تھا اور نورجہاں کے بھائی آصف کی مصاحبت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ عظیم سکوں کی جو روایت جہانگیر کو اکبر سے ورثے میں ملی تھی اس کو جہانگیر نے چار چاند لگا دیے۔ اکبر نے پانچ سو تولے وزن تک کی اشرفیاں مضروب کروائی تھیں تو جہانگیر نے ایک ہزار تولے وزن تک کی اشرفیاں بنوائیں۔ اکبر کے مختلف سکوں پر تا حال جو اشعار پائے گئے ہیں ان کی تعداد پندرہ تک پہونچتی ہے۔ لیکن جہانگیر کے سکوں پر تقریباً ساٹھ شعر دریافت ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں جہانگیر نے بارہ برجی سکوں کے اجراء کا حکم صادر کر کے مسکوکات کی دنیا میں ایک اور نادر روایت بھی قائم کی یہ سکے نہایت خوبصورت تھے اور ہر ماہ اجراء شدہ ایسے سکوں پر شمسی تقویم کی مطابقت میں ان پر اُس برج کی تصویر بنائی جاتی تھی جس بُرج میں اُس ماہ سورج داخل ہوتا تھا۔ جہانگیر کے بعض سکوں پر اس کی اپنی تصویر بھی پائی گئی ہے لیکن نورجہاں کی تصویر والا کوئی سکہ اب تک دریافت نہیں ہوا ہے۔

جہانگیر کے سکوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان پر مندرجہ بعض اشعار میں فن تاریخ گوئی کا کمال بھی پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جہانگیر کے پہلے سنہ جلوس میں جاری شدہ بعض سکوں پر حسب ذیل شعر درج ہے۔

شد چو خور زیں سکۂ نورانی جہاں
آفتابِ مملکت تاریخ آں

مندرجہ بالا شعر میں "آفتاب مملکت" کے حروف سے بحساب ابجد ۱۰۱۴ھ برآمد ہوتا ہے جو جہانگیر کا سالِ تخت نشینی ہے۔ جہانگیر کے ایک اور سکے پر مندرجہ ذیل شعر پایا جاتا ہے:

زروز ازل در عدد شد برابر
حروفِ جہانگیر و اللہ اکبر

مذکورہ بالا شعر میں یہ صنعت ہے کہ بحساب ابجد "جہانگیر" اور "اللہ اکبر" کے اعداد کا مجموعہ مساوی القدر ہیں۔

جہانگیر کے سکوں کی اس بہتات کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بابر، ہمایوں اور بالخصوص اکبر کی فتوحات کے نتیجے میں بیش قیمت جواہرات اور سونے چاندی کے عظیم ذخائر مغلوں کے خزانے میں جمع ہو چکے تھے۔ اور ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ سابقہ راجاؤں اور سلاطین کے دور کے سکوں پر مشتمل متعدد دفینے بھی برآمد ہو رہے تھے چنانچہ امیرالامراء آصف خاں کو ایک مہم کے سلسلے میں "گرھا کاٹنگا" کے مقام پر دو سو دیگوں کا ایک بہت بڑا دفینہ دستیاب ہوا جس کی ہر ایک دیگ میں علائی اشرفیاں بھری ہوئی تھیں اور اس دفینے کو آصف خاں نے شہنشاہ جہانگیر کے حضور میں پیش کر دیا۔ علائی اشرفیوں کا تعلق سلطان علاءالدین خلجی سے ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ ان دیگوں میں سلطان علاءالدین خلجی کی سو سو تولے کی وہ اشرفیاں ہوں جن کا ذکر اس کے ناظم دارالضرب ٹھاکر پھیرو نے اپنے مقالہ میں کیا ہے۔ بعض مستشرقین نے اکبر اور جہانگیر کی عظیم الشان اشرفیوں کو سکہ جات تسلیم کرنے سے یکسر انکار کر دیا ہے۔ انہیں ہندوستان کے محیّرالعقول سونے چاندی کے ذخائر سے ذرا بھی واقفیت ہوتی تو وہ ہرگز ایسی رائے ظاہر نہ کرتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان میں گپتا راجاؤں اور ان کے جانشینوں نیز مسلم حکمرانوں نے اس کثرت سے سونے کے سکے مضروب کروائے کہ ماضی قریب تک برآمد شدہ ایک ایک دفینے سے ہزاروں اشرفیاں

سلہ اکبر نامہ مصنفہ ابوالفضل جلد دوم صفحہ ۲۱۵

دستیاب ہوتی رہی ہیں۔ مستشرقین کے متذکرہ صدر اعتراض کا جواب پچھلے اوراق میں بالتفصیل دیا جا چکا ہے۔

شہنشاہ جہانگیر کی اجرا کردہ ایک ہزار تولے کی جس اشرفی کا قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے اس کے بارے میں کسی قدر تفصیل میں جانے کی ضرورت اس لئے محسوس ہو رہی ہے کہ جنیوا... (سوئٹزرلینڈ) کی مشہور فرم ہیس برگ فیلڈ مان نے ایسی ہی ایک اشرفی کا جو کیٹیلاگ شائع کیا ہے اس میں اس عظیم الشان اشرفی پر مندرجہ بعض فارسی اشعار کو صحیح طور سے نہیں پڑھا گیا ہے۔ اس کیٹیلاگ میں اس اشرفی کے ہر دو جانب کی تصویروں کے ساتھ ساتھ ان پر مندرجہ عبارات اور اشعار کے چربے بھی دیئے گئے ہیں اور پھر انگریزی زبان میں اُن اشعار کا تلفظ نیز ترجمہ بھی دیا گیا ہے اور ترجمے میں بڑی فاش غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن کی تشریح ذیل میں کی جاتی ہے۔

رُخِ اول

بالائی حاشیہ	ہزار گونہ شرف یافت روی سکہ وزر
بایاں حاشیہ	ز نقش نام جہانگیر شاہ شاہ اکبر
زیریں حاشیہ	عجب نباشد اگر زاد زوابے سکہ ادر
دایاں حاشیہ	بلکہ خانہ اش افزز امان اجر

رُخِ دوم

بالائی حاشیہ	ز فیض دیدن مہر ھزار لوحہ اش
بایاں حاشیہ	ہزار بار ببالد ز ذوق نور نظر
زیریں حاشیہ	بنام نامی اوباد سکہ وخطبہ
دایاں حاشیہ	بدہر تا بود از سکہ وز خطبہ اثر

مندرجہ صدر اشعار کے پڑھنے میں حب ذیل فروگزاشتیں ہوئی ہیں۔

رُخ اول کے زیریں حاشیہ پر مندرجہ مصرعہ دراصل اس طرح ہے۔

عجب نباشد اگر زار زوے سکہ او

ایسا پڑھنے کے بجائے بعض حروف والفاظ جو اشرفی پر موجود نہیں ہیں انہیں شریک قرا

کرلیا گیا ہے اور بعض حروف جو اشرفی پر موجود ہیں انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے مصرعے کے موزوں معنی بر آمد نہیں ہو سکے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ الفاظ "زار زدے" کو "زاد زدا بے" پڑھا گیا ہے اور "سکہ او" کو "سکہ ادر" زاد زدا بے پڑھ کر ڈائی اور آگ کے مفروضہ ازدواج کا نظریہ قائم کیا گیا ہے، جس سے آنے والے اشعار کی مزید غلط خواندگی اور مہمل معنی آفرینی کے ذریعہ ایک مضحکہ خیز صورت حال پیدا کر دی گئی ہے۔

اسی رخ پر دائیں حاشیہ کا مصرعہ یوں پڑھا گیا ہے

بسکہ خانہ اش افزز اماں اجر

اول تو اس خواندگی سے یہ مصرعہ ساقط البحر ہو گیا ہے اور دیگر یہ کہ اس طرح اس کے کوئی معنی بھی بر آمد نہیں ہوتے کیونکہ مصرعے کے ایک لفظ کا کچھ حصہ جو تین چار سو سال کا عرصہ گزر جانے کی وجہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا اور اس لفظ کی باقیات ہی کو ملحوظ رکھ کر مصرعہ پڑھنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ اس مصرعے کو پڑھنے میں جو غلطیاں صادر ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ "بسکہ خانہ اش" کے بعد جس لفظ کو "افزز" پڑھا گیا ہے وہ دراصل "آمد" ہے "افزز" اس سیاق و سباق میں بے محل ہے۔

۲۔ "اسماں" کو جس کے حرف "س" کے دندانے مٹ گئے ہیں "اماں" پڑھ لیا گیا ہے اور آخری لفظ "اختر" کو "اجر" پڑھ کر ستم بالائے ستم کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

اگر ان تمام الفاظ کو صحیح طور پر پڑھا جائے اور "س" کے مٹے ہوئے دندانوں کو ملحوظ رکھا جائے تو مصرعہ اس طرح ہوگا۔

بسکہ خانہ اش آمد ز آسماں اختر

رُخ دوم کے بالائی حاشیہ پر مندرجہ مصرعہ کو پڑھنے میں بھی بڑی مضحکہ خیز غلطی کی گئی ہے اور مصرعہ اس طرح پڑھا گیا ہے

زفیض دیدن مہر ہزار لولحو اش

اس مصرعے میں آخری الفاظ "تو لچہ اش" ہیں جن کو "نو بچہ اش" پڑھ کر اس

اشرفی کو نوزائیدہ بچہ قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ یہ اس غلطی کا تکملہ ہے جو "دار زوئے" کو "زاد زوا ہے" پڑھ کر ڈائی اور آگ کے مفروضہ ازدواج کا نظریہ پیش کرنے سے سرزد ہوئی ہے۔ ظاہر ہے ڈائی اور آگ کے ازدواج کے بعد متوقع اولاد کی پیدایش ناگزیر تھی جو "تولچہ" کو "نوبچہ" پڑھنے سے اس ایک ہزار تولے کی اشرفی کی صورت میں وقوع پذیر ہوئی۔ یہ بات صریح طور پر بنائے فاسد علیٰ الفاسد کی ایک واضح مثال ہے۔ کیٹلاگ کے مرتبین کو شاید پتہ نہیں کہ "تولچہ" فارسی زبان میں "تولہ" کا مترادف لفظ ہے[۵۱]۔ اور اس لفظ کا استعمال ابوالفضل نے بھی اپنی تصنیف آئینِ اکبری میں کیا ہے[۵۲]۔

جہانگیر کی بعض عام اشرفیوں پر مندرجہ اشعار کو بھی پڑھنے میں محققین نے غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً سی۔ جے براؤن نے اپنی مرتب کردہ پراونشیل میوزیم لکھنؤ کے کیٹلاگ صفحہ ۲۱ پر ایک شعر یوں پڑھا ہے۔

سکہ زد بار دو در راہ دکن شاہ بحر و بر
شہنشاہ زماں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

دراصل یہ شعر یوں ہونا چاہیے

بار دو سکہ در راہ دکن زد شاہ بحر و بر
شہنشاہ زماں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

اسی محقق نے ایک اور اشرفی پر مندرجہ شعر اس طرح پڑھا ہے (کیٹلاگ محولہ بالا ص ۲۶)

بماندو سکہ زد فتح دکن شاہ بحر و بر
شہنشاہ زماں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

صحیح شعر یوں ہے

---

۵۱ پرشین، عربک اینڈ انگلش ڈکشنری مرتبہ فرانسس جانسن لندن ۱۸۵۲ء صفحہ ۲۹۶
۵۲ آئین اکبری جلد اول، مرتبہ سید احمد خاں صفحہ ۱۷

بماندو سکۂ فتح دکن زد شاہ بحر و بر
شہنشاہ زماں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

اسی کیٹیلاگ کے متذکرہ صفحہ پر ہی براؤن نے ایک اور شعر کو اس طرح غلط پڑھا ہے

سکہ قند و زنام جہانگیر شاہ
بنور جہانی دہد پر تو چو مہر و ماہ

اصل میں شعر یوں ہے

دہد بنور جہانی و مہر و مہ پر تو
زنام شاہ جہانگیر سکۂ مندو

محولہ بالا کیٹیلاگ کے صفحہ ۲۲ پر مندرجہ ذیل شعر بھی براؤن کی غلط خواندگی کی ایک اور مثال ہے

در بہمن باگرہ سکۂ زد بر زر ظلِ الٰہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

صحیح شعر ہے

"ع سکہ در بہمن باگرہ زد بزد ظلِ الٰہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

ایک اور محقق اوُ۔ کوڈرنگٹن نے اپنی کتاب " اے مینول آف مسلمان نیو مسمیاٹکس" صفحہ ۱۰۹ پر ایک شعر اس طرح پڑھا ہے۔

بماہ تیر در لاہور زد ایں سکۂ را بر زد
پناہ دیں ملک شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

اس شعر کا مصرعۂ ثانی یوں ہونا چاہیئے۔

پناہ ملکِ دیں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

ایک دوسرے محقق وائٹ ہیڈ نے جہانگیر کی ایک اشرفی پر مندرجہ شعر کو یوں پڑھا ہے۔

در ماہ بہمن چوں مہ انور شد زر لاہور
بدر شاہ نور الدین جہانگیر ابن شاہ اکبر

یہاں اس شعر کا مصرعہ اولیٰ غلط پڑھا ہے، جس کی وجہ سے ایک بے معنی نثر کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ دراصل مصرعہ اولیٰ یوں ہونا چاہیے

زر لاہور شد در ماہ بہمن چوں مہ انور

مشہور ماہر مسکوکات قدیمہ اسٹینلی لین پول نے بھی جسے اپنی قابلیت پر بڑا ناز ہے اور جس نے ابوالفضل جیسی گراں پایہ شخصیت کی نگارشات پر ناقدانہ خامہ فرسائی کی جسارت کرتے ہوئے تمام مشرقی مورخین پر نااہلی کا الزام لگانے سے گریز نہیں کیا، شہنشاہ جہانگیر کی بعض اشرفیوں پر مندرجہ ذیل فارسی اشعار کو غلط پڑھ کر خود اپنی علمی بے بضاعتی کا ثبوت فراہم کر دیا ہے[1]

۱۔ ایک اشرفی پر مندرجہ مصرعہ اسٹینلی لین پول نے اس طرح پڑھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

بروئے سکۂ زر داد چندیں زیب و زیور

اصل میں مصرعہ یوں ہونا چاہیے:

بروئے سکۂ زر داد چندیں زینت و زیور

۲۔ جہانگیر ہی کی ایک دوسری اشرفی پر درج شدہ فارسی شعر کے ایک مصرعہ کو اسٹینلی لین پول نے اس طرح غلط پڑھا ہے۔

جہاں فیروز در اجمیر گشت سکۂ زر

مصرعہ دراصل یوں ہے

جہاں فیروز در اجمیر گشت سکۂ زر

---

[1] دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف ہندوستان ان دی برٹش میوزیم، مرتبہ اسٹینلی لین پول شائع کردہ انٹر انڈیا پبلیکیشنز نئی دہلی صفحات ۳۶۸، ۳۶۹

معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب فارسی لفظ "فروز" سے آشنا ہی نہ تھے اور لفظ "فروز" چونکہ متعدد بادشاہوں کے ناموں کا جزو ہونے کی وجہ سے اُن کی نظروں سے گزر چکا تھا اس لئے بغیر سوچے سمجھے اس مصرعہ میں اسی کو جڑ دیا اور اس بات کا بالکل خیال نہیں کیا کہ ایسا کرنے سے مصرعہ ساقط البحر ہو رہا ہے۔

محققین کی اِن فروگزاشتوں کی طرف توجہ دہانی اس لئے ضروری معلوم ہوئی کہ شائقین مسکوکات قدیمہ اُن معیاری کتب کا مطالعہ کرتے وقت کہیں ان اسقام کو صحیح سمجھ کر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

شہنشاہ شاہ جہاں

شہنشاہ جہانگیر کا انتقال ۱۶۲۸ء م ۱۰۳۷ھ بمقام راجوری کشمیر میں ہوا اور اس کی میت لاہور لے جا کر نور جہاں کے باغ میں دفنائی گئی۔ نور جہاں کی خواہش تھی کہ اس کا داماد شہریار تخت نشین ہو، چنانچہ جہانگیر کی تدفین کے بعد لاہور میں شہریار کی جانشینی کا اعلان کر دیا گیا لیکن اس انتظام سے امیر الامراء آصف خاں خوش نہ تھا۔ آصف خاں کی خواہش تھی کہ شہزادہ خرم جو ان دنوں دکن میں تھا اپنے باپ جہانگیر کا جانشین ہو آصف خاں نے اپنے معتمد علیہ قاصدوں کے ذریعہ خرّم کو جہانگیر کی وفات کی اطلاع دی اور اُسے بعجلت شمال کی طرف کوچ کرنے کا مشورہ دیا۔ آصف خاں شہزادہ خرم کا طرف دار محض اس لئے نہیں تھا کہ وہ اس کی بیٹی ارجمند کا شوہر تھا بلکہ آصف خاں خرّم کی ہمہ جہتی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھا اور اسی لئے چاہتا تھا کہ اس عظیم مملکت کی تمام حکومت ایسے مضبوط ہاتھوں میں دی جائے جو اس پر پوری طرح قابو رکھ سکیں۔ چونکہ شہزادہ خرّم کے دکن سے آتے آتے کچھ وقت لگ جاتا اس لئے آصف خاں نے درباری امراء کے تعاون سے شہزادہ خسرو مرحوم کے بیٹے داور بخش کو عارضی طور پر گدی پر بٹھا دیا۔

اِدھر شہریار کو جب ان مخالفانہ سرگرمیوں کی اطلاع ملی تو اس نے آصف خاں سے مقابلے کی ٹھانی اور لاہور سے تین میل کے فاصلے پر دونوں فوجیں باہم معرکہ آرا ہوئیں۔ آصف خاں ایک آزمودہ کار جرنیل ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی توڑ جوڑ کا بھی بڑا ماہر تھا چنانچہ اس نے خفیہ طور پر شہریار کے بہت سے ہمنواؤں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ نتیجتاً شہریار کو شکست ہوئی اور اسے گرفتار

کر کے داور بخش کے سامنے لایا گیا اور یہی اس کی زندگی کا خاتمہ تھا۔

داور بخش اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ اس کو اپنے دادا شہنشاہ جہانگیر کا تخت وراثت میں مل گیا ہے۔ وہ ان درونِ پردہ سازشوں سے بالکل بے خبر تھا کہ اس کو شہزادہ خرّم کے دکن سے شمال آنے تک جزو وقتی طور پر بادشاہ بنا کر قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے۔ داور بخش کے نام سے خطبہ بھی پڑھا گیا اور سکّے بھی جاری کیے گئے لیکن اِن سکّوں پر کوئی شعر درج نہیں ہے۔ اور شہریار کے نام کا کوئی سِکّہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔

آصف خاں کے ذریعہ جہانگیر کے انتقال کی اطلاع شہزادہ خرّم کو ملتے ہی وہ شمال کے لیے روانہ ہو گیا۔ خرّم دکن سے گجرات اور پھر راجپوتانہ ہوتے ہوئے آگرہ کے نواح میں فروکش ہوا اور دھارا باغ میں دو تین ہفتے آرام لینے کے بعد آگرہ میں داخل ہوا جہاں اس کا شاہانہ استقبال کیا گیا اور پھر ۴؍ فروری ۱۶۲۸ء کو شہزادہ خرّم نے شہاب الدین شاہ جہاں کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ شہنشاہ شاہ جہاں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور اس کے نام کے سکے بھی جاری کیے گئے لیکن آگرے میں آصف خاں کی آمد تک تاج پوشی کے جشن کی تقریبات اختتام کو نہ پہونچی تھیں۔ آصف خاں ۲۶؍ فروری ۱۶۲۸ء کو سکندرہ پہونچا اور دوسرے ہی دن اجازت پاکر شہنشاہ شاہ جہاں کے حضور باریاب ہوا۔ اس کے بعد پیش کشی نذور کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے شہزادوں نے نذریں گزرانیں پھر آصف خاں کی باری آئی اور اس کے بعد جلیل القدر امراء و عمائدین نے نذور پیش کیں اور شہنشاہ کی طرف سے اپنی خدمات اور وفاداری کے صلے میں گراں قدر انعامات اور خطابات سے سرفراز ہوئے۔ آصف خاں کو شہنشاہ نے اپنی بیگم ممتاز محل کی درخواست پر وکیل السلطنت مقرر کیا اور شاہی مہر بھی اس کے حوالے کی جو ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔[1]

شہنشاہ شاہ جہاں نے اپنے دورِ حکومت (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۷ء م ۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ) میں جو سکّے مضروب کروائے ان پر شمسی تقویم کے لحاظ سے سنہ جلوس کے ساتھ ساتھ سنہ ہجری کا

---

[1] تاریخ شاہ جہاں مرتبہ ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ ترجمہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین، شائع کردہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی صفحہ ۸۸۔

بھی اندراج پایا جاتا ہے۔ نیز سکّوں پر کلمۂ طیبہ کے اندراج کی روایت جو شہنشاہ بابر اور شہنشاہ ہمایوں کے عہد میں جاری رہی، لیکن اکبر اور جہانگیر کے عہد میں بھی خال خال نظر آتی ہے شاہ جہاں کے دور میں پھر سے تازہ ہو گئی۔ شاہ جہاں کے سکّوں پر خلفائے اربعہ کے اسمار بھی بالالتزام پائے جاتے ہیں۔ شاہ جہاں نے اکبر اور جہانگیر کی تقلید میں عظیم الشان سکّوں کی اجرائی کا سلسلہ بھی جاری رکھا چنانچہ مورخین نے اپنی تصانیف میں ان عظیم مسکوکات کا ذکر کیا ہے۔ پچھلے اوراق میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہ جہاں نے اپنی بیٹی جہاں آرا کی علالت کے دوران اس کا کامیاب علاج کرنے کے صلے میں حکیم داود کو پانچ سو تولے کی ایک اشرفی عطا کی تھی۔ مرشد قلی خاں علی مردان کو دو سو تولے کی اشرفی عطا کئے جانے کا ذکر بھی تواریخ میں ملتا ہے۔ حسنِ اتفاق سے شہنشاہ شاہ جہاں کی دو سو تولے[1] اور ایک سو تولے[2] کی دو اشرفیوں کا ذکر دو مستند کیٹیلاگوں میں ملتا ہے جن کے مرتبین نے ان اشرفیوں کی تصویریں بھی شائع کی ہیں۔ شاہ جہاں کے سکّوں پر فارسی اشعار بھی پائے جاتے ہیں لیکن اُن کی تعداد دس سے زیادہ نہیں ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب

شاہ جہاں کی زندگی میں ہی اس کی جانشینی کے لئے رسّہ کشی شروع ہو چکی تھی۔ اس کے چار بیٹوں داراشکوہ، شجاع، مراد بخش اور اورنگ زیب اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنے لئے حصول اقتدار کی زمین ہموار کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ داراشکوہ شمال میں اپنا موقف مستحکم کرنے کی فکر میں تھا لیکن اس نے غالباً اپنے نام کے سکّے جاری نہیں کروائے تھے البتہ بنگال میں شجاع اور گجرات میں مراد بخش نے اپنے اپنے سکّے جاری کروا دیئے تھے۔ شجاع کے سکّوں پر کوئی شعر نہیں ملتا لیکن مراد بخش کے سکّوں پر ایک شعر پایا جاتا ہے جس کو شامل کتاب کر لیا گیا ہے۔ اس بات کو قسمت کی یاوری سے تعبیر کیا جائے یا ذاتی صلاحیت و استعداد کا منطقی نتیجہ قرار دیا جائے کہ شاہ جہاں کے چاروں لڑکوں میں اورنگ زیب ہی جانشینی کا موزوں ترین امیدوار نظر آتا ہے۔ داراشکوہ کی صلاحیتیں اپنی جگہ مسلّم لیکن اس کا رجحان طبع زیادہ تر علمی، مذہبی بلکہ

---

[1] دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف ہندوستان اِن دی برٹش میوزیم مرتبہ اسٹینلی لین پول لوح نمبر ۲۳

[2] دی کیٹیلاگ فار دی سیل آف ٹوینٹ گولڈ مہرس آف جہانگیر اینڈ شاہ جہاں، جنیوا۔ سوئٹزرلینڈ بابتہ نومبر ۱۹۸۷ء، صفحات ۱۲، ۱۳

تصوف اور گیان دھیان کی طرف تھا۔ اس کے مزاج کے اس پہلو میں اس کے پردادا شہنشاہ اکبر کی نہاد طبع کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ شجاع اور مراد بخش مغل شہزادوں کی روایتی صفات سے متصف تھے۔ اب اورنگ زیب ہی وہ شہزادہ رہ جاتا ہے جس کی ہمہ جہتی صلاحیتیں پکار پکار کر اعلان کر رہی تھیں کہ مغل سلطنت کا تاج و تخت اسی کے انتظار میں ہے۔

اورنگ زیب کے ذاتی کردار کے بارے میں تاریخ کے بعض گوشوں سے اختلافی آوازیں بھی اٹھتی سنائی دیتی ہیں لیکن اس کے شدید معترضین بھی اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ وہ ایک دلیر جرنیل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑا مدبّر اور ماہر نظم و نسق بھی تھا۔ اورنگ زیب میں ایک روایتی مسلم حکمران کے اوصاف کے علاوہ رواداری اور تحمل جیسی صفات بھی پائی جاتی ہیں چنانچہ اس نے جسونت سنگھ، جے سنگھ اور کئی دیگر نامور راجپوتوں کو اپنے اعتماد میں لے کر انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب پر فائز کیا لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اورنگ زیب کی ترجیحات میں مملکت کا استحکام سرِ فہرست رہا ہے۔ اپنے اس مقصد کے حصول کی راہ میں حایل کسی بھی رکاوٹ کو ہٹا دینے میں وہ کوئی باک محسوس نہیں کرتا تھا۔ اپنے باپ شاہ جہاں کو مقید کر کے اورنگ زیب نے اپنی بادشاہت کے اعلان اور داراشکوہ، شجاع، مراد بخش اور خود اپنے بیٹے شہزادہ اکبر کے استیصال کے لئے جو کچھ کیا ان واقعات کو اسی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے

عقاید اسلامی سے اورنگ زیب کی نمایاں وابستگی کی مثال اُس کے نافذ کردہ محصول جزیہ نیز اس کے اجرا کردہ سکوں میں ملتی ہے۔ شہنشاہ اکبر نے بھی اپنے سکوں پر کلمۂ طیبہ کا اندراج موقوف کروا دیا تھا۔ اورنگ زیب نے بھی ایسا ہی کیا لیکن اکبر کا وہ عمل آج کل کی رائج اصطلاح میں سیکولرازم کی تعریف میں آسکتا ہے۔ مگر اورنگ زیب کا یہ عمل " لایمسہ الا المطہرون " کے ذیل میں آتا ہے۔ اورنگ زیب کے خیال میں چونکہ سکّے ساری مملکت میں گشت کرتے ہیں اور ان کا بلا لحاظ مذہب و ملّت مسلم و غیر مسلم رعایا کے ہاتھوں میں جانا ناگزیر تھا اس لئے اُن پر کلمۂ طیبہ کا اندراج متذکرۂ صدر نصِ قرآنی کے مغائر ہوتا اسی لئے اس نے اپنے سکوں پر ایک سیدھا سادہ فارسی شعر درج کرنے کا حکم دیا جس میں اشرفیوں کو "مہر منیر" اور روپیوں کو "بدر منیر" کہا گیا ہے۔ اشرفیوں پر حسبِ ذیل شعر درج کیا گیا تھا۔

سکہ زد در جہاں چو مہر منیر
شاہ اورنگ زیب عالم گیر

اور روپیوں پر یہ شعر درج تھا

سکّہ زد در جہاں چوں بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالم گیر

یہ دونوں شعر میر عبدالباقی المتخلص بہ شہابی کا نتیجۂ فکر ہیں[۵۱]

اپنے مسلک میں اورنگ زیب کی شدّت کی ایک اور شہادت اس کے سکّوں سے ہی ملتی ہے۔ اورنگ زیب نے اپنے آبا و اجداد کی تقلید میں اپنے ہر ایک دارالضرب کے لیے ایک لقب تجویز کیا تھا مثلاً اورنگ آباد کے لیے 'خجستہ بنیاد'، بیجاپور کے لیے 'دارالظفر' وغیرہ اس سلسلے میں دارالضرب حیدر آباد کے لیے جہاں شیعوں کی دم توڑتی ہوئی حکومت آخری سانسیں لے رہی تھی اورنگ زیب نے دارالجہاد[۵۲] کا لقب تجویز کیا تھا۔ مخفی مباد کہ اورنگ زیب سے چھ صدی قبل محمود غزنوی نے بھی اپنے مفتوحہ ہندوستانی علاقوں میں اجرا کردہ سکّوں پر بلادِ ہند کے لیے دارالجہاد[۵۳] ہی کا لقب استعمال کیا تھا۔

عظیم الشان سکّوں کی اجرائی کی جو روایت شہنشاہ اکبر کے عہد سے چلی آرہی تھی اور جس کو جہانگیر اور شاہ جہاں نے بھی برقرار رکھا تھا اس کا تسلسل اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں بھی نظر آتا ہے۔ اس تعلق سے تاریخی شواہد کے علاوہ مادّی شہادتیں بھی دستیاب ہیں۔ جیسا کہ پچھلے اوراق میں بیان کیا جاچکا ہے، اورنگ زیب نے شریف مکّہ کے ایلچی کے توسط سے ایک ہزار تولے کی ایک اشرفی بطور نذر حرم کعبہ کے لیے بھجوائی تھی[۵۴]۔ علاوہ ازیں دو سو تولے کی ایک اشرفی اورنگ زیب

---

۵۱ عالم گیر نامہ صفحہ ۳۶۷

۵۲ کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی جے براؤن (کوائنس آف دی مغل ایمپررس) جلد اول۔ اکسفورڈ ۱۹۲۰ء صفحہ ۲۲۲

۵۳ جرنل آف نیومسیاٹک سوسائٹی آف انڈیا جلد ۱۶ ۱۹۵۴ء جزو اول صفحات ۱۲۳۔ ۱۲۹

۵۴ ماثر عالم گیری صفحہ ۱۰۸

کی طرف سے سبحان قلی خاں کے سفیر کو عطا ہوئی تھی[۵۱]۔ ان تاریخی شواہد کے علاوہ ولیم مارسڈن نے بیان کیا ہے کہ اس کو اورنگ زیب کے ایک ایسے روپے کا علم ہے جو گوتھا (سابقہ مشرقی جرمنی) کے نوابوں کے ذخیرہ نوادرات میں محفوظ ہے۔ مارسڈن نے اس روپے کا قطر ۴ر۴ انچ اور اس کا وزن پانچ جرمن پاونڈ بیان کیا ہے[۵۲]۔ اورنگ زیب ہی کی ایک سو تولے کی ایک اشرفی کا ذکر جیمس گبس نے بھی کیا ہے۔ جو اس نے مہاراجہ سندھیا کے ذخیرۂ نوادرات میں دیکھی تھی[۵۳]۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس اشرفی پر بھی فارسی شعر درج ہیں لیکن رُخ اول پر مندرجہ حسب ذیل اشعار کے چوتھے مصرعے کو مشہور ماہر مسکوکات قدیمہ سید شمس اللہ قادری نے غلط پڑھا ہے

شاہ اورنگ زیب عالم گیر

آسماں قدرت و قضا تدبیر

روئی زر از فروغ سکۂ او

گشت روشن بسان مہر منیر[۵۴]

مندرجہ صدر اشعار میں چوتھا مصرعہ محقق مذکور نے اس طرح پڑھا ہے

گشت روشن بجہاں چو مہر منیر

متذکرہ بالا خواندگی میں ایک تو لفظ 'بسان' بمعنی مانند کو 'بجہاں' پڑھا گیا ہے' دوسرے لفظ 'چو' کا غیر ضروری اضافہ کر دیا گیا ہے۔ جو اشرفی کی تصویر[۵۵] پر نہیں پایا جاتا۔ ایسا کرنے سے مصرعہ ساقط البحر اور مطلب گنجلک ہو جاتا ہے۔ اس اشرفی کے رُخ ثانی پر مندرجہ اشعار کو صحت کے ساتھ پڑھا گیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

۵۱؎ عالم گیر نامہ صفحہ ۶۲۷

۵۲؎ نیومسیاٹا اور ینٹالیا السٹراٹا جلد دوم صفحہ ۶۵۱

۵۳؎ روئیداد ایشیاٹک سوسائٹی بنگال بابتہ مارچ ۱۸۸۵ء صفحات ۵۲ - ۵۳'

۵۴؎ النقود الاسلامیہ۔ سلاطین مغلیہ کے مسکوکات عظیمہ نوشتہ حکیم سید شمس اللہ قادری' مطبوعہ تاج پریس حیدر آباد صفحات ۲۷ - ۲۸'

۵۵؎ روئیداد ایشیاٹک سوسائٹی بنگال بابتہ مارچ ۱۸۸۵ء صفحات ۵۲ - ۵۳' اور ان سے منسلکہ تصاویر

شاہ عالم گیر دریائے کرم اورنگ زیب
آنکہ از قسمت سخایش آب می گیرد سحاب
از فروغ سکۂ اش در عرصۂ ہندوستان
گشت روشن روے زر چوں روی ماہ آفتاب

ان اشعار کے تیسرے مصرعے میں عرصۂ ہندوستان کے الفاظ صحیح معنیٰ میں اورنگ زیب کی حدود مملکت کی وسعتوں پر دلالت کرتے ہیں جو شمال میں کابل اور کشمیر سے جنوب میں چیناپٹن (مدراس) تک اور مغرب میں ٹھٹھ اور بھکر سے مشرق میں جہانگیر نگر (ڈھاکہ) اور اسلام آباد (چٹگانگ) تک پھیلی ہوئی تھیں۔

اورنگ زیب نے بڑی دراز عمر اور ایک طویل دور حکومت پایا تھا لیکن ۱۱۱۹ھ م ۱۷۰۷ء میں اپنے انتقال تک اس نے کسی شہزادے کو اپنا جانشین نامزد نہیں کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی سلطنت مغلیہ کے انجام کا آغاز ہو چکا تھا۔ صحیح معنیٰ میں یہ عظیم سلطنت بابر سے شروع ہو کر اورنگ زیب پر ختم ہو گئی' ویسے تو اس کے بعد متعدد حکمرانوں کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے لیکن ابتدائی چھ بادشاہوں بابر' ہمایوں' اکبر' جہانگیر' شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے مقابلے میں ان سب کی حیثیت تابع مہمل کی سی نظر آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں دو ایک ضرور اس قابل تھے کہ اگر قسمت نے یاوری کی ہوتی اور حالات نامساعد نہ ہوتے تو وہ سلطنت مغلیہ کو مزید ایک آدھ صدی تک اسی آب و تاب کے ساتھ قائم رکھنے میں کامیاب ہو جاتے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور

ع ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

کے بمصداق سلطنت مغلیہ کے تفرق و تشتت کا عمل اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہی شروع ہو گیا۔

اعظم شاہ اورنگ زیب کا سب سے بڑا بیٹا شہزادہ معظم اپنے باپ کے انتقال کے وقت کابل میں صوبہ داری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ چونکہ اورنگ زیب کے کسی جانشین کی نامزدگی عمل میں نہیں آئی تھی۔ اس لئے امرائے دربار کی سازشیں اپنا رنگ جمانے لگیں۔ شہزادہ معظم کے کابل سے آتے آتے اسد خاں اور اس کے لڑکے ذوالفقار خاں

نے جو امرائے دولت کے ایرانی گروپ کی قیادت کرتے تھے شہزادہ اعظم کی حمایت کرکے اس کو تخت سلطنت پر متمکن کردیا۔ اسی اثنا میں شہزادہ معظم نے اپنے بیٹوں کے ہمراہ کابل سے مراجعت کرکے پنجاب کے صوبہ دار منعم خاں کی امداد و اعانت سے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرلیا۔ شہزادہ معظم کی فراخ دلی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے بھائی شہزادۂ اعظم کو سلطنت میں برابر کا شریک کرلینے پر رضامندی ظاہر کی لیکن شہزادہ اعظم پر اس پیش کش کا کچھ بھی اثر نہ ہوا اور آگرے کے قریب ایک میدان میں دونوں بھائیوں کی فوجیں ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا ہوئیں۔ تقدیر نے شہزادہ معظم کا ساتھ دیا اور شہزادہ اعظم شکست کھاکر مارا گیا۔ اس مختصر سے عرصے میں شہزادہ اعظم نے اپنے نام کے جو سکے چلائے تھے ان پر فارسی اشعار کا اندراج پایا جاتا ہے۔ جنہیں شامل کتاب کرلیا گیا ہے۔

شاہ عالم بہادر شاہ

اس فتح کے بعد شہزادہ معظم چونسٹھ سال کی عمر میں شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اس موقع پر شاہ عالم بہادر شاہ کی فراخ دلی کے مظاہرے کی ایک اور مثال پائی جاتی ہے۔ مقام حیرت ہے کہ شاہ عالم بہادر شاہ نے اسی اسد خاں اور اس کے بیٹے ذوالفقار خاں کو جنہوں نے شہزادۂ اعظم کا ساتھ دے کر اس کے خلاف معرکہ آرائی میں سرگرم حصہ لیا تھا نہ صرف معاف کردیا بلکہ اسد خاں کو وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز کردیا۔ شاہ عالم طبعاً ایک شریف النفس اور رحم دل انسان تھا اور بلا تفریق مذہب و ملت پوری رعایا پر یکساں مہربان۔ شاہ عالم کے اس روادارانہ رویے کی تشکیل میں اس کی راجپوت ماں کی تربیت کے اثرات بھی کارفرما نظر آتے ہیں چنانچہ شاہ عالم نے اورنگ زیب کے نافذ کردہ محصول جزیہ کو منسوخ قرار دے دیا۔ شاہ عالم کی ان کوششوں کے باوجود عام بے اطمینانی کی جو لہر پیدا ہوگئی تھی وہ زور پکڑتی گئی۔ راجپوت اپنی نشاۃ ثانیہ کے خواب دیکھ رہے تھے جاٹوں کی شورش پسندی بھی ایک مسئلہ بنتی جارہی تھی اور سکھوں کی ایک نئی طاقت پنجاب میں ابھر رہی تھی جو سرہند اور ملحقہ علاقوں میں اپنے قدم جماکر لاہور کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ ادھر دکن میں مرہٹوں کا زور بڑھتا جارہا تھا جو دراصل سلطنت کا ایک نہایت کمزور پہلو بن چکا تھا۔

کام بخش

شاہ عالم نے اپنے چھوٹے بھائی کام بخش کو حیدرآباد اور بیجاپور کا والی

مقرر کیا تھا۔ جس نے خود اپنے بھائی کے خلاف عَلم بغاوت بلند کر دیا اور اپنے نام کے سکے بھی جاری کر دیئے۔ کام بخش کی اجرا کردہ اشرفیوں اور روپیوں پر فارسی شعر کا اندراج پایا جاتا ہے۔ اس شعر کو اسٹینلی لین پول نے اس طرح پڑھا ہے جو درست نہیں ہے۔

سکہ زد بر خورشید و ماہ
شاہ دکن کام بخش پادشاہ

دراصل ان سکوں پر مندرجہ عبارت یا شعر کو پڑھنے کے لئے ایک دو سکّے دیکھ لینا کافی نہیں ہوتا بلکہ صحیح عبارت تک پہونچنے کے لئے متعدد سکّوں کو بنظر غائر جانچنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ ڈائی پر مندرجہ عبارت تمام و کمال کسی ایک سکّے پر نہیں اُترتی بلکہ کسی سکّے پر اس کا کچھ حصہ آجاتا ہے اور کسی پر کچھ۔ یہاں پر اسٹینلی لین پول نے نہ صرف یہ غلطی کی کہ ان سکوں کے متعدد نمونے نہیں دیکھے بلکہ عبارت کا جو بھی حصہ اس کو کام بخش کی اشرفیوں پر نظر آیا اس کو شعری اور ادبی قواعد کی رو سے ربط دے کر معنی خیز انداز میں لکھنے کی بھی اس نے کوئی کوشش نہیں کی اور نتیجہ معلوم[1]۔ دراصل کام بخش کی اشرفیوں اور روپیوں پر مندرجہ فارسی شعر اس طرح ہے

در دکن زد سکّہ بر خورشید و ماہ
بادشاہ کام بخش دین پناہ

کام بخش کی ان باغیانہ سرگرمیوں کی بنا پر شاہ عالم کو ۱۱۲۰ھ میں اس کی سرکوبی کے لئے فوجی اقدام کرنا پڑا۔ اس مہم کے نتیجے میں کام بخش مارا گیا۔ بالآخر تین چار سال ہی کی مدت میں بغیر کوئی خاص کارنامہ انجام دیئے ۱۱۲۴ھ م ۱۷۱۲ء میں شاہ عالم بہادر شاہ کا انتقال ہوگیا۔ شاہ عالم بہادر شاہ کے سکّوں پر فارسی اشعار پائے جاتے ہیں جنھیں سی۔ جے براؤن نے غلط پڑھا ہے۔

شاہ عالم بہادر شاہ کی ایک اشرفی پر مندرجہ شعر کو سی۔ جے براؤن نے

---

[1] دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف ہندوستان ان دی برٹش میوزیم مرتبہ اسٹینلی لین پول صفحہ ۱۷۰۳ شائع کردہ انڈیا پبلیکیشنز نئی دہلی ۱۹۸۳ء

اس طرح پڑھا ہے

سکہ زد چو صاحب قرانی
بہادر شاہ عالم گیر ثانی

صحیح شعر یوں ہے

بزر زد سکۂ صاحب قرانی
بہادر شاہ عالم گیر ثانی

اسی حکمران کے ایک روپیہ پر مندرجہ شعر کو سی. جے براؤن نے یوں پڑھا ہے

سکۂ مبارک زد در ہفت کشور بر مہر و ماہ
شاہ جہاں ثانی سلطان معظم بادشاہ

اس شعر کے دونوں مصرعے غلط پڑھے گئے ہیں۔ صحیح شعر اس طرح ہے۔

سکہ زد در ہفت کشور چتر زد بر مہر و ماہ
ثانی شاہ جہاں سلطان معظم بادشاہ

شاہ عالم ہی کے ایک اور روپیہ پر درج شدہ شعر کو بھی سی جے براؤن نے اس طرح غلط پڑھا ہے

سکہ زد بر زر چو صاحب قرانی
معظم شاہ عالم گیر ثانی

صحیح شعر یوں ہوگا

بزر زد سکۂ صاحب قرانی
معظم شاہ عالم گیر ثانی

ان تینوں اشعار کا حوالہ صفحہ ہذا کے فٹ نوٹ میں درج ہے[1]

---

[1] کیٹیلاگ آف کوائنس ان دی پراونشیل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی. جے براؤن جلد اول صفحہ ۳۰ شائع کردہ آر سی اسپیز لمیٹڈ دہلی طبع ثانی ۱۹۸۶ء

عظیم الشان اورنگ زیب کے بعد سلطنت مغلیہ کی تاریخ، تخت حکومت کے دعویداروں کی کمزوری اور نااہلی کا ایک مرثیہ بن کر رہ گئی ہے ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کم وبیش سترہ شہزادوں نے ادعائے وراثت پیش کیا جن میں سے کسی نے بھی اُس صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کیا جو ایسے شاندار ماضی کی حامل سلطنت کے ورثا کے شایان شان ہوتی۔ شاہ عالم بہادر شاہ کے چار لڑکے تھے۔ سب سے بڑا عظیم الشان تھا جو اپنے باپ کا جانشین ہوا لیکن چند ہی ماہ کے عرصہ میں ذوالفقار خاں کی مخالفت کی وجہ سے نہ صرف اس کو تخت حکومت بلکہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا، عظیم الشان نے اپنی قلیل مدت حکومت میں جو سکے رائج کئے ان پر فارسی شعر پایا جاتا ہے

جہاندارشاہ، رفیع الشان عظیم الشان کے بعد ذوالفقار خاں نے دو اور شہزادوں کو جہاندارشاہ اور رفیع الشان کے القاب سے کٹھ پتلی حکمرانوں کی طرح سلطنت مغلیہ کے تخت پر بٹھایا اور چند ہی ماہ میں انہیں اپنے راستے سے ہٹادیا۔ جہاندارشاہ کے سکوں پر مندرجہ ایک شعر کو سی۔ جے براؤن نے یوں پڑھا ہے اور غلطی مصرع اولیٰ کے پڑھنے میں کی ہے۔ وہ پڑھتا ہے[۱]

سکہ زد در آفاق چوں مہر و ماہ
ابوالفتح غازی جہاندارشاہ

صحیح شعر اس طرح ہوگا۔

در آفاق زد سکہ چوں مہر و ماہ
ابوالفتح غازی جہاندارشاہ

مقام حیرت ہے کہ ایک ایرانی محقق مسکوکات قدیمہ آقائی جمال ترابی طباطبائی نے اپنے مرتب کردہ تبریز میوزیم کے کیٹلاگ میں اس سکہ کو زند خاندان کے دوسرے حکمران ابوالفتح ابن کریم خاں زند سے منسوب کیا ہے، محقق مذکور کو صرف ابوالفتح کی کنیت سے تسامح ہوا ہے جو اس غلط انتساب

---

[۱] کیٹلاگ آف کوائنس ان دی پراونشل میوزیم لکھنؤ مرتبہ۔ سی۔ جے براؤن جلد اول صفحہ ۳۱ شائع کردہ آرسی سینٹر لمیٹڈ۔ دہلی۔ طبع ثانی ۱۹۸۶ء

پر منتج ہوا۔ اگر موصوف نے سکے کی ہندوستانی ساخت، وضع وقطع اور پوری عبارت کو پیش نظر رکھا ہوتا تو یہ غلط فہمی پیدا نہ ہوتی۔

فرخ سیر

ذوالفقار خاں کے پیدا کردہ عالم انتشار نے ایک نئی لہر کو جنم دیا۔ ہوا یوں کہ سید عبداللہ اور سید حسین جو سادات بارہہ کے نام سے مشہور ہیں اور علی الترتیب الہ آباد اور بہار کے صوبہ دار تھے ذوالفقار خاں کے خلاف اپنی طاقت آزمائی کی کوششوں میں سرگرم ہو گئے اور نتیجتاً انہوں نے ایک ایسے شہزادے کو ڈھونڈ نکالا جس کے اطراف امرائے دولت کی اکثریت جمع ہو گئی۔ یہ شہزادہ عظیم الشان کا بیٹا فرخ سیر تھا۔ اس طرح سید برادران کی کوششیں بارآور ہوئیں اور انہوں نے ۱۱۲۴ھ م ۱۷۱۳ء میں شاہی افواج کو شکست دے کر جہاندار شاہ اور ذوالفقار خاں کے عبرتناک خاتمہ کے بعد فرخ سیر کو سلطنت مغلیہ کے تخت پر بٹھا دیا۔

فرخ سیر نے کم وبیش سات سال تک حکومت کی لیکن کسی بھی قسم کی صلاحیت کی محرومی کی وجہ سے اپنے عہد حکومت میں کوئی خاص کارنامہ انجام نہ دے سکا۔ رفتہ رفتہ سید برادران سے بھی اس کے تعلقات میں ناخوشگواری پیدا ہوتی گئی۔ اسی دوران سید حسین نے جو دکن کا صوبہ دار ہو گیا تھا مرہٹوں سے ایک اہانت آمیز صلح نامہ طے کر کے انہی کی امداد واعانت سے دہلی پر چڑھائی کر دی اور مرہٹوں نے مختصر سی مدت کے لئے سلطنت مغلیہ کی راجدھانی میں دھوم مچا دی اور انہیں کوئی ٹوکنے والا نہ تھا۔ فرخ سیر کسی مقاومت کے موقف میں نہ تھا وہ بھاگ کھڑا ہوا اور بالآخر گرفتار ہو کر قید کر لیا گیا اور چند ہی دن بعد اوائل ۱۱۳۱ھ م ۱۷۱۹ء میں اس کا کام تمام کر دیا گیا۔ فرخ سیر کے سکوں پر بھی فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔ یہ ایک مضحکہ خیز حقیقت ہے کہ فرخ سیر نے اپنے سکوں پر خود کو "بادشاہ بحر وبر" ظاہر کیا ہے۔ اس تعلی کا واقعات کی دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا، جس کا اظہار اس حکمران کی بے دست و پائی سے اظہر من الشمس ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اس عہد کا ایک دانشور شاہ جعفر زٹلی جس کی شہرت صرف ایک ہجو گو کی حیثیت سے ہے صورت حال کے اس تضاد کو برداشت نہ کر سکا اور فرخ سیر کے سکے پر مندرجہ شعر کی پیروڈی کہی۔

فرخ سیر کے سکے پر حسب ذیل شعر درج تھا

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر
بادشاہ بحر و بر فرخ سیر

جعفر زٹلی نے اس شعر کی پیروڈی اس طرح کی
سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہ پشہ کش فرخ سیر

لیکن جعفر زٹلی کو یہ پیروڈی بہت مہنگی پڑی جس کے نتیجہ میں اس کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔[۱]

رفیع الدرجات، شاہ جہاں ثانی مغلیہ تاریخ کے آخری دور میں سنہ ۱۱۳۱ھ - سنہ ۱۱۳۲ھ کو شاہی خاندان کے زوال کا بدترین مظہر قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس ایک سال کے عرصے میں پے در پے چار شہزادوں نے قسمت آزمائی کی اور سب کے سب ناکام رہے، ان میں سے دو شہزادے رفیع الشان کے بیٹے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ تھے جنھیں سید برادران نے کٹھ پتلیوں کی طرح تخت پر بٹھایا تھا جو یکے بعد دیگرے چار چار ماہ حکومت کرنے کے بعد موت کے آغوش میں پہنچا دیئے گئے۔ رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کے سکوں پر فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔ وائٹ ہیڈ نے رفیع الدرجات کے سکوں پر مندرجہ ایک شعر کو اس طرح غلط پڑھا ہے اور یہ غلطی مصرعہ اولیٰ کے تعلق سے سرزد ہوئی ہے۔[۲]

سکہ زد بہند باہزاراں برکات
شاہنشہ بحر و بر رفیع الدرجات

صحیح شعر اس طرح ہے۔

---

[۱] دی لیٹر مغلس مصنفہ ڈبلیو۔ اردن۔ جرنل آف نیومسیاٹک سوسائٹی آف انڈیا جلد LXXIII جزو اول۔ شمارہ ۱ تا ۴ سنہ ۱۹۳۳ء۔ صفحات ۲۸۷ تا ۳۶۱۔ نیز ملاحظہ ہو گنج شائیگاں مصنفہ محمد رفیع موہانی عالی۔ مطبوعہ مراد آباد سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳۷۔

[۲] کوائنس آف مغل ایمپررس مرتبہ وائٹ ہیڈ سکہ نشان ۳ ـ ۲۲۷

زد سکہ بہند باہزاراں برکات
شاہنشہ بحر و بر رفیع الدرجات

رفیع الدجات کے سکوں پر تو اس کا یہی نام درج ہے البتہ رفیع الدولہ نے اپنا لقب شاہ جہاں اختیار کیا تھا چنانچہ اس کے سکوں پر شاہ جہاں ثانی کا اندراج ہے۔ وائٹ ہیڈ نے رفیع الدولہ شاہ جہاں ثانی کے سکے پر مندرجہ شعر بھی اس طرح غلط پڑھا ہے[1]۔

سکہ زد در جہاں با امن و اماں
صاحب قراں ثانی شاہ جہاں'

صحیح شعر یوں ہے

سکہ با امن و اماں زد در جہاں
ثانی صاحب قراں شاہ جہاں'

نیکوسیر ان دونوں شہزادوں کے بعد ایک اور شہزادے نیکوسیر نے جو اورنگ زیب کا پوتا اور اس کے باغی شہزادے اکبر کا بیٹا تھا عنان اقتدار سنبھالی لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے نام کے سکے رائج کرتا اس کا کام تمام کر دیا گیا۔

محمد شاہ نیکوسیر کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ کا پوتا اور خجستہ اختر کا بیٹا محمد شاہ سولہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ ابتداً اس کو مجبور ہونا پڑا کہ سید برادران کے ظلم وستم اور ان کی چیرہ دستیوں میں ان کی ہمنوائی کرے لیکن تھوڑے ہی عرصے میں دربار کے ترکی نژاد امرائے کے زیر اثر جن کی رہنمائی چین قلیچ خاں کے ہاتھوں میں تھی محمد شاہ نے سید برادران کے غلبہ واستیلار کا قلع قمع کر دیا۔ سید برادران نے مقاومت پر کمر باندھی لیکن ان کی فوجوں کو شکست ہوئی۔ سید حسین مارا گیا۔

محمد ابراہیم اس نوبت پر سید عبد اللہ نے ایک اور چال چلی۔ اس نے رفیع الدولہ

---

[1] کیٹلاگ آف مسٹر آر بی وائٹ ہیڈ بحوالہ کیٹلاگ آف کوائنس ان دی پراونشل میوزیم لکھنؤ۔ مرتبہ سی جے براؤن جلد اول صفحہ ۳۲، شائع کردہ آر۔ سی۔ سپنسر لمیٹڈ ۱۹۸۶ء دہلی۔

ے ایک بھائی محمد ابراہیم کو ۱۱۳۲ھ میں تخت پر بٹھا دیا لیکن چین قلیچ خاں کے تدبّر کے مقابلہ میں سید عبداللہ کی چال کامیاب نہ ہو سکی اور ایک ہی مہینے کے عرصے میں ابراہیم کو تخت سے اتار کر قید کر دیا گیا۔ اس ایک ماہ کی مدت ہی میں محمد ابراہیم نے اپنے سکے جاری کروائے جن پر فارسی شعر کا اندراج ہے۔ مشہور ماہر مسکوکات قدیمہ اسٹنلی لین پول نے محمد ابراہیم کے سکوں پر مندرجہ فارسی شعر کو اس طرح غلط پڑھا ہے[۵]۔

سکّہ بر سیم زد در جہاں
بفضلِ محمد ابراہیم شاہ شاہاں

مندرجہ بالا قرأت سے شعر ساقط البحر اور اس کا مفہوم خبط ہو جاتا ہے۔ اصل میں شعر اس طرح ہے۔

سکّہ زد در جہاں بفضلِ کریم
شاہ شاہاں محمد ابراہیم

سید برادران کے زوال کے بعد محمد شاہ نے چین قلیچ خاں کو جن کا خطاب نظام الملک آصف جاہ تھا وزارت عظمٰی کے عہدے پر فائز کیا اور دکن کی صوبہ داری بھی انہی کو دی گئی۔ نظام الملک آصف جاہ کی صلاحیتوں سے سلطنت مغلیہ کی گرتی ہوئی دیوار کو ضرور سہارا ملتا لیکن حکمران کی عیش پسندی، نااہلی اور تلون طبع نیز درباری امرا کی سازشوں نے آصف جاہ کی کوششوں کو بار آور ہونے نہ دیا۔ محمد شاہ نے ۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ م ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء کم و بیش تیس سال تک حکومت کی۔ یہ اتنا طویل دور تھا کہ کوئی بھی باصلاحیت حکمران فہم و فراست، مستقل مزاجی اور مخلص مشیروں کی اعانت سے سلطنت کے ابتر حالات کو استحکام کی منزل تک پہونچا سکتا لیکن یہاں تو ان سب باتوں کا فقدان تھا۔ محمد شاہ سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل شہنشاہ اکبر نے بھی عنفوان شباب میں عنان اقتدار سنبھالی تھی۔ اس کو بھی بیرم خاں کے روپ میں ایک بہادر جرنیل اور مدبّر ماہر

---

۵ دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف ہندوستان اِن دی برٹش میوزیم مصنفہ اسٹینلی لین پول شائع کردہ انٹر انڈیا پبلکیشنز نئی دلی ۱۹۸۳ء صفحہ ۳۷۲

نظم ونسق کی سرپرستی حاصل تھی جس سے اکبر نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے سلطنت مغلیہ کی بنیادیں مستحکم کردیں اور پچاس سال تک ایک کامیاب بادشاہ کی طرح حکومت کرتا رہا۔ اس کے برخلاف محمد شاہ نے جو سولہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا اور جس کو چین قلیچ خاں کی صلاحیتوں سے استفادے کا پورا پورا موقعہ بھی ملا تھا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور عیش وعشرت کی رنگ رلیوں میں وقت برباد کرتا رہا، مغل سلطنت جو تقریباً پورے برصغیر تک پھیل چکی تھی ایک عالم انتشار سے دوچار ہوگئی۔

سلطنت مغلیہ کے مرکز کی انتشاری کیفیت کے پیش نظر نظام الملک آصف جاہ، دہلی سے زیادہ اپنا وقت دکن میں گزارنے لگے تھے۔ انہوں نے بالکل صحیح طریقہ پر یہ سوچا کر دہلی میں سلطنت کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے اُن کی کوششیں بارآور نہ ہوسکیں گی اس لئے آصف جاہ نے اپنی پوری توجہ اپنے صوبہ دکن کی طرف مبذول کردی تاکہ کم از کم اس علاقے کو مرہٹوں کی دستبرد سے بچایا جاسکے۔ بالآخر نظام الملک آصف جاہ نے ۱۱۳۶ھ م ۱۷۲۴ء میں اپنے صوبہ دکن میں خود مختاری کا اعلان کردیا۔ یہاں یہ امر بطور خاص لائق ذکر ہے کہ اعلانِ خود مختاری کے باوجود نظام الملک آصف جاہ نے اپنے نام کے کوئی الگ سکے اجراء نہیں کئے بلکہ دکن میں بھی مغل حکمرانوں کے سکے ایک مُدت مدید تک رائج رہے تا آنکہ ۱۲۷۵ھ م ۱۸۵۷ء میں مغلیہ خاندان کا چراغ ہمیشہ کے لئے گُل ہوگیا۔

محمد شاہ کے عہد حکومت ہی میں ہندوستان پر نادر شاہ کے حملے کا سانحہ پیش آیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۷۳۷ء میں نادر شاہ نے دلّی دربار کے ایرانی گروپ کی دعوت پر فوج کشی کرکے پہلے تو قندھار اور کابل پر قبضہ کرلیا اور پھر پنجاب کا رُخ کرکے لاہور میں داخل ہوگیا۔ مغل فوجوں نے نادر شاہ کی پیش قدمی کو روکنے کی پوری کوشش کی لیکن کرنال کے قریب ایک گھمسان لڑائی میں انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ابھی صلح کی شرائط طے ہو ہی رہی تھیں کہ محمد شاہ نے نادر شاہ کے کیمپ پہونچ کر خود کو اس کے حوالے کردیا اور پھر دونوں فوجیں مصالحت کے بعد ۱۹ر مارچ ۱۷۳۸ء کو دہلی میں داخل ہوگئیں۔ دونوں فوجوں کے دہلی میں داخلے کے بعد فضا نہایت خوشگوار ہوگئی تھی مگر بدقسمتی سے دلّی کے کسی شہری یا سپاہی کی نادر شاہ کے ایک فوجی سے معمولی سی تکرار نے نادر شاہ کے غیض وغضب کو پھر سے للکارا اور اس نے قتل عام کا حکم

نادری صادر کردیا، جس کے نتیجے میں دلی کے کوچہ و بازار انسانی خون کے سیلاب کی زد میں آ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس المناک واقعے میں کم و بیش ایک لاکھ بیس ہزار افراد کی جانیں گئیں۔ شرائط صلح میں نادرشاہ نے کوہ نور، تخت طاؤس اور دیگر بیش قیمت اشیا کے علاوہ سلطنت مغلیہ کا وہ علاقہ بھی حاصل کرلیا جو دریائے سندھ کے مغرب میں واقع تھا۔

محمد شاہ کی زندگی کے آخری چند سال بڑی دل شکستگی کے عالم میں گزرے اور بالآخر ۱۱۶۱ھ م ۱۷۴۸ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ محمد شاہ کے سکوں پر بھی فارسی اشعار پائے جاتے ہیں اور حیرت ہے کہ ان اشعار میں بھی وہی تعلی نظر آتی ہے اور حکمران کو "بادشاہ زماں" اور سکوں کو "روشن تر از مہر و ماہ" بتلایا گیا ہے۔ محمد شاہ کے سکوں پر مندرجہ ایک شعر کو سی، جے براؤن نے صحیح طریقے پر نہیں پڑھا ہے[1] جو حسب ذیل ہے۔

سکہ زر زد ز فضل الہٰ
بادشاہ جہاں محمد شاہ

صحیح شعر یوں ہے

سکہ زد در جہاں ز فضل الہٰ
بادشاہ زماں محمد شاہ

محمد شاہ کے عہد ہی میں انقراض مملکت کا عملاً آغاز ہو چکا تھا۔ نظام الملک آصف جاہ اول نے ۱۷۲۴ء میں صوبہ دکن میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اور فرانسیسیوں نے دوست علی خاں صوبیدار ارکاٹ سے ۱۷۳۱ء میں سکے مضروب کرنے کی اجازت حاصل کرلی تھی اور اسی سال ماہ دسمبر سے پانڈیچری میں سکے مضروب کئے جانے لگے تھے[2]۔ انگلستان کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی نواب سعادت اللہ خاں صوبہ دار ارکاٹ سے ۱۷۴۲ء میں سکے مضروب

---

[1] کیٹلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی۔ جے براؤن جلد اول صفحہ ۳۲ شائع کردہ آر بسی ینیر لمیٹڈ ۱۹۸۶ء دہلی۔

[2] دی کیٹلاگ آف کوائنس اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ، جلد چہارم باب دوم صفحہ ۱۳۰، مرتبہ جے۔ آر۔ ہنڈرسن

کرنے کی اجازت لے لی تھی مگر ایسے سکوں کی اجرائی ۱۷۵۹ء سے عمل میں آئی۔[1] یہ عجیب بات ہے کہ اس طرح اجرا شدہ سکوں پر برائے نام ہی سہی مغل بادشاہ کے نام کا اندراج پایا جاتا ہے اور بعض صورتوں میں تو اُن پر وہی شعر درج ہے جو محمد شاہ کے عام سکوں پر نظر آتا ہے۔

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

احمد شاہ

احمد شاہ نے ۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۷ھ م ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء چھ سال تک حکومت کی۔ یہ دور بھی بڑا پُر آشوب رہا۔ جس میں دربار کے ایرانی اور ترک نژاد امراء کی باہمی آویزشیں، جاٹوں کی شورشیں اور روہیلوں کی باغیانہ سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ راجپوتانے میں سابق حکمرانوں کی رقابتیں اور دکن میں مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی طاقتیں مملکت کے انتشاری، ماحول میں آگ پر تیل کا کام کر رہی تھیں۔ ایسے میں افغانستان کے ایک اور مہم پسند حکمران احمد شاہ دُرّانی نے ۱۷۴۸ء میں لاہور پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ وقتی طور پر مغل فوجوں نے احمد شاہ دُرّانی کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ لیکن بعد میں احمد شاہ دُرّانی نے اپنی طاقت میں اضافہ کر کے پھر ہندوستان کا رُخ کیا اور اب اس کے آگے مغل افواج بے بس ہو گئیں۔ احمد شاہ درّانی کو اس کامیابی کے صلے میں لاہور اور ملتان کے علاقے مل گئے۔

اب حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ گجرات پر مرہٹوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ مالوہ اور راجپوتانے نے مرکز کو خراج دینا بند کر دیا تھا کیونکہ مالوے کا الحاق دکن سے ہو چکا تھا اور راجپوتانے میں پُرانے راجاؤں کے نام لیوا اپنی طاقتوں کو اکٹھا کر رہے تھے۔ آگرے کے جنوب میں جاٹوں کا زور تھا اور گنگ وجمن کے وسطی دوآبے میں فرخ آباد کے بنگش پٹھانوں کی للکار سنائی دے رہی تھی۔ اودھ اور الہ آباد ایک طرح سے وزرائے اودھ کی سلطنت بن چکے تھے۔ مشرقی صوبوں بہار، بنگال اور اڑیسہ میں اللہ وردی خاں کے خاندان کا زور تھا۔ مرکزی حکومت دہلی اور اس کے مضافات تک سمٹ کر رہ گئی تھی جہاں غازی الدین خاں کا طوطی بول رہا تھا جس نے اپنی دراز دستیوں کو کافی نہ سمجھ کر احمد شاہ کو تخت سے اُتار دیا۔

---

[1] دی کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد چہارم باب دوم صفحہ ۱۳۱ مرتبہ جے آر ہنڈرسن

احمد شاہ کے سکوں پر بھی فارسی شعر پایا جاتا ہے جس کو سی' جے' براؤن نے اس طرح غلط پڑھا ہے[۱]

سکہ زد بر زر بفضل الٰہ
شاہ عالم پناہ احمد شاہ

صحیح شعر اس طرح ہے۔

سکہ بر زر زدہ بفضل الٰہ
شاہ عالم پناہ احمد شاہ

عالم گیر ثانی

احمد شاہ کو تخت سے اُتارنے کے بعد غازی الدین خاں نے وزارت کا عہدہ خود سنبھال لیا اور جہاندار شاہ کے ایک پچپن سالہ بیٹے کو عالم گیر ثانی کے لقب سے ۱۱۶۷ھ م ۱۷۵۴ء میں تخت پر بٹھا دیا۔ عالم گیر ثانی بھی غازی الدین خاں کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی تھا۔ اکتوبر ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ دُرّانی نے پھر دہلی پر حملہ کیا' اور کثیر مالِ غنیمت لے کر واپس ہوگیا۔ نومبر ۱۷۵۹ء میں عالم گیر ثانی بھی غازی الدین خاں کے ہاتھوں قتل ہوا اور اس کا پانچ سالہ' تکلیف دہ' دورِ حکومت اِس اذیت ناک انجام پر اختتام کو پہونچا۔

عالم گیر ثانی کے سکوں پر بھی فارسی اشعار پائے جاتے ہیں جنھیں سی. جے براؤن نے یوں غلط پڑھا ہے[۲]

سکہ بر زر زد چوں صاحب قرانی
عزیز الدین عالم گیر ثانی
سکہ زر یافت رونق چو مہر منیر
از نام شاہ جہاں بادشاہ عالم گیر

---

[۱] کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی. جے. براؤن جلد اول' صفحہ ۳۳' شائع کردہ آر. سی. پبلیکیشنز ۱۹۸۶ء دہلی۔

[۲] " " " " " " " "

دونوں صحیح اشعار اس طرح ہیں

بزد زد سکۂ صاحب قرانی
عزیز الدین عالم گیر ثانی
بیافت رونق ازیں سکہ زر جو مہر منیر
زنام شاہ جہاں بادشاہ عالم گیر

شاہ جہاں ثالث، شاہ عالم ثانی

عالم گیر ثانی کے قتل کے بعد غازی الدین خاں نے ایک نئے شکار کی تلاش شروع کر دی چنانچہ اس نے ۱۷۵۹ء میں کام بخش کے ایک پوتے کو شاہ جہاں ثالث کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا۔ شاہ جہاں ثالث کا دورِ حکومت بھی مختصر رہا کیونکہ تخت کا حقیقی وارث عالم گیر ثانی کا بیٹا عالی گہر تھا، جس نے شاہ عالم ثانی کے لقب سے ۱۱۷۳ھ م ۱۷۵۹ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ امرائے سلطنت کی غالب اکثریت شاہ عالم کے ساتھ تھی۔ اور اس کی خوش نصیبی سے ہمسایہ ملک افغانستان کے طاقتور حکمران احمد شاہ دُرّانی نے ۱۷۶۱ء میں ہندوستان پر پھر حملہ کیا۔ اس زمانے میں دارالسلطنت دہلی میں مرہٹوں کا بڑا زور تھا۔ احمد شاہ دُرّانی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش دی اور غازی الدین خاں نیز اس کے کٹھ پتلی حکمران شاہ جہاں ثالث کو اقتدار سے بے دخل کر کے شاہ عالم ثانی کی حکومت کی بنیادیں وقتی طور پر ہی سہی مستحکم کر دیں۔

شاہ عالم ثانی کے سکوں پر بھی فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک شعر کو سی۔ جے براؤن نے اس طرح غلط پڑھا ہے[1]

سکہ زد صاحب قرانی زتائید الٰہ
حامی دیں محمد شاہ عالم بادشاہ

---

[1] کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشل میوزیم لکھنؤ۔ مرتبہ سی۔ جے براؤن۔ جلد اول صفحہ ۳۲
شائع کردہ آر۔ سی۔ سینیر لمیٹڈ دہلی ۱۹۸۶ء

صحیح شعر اس طرح ہے

سکہ صاحب قرانی زد ز تائید الٰہ

حامی دین محمد شاہ عالم بادشاہ

شاہ عالم کے دورِ حکومت میں ہندوستان میں اُبھرتی ہوئی ایک بیرونی طاقت یعنی برطانوی حکومت حصول اقتدار کی کوششوں میں لگی ہوئی تھی جن کا آغاز بنگال میں ہو چکا تھا۔ ابتداءً شاہ عالم ثانی تقاضائے وقت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ چنانچہ اس نے ۱۷۶۱ء میں بنگال پر حملہ کیا اور ناکام رہا۔ پھر ۱۷۶۴ء میں شاہ عالم نے شجاع الدولہ کی مدد لے کر بنگال پر دوبارہ حملہ کیا، جس کے نتیجے میں اس کو بکسر کے میدان میں شکست فاش ہوئی۔ اس ہزیمت کے دوسرے ہی دن شاہ عالم نے برطانوی کیمپ میں حاضری دی اور وہ دن دراصل سلطنت مغلیہ کے خاتمہ کا دن تھا۔ اس کے بعد سے سلطنت مغلیہ عملاً ایک قصۂ پارینہ بن گئی۔ پھر ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کو الٰہ آباد میں طے شدہ ایک معاہدے کی رُو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال 'بہار' اور اڑیسہ کی دیوانی اور اُن علاقوں کے مالیاتی نظم و نسق کا مختار بنا دیا گیا، جس کے معاوضے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ عالم ثانی کو اس کے اعزاز اور وقار کی بقا کے لئے ایک معقول سالیانہ دینے سے اتفاق کر لیا۔ بالفاظ دیگر شہنشاہ ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار بن گیا

بیدار بخت

شاہ عالم کے باقی دورِ حکومت میں کئی نشیب و فراز آتے رہے اور وقتاً فوقتاً اس کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے مدد ملتی رہی تا آنکہ ۱۷۸۸ء میں ایک اندوہناک واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ انہی دنوں غلام قادر روہیلہ نے قابو پا کر شاہ عالم ثانی کو بے رحمانہ طریقے سے اندھا کر دیا اور اس کی جگہ احمد شاہ کے بیٹے بیدار بخت کو کٹھ پتلی حکمران بنا دیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد مرہٹوں نے دہلی پر چڑھائی کر کے مجرموں سے انتقام لیا، اور مدعی سلطنت بیدار بخت کو بے دخل کر دیا۔

بیدار بخت کے سکوں پر مندرجہ فارسی شعر کو سی۔ جے۔ راجرس اور سی جے براؤن، دونوں نے اس طرح غلط پڑھا ہے۔ راجرس یوں پڑھتا ہے

بزر سکہ زد والی تاج و تخت
شاہ جہاں محمد بیدار بخت[1]

براؤن کی قرأت اس طرح ہے

سکہ زد بزر وارث تاج و تخت
شاہ جہاں محمد بیدار بخت[2]

مندرجہ بالا شعر صحیح طور پر اس طرح پڑھا جائے گا

بزر سکہ زد وارث تاج و تخت
محمد جہاں شاہ بیدار بخت

مرہٹوں نے مظلوم شاہ عالم ثانی کو کلیتہً اپنے قابو میں رکھا تا آنکہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے اس کو مرہٹوں کی قید سے اور حکومت کو اُن کی بالادستی سے نجات دلائی۔ بحیثیت مجموعی شاہ عالم ثانی نے وقت اور حالات سے صلح کر لی تھی جس کے نتیجہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے اس کے روابط خوشگوار ہی رہے۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اجرا کردہ سکوں پر شاہ عالم ثانی کا نام پایا جاتا ہے۔

اکبر شاہ ثانی

شاہ عالم ثانی نے ۱۲۲۱ھ م ۱۸۰۶ء میں وفات پائی اور اس کے بعد اُس کا بیٹا اکبر شاہ ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا اور ۱۲۵۳ھ م ۱۸۳۷ء تک برائے نام حکومت کرتا رہا۔ یہاں برائے نام کی اصطلاح یوں بھی صادق آتی ہے کہ دریں اثنا ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں اُن میں رائج سکوں پر اکبر شاہ ثانی کا نام بھی پایا جاتا ہے۔

---

[1] دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف انڈیا کیٹلاگ بائی چارلس جے. راجرس اینڈ پرنٹڈ بائی دی پنجاب گورنمنٹ مرتبہ سر جیمس لیال اینڈ ایچ سی فانشیو طبع کردہ منجانب حکومت پنجاب ۱۸۹۳ء تمہید صفحہ XVI

[2] کیٹلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی. جے براؤن جلد اول صفحہ ۳۲ شائع کردہ آر. سی سینٹر لمیٹڈ دہلی. ۱۹۸۶ء۔

اکبر شاہ ثانی کے سکوں پر بھی فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔ اکبر شاہ ثانی کے سکے پر مندرجہ ایک شعر کو مصنف گنج شائیگاں نے اس طرح غلط پڑھا ہے[1]

سکہ مبارک صاحبقران ثانی
محمد اکبر نسلِ چنگیز خانی

صحیح شعر یوں ہے

مبارک سکہ صاحبقرانی
محمد اکبرِ چنگیز ثانی

بہادر شاہ ظفر

اکبر شاہ ثانی کے بعد اس کا بیٹا سراج الدین بہادر شاہ ثانی کا لقب اختیار کرکے ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوا، بہادر شاہ ثانی بھی اپنے باپ اکبر شاہ ثانی اور داداشاہ عالم ثانی کی طرح انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا۔ اس کا دورِ حکومت بھی اپنے پیشرووں کی طرح کارہائے نمایاں سے خالی رہا، البتہ بہادر شاہ کے دربار میں اردو شاعری کا خوب چرچا تھا۔ امورِ سیاست یا کاروبارِ سلطنت سے دربار کا تعلق نہ ہونے کے برابر تھا اور انگریزوں کا اثر و نفوذ پورے ملک میں بڑھتا جا رہا تھا۔ ہندوؤں کے روشن خیال طبقے اور مسلمانوں کے علماء میں ایک طرح کی انگریز بیزاری اور وطن پرستی کی لہر پیدا ہو چکی تھی دیسی رؤساء بھی غیر مطمئن تھے لیکن انہیں اپنے اپنے علاقوں کے باغی عناصر کی سرکوبی کے لیے انگریزوں کی پشت پناہی درکار تھی۔ دکن سے وہ جو ایک مجاہد آزادی ٹیپو سلطان کے روپ میں اُٹھا تھا اس کو بھی انگریزوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے نصف صدی قبل زیر کر لیا تھا۔ تاہم ٹیپو سلطان کے نعرۂ آزادیٔ وطن کی گونج ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکی تھی۔ انگریزوں کے پاس "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا جو ایک حربہ تھا اب انہوں نے اپنے خلاف اُٹھتی ہوئی بیزاری کی لہروں کو دبانے کے لیے اسی حربے سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ان کی یہ چال کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی اور دلوں کے سینوں میں بیرونی انگریز طاقت کے خلاف ایک جوالا مکھی پک رہا تھا، دہلی کا دربار خاموش اور

---

[1] گنج شائیگاں مولفہ محمد رفیع موہانی عالی۔ مطبوعہ مُراد آباد ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۷

بے بس تھا، لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے دانشور، دیسی ریاستوں کے وطن دوست عناصر نیز خود برطانوی افواج کے دلیر اور وطن کا درد رکھنے والے سورما اندر ہی اندر ایسی تجویزوں میں لگے ہوئے تھے جن پر عمل کر کے آزادی وطن کا مقصد حاصل ہو سکتا۔

بالآخر یہ آتش فشاں ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو پھٹ پڑا۔ دہلی مجاہدین آزادی کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ آزادی کے متوالے فوجیوں کی قیادت جنرل بخت خاں کر رہا تھا۔ تحریک آزادی کے علمبرداروں کو بہر حال ایک ایسے مرکز کی ضرورت تھی جس کے گرد جمع ہو کر وہ اپنی جد وجہد کو منظم کر سکتے۔ ایسا مرکز انہیں بہادر شاہ کی ذات میں نظر آیا، جس کے گرد بلا تفریق مذہب وملت ہندو اور مسلمان جمع ہو گئے۔ بعض دیسی رؤسا کی دلی ہمدردیاں بھی اُن کے ساتھ تھیں، مگر وہ کھُل کر میدان میں اُتر نہ سکتے تھے۔ انگریزوں کے قدم ڈگمگا نے لگے۔ دہلی کا ریجنٹ مارا گیا، اور ہر طرف انگریزوں کے خلاف نفرت کا طوفان اُمڈتا نظر آتا تھا۔ اس موقع پر بھی انگریزوں نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اپنے پرانے حربے سے کام لیا اور نتیجتاً چار ماہ سے چل رہی سرفروشوں کی یہ تحریک ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دم توڑ گئی۔

جد وجہد آزادی کے دوران مجاہدین نے بہادر شاہ کے نام سے مخصوص اشرفیاں مضروب کروائی تھیں[۱]۔ جن پر مندرجہ ذیل شعر درج تھا۔

بزر زد سکۂ نصرت طرازی
سراج الدین بہادر شاہ غازی

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ شعر مرزا غالب نے کہا تھا اور اس خیال کی تائید خود اُن کے خط بنام یوسف مرزا سے ہوتی ہے[۲]۔ مقام حیرت ہے کہ مرزا غالب نے اس شعر سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا اور مکتوب مذکور میں یہ لکھا کہ

---

[۱] چراغ دہلی مصنفہ مرزا حیرت دہلوی، مطبوعہ کرزن پریس دہلی، دسمبر ۱۹۰۲ء ص ۳۳۲ پر اردو ترجمہ درج ہے

[۲] اُردوئے معلیٰ مصنفہ مرزا غالب مطبع اُردو گائیڈ کلکتہ ۱۸۸۳ء صفحہ ۳

"بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے
نوکر شاعر، خدا جانے سکہ کس نے کہا۔ اخبار نویس
نے میرا نام لکھ دیا۔[۱]

لیکن جدوجہد آزادی کے ناکام ہو جانے کے بعد جب انگریزوں نے اپنے مخالفین اور بہادر شاہ کے مؤیدین کے خلاف تحقیقات کا آغاز کیا تو مرزا غالب سے بھی باز پُرس ہوئی اور دارالضرب سے مرزا غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ شعر مجسٹریٹ نے اُن کے سامنے رکھدیا۔ اب مرزا کے لئے کوئی گنجایش باقی نہ رہی اور "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" والی کیفیت پیدا ہوگئی مرزا نے نہایت معصومانہ انداز میں یہ اعتراف کیا کہ

"میں نے سکہ کہا تو اپنی جان اور حُرمت بچانے کو کہا۔"[۲]

بہادر شاہ ظفر کے سکّوں پر فارسی اشعار کے علاوہ مندرجہ ذیل اُردو اشعار بھی پائے گئے ہیں۔[۳]

چلے نہ اشرفی آفتاب عالم میں
خطِ شعاع سے اوس پر جو یہ نہ ہو تحریر
ابوظفر شہ والا گہر بہادر شاہ
سراج دین نبی سایۂ خدائے قدیر
جہاں مسخّر و عالم مطیع و خلق مطاع
فلک مؤیّد و اختر معین و بخت نصیر

---

[۱] ماہنامہ "شاعر" غالب نمبر، مضمون غالب کی کہانی از ڈاکٹر ظ۔ انصاری صفحہ ۵۹
[۲]۔ اُردوئے معلیٰ مصنفہ مرزا غالب مطبوعہ اُردو گائیڈ کلکتہ ۱۸۸۳ء صفحہ ۳۷۵
[۳] گنج شائگاں مصنفہ محمد رفیع موہانی عالی، مطبوعہ مُراد آباد ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۸

ان اشعار کے بارے میں وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس کا نتیجۂ فکر ہیں۔ لیکن اِن اشعار کے پس منظر میں جو انداز نظر جھلک رہا ہے وہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ان کا خالق بھی مرزا غالب کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ تحریک آزادی کی ناکامی کے ساتھ وہ شمع ہمیشہ کے لئے گُل ہوگئی جس کو ظہیر الدین بابر نے روشن کیا تھا۔ اور جس کی لَو کو تیز کرنے میں ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب عالم گیر نے اپنی بے پناہ صلاحیتیں صرف کردی تھیں۔

••

سلطنت خداداد میسور کے سِکّوں پر فارسی اشعار

سلطنت خداداد میسور کے بانی حیدر علی کے اقتدار پر آنے سے قبل ریاستِ میسور کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ میسور کے ہندو راجا بظاہر دہلی کے مغل حکمرانوں کی نیابت کا دَم بھرتے تھے لیکن آخری دور میں وہ مختلف سمتوں سے دباؤ کا شکار ہو چکے تھے۔ کبھی نظام دکن میسور پر چڑھائی کرتے تو کبھی پونا کے مرہٹے پیشوا اپنی فوجیں میسور کی طرف بڑھاتے۔ اسی زمانے میں حیدر علی ایک اونچے اوسط درجے کے مُسلم گھرانے میں ریاست میسور کے ضلع کولار کے ایک گاؤں بودی کوٹہ میں ۱۱۳۴ھ م ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوا۔[1] اس زمانے میں حیدر علی کا باپ شیخ فتح محمد ریاست میسور کے علاقہ سُرا کے گورنر عابد خاں کے ماتحت منصب دو ہزاری پر فائز تھا۔

اُس دَور کی درباری سازشوں کے نتیجے میں حیدر علی کا باپ فتح محمد مارا گیا۔ اس وقت حیدر علی کی عمر پانچ سال تھی اور اُس کا خاندان آرام و آسایش کی زندگی سے محروم ہو کر عُسرت و پریشانی سے دوچار تھا لیکن اُسی دَور میں حیدر علی کے ایک ننھیالی عزیز حیدر صاحب نے جو خود میسور کے راجا کی ملازمت میں تھا اس خاندان کی کفالت اپنے ذمّے لے لی اور انہیں سرنگاپٹم بُلوا لیا۔ سرنگاپٹم میں حیدر علی اور اس کے بھائی کی پرورش اور تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ یہ بچے فنون سپہ گری، تیغ زنی، کمند افگنی، اسپ رانی اور تفنگ اندازی میں ایسے مشّاق ہو گئے کہ نامور سپاہیوں کی نگاہیں بھی ان پر پڑنے لگیں اور بالآخر اُن کے سِنّ شعور تک پہونچتے پہونچتے اُن کے مُربّی حیدر صاحب نے میسور کے وزیر نندراج کے پاس انہیں لے جا کر فوج کے ابتدائی عہدوں پر فائز کروا دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب حیدر علی کی اعلیٰ صلاحیتوں کے جوہر نمایاں ہونے لگے تھے یہاں تک

---

[1] تاریخ سلطنت خداداد میسور مصنفہ محمود خاں محمود بنگلوری شایع کردہ ہمالیہ بُک، باڑہ دہلی ۱۹۹۱ء صفحہ ۵۰

کر وہ درجہ بدرجہ ترقی کر کے علاقۂ ڈنڈی گل کا گورنر مقرر ہو گیا۔ اسی زمانے میں میسور کے اطراف ارکاٹ و ترچناپلی میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کے درمیان اپنا اپنا اثر و رسوخ پھیلانے کی کشمکش جاری تھی اور ادھر نظام دکن اور مرہٹے بھی اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کرناٹک پر اپنا تسلط قائم کر لیں۔ ارکاٹ کے چندا صاحب کی حمایت صلابت جنگ اور فرانسیسی کر رہے تھے اور ترچناپلی کے والاجاہ محمد علی نے میسور کے وزیر نندراج اور انگریزوں سے امداد طلب کی تھی۔ نندراج نے افواجِ میسور کو ساتھ لے کر ترچناپلی کی طرف پیش قدمی کی۔ اُس وقت حیدر علی نندراج کا دستِ راست تھا۔ ان معرکوں میں حیدر علی نے اپنی جوانمردی کے وہ جوہر دکھائے کہ چندا صاحب اور فرانسیسی عاجز آگئے تھے۔ فرانسیسیوں کی متعدد توپوں پر بھی حیدر علی نے قبضہ کر لیا تھا لیکن نظام الملک کی فوجوں کا پلہ بھاری تھا چنانچہ انہوں نے سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا اور بالآخر ایک معقول زرِ تاوان لے کر واپس ہوئیں۔ ابھی نظام دکن کی فوجیں واپس ہو ہی رہی تھیں کہ پونا کے پیشوا بالاجی باجی راؤ نے خراج وصول کرنے کے لیے اپنا لشکر میسور کی طرف بڑھا دیا۔ یہاں خزانے میں رکھا ہی کیا تھا۔ بہر حال راجہ نے مرہٹوں کو ایک کروڑ روپیہ ادا کرنے کا اقرار کیا اور بطور ضمانت ملک کا بہت بڑا حصہ ان کی کفالت میں دے دیا۔ چنانچہ مرہٹوں نے اپنی طرف سے بلونت راؤ کو اس علاقے کا صوبہ دار مقرر کر دیا اور اب میسور کے راجہ کی حکومت صرف سرنگاپٹم اور اس کے مضافات تک محدود ہو کر رہ گئی۔[۱]

حیدر علی کی قسمت نے پھر یاوری کی۔ مرہٹے ابھی میسور کے مکفولہ علاقوں پر اپنا تسلط جما ہی رہے تھے کہ پانی پت کا وہ عظیم سانحہ پیش آیا جس نے مرہٹوں کو ایسی ٹھیس پہنچائی کہ وہ پھر سنبھل نہ سکے۔ یہ احمد شاہ درانی کا ہندوستان پر آخری حملہ تھا۔ اب مرہٹے میسور کے علاقوں میں اپنے قدم جمانے کے موقف میں نہ رہے تھے۔ حیدر علی کو اُس کی نمایاں خدمات کے صلے میں میسور کی فوجوں کا سپہ سالار بنا دیا گیا تھا۔ مرہٹوں پر اس نئی اُفتاد کے بعد تو حیدر علی کے لئے میدان صاف تھا اور اُس نے بغیر کسی خاص مزاحمت کے اُن تمام علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا جو مرہٹوں کے زیرِ کفالت آچکے تھے۔[۲]

---

[۱] تاریخ سلطنت خداداد میسور مصنفہ محمود خاں محمود بنگلوری شائع کردہ ہمالیہ بک ہاؤس۔ دہلی ۱۹۴۰ء صفحہ ۵۳
[۲] ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ۵۷

اس زمانے میں میسور کے راجہ کے خاندان اور وزیر نندراج کے درمیان اختلافات رونما ہونے لگے تھے۔ جن میں آہستہ آہستہ بڑی شدّت پیدا ہوگئی۔ راجہ، رانیاں اور خاندان کے دیگر افراد خود کو نندراج کے مقابلے میں بے بس محسوس کرنے لگے تھے حتیٰ کہ کھنڈے راؤ کے توسط سے حیدرعلی سے خواہش کی کہ راجہ کو نندراج سے نجات دلائی جائے۔ حیدرعلی کو اس کام میں کسی دشواری کا سامنا کرنا نہ پڑا۔ اس نے بآسانی اپنی مخصوص حکمت عملی کے ذریعے نندراج اور اس کے بھائی سے اسنادِ وزارت لے کر راجہ کے حوالے کر دیں۔ نندراج اپنی جاگیر کو چلا گیا اور راجہ کی گھٹن دور ہوگئی۔ اس واقعہ سے حیدرعلی کے وقار میں مزید اضافہ ہوا۔

دراصل حیدرعلی اب اپنے عروج کی آخری منزلوں کی راہ پر گام زن تھا۔ اسی اثنا میں دلی کے حکمران شاہ عالم ثانی کا سفیر حیدرعلی کے نام صوبہ داری سرا کا فرمان[1] لے کر آیا جس کے ساتھ بادشاہ نے حیدرعلی کو شمشیر مرصّع، سپر، پالکی، ماہی مراتب اور نقارہ و نشان مع خطاب نواب سے سرفراز کیا تھا۔ چونکہ انتظام مملکت میں راجہ کی مداخلت کی وجہ سے بعض اوقات پیچیدگیاں پیدا ہو رہی تھیں اور سازشیوں کو اپنے جال بچھانے کا موقع فراہم ہو رہا تھا اس لیے حیدرعلی نے چند بیش بہا تحایف کے ساتھ راجہ سے باریابی کی اجازت چاہی اور نذر گزراننے کے بعد تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے راجہ سے گزارش کی کہ ریاست کا نظم و نسق خود اُس (حیدرعلی) کو تفویض کر دے اور اس طرح راجہ کے ذاتی مصارف کے لیے تین لاکھ کی جاگیر مختص کر کے حیدرعلی نے عنانِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنے آزاد حکمران ہونے کا اعلان[2] کر دیا۔ یہ تھا حیدرعلی کے ارتقاء و عروج کا ایک اجمالی خاکہ اور سلطنت خداداد میسور کے قیام کا پس منظر۔

جہاں تک مسکوکات کا تعلق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیدرعلی ان کی اجرائی کے سلسلے میں کسی جدت طرازی کی طرف مائل نہ تھا۔ اس کے اجرا کردہ چند اقسام کے تانبے کے سکّے[3] تو اس کے پیش رو ہندو راجاؤں کے سکّوں کے نمونہ پر ہی تھے۔ حیدرعلی کے سونے کے سکّوں پر بھی ضلع شموگہ (میسور) کے علاقہ اکیری کے نائکوں اور وجیانگر کے ہندو راجاؤں کے سکوں کے اثرات غالب ہیں البتہ ان سکّوں پر

---

[1] تاریخ سلطنت خداداد میسور مصنفہ محمود خاں محمود بنگلوری شائع کردہ ہمالیہ بک ہاؤس دہلی سنہ ۱۹۸۰ء صفحہ ۶۰
[2] ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ۶۲

حیدر علی نے اپنے نام کا پہلا حرف (ح) نمایاں طور پر درج کروایا تھا۔ اب تک حیدر علی کا ایسا کوئی سکہ نہیں ملا ہے جس پر فارسی شعر کا اندراج ہو۔

حیدر علی کی وفات کے بعد ۲۰ محرم ۱۱۹۶ھ م ۱۷۸۲ء کو فتح علی خاں المعروف بہ ٹیپو سلطان اپنے باپ کے جانشین کی حیثیت سے تخت پر بیٹھا۔ حیدر علی اگرچہ خود اَن پڑھ تھا لیکن اس نے اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ چنانچہ ٹیپو سلطان اس وقت کے علوم متداولہ میں کامل دستگاہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فرانسیسی فوجی افسروں سے اعلیٰ تربیت بھی حاصل کر چکا تھا جو اُس کے متعدد معرکہ آرائیوں بالخصوص انگریزوں کے ساتھ اس کے محاربات میں بہت کام آئی حیدر علی کے آخری ایام میں انگریزوں سے میسور کی افواج برسرِ پیکار تھیں اور یہ سلسلہ ٹیپو کی تخت نشینی کے بعد بھی جاری رہا۔ انگریزی فوج اسٹیوارٹ اور جنرل لانگ کے ماتحت وانڈی واش میں پڑاؤ ڈالے ہوئی تھی۔ ٹیپو سلطان نے ایک دوسرا راستہ اختیار کر کے انگریزوں کو جالیا۔ اس مہم میں دو ہزار فرانسیسی سپاہی بھی سلطان کے لشکر میں تھے۔ لیکن یہ مہم بغیر کسی مقابلے کے اس وجہ سے سَر ہوگئی کہ ٹیپو سلطان کی آمد کی اطلاع پر مدراس کے گورنر نے انگریزی فوجوں کو فوراً واپس ہو جانے کا حکم بھجوایا۔ انگریزی فوجوں کی اس پسپائی کے بعد ٹیپو سلطان کو کچھ اندرونی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا جن کے منجملہ ایک سازش ایسی تھی کہ سرنگاپٹم کے قلعہ دار کو اپنے جال میں پھانس کر حرم سرائے سلطانی کو مقید کر کے دارالسلطنت پر قبضہ کر لیا جائے لیکن سلطان کی ذہانت اور دانائی نے اس سازش کو ناکام بنا دیا اور سازشیوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا گیا اور قلعہ اور محل سرائے کے انتظامات میں تبدیلی کر دی گئی۔ قلعہ کی کمان اسد خاں رسالدار کو دی گئی اور سید محمد خاں مہدوی کو سرنگاپٹم کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اسی اثنا میں انگریزی افواج پیش قدمی کر کے حیدر نگر پر قابض ہو چکی تھیں۔ ٹیپو سلطان نے محمد علی کمندان کی فوج کے سلطانی لشکر سے آملنے کے بعد حیدر نگر کا رُخ کیا اور اٹھارہ دن کی سخت معرکہ آرائی کے بعد انگریزوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ بالآخر انگریزوں نے قلعۂ حیدر نگر سلطان کے حوالے کر دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ٹیپو سلطان کی نظر میں دو باتیں بڑی اہمیت کی حامل تھیں ایک تو اپنے حدودِ مملکت میں توسیع اور ان کا استحکام دوسری اہم بات انگریزوں کی ابھرتی ہوئی استعماری طاقت کا سدّباب بلکہ اس کا استیصال تھی۔ ٹیپو سلطان کی دُور رس نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ انگریزی فتنہ

ایسٹ انڈیا کمپنی کی نقاب اوڑھے آہستہ آہستہ ہندوستان کی آزادی کو گھُن کی طرح کھاتا چلا جارہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب کہ سارا ملک برطانوی غلامی کے طوق و سلاسل میں جکڑ جائے گا۔ جہاں تک حدود مملکت میں توسیع اور اُن کے استحکام کا تعلق ہے ٹیپو سلطان کی کوششیں کبھی بار آور ہوتیں اور کبھی اُسے ناکامی کا موں‌ہہ دیکھنا پڑتا جس میں کبھی انگریزوں کی ریشہ دوانیاں کارفرما ہوتیں تو کبھی اُن کی کھُلم کھُلا فوجی مداخلت اس کی راہ میں رکاوٹ بنتی۔ ٹیپو سلطان نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ تنہا انگریزوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے موقف میں نہیں ہے اس لئے اس نے مرہٹوں سے بار بار اتحاد کی درخواست کی اور حیدر آباد کے حکمران نظام علی خاں کی طرف بھی کئی بار دوستی کا ہاتھ بڑھایا لیکن ہر طرف سے اُسے مایوسی ہوئی۔ اپنے عہد کی عالمی بساطِ سیاست پر بھی ٹیپو سلطان کی نظر بہت گہری تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ یوروپ میں نپولین بوناپارٹ کی اُبھرتی ہوئی طاقت کے آگے وہاں کی بڑی بڑی سلطنتیں لرزہ براندام ہو رہی تھیں۔ چنانچہ ٹیپو سُلطان نے فاتح اعظم نپولین کو ایک مکتوب بھی روانہ کیا تھا جس میں اُسے ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی۔ نپولین نے ٹیپو سلطان کے مکتوب کا امید افزا جواب دیا تھا جس میں اس نے انگریزوں کے خلاف ٹیپو کی کامیابی کے لئے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔[۱]

ٹیپو سُلطان نے انگریزوں کے استیصال کی کوششوں کے دوران بیرونِ ہند کی معاصر اسلامی طاقتوں سے بھی ربط پیدا کیا تھا اور افغانستان، ایران نیز ترکی کو اپنی سفارتیں روانہ کی تھیں ٹیپو سلطان کا منشا یہ تھا کہ ان ممالک کے آگے انگریزوں کے مقاصدِ اصلی کا پردہ فاش کر کے یہ بتلایا جائے کہ وہ ہندوستان پر اپنی مستقل حکومت قائم کرنے کے لئے بلادِ اسلامیہ کے سواحل پر نظریں جمائے ہوئے ہیں اور وہ ایک نہ ایک دن عراق، ایران اور عرب کے ساحلی شہروں پر اپنا قبضہ جمالیں گے انگریزوں کو اس جسارت سے باز رکھنے کے لئے ٹیپو سلطان نے اپنے لائحۂ عمل کا ایک خاکہ تیار کر لیا تھا اور اس پر عمل پیرائی کے لئے اس نے سب سے پہلے اپنے سفیر غلام علی کی سرکردگی میں ایک وفد سلیم سوم سلطان روم (ترکی) کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ ٹیپو سلطان نے اپنے سفیر کے ذریعہ جو

---

[۱] نپولین کا یہ خط اکتوبر ۱۹۹۰ء کے پہلے ہفتہ میں لندن میں منعقدہ ٹیپو سُلطان پر ایک شاندار نمائش میں پیش کیا گیا تھا۔ بحوالہ بی بی سی۔

مکتوب سلطان روم کے پاس بھیجا تھا اس میں منجملہ اور باتوں کے اِن اُمور پر زور دیا گیا تھا کہ بندرگاہ بصرہ سلطنت خداداد کو اجارہ پر دی جائے تاکہ سلطنت خداداد کے بحری جہاز اس کو استعمال کر سکیں۔ اس رعایت کے معاوضہ میں ٹیپو سلطان نے سلطنت عثمانی (ترکی) کے جہازوں کے استعمال کے لئے اپنی کسی بھی بندرگاہ کی پیش کش کی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح ترکی اور ہندوستان کی بحری طاقتیں اس علاقہ میں ایک نئی قوت بن کر اُبھریں اور مغربی دول کو کوس لمن الملک بجانے کا موقع نہ مل سکے تاکہ بلاد اسلامیہ کے سواحل اُن کی دست بُرد سے محفوظ رہیں۔ ٹیپو سلطان نے سلطان سلیم کی توجہ اس امر کی طرف بھی مبذول کروائی تھی کہ سلطنت خداداد میں بندوقوں اور توپوں کی تیاری کا کام بھی شروع ہو چکا ہے اور مملکت عثمانی میں اس صنعت کو فروغ دینے کے لئے وہ ماہرین کو اپنے پاس سے ترکی بھیجنے آمادہ ہے[1]۔ یہ امر لائق افسوس ہے کہ رومی دربار میں ٹیپو سلطان کی اِن تجاویز کو تھی اَن سُنی کر دیا گیا۔ اس دور میں عثمانی ترکوں کی حالت کم وبیش ویسی ہی ہوگئی تھی جیسی کہ بابر اور اکبر کے جانشینوں محمد شاہ اور احمد شاہ کی دلی میں تھی' اسی لئے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ ان سنجیدہ تجاویز پر غور کر کے وہ کسی صحیح فیصلے تک پہونچ سکتے پھر ٹیپو سلطان نے ایران کے حکمران کریم خاں زند سے ربط پیدا کیا مگر بدقسمتی سے ایران اُن دنوں' شیعہ سُنی اختلافات کا شکار تھا اور افراتفری کے اس عالم میں ٹیپو سلطان کو مایوسی کا مونھہ دیکھنا پڑا اپنی کوشش کے آخری مرحلے کے طور پر اب ٹیپو سلطان کی نگاہیں افغانستان کی طرف اٹھیں اور اس نے زماں شاہ حاکم افغانستان کی خدمت میں اپنے سفیر بھیجے لیکن وہاں بھی انگریزوں کی سازشوں نے رنگ لایا۔ جن کے نتیجے میں افغانستان اور ایران کی آویزش شروع ہوگئی اور ٹیپو سلطان کی مقصد برآری نہ ہو سکی۔

ہندوستان میں انگریز اپنی ہمہ جہتی صلاحیتوں کی وجہ سے فرانسیسیوں اور پرتگیزیوں پر غالب آتے جا رہے تھے۔ ادھر شمال مشرقی ہندوستان میں اپنے دائرہ اثر کو وسیع سے وسیع تر کر کے صوبہ بنگال سے آگے بڑھ کر دہلی کی طرف پیش قدمی کا منصوبہ بنا رہے تھے اور اِدھر دکن اور جنوبی ہندوستان میں اپنی مخصوص حکمت عملی کے ذریعہ نظام دکن اور مرہٹوں کو ساتھ لے کر اپنے حقیقی دشمن

---

[1] تاریخ سلطنت خداداد میسور مصنفہ محمود خاں محمود بنگلوری شائع کردہ ہمالیہ بک ہاؤز دہلی ۱۹۸۰ء صفحہ ۵۳۳

ٹیپو سلطان کو نیچا دکھانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ انگریزوں کی نظر میں ٹیپو سلطان ہی ہندوستان میں اُن کے لئے سب سے بڑا چیلنج تھا۔ ٹیپو سلطان اپنے جوش حُب الوطنی میں سرشار انگریزوں کے قلع قمع کی تجویزیں سوچ رہا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ٹیپو سلطان کی تمام مساعی رائیگاں گیئں، مملکت خداداد میسور کی اندرونی سازشیں انگریزوں کی سرپرستی میں آہستہ آہستہ اپنا رنگ جمانے لگیں اور پھر ان کی فوجوں سے ٹیپو سلطان کی فوجوں کی راست معرکہ آرائیاں شروع ہوگیئں۔ اور بالآخر آزادئ وطن کے اس متوالے نے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو اپنی آخری سانس تک بذاتِ خود انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جام اجل نوش کرلیا۔ اس طرح انگریزوں کے عزائم کی تکمیل کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ دور ہوگئی۔

ٹیپو سلطان نے اپنے سکوں کی اجرائی کے سلسلہ میں اپنی جدت طبع کا غیر معمولی مظاہرہ کیا ہے۔ ٹیپو سلطان کے سکوں پر فارسی اشعار کا اندراج تو ہے ہی علاوہ ازیں سکوں پر سنین کے اندراج کا بھی اس نے ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ ٹیپو سلطان کا خیال تھا کہ جب فارسی رسم الخط کا رُخ دائیں جانب سے بائیں جانب کی طرف ہے تو پھر اعداد کے لکھنے میں فارسی رسم الخط کے برخلاف بائیں جانب سے دائیں جانب کا رُخ کیوں اختیار کیا جائے۔ چنانچہ ٹیپو سلطان نے سنین کے اعداد کو بائیں جانب سے دائیں جانب کو لکھنے کے مروجہ طریقے کے برخلاف اپنے سکوں پر سنین کے اعداد کو دائیں جانب سے بائیں جانب کو لکھنے کا فرمان صادر کیا جیسا کہ اس کے سکوں سے ظاہر ہے۔ مثال کے طور پر ٹیپو سلطان کے ایک تانبے کے سکے پر سنہ ۱۲۲۴ کو سنہ ۴۲۲۱ لکھا گیا ہے[1]۔

ٹیپو سلطان کے ابتدائی سکوں پر سنہ ہجری کا اندراج پایا جاتا ہے لیکن بعد میں ٹیپو سلطان نے اپنی رائے بدل دی اور اپنے سکوں کے لئے اس نے ایک نیا سنہ مولودی اختیار کیا۔ اس سنہ کا حساب پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم کی ولادت باسعادت کی تاریخ سے لگایا گیا تھا۔ ٹیپو سلطان کی رائے میں آنحضرت صلعم کا میلاد مبارک واقعہ ہجرت سے زیادہ اہم اور عہد آفریں تھا چنانچہ ٹیپو سلطان کے

---

[1] کیٹیلاگ آف کوائنس ان دی انڈین میوزیم کلکتہ، جلد چہارم باب دوم، مرتبہ جے آر ہینڈرسن صفحہ ۱۰۵ و ۱۰۵ سکہ نمبر ۵ شائع کردہ انڈولاجیکل بک کارپوریشن نئی دہلی ۱۹۷۶ء

سکوں پر جابجا سنہ مولودی کی صراحت پائی جاتی ہے۔ ٹیپو سلطان کی جدّت طبع کی ایک اور شہادت اس امر سے ملتی ہے کہ اس نے اپنے سونے چاندی اور تانبے کے سکوں کے نہ صرف جداگانہ نام رکھے تھے بلکہ اِن ناموں کو متعلقہ سکوں پر درج بھی کردیا تھا۔ اگرچہ یہ بات ہمیں کسی حد تک اکبر کے سکوں اور بڑی حد تک جہانگیر کے سکوں میں نظر آتی ہے لیکن اکبر اور جہانگیر نے اپنے سکوں کو جو نام دیئے تھے وہ اُن کے سکوں پر کہیں نظر نہیں آتے۔ اس کے بالمقابل ٹیپو سلطان کی اشرفیوں پر "احمدی" اور "محمدی" نصف اشرفی پر "صدیقی" اور "فاروقی" درج ہے۔ ٹیپو سلطان کے چاندی کے دو تولے کے سکوں پر "حیدری" ایک تولے کے سکّے پر "امامی" نصف روپے پر "عابدی" اور چوتھائی روپے پر "باقری"، دوانی پر "جعفری" اور اکنّی پر "کاظمی" نیز نیم آنہ پر "خضری" کا اندراج پایا جاتا ہے۔ اور ٹیپو سلطان کے بڑے پیسے پر "عثمانی" درج ہے۔ بعد میں تانبے کے سکوں کے نام تبدیل کرکے بڑے پیسے کو "مشتری" اور عام پیسے کو "زہرہ" نصف پیسے کو "بہرام" چوتھائی پیسے کو "اختر" اور پیسے کے آٹھویں حصے کو "قطب" سے موسوم کیا گیا تھا۔ سکّہ جات کی اجرائی کے تعلق سے ٹیپو سلطان نے جس جدّت طرازی کا ثبوت دیا ہے، وہ اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے مگر اس کی زندگی جس پُرآشوب انداز سے گزری ہے اس کا اثر اس کے سکوں پر مندرجہ اشعار کی قلّت سے ملتا ہے۔ ٹیپو سلطان کو یہ مہلت ہی نہ ملی کہ وہ اپنے مسکوکات کو گوناگوں اشعار سے زینت بخشتا اور شہنشاہ جہانگیر کے بعد ہندوستان کے حکمرانوں میں ایک اور ممتاز نظیر قائم کرتا۔ بہرحال ہم نے ٹیپو سلطان کے سکوں پر جو بھی شعر درج ہیں انہیں شاملِ کتاب کرلیا ہے۔

••

نوّابان اودھ کے سکّوں پر فارسی اشعار

تاریخ شاہد ہے کہ نوّابان اودھ کا جدّ امجد محمد امین المعروف بہ سعادت خاں ایک ایرانی نژاد مہم پسند تھا۔ اس نے دہلی میں محمد شاہ کے دربار میں رسائی حاصل کرلی اور رفتہ رفتہ وزارت کے عہدہ پر فائز ہوگیا ۱۷۲۰ء میں سیّد برادران کے زوال کے بعد سعادت خاں نے خود کو صوبہ اودھ میں عملاً خود مختار بنالیا تھا۔ اس صوبہ میں اضلاع غازی پور، بنارس اور گورکھپور شامل تھے۔ سعادت خاں کے بعد اس کا داماد صفدر جنگ ۱۷۳۹ء میں وزارت کے عہدہ سے سرفراز ہوا۔ اس خاندان کا تیسرا وزیر شجاع الدولہ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۷۵ء) تھا اس کے عہد میں اضلاع الہ آباد، کورا نیز روہیلکھنڈ کے علاقے کا صوبہ اودھ میں انضمام عمل میں آیا۔ شجاع الدولہ اور اس کے بیٹے آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) کے زمانہ میں اس خاندان کے ایسٹ انڈیا کمپنی سے گہرے روابط قائم ہوچکے تھے۔ آصف الدولہ نے وزارت اودھ کا عہدہ سنبھالنے کے کچھ ہی دنوں بعد اضلاع غازی پور اور بنارس ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کردیئے اور اپنا مستقر فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کردیا۔ آصف الدولہ کے جانشین سعادت علی خاں (۱۷۹۸ء تا ۱۸۱۴ء) نے ۱۸۰۱ء میں روہیلکھنڈ کے علاقے کے علاوہ اضلاع گورکھپور، الہ آباد اور کورا بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تحویل میں دیدیئے۔ سعادت علی خاں کے بعد غازی الدین حیدر اس کا جانشین ہوا۔ غازی الدین حیدر نے ۱۸۱۴ء سے ۱۸۱۹ء تک خود کو سلطنت مغلیہ کا وزیر ہی کہلانا پسند کیا۔ دراصل ۱۸۱۸ء کے اواخر میں لارڈ ہیسٹنگز نے غازی الدین حیدر کو اس بات پر اکسانا شروع کردیا تھا کہ وہ نام نہاد سلطنت مغلیہ کا قلادہ بھی اپنی گردن سے اُتار پھینکے۔ غازی الدین حیدر نے پہلے تو کچھ تامّل کیا لیکن بعد میں ۹ر اکتوبر ۱۸۱۹ء کو اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔ یہ تھا وہ پس منظر جس سے ہندوستان کی مریضانہ ملکی سیاست کے نقشے پر ایک نئی کٹھ پتلی حکومت اُبھری۔

اس عہد تک اس خاندان کے سربراہ نواب وزیر اودھ کہلاتے تھے مگر اعلان آزادی کے بعد وہ اودھ کے حکمران کہلائے جانے لگے۔ غازی الدین حیدر کے اعلان خود مختاری تک اودھ میں

مغل بادشاہوں کے سِکّے رائج رہے لیکن اعلانِ خودمختاری کے بعد اودھ کے حکمران اپنے الگ سِکّے مضروب کروانے لگے۔ اِن سِکّوں پر فارسی اشعار پائے جاتے ہیں اور بعض اشعار سے اس خاندان کے شیعی مسلک کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ غازی الدین حیدر نے ۱۸۱۹ء کے اعلانِ خودمختاری کے بعد ۱۸۲۷ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد نصیرالدین حیدر اُس کا جانشین ہوا جس کا دورِ حکومت ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک رہا۔ نصیرالدین حیدر کے سِکّوں پر بھی فارسی اشعار کا اندراج ہے۔ نصیرالدین حیدر کا جانشین محمد علی شاہ (۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۲ء) ہوا۔ محمد علی شاہ کے بعد امجد علی شاہ (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء) اور پھر واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء) نے عنانِ اقتدار سنبھالی۔ اِن تینوں حکمرانوں کے سِکّوں پر فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔ متذکرہ صدر پانچوں حکمرانوں نے سونے کی اشرفیاں چاندی کے روپے اور تانبے کے فلوس مضروب کروائے۔ سونے کے سِکّوں میں معمولی اشرفیوں کے علاوہ نصف اشرفی اور رُبع اشرفی نیز اشرفی کے آٹھویں اور سولھویں حصّے کے معادل سِکّے بھی مضروب کیے جاتے تھے۔ اس طرح انہی اوزان کے چاندی کے سِکّے بھی مضروب کروائے جاتے تھے۔ اودھ کے حکمرانوں نے سِکّوں پر مغلوں کی طرح اپنے لئے بھی نہایت شاندار القاب مثلاً 'شاہ زمن' 'عالم پناہ' 'ظلّ الٰہ' 'شاہ زماں' 'شاہ جہاں' 'سلطانِ عالم' وغیرہ استعمال کئے ہیں۔ دارالضرب لکھنؤ کو بھی 'دارالامارہ' 'دارالسلطنت' اور 'بیت السلطنت' کے القاب سے مفتخر کیا۔ البتہ واجد علی شاہ نے جو خود بھی ایک شاعر تھا لکھنؤ کو اپنے تخلص اختر کی مناسبت سے اخترنگر سے موسوم کیا۔[1] اگرچہ نوابانِ اودھ کا سلسلہ واجد علی شاہ پر ختم ہوجاتا ہے لیکن جنگِ آزادی کے دوران واجد علی شاہ کے بیٹے برجیس قدر نے رمضان علی شاہ کا لقب اختیار کر کے حُریّت کے متوالوں کا ساتھ دے کر حُبِّ وطن کی شمع جلائے رکھی۔ اور اپنے نام کے سِکّے بھی اجراء کیے جن پر فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔[2] لیکن برجیس قدر کی تمام کوششیں رائگاں گئیں۔ اور اودھ پر انگریزی اقتدار قائم ہوگیا۔

---

[1] کیٹلاگ آف دی کوائنس ان دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد چہارم باب اول مولفہ سی جے براؤن صفحات ۵ تا ۹۰ انڈولاجیکل بک کارپوریشن نئی دہلی ۱۹۷۴ء

[2] گنج شائگان مصنفہ محمد رفیع موہانی عالی مطبوعہ مرادآباد ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۷

متفرقات

کامروپ (رنگپور۔ آسام) کے حکمرانوں کے سکّوں پر فارسی اشعار

ہندوستان کی شمال مشرقی سرحد پر واقع علاقہ کامروپ کی تاریخ جو کم و بیش صوبہ آسام پر محتوی تھا غیر تشفی بخش مواد کی وجہ سے باقاعدگی کے ساتھ مرتب نہیں کی جا سکتی۔ اس علاقے کے ابتدائی حکمرانوں نے اپنی مسکوکات کے شواہد بھی نہیں چھوڑے ہیں۔ یہاں کی جدید تاریخ کا آغاز آہوم قبائل کے حملے اور اُن کی آمد سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ دراصل جنوبی چین کے 'شان' قبائل کے پسماندگان سے تھے۔ اور وہ قریب قریب اُسی زمانے میں جب کہ قبلائی خاں سنہ ۱۲۲۸ء میں چین میں اپنے اقتدار کو مستحکم کر رہا تھا کامروپ کے بالائی علاقوں میں داخل ہوئے۔ انہیں اس علاقے میں اپنی حیثیت منوانے میں کافی وقت لگا۔ دو تین صدیوں تک یہ لوگ مقامی کچھار قبائل سے دست و گریباں رہے اور بالآخر سنہ ۱۵۴۰ء میں انہوں نے کچھاروں کو مار بھگایا۔ اب ان کی حکومت گوہاٹی کے نزدیک دریائے کلنگ تک پھیل چکی تھی۔ رفتہ رفتہ اطراف و جوانب کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں نے بھی ان کی بالادستی قبول کر لی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سلطنت مغلیہ کا اقتدار قریب قریب سارے ہندوستان میں قائم ہو چکا تھا اور بہار بنگال بھی اُن کے زیر تسلط آ چکے تھے۔ مغل فوجوں نے کامروپ کے علاقے پر بھی مہمات بھیجیں لیکن انہیں وہاں کے جغرافیائی حالات کی وجہ سے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی تا آنکہ سنہ ۱۶۶۳ء میں اورنگ زیب

کے عہدِ حکومت میں میر جملہ نے اپنی فوجیں اس علاقہ میں بڑھا دیں اور آہوم حکمرانوں کی جانب سے کچھ مقاومت کے بعد راجہ دھانی پر قبضہ کرلیا۔ تاہم مغل اس علاقہ میں مستقل طور پر اپنے قدم نہ جما سکے۔ یہاں کا سب سے طاقتور راجہ رُودر اسنگھ عرف چُک رنگ پھا گزرا ہے جو سنہ ۱۶۹۵ء میں تختِ نشین ہوا۔ اس عہد تک آہوم اپنے نام 'شان' اور ہندو دونوں طریقوں سے رکھا کرتے تھے لیکن رودر اسنگھ نے علی الاعلان ہندو مذہب اختیار کرلیا۔ سنہ ۱۷۱۴ء میں رودر اسنگھ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سِب سنگھ برسرِ اقتدار آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستانی سیاست میں انگریزوں کی مداخلت کا آغاز ہو چکا تھا' اور وہ کسی نہ کسی بہانے نئے نئے علاقوں میں اپنا اثر و نفوذ پھیلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ آہوم حکمرانوں کے علاقے میں بھی انگریزوں کو ایسا موقع مل گیا۔ چنانچہ درباری سازشوں اور بغاوتوں کو کچلنے کے لئے انہوں نے مقامی حکمرانوں کی امداد سے دریغ نہ کیا۔

جہاں تک مسکوکات کا تعلق ہے اب تک دستیاب شدہ مواد کے بموجب آہوم خاندان کے سکّوں کی ابتداء راجہ سک لن من (سنہ ۱۵۳۹ء تا سنہ ۱۵۵۲ء) کے ہشت پہلو چاندی کے سکّوں سے ہوتی ہے۔ جن پر مندرجہ عبارت آہوم زبان اور اُسی کے رسم الخط میں ہے۔ اسی خاندان کے ایک راجہ پرمتھا سمہا (سنہ ۱۷۴۴ء تا سنہ ۱۷۵۱ء) کے سکّوں پر سنسکرت زبان کی عبارات بھی پائی جاتی ہیں۔ یہاں اس امر کا تذکرہ باعثِ دلچسپی ہوگا کہ اس عہد تک آہوم حکمران مغل بادشاہوں سے روشناس ہو چکے تھے' اس لئے ان کے مسکوکات بھی مغل اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ آہوم خاندان کی ایک حکمران پرمتھیشوری کے چاندی کے سکّوں پر بھی ایک فارسی شعر پایا جاتا ہے۔ اسی خاندان کے ایک اور حکمران راجیشورا کے سکّوں پر بھی ایک فارسی شعر پایا جاتا ہے۔ اس خاندان کے اِن دونوں حکمرانوں کے سکّوں پر مندرجہ اشعار بعینہٖ مغل بادشاہوں کے سکّوں پر مندرجہ اشعار کا چربہ معلوم ہوتے ہیں۔[1]

سِکھ حکمرانوں کے سکّوں پر فارسی اشعار[2]

ہندوستان پر احمد شاہ دُرّانی کے متعدد حملوں کے نتیجہ میں پنجاب کے سِکھوں میں تحفظ

---

[1] کوائنس آف اینشنٹ انڈیا اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد اول مصنفہ وینسنٹ اے اسمتھ صفحات ۳۰۱ ، ۳۰۲ شائع کردہ انڈولاجیکل بک ہاؤز۔ دہلی سنہ ۱۹۷۲ء

[2] کوائنس مرتبہ پرمیشوری لال گپتا شائع کردہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی سنہ ۱۹۶۹ء صفحات ۱۳۵ تا ۱۳۷

ذات کی ایک نئی لہر پیدا ہو گئی تھی اور جب ۱۷۱۰ء میں ایک سکھ سردار باندہ سنگھ المعروف بہ "سچا پادشاہ" نے درّانیوں سے سرہند کا علاقہ چھین لیا تو اس نے خالصہ کی قیادت حاصل کر کے اسی کامیابی کی یادگار کے طور پر ایک نئے سال کا آغاز کیا اور اپنے صدر مقام لوہ گڑھ سے ایسے سِکّے جاری کروائے جن پر فارسی شعر درج تھا۔ ۱۷۶۱ء میں جسّا سنگھ کے اجراء کردہ بعض سِکّوں پر بھی فارسی شعر کا اندراج پایا جاتا ہے۔ پھر ۱۷۷۷ء میں امرتسر سے بھی فارسی شعر والے سِکّے جاری ہوئے تھے لیکن ان پر کسی حکمران کے نام کے بجائے گورو گوبند سنگھ کا نام پایا جاتا ہے۔

کشمیر کے ڈوگرا حکمرانوں کے سِکّوں پر فارسی شعر

کشمیر کے ڈوگرا راجاؤں کا سلسلہ سارنگ دیو سے شروع ہو کر آخری راجہ ہری سنگھ پر ختم ہوتا ہے۔ ان حکمرانوں میں صرف رنجیت دیو کے سِکّوں پر فارسی شعر پایا جاتا ہے۔ رنجیت دیو ۱۷۲۴ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۷۴۲ء میں تختِ حکومت پر فائز ہوا۔ اس نے امن و آشتی کے ساتھ ۱۷۸۰ء تک حکومت کی۔

رؤسائے ٹونک کے سِکّوں پر فارسی شعر

راجپوتانہ (موجودہ راجستھان) میں واقع دیسی ریاست ٹونک کے حکمران مسلمان تھے۔ یہ ریاست حسبِ ذیل چھ مختلف ڈویژنوں پر مشتمل تھی جو باہم مربوط بھی نہ تھے بلکہ ایک دوسرے سے بیس میل سے دو سو پچاس میل تک کے فاصلے پر واقع تھے۔

۱. ٹونک
۲. علی گڑھ
۳. رام پورہ
۴. نمبھورہ
۵. چھبرہ

۶. سرونج

ٹونک کے حکمرانوں کا تعلق پٹھانوں کے 'بونر' قبیلے سے تھا۔ اس خاندان کا بانی امیر خاں تھا۔ جس کو مہاراجہ ہولکر نے اُس کی خدمات کے صلے میں ٹونک کا علاقہ عطا کیا تھا اور پھر برطانوی حکومت کی نوازشات سے قلعہ رام پورہ اور علی گڑھ بھی اس خاندان کے زیرِ نگیں آگئے۔

امیر محمد خاں کی اولاد میں وزیر محمد خاں نے ۱۸۳۴ء میں اپنے نام کے سِکّے رائج کئے۔ اس کے بعد محمد علی خاں (۱۸۶۴ء) اور محمد ابراہیم علی خاں (۱۸۶۷ء) کے سِکّے بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر ان میں سے صرف ابراہیم علی خاں کے سکّوں پر فارسی شعر[1] پایا جاتا ہے۔

راجگان جودھپور کے سکّوں پر فارسی اشعار

مارواڑ کی یہ ریاست جو عام طور سے ریاست جودھپور کے نام سے مشہور ہے ۱۴۵۹ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا بانی راؤ جودھا تھا اور اسی کے نام سے شہر جودھپور موسوم ہوا۔ ان حکمرانوں کا تعلق راجپوتوں کے راٹھور قبیلے سے تھا۔ ان کا ادّعا تھا کہ وہ راست رام چندرجی کی نسل سے ہیں۔ ایک عرصے تک دلی کے مغل حکمرانوں کے زیرِ تسلط رہنے کے بعد اس خاندان کے ایک حکمران بجے سنگھ نے ۱۷۸۳ء میں اپنے علیحدہ سکّے جاری کئے لیکن ان سکّوں پر مغل بادشاہ شاہ عالم کے نام کا اندراج بھی ہوا کرتا تھا۔ بجے سنگھ کے جانشینوں بھیم سنگھ مان سنگھ اور تخت سنگھ نے بھی اپنے سکّے جاری کئے لیکن ۱۸۵۸ء کے بعد سکّوں پر مغلوں کی بالادستی کی بجائے ملکۂ وکٹوریہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا اندراج ہونے لگا تھا۔ تخت سنگھ کے بعد جسونت سنگھ (۱۸۷۳ء) سردار سنگھ (۱۸۹۵ء) اور سومار سنگھ (۱۹۱۱ء) یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوتے گئے۔ ان حکمرانوں میں سے صرف تخت سنگھ اور جسونت سنگھ کے سکّوں پر فارسی اشعار[2] پائے جاتے ہیں۔

---

[1] کیٹلاگ آف دی کوائنس اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد چہارم باب سوم صفحات ۲۷۲، ۲۷۳، مرتبہ، ڈبلیو ایچ والنٹائن شائع کردہ انڈولاجیکل بک کارپوریشن نئی دلی ۱۹۷۶ء

[2] گنج شائیگاں مصنفہ محمد رفیع موہانی عالی مطبوعہ مراد آباد ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲۳

اندور کے سکّوں پر فارسی شعر

اندور ایک مرہٹہ ریاست تھی۔ اس کا بانی ملہر راؤ تھا جو علاقۂ دکن کی ایک ندی نیرا کے کنارے آباد ہول نامی ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور اسی مناسبت سے ملہار راؤ کا خاندان ہولکر کہلایا جانے لگا۔ ملہار راؤ اکتیس سال کی عمر میں مرہٹوں کے پیشوا کی سلکِ ملازمت میں شامل ہوا اور تین ہی سال کے عرصہ میں اپنی نمایاں خدمات کے صلے میں دریائے نربدا کے شمال میں واقع بارہ پرگنوں کے انعام کا مستحق قرار پایا۔ ملہر راؤ کی مابقی زندگی ترقی اور کامرانی کا ایک شاندار سلسلہ رہی چنانچہ ریاست اندور کا قیام اس کی یادگار ہے۔

اندور کے ہولکر خاندان میں متعدد حکمران گزرے ہیں لیکن سب سے اہم دور اہلیا بائی کا رہا ہے۔ جس نے تیس سال تک حکومت کی اور اپنی رعایا کو خوش حالی اور امن و عافیت کی زندگی سے بہرہ مند کیا۔ ہولکر خاندان کے سکّے اہلیا بائی کے دور ہی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ اندور کو اہلیا بائی نے اس خاندان کے بانی ملہر راؤ کی یادگار کے طور پر ملہار نگر کے نام سے موسوم کیا تھا۔ ابتداءً اِس خاندان کے مسکوکات سے دہلی کے مغل سلاطین کی بالادستی کا اظہار ہوتا ہے لیکن بعد میں ہندوستان پر برطانیہ کی گرفت مضبوط ہونے پر ہولکر خاندان کی وفاداریاں ملکۂ وکٹوریہ سے وابستہ ہو گئیں۔ ہندوستان کی آزادی تک اس خاندان میں کئی حکمران گزرے لیکن صرف جسونت راؤ (۱۷۹۷ء تا ۱۸۱۱ء) کے سکّوں پر ایک فارسی شعر پایا جاتا ہے۔ جس کا ذکر ڈبلیو ایچ والنٹائن نے اپنی مرتب کردہ کیٹلاگ میں محض نثری عبارت کے طور پر کیا ہے حالانکہ جس سکّے کی تصویر اور تشریح اس نے اپنے کیٹلاگ میں درج کی ہے[1] اس سے شعر کا پڑھنا اور سمجھنا زیادہ دشوار نہیں تھا۔ صرف ذرا سی توجہ کی ضرورت تھی۔ اس سکّے کے رُخِ اول پر موجودہ عبارت بعینہ درج ذیل کی جاتی ہے۔

---

[1] کیٹلاگ آف دی کوائنس اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد چہارم باب سوم صفحات ۳۱۵ تا ۳۱۸، ۳۲۳ مرتبہ ڈبلیو ایچ والنٹائن شائع کردہ انڈولاجیکل بک کارپوریشن نئی دہلی ۱۹۷۶ء

محمد اکبر
قران ثانی سلطان
حب ۱۲۲۲
صا ازارض تاباختر
ک
زد سکہ مبار

مندرجہ صدر الفاظ کوئی بے ربط عبارت نہیں ہیں بلکہ یہ ایک فارسی شعر ہے جو درج ذیل کیا جاتا ہے۔

زد سکۂ مبارک ازارض تاباختر
صاحب قران ثانی سلطاں محمد اکبر

اس شعر کو پڑھنے کے لیے سکّہ پر مندرجہ ایک ایک لفظ سے کام لیا گیا ہے نہ کسی لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے نہ کسی کو متروک کیا گیا ہے۔ سکّے پڑھتے وقت اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ان پر مندرجہ عبارت کسی کتابی جملے کی طرح نہیں لکھی جاتی بلکہ ایک مختصر اور محدود جگہ میں پوری عبارت کو مناسب طور پر درج کرنے کے لیے الفاظ کو حسب موقع حسن کارانہ انداز میں ڈائی پر کندہ کیا جاتا تھا جس کی ضرب سے سکّے پر مطلوبہ عبارت ابھر آتی تھی۔ مندرجہ صدر شعر کے الفاظ کو بھی اسی طرح ڈائی پر درج کیا گیا ہے۔ جہاں تک اس شعر کا تعلق ہے اس پر مغل بادشاہ محمد اکبر کا نام درج ہے جس کی بالادستی جسونت سنگھ نے تسلیم کی تھی۔ اس سکّے کے دوسرے رُخ پر مہاراجہ جسونت سنگھ کا نام اور مقام ضرب اندور کا اندراج ہے۔

اس منزل پر ہندوستان کے حکمرانوں کے سکّوں پر مندرجہ فارسی اشعار کا تذکرہ اختتام کو پہونچتا ہے۔ آیندہ صفحات میں ایران' افغانستان اور ماوراالنہر کے حکمرانوں کے سکّوں پر مندرجہ فارسی اشعار کا ذکر کیا جائیگا۔

ایران

صفوی خاندان کے حکمرانوں کے سکوں پر فارسی اشعار

خلافت عباسیہ کے آخری دور میں مختلف علاقوں کے صوبائی گورنر مرکز کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اپنے علاقوں میں علم بغاوت بلند کرنے لگے تھے۔ لیکن ان سب نے اس بات کا ضرور خیال رکھا کہ برائے نام ہی سہی خلفا کی بالادستی کو اپنے خطبوں اور سکوں میں ظاہر کیا جائے۔ ایسے گورنروں میں کچھ تو عربی النسل تھے اور کچھ عجمی نژاد مگر یہ سب عربی تہذیب و تمدن میں رنگے ہوئے تھے لہذا ان کے سکوں پر جو عبارات درج ہوا کرتی تھیں وہ عربی زبان کی ہوتی تھیں۔

بغداد پر منگولوں کے حملے کے بعد خلافت عباسیہ کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا مگر منگول خلافت عباسیہ کے پورے حدود مملکت کو اپنے زیر تسلط لانے میں کامیاب نہ ہو سکے مصر اور شمالی افریقہ کے ممالک ان کی دسترس سے باہر ہی رہے۔ ادھر عجم میں نئی نئی طاقتیں ابھر رہی تھیں۔ ایشیائے کوچک میں ترک ایک نئی طاقت بن کر سر اٹھا رہے تھے۔ بالآخر ترکوں نے عثمانی خلافت کی صورت میں بلاد اسلامیہ کے اصل مراکز کو اپنے زیر نگیں کر لیا لیکن وہ بھی عجمی علاقوں میں اپنے اثرات دور تک نہ پھیلا سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عثمانی ترک

سُنی العقیدہ تھے اور ایران کے علاقوں میں شیعہ کثرت سے آباد تھے۔ دراصل یہ دور من حیث المجموع اسلامی ممالک کی بالادستی حاصل کرنے کی کوششوں کا آیئنہ دار تھا۔ ایک طرف ترک اس کے مدعی تھے تو دوسری طرف ایران میں اُبھرتی ہوئی صفوی خاندان کی ایک نئی طاقت اس کی دعویدار تھی اور ایک تیسرے گوشہ میں ہندوستان کے مغل حکمران جن کی بہتر نمایندگی شہنشاہ اکبر نے کی اس کوشش میں لگے رہے کہ اسلامی ممالک کی بالادستی نہ سہی کم از کم خود کو ترکوں اور ایرانیوں کے روز افزوں اثرات سے آزاد رکھیں۔

بلادِ عجم میں دسویں صدی ہجری میں اسمٰعیل اول نے ۹۰۷ھ م ۱۵۰۲ء میں صفوی خاندان کی بنا ڈالی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسمٰعیل اول کے مورث اعلیٰ شیخ صفی الدین تھے جن کا سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظم سے جا ملتا ہے اور اسی نسبت سے یہ خاندان صفوی کہلانے لگا۔ اسمٰعیل نے تبریز کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس خاندان نے ۹۰۷ھ تا ۱۱۴۸ھ م ۱۵۰۲ء تا ۱۷۳۶ء پورے ایران پر حکومت کی، جہاں تک سکوں کا تعلق ہے صرف اسمٰعیل اول کے سکوں پر منظوم عربی دعائے نادِ علی کا اندراج پایا جاتا ہے، اسمٰعیل اول کے بعد صفوی خاندان کے حکمرانوں کے سکوں پہ فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔
مقامِ حیرت ہے کہ فارسی زبان جو صدیوں سے ایران اور اس کے اطراف وجوانب میں نہ صرف رائج تھی بلکہ اس نے ایک کلاسیکی زبان کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور جس نے فردوسی، انوری اور سعدی جیسے شہرۂ آفاق شاعر پیدا کر لئے تھے صفوی خاندان سے پہلے سکوں پر جگہ نہ پا سکی تھی، سکوں پر فارسی اشعار کے اندراج کا سہرا تو ہندوستان کے سر باندھا جانا تھا اور جیسا کہ پچھلے اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے صفوی خاندان کے حکمرانوں کے سکوں پر فارسی اشعار کے اندراج کی تاریخ سے کم و بیش سو سال پیشتر ہندوستان کے علاقۂ گجرات کے بادشاہ محمد شاہ ثانی نے اپنے سکوں پر فارسی شعر کے اندراج کی طرح ڈال دی تھی۔

گجرات ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع ہے اور بحیرۂ عرب کے توسط سے ایران، خلیجی ممالک، اور جزیرہ نمائے عرب سے مربوط ہے۔ کئی صدیوں سے سمندری راستوں کے ذریعہ ان ممالک سے ہندوستان کی تجارت ہوا کرتی تھی۔ یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ سلطان محمد شاہ والیٔ گجرات کے ایسے سکے جن پر فارسی شعر درج تھا ضرور ایران پہونچے ہوں گے جنھیں

دیکھ کر ایرانی حکمرانوں کو بھی اپنے سکوں پر فارسی شعر کے اندراج کا خیال پیدا ہوا ہوگا۔

صفوی خاندان کے حسب ذیل حکمرانوں کے سکوں پر فارسی اشعار پائے گئے ہیں

۱۔ اسمٰعیل ثانی

۲۔ محمد خدابندہ

۳۔ عباس اول

۴۔ صفی اول

۵۔ عباس ثانی

۶۔ سلیمان اول (صفی ثانی)

۷۔ حسین اول

۸۔ طہماسپ ثانی

۹۔ احمد

۱۰۔ عباس ثالث

۱۱۔ سام

۱۲۔ سلیمان ثانی

۱۳۔ حسین ثانی

۱۴۔ محمد

متذکرۂ صدر حکمرانوں میں سب سے اہم شخصیت شاہ عباس ثانی (سنہ ۱۵۸۶ء تا سنہ ۱۶۲۹ء) کی تھی۔ اس نے سر انتھونی شرلی[1] کی اعانت سے ایرانی فوج کو منظم کیا اور بعض مغربی صوبوں کو عثمانی ترکوں کی علداری سے آزاد کرالیا۔ شاہ عباس کے دور حکومت میں علم و ہنر کو بہت زیادہ فروغ ہوا۔ تعمیرات عامہ کو ترقی ہوئی اور بیرونی دول کے ساتھ خوشگوار تعلقات بھی قائم ہوئے۔

---

[1] مسلمان شاہی خاندان اور اُن کے سلسلے مولفۂ اسٹینلی لین پول مترجمہ محمد عبدالرحمٰن خاں سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد مطبوعۂ حیدرآباد دکن۔ سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو شمارہ ۱۳۶ صفحہ ۲۷۲

حقیقی معنوں میں شاہ عباس کا تقابل اس کے ہم عصر عثمانی خلیفہ سلیمان اعظم، ہندوستان کے شہنشاہ اکبر اور انگلستان کی ملکہ ایلزبیتھ اول کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ اس خاندان کے دیگر سلاطین شاہ عباس کے مرتبہ تک تو نہ پہونچ سکے لیکن بہرحال انہوں نے ایک صدی اور ایران پر حکومت کی جو بالآخر تفرق وتشتت کا شکار ہوکر ختم ہوگئی۔ صفوی خاندان کے حکمرانوں کے سکوں پر جو اشعار پائے جاتے ہیں اُن سے اُن کے شیعی مسلک کا برملا اظہار ہوتا ہے۔

••

خاندان افاغنہ کے سکوں پر فارسی اشعار

یہ حکمران اگرچہ نسلاً سادات تھے مگر اغلب ہے کہ وطنیت کی نسبت سے افاغنہ کے نام سے شہرت پائی۔ صفوی حکمرانوں کے دورِ انحطاط میں اس خاندان کے بانی میر اُویس نے ایران کے شمال، مشرق میں علم بغاوت بلند کر کے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ پھر اس کے بیٹے میر محمود نے ۱۷۲۲ء میں ایران کے صفوی حکمران حسین کو شکست دے کر ہرات و مشہد پر اور پھر ایران کے پائے تخت اصفہان پر قبضہ کر لیا۔

میر محمود کے بعد اس کا جانشین میر اشرف ہوا جو اس خاندان کا آخری حکمران بھی تھا اور افاغنہ کی حکومت کا یہ مختصر دور ۱۷۲۹ء میں اختتام کو پہونچا۔ افاغنہ مسلک کے سنی العقیدہ تھے جس کا اظہار اُن کے سکوں پر مندرجہ اشعار سے ہوتا ہے۔

افشاری خاندان کے سکّوں پر فارسی اشعار

افشاری خاندان کا بانی نادر قلی افشاری ترک تھا جس نے صفوی خاندان کے آخری دور میں افاغنہ کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر ماژندران میں صفویوں کے بچے کھچے اقتدار کے دعویداروں کی مدد کے بہانے خود ہی نادر شاہ کے لقب سے ۱۷۳۶ء م ۱۱۴۸ھ میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور رفتہ رفتہ اتنی طاقت جمع کر لی کہ پورے ایران، افغانستان اور ماوراء النہر کے وسیع علاقوں پر اپنا پرچم لہرا دیا۔

نادر شاہ کی ہوسِ ملک گیری نے اس کو ہندوستان پر حملہ کرنے سے بھی باز نہ رکھا اگرچہ نادر شاہ نے صرف بارہ سال تک حکومت کی لیکن یہ مختصر دور بھی مہم پسندیوں اور معرکہ آرائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایران کے مغرب میں اقطاع عرب کی جانب نادر شاہ نے رخ نہیں کیا لیکن ایران کے شمال میں روس کے بیشتر جنوبی علاقے اس کے زیرِ نگین آ چکے تھے۔ ہندوستان پر نادر شاہ نے ۱۷۳۸ء م ۱۱۵۱ھ میں حملہ کیا اور لاہور سے ہوتے ہوئے مغل فوجوں کو شکست دے کر دلی تک پہونچ گیا جہاں اس کے قتلِ عام کی داستان تاریخ کے صفحات پر ایک بدنما داغ ہے۔ اب نادر شاہ کی مملکت دریائے سندھ سے کوہِ قاف تک پھیل چکی تھی۔ اس نے غالباً اسی وجہ سے اپنے سکّوں پر حسبِ ذیل شعر درج کروایا تھا۔

ہست سلطان بر سلاطین جہاں
شاہِ شاہان نادر صاحب قراں

لیکن اس عظیم المرتبت حکمراں کی موت افشاری خاندان کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی نادر شاہ کے بعد اس خاندان میں تین اور حکمران گزرے ہیں لیکن وہ اس عظیم ورثہ کے اہل نہ تھے جو نادر شاہ نے چھوڑا تھا۔ اس خاندان کا اقتدار رفتہ رفتہ زوال پذیر ہوتا گیا۔ نادر شاہ کے بعد عادل شاہ اور ابراہیم شاہ تختِ حکومت پر آئے اور ان دونوں کے بعد شاہ رخ بادشاہ بنا جس کے عہدِ حکومت میں ۱۷۹۶ء م

سنہ ۱۲۱۰ھ میں اس خاندان کا چراغ گل ہوگیا۔

افشاری حکمران شیعہ مسلک کے حامل تھے، اور ان کے سکوں پر جو اشعار پائے جاتے ہیں اُن سے اسی عقیدے کا اظہار ہوتا ہے۔ افشاری خاندان کے زوال کے بعد ایران کی وسیع و عریض مملکت کئی مہم پسندوں کے درمیان منقسم ہوگئی، حتیٰ کہ اسی نراجی کیفیت کے دوران آزاد خاں نامی ایک باغی سردار نے تک آذربائیجان کے علاقہ میں اپنے نام کے سکے جاری کروائے جن پر فارسی شعر درج ہے

●●

زند خاندان کے سکّوں پر فارسی اشعار

افشاری خاندان کے دورِ زوال میں کریم خاں زند اور محمد حسین قاچار کے درمیان حصول اقتدار کی کشمکش شروع ہوگئی تھی۔ محمد حسین قاچار استر آباد کا حاکم بن بیٹھا تھا اور کریم خان زند مابقی ایران کی حاکمیت کا دعویدار تھا۔ بالآخر کریم خاں زند کی جیت ہوئی اور اس نے ۱۷۵۰ء میں پوری سرزمین ایران پر باستثناء خراساں اپنا تسلط قائم کرلیا۔ کریم خاں کے فوت ہونے کے بعد اس کے جانشینوں اور قاچاروں کے درمیان برسوں معرکہ آرائی رہی جس کے نتیجہ میں آقا محمد قاچار غالب آیا اور زند خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

زند خاندان کے حکمرانوں میں صرف کریم خاں زند کے سکوں پر فارسی شعر کا اندراج پایا جاتا ہے، اس خاندان کا دورِ حکومت ۱۷۵۰ء تا ۱۷۹۴ء م ۱۱۶۳ھ تا ۱۲۰۹ھ رہا ہے۔

••

قاچار حکمرانوں کے سکّوں پر فارسی اشعار

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ افشاری خاندان کے زوال کے بعد طوائف الملوکی کے دور میں قاچار اور زند حصولِ اقتدار کے لئے آپس میں دست و گریباں رہے، محمد حسین قاچار نے استرآباد پر تو قبضہ کر ہی لیا تھا مگر کریم خاں زند کے حینِ حیات وہ اپنے حدود مملکت میں کوئی قابلِ لحاظ توسیع نہ کر سکا تھا، کریم خاں کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں اور قاچاروں میں کشمکش جاری رہی اور نتیجتاً ناصر الدین شاہ قاچار کو فتح نصیب ہوئی اور اس نے تہران کو اپنا پایۂ تخت بنا کر ایک زیادہ مستحکم حکومت قائم کر لی۔

قاچاروں میں مندرجہ ذیل حکمرانوں کے سکّوں پر فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔

۱. محمد حسین قاچار
۲. آقا محمد قاچار
۳. فتح علی شاہ قاچار
۴. محمد حسن خاں سالار
۵. ناصر الدین شاہ قاچار

قاچار حکمران بھی شیعی مسلک کے حامل تھے جس کا اظہار ان کے سکّوں سے ہوتا ہے۔

••

افغانستان

درّانی خاندان کے سکّوں پر فارسی اشعار

افغانستان اپنے محل وقوع کے اعتبار سے ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ زمانۂ ماقبل تاریخ سے ہی یہ علاقہ ان اقوام کی ایک گذرگاہ رہا ہے جو وسط ایشیاؔ، یوروپ یا مغربی ایشیاؔ سے ہندوستان کی طرف آتی رہیں۔ پہلے تو آریائی اقوام اسی راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوئیں پھر سکندر اعظم بھی اسی راستہ سے آیا۔ اگرچہ وہ اصل سرزمین ہند میں داخل نہ ہو سکا لیکن اس کے سرداروں کی حکومت نہ صرف افغانستان بلکہ شمال مغربی ہندوستان کے وسیع علاقوں پر عرصے تک قائم رہی' پھر کُشان آئے اُن کے بعد ہَنوں نے اسی راستے سے ہندوستان پر یلغار کی' طلوعِ اسلام کے بعد خلافت راشدہ کے دَور میں عرب افغانستان میں داخل ہو چکے تھے' پھر غزنویوں اور غوریوں نے افغانستان ہی سے آگے بڑھ کر ہندوستان پر یورش کی' ان بیرونی مہم پسندوں میں ظہیر الدین بابر نے سولھویں صدی عیسوی میں افغانستان ہی کے راستے ہندوستان کا رُخ کیا اور سب سے آخر میں نادر شاہ نے افغانستان سے جو اس کی مملکت کا ایک حصہ تھا آگے بڑھ کر ہندوستان پر حملہ کیا۔

کئی صدیوں کی تاریخ کا یہ اجمالی خاکہ اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ نادر شاہ کے عہد تک افغانستان میں کوئی مستحکم مقامی حکومت قائم نہ ہو سکی تھی کبھی یہ علاقہ ایرانیوں کے زیر اثر رہا تو کبھی یونانیوں

کے زیرِ اقتدار، کبھی عرب اس پر قابض رہے تو کبھی منگول اور تُرک۔ کچھ عرصہ کے لئے ہندوستان کے مغل حکمرانوں کا بھی اس علاقہ پر تسلط رہا۔ پھر صفوی حکمرانوں نے اس علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ صفویوں کے زوال کے بعد نادر شاہ نے افغانستان پر اپنا اقتدار جمالیا۔

نادر شاہ کی موت کے بعد احمد خاں افغان جو درّانی قبیلہ کا ایک معزز سردار اور نادر شاہ کی فوج میں ایک بلند مرتبہ سپہ سالار تھا بڑی دور اندیشی سے کام لے کر نادر شاہ کی وسیع مملکت کا مدعی بننے کے بجائے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے وطن افغانستان کو ایران کی سلطنت سے علٰحدہ کر کے اس کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت دے دی جائے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار افغانستان کو ایک مقامی خود مختار حکمران نصیب ہوا۔

احمد شاہ نے افغانستان کو ایران سے علٰحدہ کر کے ۱۷۴۷ء میں دُرّانی خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ احمد شاہ کی فراست اور اس کے تدبّر کا ایک اور ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اس نے افغانستان کے ایک اور طاقتور قبیلے بارق زائی (بارک زائی) کے سرداروں سے اس شرط پر صلح کر لی کہ ان کے قبیلے کا ایک بااثر فرد ہمیشہ عہدۂ وزارت پر فائز رہے گا۔ چنانچہ بارق زائی قبیلے کے سردار جمال خاں کو اس نے اپنا وزیر بنالیا اور احمد شاہ کے بعد یہ سلسلہ کم و بیش سو سال تک جاری رہا، احمد شاہ کی فوجی صلاحیت بھی مسلّم تھی اس نے ہرات اور خراساں کو ایرانیوں کے اثر سے آزاد کرالیا تھا اور ہندوستانی علاقوں پر بھی کئی بار فوج کشی کی اور بالآخر ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں ہندوستانی افواج کو بڑی طرح شکست دے کر سندھ، پنجاب اور کشمیر کے بیشتر علاقوں کو سلطنت افغانستان میں شامل کرلیا۔

اسی دوران ہندوستان کے علاقۂ پنجاب میں سکھوں کی ایک نئی طاقت ابھر رہی تھی جو بتدریج اپنی قوت میں اضافہ کرتے کرتے اٹھارویں صدی عیسوی کے ختم ہونے سے پہلے ہی پنجاب کے مالک بن بیٹھے تھے۔ احمد شاہ دُرّانی کے انتقال کے بعد اس کی ہندوستانی مقبوضات آہستہ آہستہ سکھوں کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔ اِدھر افغانستان میں دُرّانی خاندان پر ایک نئی افتاد یہ آن پڑی کہ احمد شاہ نے بارق زائیوں سے انہیں عہدۂ وزارت پر مستقلاً فائز رکھنے کے بارے میں جو معاہدہ کیا تھا وہ ایک صدی تک تو برقرار رہا لیکن بعد ازاں احمد شاہ کے جانشینوں نے بارق زائیوں سے نظریں پھیر لیں اور انہیں عہدۂ وزارت سے ہٹانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ جب ان کوششوں میں کامیابی نہ ہوئی تو درّانیوں نے وزیرِ وقت

فتح خاں بارق زائی کو ۱۸۱۸ء میں اندھا کر کے قتل کر دیا۔ یہ سانحہ افغانستان میں دُرّانی حکومت کے خاتمہ کا سبب بنا۔ اب بارق زائی اُٹھ کھڑے ہوئے اور چند سال کی تراجی کیفیت کے بعد انہوں نے فتح خاں کے بھائی دوست محمد خاں کی قیادت میں افغانستان پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

دُرّانی خاندان میں حسب ذیل حکمرانوں کے سِکّوں پر فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔

۱. احمد شاہ دُرّانی
۲. سلیمان شاہ
۳. تیمور شاہ
۴. ہمایوں شاہ
۵. زماں شاہ
۶. محمود شاہ
۷. شاہ شجاع
۸. قیصر شاہ
۹. نورالدین شاہ
۱۰. ایوب شاہ
۱۱. کامران شاہ
۱۲. شہپور شاہ

جہاں تک ان حکمرانوں کے سِکّوں پر مندرجہ اشعار کو صحت کے ساتھ پڑھنے کا تعلق ہے یہ امر باعث حیرت ہے کہ وائٹ ہیڈ جیسے گراں پایہ ماہر مسکوکات قدیمہ نے بھی اس بارے میں شدید غلطیاں کی ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱. سلیمان شاہ دُرّانی کے سکہ پر مندرجہ شعر کو وائٹ ہیڈ نے اس طرح پڑھا ہے

سکہ زد بر سیم و زر چوں مہر و ماہ
سلیمان بادشاہ ابن احمد شاہ

اصل میں یہ شعر اس طرح ہے

بسکہ زد بر سیم و زر چوں مہر و ماہ
ابن احمد شہ سلیمان بادشاہ

۲۔ تیمور شاہ دُرّانی کے سونے اور چاندی کے سکّوں پر مندرجۂ ذیل شعر درج ہے

بحکم خُدا و رسولِ انام
بزد سکہ تیمور شاہِ نظام

تیمور شاہ کے سونے کے سکّوں پر اس شعر کے ساتھ لفظ "بزر" اور چاندی کے سکوں پر لفظ "بسیم" بھی درج ہوتا تھا جس کو وائٹ ہیڈ نے اپنی نادانستگی سے مصرعۂ ثانی کا جزو سمجھ لیا اور یہ نہ سوچا کہ ان الفاظ کے اضافہ سے مصرعۂ مذکور ساقط البحر ہو جاتا ہے۔

۳۔ ہمایوں شاہ دُرّانی کے سکّوں پر مندرجہ شعر کو بھی وائٹ ہیڈ نے اس طرح پڑھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

سیم و زر در جہاں شد روشن تر از خورشید و ماہ
تا کہ بر او نقش شد نام ہمایوں بادشاہ

یہ شعر دراصل اس طرح ہے۔

در جہاں شد سیم و زر روشن تر از خورشید و ماہ
تا کہ بر او نقش شد نام ہمایوں بادشاہ

۴۔ زماں شاہ دُرّانی کے ایک سکّہ پر حسب ذیل شعر درج ہے۔

بزد سکّہ بر زر بحکم الٰہی
زماں شاہ شاہِ یمین و یساری

اس شعر کو بھی وائٹ ہیڈ نے غلطی سے اس طرح پڑھا ہے

بسکہ زد بر سیم و زر بحکم الٰہی
زماں شاہ شاہِ یمین و یساری

۵۔ محمود شاہ دُرّانی کے سکّوں پر یہ شعر درج ہے

سکۂ دولت سلطان محمود
حسن دیگر بزر و سیم فزود

اس شعر کو صحیح طریقہ سے پڑھنے میں نہ صرف وائٹ ہیڈ نے غلطی کی ہے بلکہ اس کے دو پیشرو لانگ ورتھ ڈیمز اور راجرس بھی اس خصوص میں ناکام رہے ہیں۔ اس شعر کے مصرعۂ ثانی کا لفظ "حسن" کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس لفظ کو صحیح نہ پڑھا جائے تو شعر کا مطلب خبط ہو کر رہ جاتا ہے لانگ ورتھ ڈیمز اور راجرس نے اس لفظ کو "خسرو" پڑھ کر یہ تعبیر کی ہے کہ سلطان محمود نے خود کو ایران کے شہنشاہ خسرو پرویز کا ثانی قرار دیا ہے۔ وائٹ ہیڈ نے ان دونوں کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے اس طرح ظاہر کی ہے کہ وہ لفظ "خسرو" نہیں بلکہ "حسن" ہے اور اس کی توجیہہ یوں کی ہے کہ سلطان محمود خود کو سبطِ نبی امام حسن کا ثانی قرار دیتا ہے۔ متذکرہ صدر دونوں تاویلات یوں غلط ٹھہرتی ہیں کہ اصل لفظ کو صحیح طریقہ سے پڑھا ہی نہیں گیا وہ لفظ خسرو ہے نہ حسن۔ قطع نظر اس امر کے کہ اس لفظ کو خسرو یا حسن پڑھنے سے مصرعہ ساقط البحر ہو جاتا ہے اور مصرع کی معنویت بھی چیستاں بن جاتی ہے۔ فی الحقیقت یہ لفظ "حسن" ہے اور پورے شعر کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ سلطان محمود کی سلطنت کے سکے کا ٹھپہ پڑنے سے سونے اور چاندی میں ایک نئے حسن کا اضافہ ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک لفظ کے بھی غلط پڑھے جانے سے بات کہاں سے کہاں پہونچ جاتی ہے اور صحیح مطلب تک رسائی کس قدر دشوار ہو جاتی ہے۔

••

بارق زائی خاندان کے سکوں پر فارسی اشعار

پچھلے اوراق میں یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ۱۸۱۸ء میں بارق زائی خاندان کے وزیر فتح خاں کے قتل کے بعد افغانستان کا دوسرا با اثر قبیلہ بارق زائی بھڑک اٹھا اور اس کی آتش انتقام درّانی خاندان کے زوال کا باعث ہوئی۔ بارق زائیوں نے دوست محمد خاں کو اپنا امیر تسلیم کرکے افغانستان میں بارق زائی خاندان کی آزاد حکومت کی بُنیاد رکھی۔ اس زمانے میں افغانستان برطانوی ہند، روس اور ایران کی حکومتوں کی سازشوں کا شکار بن رہا تھا۔ امیر دوست محمد خاں کی نسبت انگریزوں کو یہ شبہ ہوا کہ شائد وہ روس کے جال میں پھنس گیا ہے، چنانچہ انہوں نے افغانستان کے خلاف اعلان جنگ کردیا جس کے نتیجہ میں انگریزوں کو ۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۲ء کی لڑائیوں میں بڑی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ اب انہوں نے درّانی خاندان کی بچی کھچی مقبوضات پر ایک کٹھ پتلی حکمران شاہ شجاع کو ڈھونڈ نکالا اور اس کو سَر ولیم میکناٹن برطانوی رزیڈنٹ کی معیّت میں کابل میں لابٹھایا، دوست محمد خاں نے اس صورتحال سے پریشان ہوکر خود کو انگریزوں کے حوالے کردیا۔ تاہم دوست محمد خاں کے بیٹے اکبر خاں نے بارق زائیوں کی طرف سے مقاومت جاری رکھی اور میکناٹن اور برنیز کی سولہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج کو اپنی حکمت عملی سے ایسی زبردست شکست دی کہ اس فوج کا صرف ایک سپاہی زندہ بچا اور اسی نے یہ داستان انگریزوں کو سُنائی[1]

انگریزوں کی اس ہزیمت کے بعد امیر دوست محمد خاں دوبارہ اقتدار پر آگیا، امیر دوست محمد خاں نے اس فتح اور اقتدار پر اپنی واپسی کے بعد اجرا کردہ اشرفیوں پر اس واقعہ کو مندرجہ ذیل شعر کی صورت میں بیان کیا ہے۔

بزد زعین عنایات خالق اکبر
امیر دوست محمد دوبارہ سکۂ زر

---

[1] مسلمان شاہی خاندان اور اُن کے سلسلے مولفہ اسٹینلی لین پول مترجمہ محمد عبدالرحمٰن خاں سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، مطبوعہ حیدرآباد دکن، سلسلۂ مطبوعات ادارہ ادبیات اُردو شمارہ ۱۲۶ صفحات ۳۶۲، ۳۶۳۔

امیر دوست محمد خاں کے بعد امیر شیر علیؒ امیر محمد افضل اور امیر محمد اعظم کے سکوں پر بھی فارسی اشعار پائے جاتے ہیں۔ امیر محمد اعظم کے بعد امیر عبدالرحمٰن خاں اور پھر امیر حبیب اللہ خاںؒ امان اللہ خاںؒ نادر شاہ اور ظاہر شاہ بادشاہ ہوئے لیکن ان میں سے کسی کے سکوں پر فارسی اشعار نہیں پائے جاتے۔

افغانستان ہی میں بارق زائی خاندان کی حکومت کے قیام سے پہلے جو نراجی کیفیت رہی اس کے دوران ایک باغی سردار محمد جان نے بھی اپنے سکے چلائے تھے جن پر حسب ذیل فارسی شعر درج تھا جس میں اس دور کی صحیح تصویر کھینچی گئی ہے

می کنم دیوانگی تا بر سرم غوغا شود
سکہ بر زری کنم تا ھاجتم پیدا شود

••

خانانِ خوقند کے سِکّوں پر فارسی شعر

ماوراءالنہر کے اس خاندان کی حکومت ۱۷۰۰ء تا ۱۸۷۶ء م ۱۱۱۲ھ تا ۱۲۹۳ھ فرغانہ میں قائم تھی۔ اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ شاہ رُخ بیگ چنگیز خاں کی نسل سے تھا۔ اس کے جانشینوں میں ایک حکمران نربوتا نے ۱۸۰۰ء میں تاشقند کے علاقے کو بھی اپنی حکومت میں ضم کرلیا۔ اپنے آخری دور میں اس خاندان کے حکمران بہت کمزور ہوگئے تھے اور نتیجتاً ۱۸۷۶ء میں زارِ روس نے ان کے علاقے کو اپنی عظیم مملکت میں شامل کرلیا۔

یوں تو اس خاندان میں سترہ حکمران ہوئے ہیں اور ان سبھوں کے سِکّے بھی دستیاب ہیں، لیکن فارسی شعر کا اندراج اس خاندان کے دسویں حکمران محمد علی کے سِکّوں پر پایا گیا ہے، جس میں اس نے اپنا نام ولدیت اور مقامِ ضرب کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

بفرغانہ زد سکّہ بر سیم و زر
محمد علی ابن غازی عمر

سکوں پر اشعار

سنسکرت

سمدراگپتا

معمولی وزن کی عام اشرفیاں

۱. سمرشت وی تت وجیو
جی تریپورہ جتو دِوم جیتی

۲. راجا ادِھراجا پرتھوی موتوا
دِوم جیتی ہری تادا جمیدھا

۳. کرتانت پر سورجیت
یحت راجاجیت جتھا

۴. اپرتی رتھو دجتی کشتم
سوچریتر دِوم جیستی

کاچاگپتا

کو گاما وجتی دِوم
کرمابھر تمائر جیتی

چندراگپتا ثانی

۱. ششتی موجتی سوچیا
ریتارئ دِوم جیشتی
وکرم دیتیھا

۲. نریندرا چندرھا
پرتھستا رنورینے جیتی جیو
بھوی سمھا وکرمھا

کماراگپتا

۱. وجتا ونی رونی پتھی
کماراگیتو دِوم جیتی

۲. گیت کولا دیوم شتی
جیتی جے یوجت ہبیندرھا

۳. گیت کولا ملاچندرو
ہبیندرا کرماجو جیتی

۴. پرتبوی تلیشوریندرھا
کماراگپتو جیتی (جبھا)

۵. چھتریپو کمارگپتو
راجہ تراتا جیتی ریم

اسکندگپتا

۱. وجتا ونی ردنی پتھی سری
سکندگپتو دِوم جیتی

عربی

ہارون الرشید عباسی

ایک سو ایک دیناروں کے مماثل ایک دینار
رُخ اول

۱۔ وَاَصْفَرُ مِن ضَرب دارِ الملوک
یَلُوحُ عَلَی وَجْهِهِ جَعْفَرا

رخ ثانی

۲۔ یزید علی مائة واحد ا
اذا نالَه مُعْسِرٌ یَیْسِرا

زیادة الله ثالث اغلبی

دس دیناروں کے مماثل ایک دینار
رخ اول

۱۔ یا سائرا نحوا الخلیفة قُل لَهُ
اِن قد کفاکَ اللهُ اَمرَکَ کلّهُ

۲۔ بزیادةِ اللهِ ابنِ عبدِ اللهِ سیـ
فِ اللهِ مِن دُونِ الخلیفة سَلّهُ

رخ ثانی

۳۔ ما اِن یَرَیٰ لکَ بالخلافِ مُنافق
اِلّا استباحَ حَرِیمَهُ واِذلّه

۲. مَن لَا یَرىٰ لک طَاعَۃً فَاللہِ قَدْ
اَعْمَاہُ عَنْ طُرُقِ الْھُدیٰ وَاَضَلَّہٗ

فخر الدولہ بُویہی

ایک ہزار دیناروں کے مماثل ایک دینار

ایک ہی رخ پر

ولم یحکی الشمسَ شکلاً وصورۃً
۱. فاوصافہٗ مُشتقۃٌ من صِفاتہٖ
فَاِن قیل دینارٌ فقد صَدَق اسمہٗ
۲. واِن قیلَ الفٌ کان بعض سِماتہٖ
بَدیعٌ ولم یُطبعْ علی الدھرِ مثلہٗ
۳. ولاَ ضُربت اضرابہ لسراتہٖ
فقد ابرزتہٗ دولۃٌ فلکیۃٌ
۴. اقام بھا الاقبالُ صدرَ قناتہٖ
وصار الی شاھنشاہ انتسابہٗ
۵. علی انہٗ مُستصغرٌ لِعُفاتہٖ
یُخَیِّرُ ان یبقی سنین کوزنہٖ
۶. لتَستبشرَ الدنیا بطولِ حیاتہٖ
تَاَنَّقَ فیہ عبدہٗ وابنُ عبدہٖ
۷. وغرسُ ایادیہ وکافی کُفاتہٖ

اسمٰعیل اول صفوی

عام روپے

۱. ناد علیاً مظہر العجائب
تجدہ عوناً لک فی النوائب

۲. کل ہمٍ وغمٍ سینجلی
بولایتک یا علی یا علی یا علی

محمد شاہ ثانی (گجرات) فارسی

تانبے کے سکے

۱۔ تا بدار الضرب گردوں قرص مہر و ماہ باد
سکۂ سلطاں غیاث الدین محمد شاہ باد

بہادر شاہ (گجرات)

تانبے کے سکے

۱۔ ہر کرا روی و رواجے ہست بر سطح زمیں
سکۂ اقبال شاہ ہند دارد بر جبیں

حسن شاہ (کشمیر)

عام اشرفیاں

۱۔ نگین خاتم ملک سلیماں
حسن شاہ ابن حیدر شاہ سلطاں

فتح شاہ (کشمیر)

عام اشرفیاں

۱۔ مہر دولت کہ مملکت گیر است
سکۂ فتح شاہ کشمیر است

ابراہیم عادل شاہ ثانی (بیجاپور)

تین تولے کی اشرفیاں

۱۔ نورس مہر عادل شاہی
جگت گرو داد الٰہی

محمد عادلشاہ (بیجاپور)

تانبے کے سکے اور چھوٹی اشرفیاں

۱. جھاں زایں دو محمد گرفتہ زینت و جاہ
یکے محمد مرسل دوم محمد شاہ

محمد قلی قطب شاہ (گولکنڈہ)

تانبے کے سکے

۱. تعبیر دہ فلوس شاھی
پیوستہ بلعنت الٰہی

شہنشاہِ اکبر

ایک سو تولے کی اشرفی

رخِ اول

۱. خورشید کہ ہفت بحر از او گوہر یافت
سنگ سیہ از پرتو آں جوہر یافت
کان از نظر تربیت او زر یافت
واں زر شرف از سکہ شہ اکبر یافت

رخِ ثانی

۲ ایں سکہ کہ پیرایۂ امید بود
با نقشِ دوامِ نامِ جاوید بود
سیمائے سعادتش ہمیں بس کہ بدھر
یک ذرہ نظر کردۂ خورشید بود

پچاس تولے کی اشرفی

۳ ایں نقد رواں گنج شاہنشاہی
با کوکب اقبال کند ہمراہی
خورشید بہ پرورش ازاں رُو کہ بدھر
یابد شرف از سکۂ اکبر شاہی

پچیس تولے کی اشرفی

۴ ایں سکہ کہ دست بخت را زیور باد
پیرایۂ نہ سپہر و ہفت اختر باد
زرین نقدیست کار ازو چوں زر باد
در دہر رواں بنام شہ اکبر باد

عام وزن کی معمولی اشرفیاں اور روپے

۵ سعادت یافت دینار جلالی
ز مہر نام اکبر شاہ عالی

۶ زر است از مہر اکبر بادشاہ نور
برآں زر نام شہ نورعلی نور

۷ تا زمین و آسمان را مہر انور زیوراست
مہر مُہر شاہ اکبر آبروے ایں زراست

۸ ہمیشہ ہمچو زر مہر و ماہ رائج باد
بغرب و شرق جہاں سکۂ الہ آباد

۹ ہمیشہ چوں زر خورشید و ماہ رائج باد
بغرب و شرق جہاں سکۂ الہ آباد

۱۰ رواج سکۂ اللہ اکبر
بود با قلعۂ باندھو برابر

۱۱ سکۂ بنگالہ زاں دلخواہ شد
کا بر ویش ضرب اکبر شاہ شد

شہنشاہ جہانگیر

ایک ہزار تولے کی اشرفی

رُخ اول

۱ ہزار گونہ شرف یافت روی سکہ د زر
زنقش نام جہانگیر شاہ شاہ اکبر
عجب نباشد اگر زار زوے سکہ او
بسکہ خانہ اش آمد ز آسماں اختر

رخ ثانی

۲ زفیض دیدن مہر ہزار تولچہ اش
ہزار بار ببالد ز ذوق نور نظر
بنام نامی اُو باد سکہ و خطبہ
بدہر تا بود از سکہ و ز خطبہ اثر

پانچ تولے کی اشرفی

رخ اول

۳ از شاہ جہانگیر بود دورِ زماں
در آگرہ ز نام اوست زر نورفشاں

رخ ثانی

۴ تاہست نشان پنج نوبت بجہاں
ایں سکہ پنج مہریش باد رواں

معمولی وزن کی عام اشرفیاں اور روپے

۵ حروف جہانگیر و اللہ اکبر
ز روزِ ازل در عدد شد برابر

۶ مالک الملک سکہ زد بر زر
شاہِ سلطاں سلیم شہ اکبر

۷ قضا بر سکۂ زر کرد تصویر
شبیہ حضرت شاہ جہانگیر

۸ بخط نور بر زر کلک تقدیر
رقم زد شاہ نور الدیں جہانگیر

۹ روی زر را ساخت نورانی برنگ مہر و ماہ
شاہ نورالدیں جہانگیر ابنِ اکبر بادشاہ

۱۰ ساخت روی زر زنور سکّہ یکسر مہر و ماہ
شاہ نورالدیں جہانگیر ابنِ اکبر بادشاہ

۱۱ شد چو خور زیں سکّہ نورانی جہاں
آفتاب مملکت تاریخ آں

۱۲ تا زند از نام جہانگیر شاہ
سکّہ بود نور دہِ مہر و ماہ

۱۳ بہفت کشور ایں زر ہمیشہ باد رواں
زنقش نام جہانگیر بادشاہ زماں

۱۴ بروی سکۂ زر داد چندیں زینت و زیور
شبیہ شاہ نور الدیں جہانگیر ابن شہ اکبر

۱۵ بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

۱۶ سکہ زد در شہر کابل خسرو گیتی پناہ
شاہ نور الدیں جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

۱۷ ہمیشہ باد ز دار العباد حی و قدیم
رواج سکۂ کابل بنام شاہ سلیم

۱۸ سکۂ قندھار شد دلخواہ
از جہانگیر شاہ اکبر شاہ

۱۹ بدھر باد رواں تا فلک بود در دور
بنام شاہ جہانگیر سکۂ لاہور

۲۰ بحکم شاہ جہانگیر سکۂ لاہور
ز نام نور جہاں بادشاہ شد پُر نور

ز نام شاه جهانگیر تا شود پُر نور
۲۱ فزوده نورجهان روئ سکهٔ لاهور

همیشه بادا بر روی سکهٔ لاهور
۲۲ ز نام شاه جهانگیر شاه اکبر نور

زر لاهور شد در ماه بهمن چوں مہِ انور
۲۳ بدور شاه نورالدیں جهانگیر ابن شاه اکبر

در اسفندارمز ایں سکّہ در لاهور زد بر زر
۲۴ شہنشاہِ امم شاه جهانگیر ابن شاه اکبر

بفرور دیں زر لاهور شد رشک مہِ انور
۲۵ ز نور سکهٔ شاه جهانگیر ابن شاه اکبر

مہِ اردی بهشت ایں سکّہ در لاهور زد بر زر
۲۶ شهنشاه زماں شاه جهانگیر ابن شاه اکبر

بماه تیر در لاهور زد ایں سکّہ را بر زر
۲۷ پناه ملک دیں شاه جهانگیر ابن شاه اکبر

جهاں فروز بہ کشمیر گشت سکّهٔ زر
۲۸ ز نور نام جهانگیر شاه شاه اکبر

۲۹ زر فتح و نصرت جہانگیر شاہ
به دہلی زد از فیض لطف الله

۳۰ سکه زد در شہر اگره خسرو گیتی پناه
شاه نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاه

۳۱ سکهٔ اگره داد زینت زر
از جہانگیر شاه شاه اکبر

۳۲ زد باگره سکهٔ شاہی بزر در مہر و ماه
شاه نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاه

۳۳ یافت در اگره روئی زر زیور
از جہانگیر شاه شاه اکبر

۳۴ باگره سکه زد در ماه آذر شاه بحر و بر
شہنشاه زماں شاه جہانگیر ابنِ شاه اکبر

۳۵ سکّه در بہمن باگره زد بزر ظلّ الله
شاه نورالدین جہانگیر ابنِ اکبر بادشاه

۳۶ در اسفندار مُز ایں سکّه را در اگره زد بر زر
شہنشاه زماں شاه جہانگیر ابنِ شاه اکبر

۳۷ بفرودیں زد اگرہ فروزاں گشت چوں اختر
زنور سکۂ شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

۳۸ در مہ آباں باگرہ سکہ زد ظل اللہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

۳۹ بفتح پور فروزندہ گشت سکۂ زر
ز نور نام جہانگیر شاہ شاہ اکبر

۴۰ جہاں فروز باجمیر گشت سکۂ زر
ز نور نام جہانگیر شاہ شاہ اکبر

۴۱ زد بزر ایں سکہ در اجمیر شاہ دیں پناہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

۴۲ در اجمیر زد سکۂ فتح بر زر
جہانگیر شاہ شہنشاہ اکبر

۴۳ در بداؤں سکہ زد سلطان گردوں بارگاہ
شاہ نورالدیں جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

۴۴ ہمیشہ نور زر سکۂ الٰہ آباد
ز نام شاہ جہانگیر شاہ اکبر باد

۴۵ سکہ زد در شہر پٹنہ خسرو عالم پناہ
شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

۴۶ سکہ در اکبر نگر زد شاہ گردوں بارگاہ
شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

۴۷ ساخت روی زر ز نور سکہ یکسر مہر و ماہ
شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

۴۸ باد رواں تا کہ بود دورِ ماہ
سکۂ اُردوے جہانگیر شاہ

۴۹ باردو سکہ در راہ دکن زد شاہ بحر و بر
شہنشاہ زماں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

۵۰ سکہ زد در شہر برہانپور شاہ دیں پناہ
شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

۵۱ بماندو سکۂ فتح دکن زد شاہ بحر و بر
شہنشاہ زماں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

۵۲ دہد بنور جہانے و مہر و مہ پرتو
ز نام شاہ جہانگیر سکۂ مندو

۵۳ پس از فتح دکن آمد چو در گجرات از ماندو
بزر این سکّہ زد شاہ جہانگیر ظفر پرتو

۵۴ شہنشاہ اکبر جہانگیر شاہ
زر و نور داد احمد آباد را

۵۵ الٰہی تا جہاں باشد رواں باد
بشرق و غرب مہر احمد آباد

۵۶ زر احمد آباد را داد زیور
جہانگیر شاہ شہنشاہ اکبر

۵۷ سکّہ زد در احمد آباد از عنایات اللہ
شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

شہنشاہ شاہ جہاں

دو سو تولے کی اشرفی

رُخ اول

۱۔
از صدق ابی بکر شد ایماں انور
اسلام قوی دست شد از عدل عمر
دیں تازہ شد از شرم و حیاے عثماں
وز علم علی یافت ولایت زیور

رُخ ثانی

۲۔
سکہ بر مہر دو صد مہری زد از لطف الٰہ
ثانی صاحب قراں شاہ جہاں دیں پناہ
روی زر باد از نقش سکہ اش عالم فروز
تا شود از پرتو خورشید روشن روی ماہ

ایک سو تولے کی اشرفی

رُخِ اول

۳۔
از صدق ابی بکر شد ایماں انور
اسلام قوی دست شد از عدل عمر
دیں تازہ شد از شرم و حیائے عثماں
وز علم علی یافت ولایت زیور

رُخ ثانی

۴۔
شد شاہ جہاں چو بادشاہ عالم
بخشید ز جود گنجہا در یکدم
یک مہر ز صد مہر بفرمود از انکہ
صد مہر کند بجای یک مہر کرم

۵۔ زر سپہر کند مہر از سر افرازی
نثار شاہ جہاں شاہ خرم غازی

۶۔ سکہ شاہ جہاں آباد رائج در جہاں
جاوداں بادا بنام ثانی صاحب قراں

مُراد بخش

عام اشرفی اور روپیہ

۱۔ گرفت ارث ز صاحب قراں شہ ثانی
مراد بخش محمد سکندر ثانی

شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر

ایک سو تولے کی اشرفی

رُخ اوّل

۱۔ شاہ اورنگ زیب عالم گیر
آسماں قدرت و قضا تدبیر
روی زر از فروغ سکہ او
گشت روشن بسان مہر منیر

رُخ ثانی

۲۔ شاہ عالم گیر دریائی کرم اورنگ زیب
آنکہ از قسمت سخایش آب می گرد سحاب
از فروغ سکہ اش در عرصۂ ہندوستان
گشت روشن روی زر چوں روی ماہ و آفتاب

عام اشرفی

۳۔ سکہ زد در جہاں چو مہرِ مُنیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

عام روپیہ

۴۔ سکہ زد در جہاں چو بدرِ مُنیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اعظم شاہ

عام اشرفی اور عام روپیہ

۱۔ سکہ زد در جہاں بدولت و جاہ
بادشاہ ممالک اعظم شاہ

۲۔ نگیں سلیماں کہ تابندہ بود
بر اُو اسمِ اعظم ہمیں کندہ بود

کام بخش

عام اشرفی اور عام روپیہ

۱۔ در دکن زد سکہ بر خورشید و ماہ
بادشاہ کام بخش دیں پناہ

شاہ عالم بہادر شاہ

دس تولے کی اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد در جہاں بفضلِ اللہ
شاہ ہندوستاں بہادر شاہ

عام اشرفیاں اور روپے

۲۔ بزر زد سکۂ صاحب قرانی
بہادر شاہ عالم گیر ثانی

۳۔ بزر زد سکۂ صاحب قرانی
معظم شاہ عالم گیر ثانی

۴۔ سکہ زد در ہفت کشور چتر زد بر مہر و ماہ
ثانی شاہ جہاں سُلطاں معظم بادشاہ

عظیم الشان

عام روپیہ

۱۔ سکہ زد در جہاں بفتح و ظفر
بادشاہ عظیم دیں پرور

جہاندار شاہ

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ در آفاق زد سکہ بر مہر و ماہ
ابوالفتح غازی جہاندار شاہ

۲۔ در آفاق زد سکہ چوں مہر و ماہ
ابوالفتح غازی جہاندار شاہ

۳۔ بزد سکہ بر زر چو صاحب قرآں
جہاندارشہ بادشاہ جہاں

۴۔ بزد سکہ بر مہ چو صاحب قراں
جہاندار شہ بادشاہ جہاں

۵۔ بزد سکہ بر نقرہ چوں مہر و ماہ
ابو الفتح غازی جہاندار شاہ

۶۔ بزد سکہ در دہر چوں مہر و ماہ
ابو الفتح غازی جہاندار شاہ

۷۔ بزد سکہ در ملک چوں مہر و ماہ
شہنشاہ غازی جہاندار شاہ

فرخ سیر

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر
بادشاہ بحر و بَر فرخ سیر

۲۔ سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر
ثالث صاحب قراں فرخ سیر

رفیع الدرجات

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ زد سکہ بہند با ہزاراں برکات
شاہنشہ بحر و بر رفیع الدرجات

۲- زد سکہ بہند باہزاراں برکات
شاہنشہ آفاق رفیع الدرجات

۳- زد سکہ بہند باہزاراں برکات
شاہنشہ دادگر رفیع الدرجات

۴- زد سکۂ نصر باہزاراں برکات
شاہنشہ بحر و بر رفیع الدرجات

۵- سکہ زد شاہ رفیع الدرجات
مہر مانند بہ یمن و برکات

رفیع الدولہ شاہ جہاں ثانی

عام اشرفیاں اور روپے

۱- سکہ با امن و اماں زد در جہاں
ثانی صاحب قراں شاہ جہاں

۲ سکہ زد در جہاں با من و اماں
شاہ صاحب قراں ولی جہاں

نیکوسیر

عام اشرفیاں اور روپے

۱- بزر زد سکہ صاحب قرانی
شہ نیکوسیر تیمور ثانی!

محمد ابراھیم

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد در جہاں بفضلِ کریم
شاہ شاہاں محمد ابراہیم

محمد شاہ

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد درجہاں بلطف اللہ
بادشاہ زماں محمد شاہ

۲۔ سکہ زد درجہاں بفضلِ اللہ
بادشاہ زماں محمد شاہ

۳۔ زفضل حق شہنشاہ محمد شاہ دیں پرور
دریں عالم زدہ سکہ ز مہر و ماہ روشن تر

احمد شاہ

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ بر زر زدہ بفضل الٰہ
شاہ عالم پناہ احمد شاہ

عزیز الدین عالم گیر ثانی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ بزر زد سکہ صاحب قرانی
عزیز الدین عالم گیر ثانی

۲۔ بزر زد سکہ چوں صاحب قرانی
عزیز الدین عالم گیر ثانی!

۳۔ بیافت رونق ازیں سکہ زر چو مہر منیر
ز نام شاہ جہاں بادشاہ عالم گیر

۴۔ سکہ زد بر ہفت کشور ہمچو تاباں مہر و ماہ
شاہ عزیز الدین عالم گیر غازی بادشاہ

۵۔ مبارک سکۂ صاحب قرانی
عزیز الدین عالم گیر ثانی

شاہ عالم ثانی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد بر ہفت کشور سایۂ فضل الٰہ
حامی دین محمد شاہ عالم بادشاہ

۲۔ سکۂ صاحب قرانی زد ز تائید الٰہ
حامی دین محمد شاہ عالم بادشاہ

بیدار بخت

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ بزر سکہ زد وارث تاج و تخت
محمد جہاں شاہ بیدار بخت

۲۔ بزر سکہ زد والی تاج وتخت
محمد جہاں شاہ بیدار بخت

۳۔ سکہ زد در ہند از فضل اللہ
حامی دین نبی بیدار شاہ

اکبر ثانی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد در جہاں ز فضل اللہ
حامی دین محمد اکبر شاہ

۲۔ سکہ زد در جہاں بفضل اللہ
حامی دین محمد اکبر شاہ

۳۔ مبارک سکۂ صاحب قرانی
محمد اکبر چنگیز خانی

۴۔ بسیم و زر زدہ خوش سکۂ جہانبانی
چراغ دودۂ تیمور اکبر ثانی

بہادر شاہ ظفر

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ بسیم و زر زدہ شد سکہ بفضل اللہ
سراج دین ابوظفر شہ بہادر شاہ

۲۔ بزر زد سکۂ صاحب قرآنی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران اجرا شدہ مخصوص اشرفیاں

۳۔ بزر زد سکۂ نصرت طرازی
سراج الدین بہادر شاہ غازی

۴۔ چلے نہ اشرفیٔ آفتاب عالم میں
خطِ شعاع سے او سپر جو یہ نہ ہو تحریر

۵۔ ابوظفر شۂ والا گہر بہادر شاہ
سراج دین نبی سایۂ خدائے قدیر

۶۔ جہاں مسخّر و عالم مطیع و خلق مطاع
فلک مؤیّد و اختر معین و بخت نصیر

ٹیپو سلطان (میسور)

تین تا چار تولے کی اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد درجہاں بآسانی
شاہ ٹیپو سکندر ثانی

۲۔ دیں احمد درجہاں روشن زفتح حیدر است

غازی الدین حیدر (اودھ)

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد برسیم و زراز فضل رب ذوالمنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

نصیر الدین حیدر (اودھ)

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد برسیم و زراز فضل حق ظل اِلٰہ
نائب مہدی نصیر الدین حیدر بادشاہ

۲۔ بدہر سکۂ شاہی زدہ ز لطف اِلٰہ
سپہر مرتبہ شاہ جہاں سلیماں جاہ

۳۔ بگیتی سکہ زد چوں مہر انور
شہ عالم نصیر الدین حیدر

۴۔ سکہ زد بر سیم و زر تابندہ مثل مہر و ماہ
ظل سبحانی نصیر الدین حیدر بادشاہ

محمد علی شاہ (اودھ)

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ بجود و کرم سکہ زد در جہاں
محمد علی پادشاہ زماں

امجد علی شاہ (اودھ)

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ در جہاں زد سکۂ شاہی بتائید اللہ
ظل حق امجد علی شاہ زمن عالم پناہ

واجد علی شاہ (اودھ)

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد بر سیم و زر از فضل و تائید اللہ
ظل حق واجد علی سلطان عالم بادشاہ

رمضان علی برجیس قدر

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد بر سیم و زر چوں مہر و بدر
نیر دیں میرزا برجیس قدر

۲- سکہ زد از فضل حق بر اشرفی مہر و بدر
اختر سلطان عالم میرزا برجیس قدر

۳- سکہ زد اندر جہاں چوں ماہ بدر
شاہ رمضان علی برجیس قدر

۴- بزد سکہ در دہر چوں مہر و بدر
ابوالحرب قاآن برجیس قدر

رانی پرمتھیشوری (رنگپور- آسام)

چوکور روپے

۱- بحکم بیگم پرمتھی سری شاہ
زد سکہ چو مہر شیو سنگ شاہ

راجیشورا سمہا (رنگپور- آسام)

عام روپے

۱- سری راجیشر سنگھ عالم پناہ
زد ایں سکہ سلطان چو خورشید و ماہ

باندہ سنگھ (غیر منقسمہ پنجاب)

عام روپے

۱- سکہ زد در ہر دو عالم تیغ نانک واہب است
فتح گوبند شاہ شاہاں فضل ستا صاحب است

جسّا سنگھ (غیر منقسم پنجاب)

عام روپے

۱۔ سکہ زد در جہاں بفضل اکال
ملک احمد گرفت جسّا کلال

رنجیت سنگھ (غیر منقسم پنجاب)

عام روپے

۱۔ دیگ تیغ و فتح و نصرت بیدرنگ
یافت از نانک گورو گوبند سنگھ

رنجیت دیو (جموّں و کشمیر)

عام روپے

۱۔ لچھمی نرائن دل شاد کرد
خانۂ رنجیت دیو آباد کرد

ابراہیم علی خاں (ٹونک)

عام روپے

مبارک سکّہ زد از فضل یزداں
رئیس ٹونک ابراہیم علی خاں

تخت سنگھ (جودھپور)

عام اشرفیاں اور روپے

زر و سیم را سکہ زد تخت سنگھ
بعہد کوئن شاہ ہند و فرنگ

جسونت سنگھ (جودھپور)

ام اشرفیاں اور روپے

زد بعہد کوتن چو سکۂ بخت
گشت جسونت سنگھ وارث تخت

جسونت سنگھ (اندور)

عام روپے

زد سکۂ مبارک از ارض تا باختر
صاحب قِرانِ ثانی سلطاں محمد اکبر

اسمٰعیل ثانی صفوی

عام روپے

ا۔ زمشرق تا بمغرب گر امام است
علی و آل او مارا تمام است

محمد خدا بندہ

عام روپے

ا۔ لطف حق تا کہ درجہاں باقیست
سکۂ صاحب الزماں باقیست

عباس اول

عام روپے

ا۔ از بھر خیر ایں سکہ را
کلب علی عباس زد

صفی اول

عام روپے

۱۔ ہست از جاں غلام شاہ صفی

عباس ثانی

عام روپے

۱۔ بہ گیتی سکۂ صاحب قرانی
زد از توفیق حق عباس ثانی

۲۔ بہ گیتی آنکہ اکنوں سکۂ صاحبِ قرانی زد
ز توفیق خدا کلب علی عباس ثانی زد

۳۔ بود کلب علی عباس ثانی

سلیمان اوں صفی ثانی

عام اشرفیاں اور عام روپے

۱۔ سکہ زد بعد از شہ صاحبِ قراں
صاحب دوراں سلیماں جہاں

۲۔ بہر تحصیل رضائے مقتدائی اِنس و جاں
سکۂ خیرات بر زر زد سلیماں جہاں

۳۔ بہ گیتی بعد شہ عباس ثانی
صفی زد سکہ صاحب قرانی

۴۔ زبعد ہستی عباس ثانی
صفی زد سکہ صاحب قرانی

۵۔ از برائے صرف زوّار امام انس وجاں
تازہ از نام صفی شد سکۂ صاحب قراں

۶۔ سکۂ مہر علی را تا زدم بر نقد جاں
گشت از فضل خدا محکوم فرمانم جہاں

حسین اول صفوی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ زد ز توفیق حق بہ چہرۂ زر
سکہ سلطاں حسین دیں پرور

۲۔ گشت صاحب سکہ از توفیق رب المشرقین
در جہاں کلب امیر المومنیں سلطاں حسین

۳۔ گشت صاحب سکہ از توفیق رب المشرقین
کلب درگاہ امیر المومنیں سلطاں حسین

طہماسپ ثانی صفوی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد طہماسپ ثانی بر زر کامل عیار
لافتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

۲۔ بگیتی سکۂ صاحب قرانی
زد از توفیق حق طہماسپ ثانی

۳۔ از خراساں سکہ بر زر شد بتوفیق خدا
نصرت و امداد شاہ دیں علی موسیٰ رضا

احمد صفوی

عام روپے

۱۔ سکہ زد بر ہفت کشور چتر زد بر مہر و ماہ
وارث ملک سلیماں گشت احمد بادشاہ

عباس ثالث صفوی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ بر زر زد بتوفیق الٰہی در جہاں
ظل حق عباس ثالث ثانی صاحبقراں

سام صفوی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ بر زر زد بگیتی چوں طلوع نیرین
وارث ملک سلیماں سام بن سُلطاں حسین

۲ بندۂ شاہ ولایت
سام بن سلطاں حسین

سلیماں ثانی صفوی

عام روپے

۱۔ زد از لطف حق سکۂ کامرانی
شہ عدل گستر سلیمان ثانی

حسین ثانی صفوی

عام روپے

۱۔ دارد ز شاہ مرداں فرمان حکم رانی
فرزند شاہ طہماسپ سلطان حسین ثانی

محمد صفوی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ بزر زد سکہ از الطاف سرمد
شہ والا گہر سلطان محمد

میر اویس (افاغنہ)

عام روپے

۱۔ سکہ زد بر درہم دارالقرار قندھار
خان عادل شاہ عالم میر اویس نامدار

میر محمود

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ چو مہر و مہ زر شاہنشہی محمود عالم شد
کہ نقد قلبش از فیض خدا از غش مسلم شد

۲۔ دین حق را سکہ بر زر کرد از حکم الٰہ
عاقبت محمود باشد بادشاہ دیں پناہ

۳۔ سکہ زد از مشرق ایراں چو قرص آفتاب
شاہ محمود جہانگیر سیادت انتساب

۴۔ فرو رود بزمیں ماہ و آفتاب منیر
ز رشک سکۂ محمود شاہ عالمگیر

۵ سکۂ سلطاں حسیں نابود شد
شاہ ایراں عاقبت محمود شد

۶۔ بمحمود ارشد خداداد شاہی

میر اشرف

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ باشرفی اثر نام آنجناب رسید
شرف زسکۂ اشرف بر آفتاب رسید

۲۔ خور و مہ چوں طلا و نقرہ از فیضش منور شد
سر یر آفتاب از نام اشرف سکہ برزر شد

۳۔ ز الطاف شہ اشرف حق شعار
بزر نقش شد سکۂ چار یار

آزاد خاں باغی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ تاکہ آزاد در جہاں باشد
سکۂ صاحب الزماں باشد

نادرشاہ افشاری

عام اشرفیاں اور روپے

۱. سکہ بر زر کرد نام سلطنت را در جہاں
نادر ایران زمین و خسرو گیتی ستاں

۲. سکہ زد بر سیم و زر از فضل ربّ العٰلمین
بادشاہ ہفت کشور نادر ایران زمین

۳. دادہ زیب تازہ رو بر مہر و ماہ
سکۂ نادر شہ گیتی پناہ

۴. ہست سلطان بر سلاطین جہاں
شاہ شاہاں نادر صاحبقراں

۵. خادم شاہ نجف زیبندۂ تاج و نگیں
بادشاہ دادگستر نادر ایران زمیں

۶. نادرم در ملک ایراں قادرم بر ہر دیار
لافتیٰ الا علیٰ لاسیف الا ذوالفقار

۷. نگیں دولت و دیں چوں کہ رفتہ بود زجا
بنام نادر ایران قرار داد خدا

عادل شاہ افشاری

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ زبعد نادر دوراں عدالت سکہ بر زر شد
بنام شاہ دیں سلطاں علی عالم منور شد

۲۔ گشت رائج بحکم لم یزلی
سکۂ سلطنت بنام علی

ابراھیم شاہ افشاری

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ زفیض حضرت باری و سرنوشت قضا
رواج یافت بزر سکۂ امام رضا

۲۔ سکۂ صاحبقرانی زد بتوفیق اللہ
ہمچو خورشید جہاں افروز ابراہیم شاہ

شاہرخ افشاری

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد درجہاں بحکم خدا
شاہ رخ کلب آستان رضا

۲۔ سکہ زد از سعی نادر ثانی صاحبقراں
کلب سلطان خراساں شاہرخ شاہ جہاں

۳۔ امر شد از شاہ شاہاں نادر صاحبقراں
سکہ یابد در ہرات از شاہرخ نام ونشاں

۴۔ یافت از الطاف احمد بادشاہ
شاہرخ برتخت شاہی جایگاہ

۵۔ دوبارہ دولت ایراں گرفت از سر جوانی را
بنام شاہرخ زد سکۂ صاحبقرانی را

کریم خاں زند

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ شد آفتاب و ماہ زر و سیم در جہاں
از سکۂ امام بحق صاحب !!

محمد حسن قاچار

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ بزر سکہ از میمنت زد قضا
بنام علی ابن موسیٰ رضا

۲۔ باشد چو آفتاب زر و سیم در جہاں
از سکۂ امام بحق صاحب الزماں

۳۔ شد زیمن دین حق رائج بتوفیق خدا
سکۂ اقبال برنام علی موسیٰ رضا

آقا محمد قاچار

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ بر عرش بریں فگندہ مسند
شاہنشہ انبیا محمد

۲۔ تا زر و سیم درجہاں باشد
سکۂ صاحب الزماں باشد

۳۔ تا زر و سیم را نشاں باشد
سکۂ صاحب الزماں باشد

فتح علی شاہ قاچار

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ آمدہ سکۂ شاہی بزر از فتحعلی

۲۔ سکۂ فتحعلی شہ خسرو صاحبقراں

۳۔ سکۂ فتحعلی شہ خسرو کشورستاں

۴۔ شاہ شاہان جہاں فتحعلی

محمد حسن خاں سالار

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ بر زر میزند سالار دیں
یاورش باشد امیرالمومنیں

ناصرالدین شاہ قاچار

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد بر ہفت کشور چتر زد بر مہر و ماہ
ناصر دین محمد ناصرالدیں بادشاہ

احمد شاہ دُرّانی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ حکم شد از قادر بیچوں باحمد بادشاہ
سکہ زن بر سیم و زر از اوج ماہی ما بماہ

سلیمان شاہ

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکہ زد بر سیم و زر چوں مہر و ماہ
شہ سلیماں ابن احمد بادشاہ

۲۔ سیم و زر را سرفرازی داد چوں خورشید و ماہ
وارث شاہنشۂ دوراں سلیماں بادشاہ

۳۔ سکہ زد بر سیم و زر از فضل و الطاف الٰہ
شاہ دُرّانی سلیماں شاہ گردوں بارگاہ

تیمور شاہ دُرّانی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ بحکم خدا و رسول انام
بزد سکہ تیمور شاہ نظام

۲۔ چرخ می آرد طلا و نقرہ از خورشید و ماہ
تا کند بر چہرہ نقش سکۂ تیمور شاہ

ہمایوں شاہ دُرّانی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ درجہاں شد سیم و زر روشن تر از خورشید و ماہ
تاکہ بر او نقش شد نام ہمایوں بادشاہ

زماں شاہ دُرّانی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ زر و سیم شد مہر و مہ درجہاں
بنام زماں شاہ شاہ زماں

۲۔ قرار یافت بحکم خدائے ہر دو جہاں
رواج سکۂ دولت بنام شاہ زماں

۳۔ بزد سکہ بر زر بحکم الٰہی
زماں شاہ شاہ یمین و یساری

محمود شاہ دُرّانی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکۂ دولت سُلطاں محمود
حُسن دیگر بزر و سیم فزود

۲۔ سکہ بر زر زد بتوفیقِ اللہ
خسرو گیتی ستاں محمود شاہ

شاہ شجاع دُرّانی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سکّہ زد بر سیم و زر روشن‌تر از خورشید و ماہ
حامی دین نبی سُلطاں شجاع الملک شاہ

۲۔ سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر
شہ شجاع الملک شاہ بحر و بر

۳۔ سکہ زد بر سیم و زر از فضل خاص کردگار
خسرو گیتی ستاں شاہ شجاع نامدار

۴۔ سکہ زد بر سیم و زر چوں مہر و ماہ
شاہ دیں پرور شجاع الملک شاہ

۵۔ رونق آفاق شد بر سیم و زر
سکۂ شاہ شجاع نامور

قیصر شاہ دُرّانی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ سیم و زر در جہاں بحکم اللہ
گشت رائج بنام قیصر شاہ

نورالدین شاہ دُرّانی

عام اشرفیاں اور روپے

سکہ روشن شد ز شاہ نورالدین
۱۔ رائج از مخدوم قطب العارفین

ایوب شاہ دُرّانی

عام اشرفیاں اور روپے

شاہ ایوب سکہ بر زر و سیم
۱۔ زد بتائید کردگار عظیم

شد جہاں روشن تر از خورشید و ماہ
۲۔ از شعاع سکۂ ایوب شاہ

کامران شاہ دُرّانی

عام اشرفیاں اور روپے

طلا از مہر تا زد نقرہ از ماہ
۱۔ ز فیض نقش نام کامراں شاہ

شہ پور شاہ دُرّانی

عام اشرفیاں اور روپے

سکہ زد از فیض و الطاف الٰہ
۱۔ خسرو عالم ستاں شہ پور شاہ

امیر دوست محمد بارق زائی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ شمس و قمر به سیم و طلا مید هد نوید
وقت رواج سکهٔ پاینده خاں رسید

۲۔ بزد زعین عنایات خالق اکبر
امیر دوست محمد دوباره سکهٔ زر

۳۔ کمر ببست و بزد سکهٔ بعزم جهاد
امیر دوست محمد که ناصرش حق باد

امیر شیر علی

عام اشرفیاں اور روپے

۱۔ ز التفات کثیر امیر نیک ضمیر
امیر شیر علی سکه زد چو بدر منیر

۲۔ جمال دولت پاینده قسمت ازلی است
ز بعد دوست محمد امیر شیر علی است

۳۔ ز عین مرحمت کردگار لم یزلی
بیافت سکهٔ رواج از امیر شیر علی

۴۔ شد از عنایت و الطاف شاه لم یزلی
رواج سکه بنام امیر شیر علی

شد ز فضلِ خدائے لم یزلی
۵۔ والیٔ قندھار شیر علی

سکہ زد در جہاں چو بدر جلی
۶۔ بار دویم امیر شیر علی

امیر محمد افضل

عام اشرفیاں اور روپے

دو فوج مشرق و مغرب زہم مفصّل شد
۱۔ امیر ملک خراساں محمد افضل شد

امیر محمد اعظم

عام اشرفیاں اور روپے

چو از عنایت و الطاف حق ملزّم شد
۱۔ رواج سکہ بنام محمد اعظم شد

محمد جان باغی

عام اشرفیاں اور روپے

می کنم دیوانگی تا بر سرم غوغا شود
سکہ بر زر می کنم تا صاحبش پیدا شود

محمد علی (خوقند)

عام اشرفیاں اور روپے

بظفر خانہ زد سکہ بر سیم و زر
۱۔ محمد علی ابن غازی عمر

فہرست مآخذ اشعار

سنسکرت

نام حکمران	سلسلۂ نشان شعر	صفحہ کتاب	صراحت مآخذ
گپتا خاندان			
سمدرا گپتا	۱	۱۴۱	دی گپتا گولڈ کوائنس ان دی بیانہ ہورڈ مرتبہ اے۔ ایس الٹیکر شائع کردہ نیومسمیاٹک سوسائیٹی آف انڈیا سنہ ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۲
ایضاً	۲	۱۴۱	صفحہ ۴۶
ایضاً	۳	۱۴۱	صفحہ ۵۰
ایضاً	۴	۱۴۱	صفحہ ۵۵
کاچا گپتا	۱	۱۴۱	صفحہ ۶۳
چندرا گپتا ثانی	۱	۱۴۱	صفحہ ۱۸۴
ایضاً	۲	۱۴۲	صفحہ ۲۰۴
کمارا گپتا	۱	۱۴۲	صفحہ ۲۲۴
ایضاً	۲	۱۴۲	صفحہ ۲۴۸

ایضاً	۳	۱۴۲	صفحہ ۲۵۷
ایضاً	۴	۱۴۲	صفحہ ۲۶۹
ایضاً	۵	۱۴۲	صفحہ ۳۰۱
اسکند گپتا	۱	۱۴۲	صفحہ ۳۰۸
		عربی	
خلفائے عباسیہ			
ہارون الرشید	۱	۱۴۳	الذخائر والتحف مصنفہ قاضی ابن الزبیر مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی مطبوعہ کویت ۱۹۵۹ء صفحات ۲۲۴ تا ۲۲۵
ایضاً	۲	۱۴۳	ایضاً ایضاً
اغلبی حکمران			
زیادۃ اللہ ثالث اغلبی	۱	۱۴۳	ایضاً ایضاً
ایضاً	۲	۱۴۳	ایضاً ایضاً
ایضاً	۳	۱۴۳	ایضاً ایضاً
ایضاً	۴	۱۴۴	ایضاً ایضاً
بویہی حکمران			
فخر الدولہ بویہی	۱	۱۴۳	الکامل فی التاریخ مصنفہ ابن الاثیر

			مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۶۳ء جلد نہم صفحہ ۴۱
ایضاً	۲	۱۴۴	ایضاً ایضاً
ایضاً	۳	۱۴۴	ایضاً ایضاً
ایضاً	۴	۱۴۴	ایضاً ایضاً
ایضاً	۵	۱۴۴	ایضاً ایضاً
ایضاً	۶	۱۴۴	ایضاً ایضاً
ایضاً	۷	۱۴۴	ایضاً ایضاً
صفوی حکمران			
اسمٰعیل اول	۱	۱۴۵	اے میانول آف مسلمان نیومسمیاٹکس مرتبہ اوکوڈرنگٹن شائع کردہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن سنہ ۱۹۰۴ء صفحہ ۹۵
ایضاً	۲	۱۴۵	ایضاً ایضاً
		فارسی	
سلاطین گجرات			
محمد شاہ	۱	۱۴۶	۱. مراۃ سکندری ۲. کیٹیلاگ آف دی کوائنس آف سلطانس آف گجرات ان دی پرنس آف ویلز میوزیم بمبئی مرتبہ جی اُو آچاریہ سنہ ۱۹۵۳ء صفحات انٹروڈکشن XXI XX

بہادر شاہ	۱	۱۴۶	ایضاً ایضاً
سلاطینِ کشمیر			
حسن شاہ	۱	۱۴۶	نیومِسمیاٹک کرانیکل XIII سلسلۂ پنجم صفحہ ۲۶۳ تحریر آر بی وائٹ ہیڈ۔
فتح شاہ	۱	۱۴۶	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۶۴
عادل شاہی حکمران			
ابراہیم عادل شاہ ثانی	۱	۱۴۶	ہسٹری آف میڈی ایول دکن مرتبہ پروفیسر ہارون خاں شروانی جلد اول صفحہ ۳۹۷ شائع کردہ حکومت آندھرا پردیش سنہ ۱۹۷۳ء

محمد عادل شاہ	۱	۱۴۷	جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سنہ ۱۹۱۰ء نیو مسمیاٹک سپلمنٹ شمارہ XV صفحہ ۶۸۴
قطب شاہی حکمران			
محمد قلی قطب شاہ	۱	۱۴۷	جرنل آف نیو مسمیاٹک سوسائٹی آف انڈیا جلد XX نمبر XIV سکہ نشان ۱۰، تحریر کردہ ڈنکر راؤ۔
سلاطین مغلیہ			
شہنشاہ اکبر،	۱	۱۴۸	۱. آئین اکبری مصنفہ ابو الفضل مرتبہ سید احمد خان صفحہ ۱۷ ۲. النقود الاسلامیہ، سلاطین مغلیہ کے عظیم مسکوکات نوشتہ حکیم شمس اللہ قادری، تاج پریس حیدرآباد صفحہ ۱۸
ایضاً	۲	۱۴۸	ایضاً
ایضاً	۳	۱۴۸	ایضاً
ایضاً	۴	۱۴۸	ایضاً
ایضاً	۵	۱۴۹	کیٹلاگ آف کوائنس ان دی پراونشل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی جے براؤن جلد اول صفحہ ۱۷ شائع کردہ آر سی پبلیشر لمیٹڈ سنہ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۶	۱۴۹	ایضاً ایضاً
ایضاً	۷	۱۴۹	دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف ہندوستان ان دی برٹش میوزیم لندن مرتبہ اسٹینلی لین پول

			صفحہ ۳۶۶ شائع کردہ انٹر انڈیا پبلیکیشنز نئی دہلی سنہ ۱۹۸۳ء
ایضاً	۸	۱۴۹	ایضاً ایضاً
ایضاً	۹	۱۴۹	گنج شایگاں مولفہ محمد رفیع موہانی عالی مطبوعہ مراد آباد سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱۹
ایضاً	۱۰	۱۴۹	کیٹلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی جے براؤن جلد اول صفحہ ۱۸ شائع کردہ آر سی پبلیشرز لمیٹیڈ سنہ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۱۱	۱۴۹	ایضاً ایضاً
شہنشاہ جہانگیر	۱	۱۵۰	دی کیٹلاگ فار دی سیل آف ٹوجینٹ گولڈ مہرس آف جہانگیر اینڈ شاہ جہاں جینوا سوئیٹزرلینڈ بابتہ نومبر سنہ ۱۹۸۷ء صفحہ ۲
ایضاً	۲	۱۵۰	ایضاً صفحہ ۹
ایضاً	۳	۱۵۰	کیٹلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم لکھنؤ، مرتبہ سی جے براؤن جلد اول صفحہ ۲۲ شائع کردہ آر سی پبلیشرز لمیٹیڈ سنہ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۴	۱۵۰	ایضاً ایضاً
ایضاً	۵	۱۵۱	دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف ہندوستان اِن دی برٹش میوزیم، مرتبہ اسٹینلی لین پول صفحہ ۳۶۸ شائع کردہ انٹر انڈیا پبلیکیشنز نئی دہلی سنہ ۱۹۸۳ء
ایضاً	۶	۱۵۱	ایضاً ایضاً صفحہ ۳۶۶
ایضاً	۷	۱۵۱	کیٹلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم

			لکھنؤ مرتبہ سی، جے، براؤن جلد اول صفحہ ۱۹، شائع کردہ آر، سی، سینیر لمیٹیڈ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۸	۱۵۱	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۷
ایضاً	۹	۱۵۱	ایضاً ایضاً صفحہ ۱۸
ایضاً	۱۰	۱۵۱	فہرست سکہ جات مرتبہ محمد عبدالعزیز خاں بریلوی وکیل فرخ آباد بحکم مارک تھارنل جج فرخ آباد صفحہ ۱۱
ایضاً	۱۱	۱۵۱	کیٹلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم لکھنؤ، مرتبہ سی، جے، براؤن جلد اول صفحہ ۲۷ شائع کردہ آر، سی، سینیر لمیٹیڈ ۱۹۸۶ء نئی دہلی۔
ایضاً	۱۲	۱۵۱	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۴
ایضاً	۱۳	۱۵۲	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۰
ایضاً	۱۴	۱۵۲	ایضاً ایضاً صفحہ ۱۹
ایضاً	۱۵	۱۵۲	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۷
ایضاً	۱۶	۱۵۲	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۴
ایضاً	۱۷	۱۵۲	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۴
ایضاً	۱۸	۱۵۲	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۱۹	۱۵۲	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۵
ایضاً	۲۰	۱۵۲	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۷
ایضاً	۲۱	۱۵۳	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۲۲	۱۵۳	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۶
ایضاً	۲۳	۱۵۳	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۵
ایضاً	۲۴	۱۵۳	کیٹلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم

			لکھنؤ" مرتبہ سی جے' براؤن جلد اول صفحہ ۲۵ شائع کردہ آر سی سینیر لمیٹیڈ دہلی ۱۹۸۶ء
ایضاً	۲۵	۱۵۳	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۲۶	۱۵۳	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۶
ایضاً	۲۷	۱۵۳	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۲۸	۱۵۳	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۵
ایضاً	۲۹	۱۵۴	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۳
ایضاً	۳۰	۱۵۴	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۱
ایضاً	۳۱	۱۵۴	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۳
ایضاً	۳۲	۱۵۴	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۱
ایضاً	۳۳	۱۵۴	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۲
ایضاً	۳۴	۱۵۴	سم نوٹیبل مغل کوائنس ان لکھنؤ میوزیم تحریر کردہ سی آر' سنگھال ۔ جرنل آف نیو مسمیاٹک سوسائٹی آف انڈیا شمارہ XXV ۱۹۶۳ء حصہ دوم صفحہ ۱۸۲
ایضاً	۳۵	۱۵۴	کیٹلاگ آف دی کوائنس ان دی پراونشل میوزیم لکھنؤ' مرتبہ سی' بے' براؤن جلد اول صفحہ ۲۲' شائع کردہ آر سی' سینیر لمیٹیڈ ۱۹۸۶ء
ایضاً	۳۶	۱۵۴	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۳۷	۱۵۵	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۳۸	۱۵۵	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۳۹	۱۵۵	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۴

ایضاً	۴۰	۱۵۵	دی کوائنس آف دی مغل ایمپرس آف انڈیا کلکٹیڈ بائی چارلس ٗ جے راجرس اینڈ پرچیزڈ بائی دی پنجاب گورنمنٹ مرتبہ سر جمس لایال اینڈ ایچ سی. فانشو طبع کردہ منجانب حکومت پنجاب ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۴۰
ایضاً	۴۱	۱۵۵	ایضاً ایضاً صفحہ ۱۳۶
ایضاً	۴۲	۱۵۵	کیٹلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی ٗ جے ٗ براؤن جلد اول صفحہ ۱۹ شائع کردہ آرسی بینیر لمیٹیڈ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۴۳	۱۵۵	گنج شائیگاں مولف محمد رفیع موہانی عالی ٗ مطبوعہ مرادآباد ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱۹
ایضاً	۴۴	۱۵۵	کیٹلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی ٗ جے ٗ براؤن جلد اول صفحہ ۲۳ شائع کردہ آرسی بینیر لمیٹیڈ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۴۵	۱۵۶	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۴۶	۱۵۶	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۱
ایضاً	۴۷	۱۵۶	فہرست سکہ جات مرتبہ محمد عبدالعزیز خاں بریلوی وکیل فرخ آباد بحکم مارک تھارنل ٗ جج فرخ آباد صفحہ ۱۱
ایضاً	۴۸	۱۵۶	کیٹلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی ٗ جے ٗ براؤن جلد اول صفحہ ۲۱ شائع کردہ آرسی بینیر لمیٹیڈ ۱۹۸۶ء دہلی

ایضاً	۴۹	۱۵۶	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۵۰	۱۵۶	کیٹیلاگ آف کوائنس ان دی پراونشل میوزیم لکھنؤ، مرتبہ سی جے براؤن جلد اول صفحہ ۲۳ شائع کردہ آر سی بینیر لمیٹیڈ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۵۱	۱۵۶	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۶
ایضاً	۵۲	۱۵۶	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۵۳	۱۵۷	سکہ جات سلاطین مغلیہ کے ابیات نوشتہ حکیم سید شمس اللہ قادری صفحہ ۲۶ مطبوعہ شمسی پریس آگرہ۔
ایضاً	۵۴	۱۵۷	دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس مرتبہ آر بی وائٹ ہیڈ سکہ نمبر ۸۹۱
ایضاً	۵۵	۱۵۷	کیٹیلاگ آف کوائنس ان دی پراونشل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی جے براؤن جلد اول صفحہ ۲۰ شائع کردہ آر سی بینیر لمیٹیڈ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۵۶	۱۵۷	دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف انڈیا کلکٹیڈ بائی چارلس جے راجرس اینڈ پرچیزڈ بائی دی پنجاب گورنمنٹ مرتبہ سر جیمس للایال اینڈ سی ایچ فانشو طبع کردہ منجانب حکومت پنجاب ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۵۲
ایضاً	۵۷	۱۵۷	ایضاً ایضاً صفحہ ۱۳۱
شہنشاہ شاہجہاں	۱	۱۵۸	النقود الاسلامیہ (سلاطین مغلیہ کے مسکوکات عظیم) مصنفہ حکیم سید شمس اللہ قادری مطبوعہ تاج پریس

			حیدر آباد صفحہ ۲۶ ، ۲۷
ایضاً	۲	۱۵۸	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۳	۱۵۸	دی کیٹلاگ فار دی سیل آف ٹوجینٹ گولڈ مہرس آف جہانگیر اینڈ شاہ جہاں ۔ جینوا سوئٹزرلینڈ بابتہ نومبر سنہ ۱۹۸۷ء صفحہ ۱۳
ایضاً	۴	۱۵۸	ایضاً ایضاً صفحہ ۱۲
ایضاً	۵	۱۵۹	جرنل آف نیومسمیاٹک سوسائٹی آف انڈیا جلد XXVII سنہ ۱۹۶۵ء صفحات ۱۰۸ ، ۱۰۹ آرٹیکل تحریر کردہ ضیاء الدین احمد دیسائی
ایضاً	۶	۱۵۹	دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف انڈیا کلکٹیڈ بائی چارلس جے راجرس اینڈ پرچیزڈ بائی دی پنجاب گورنمنٹ مرتبہ سرجیمس لایال اینڈ ایچ سی فانشیو طبع کردہ منجانب حکومت پنجاب سنہ ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۷۱
مراد بخش	۱	۱۵۹	دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف ہندوستان ، ان دی برٹش میوزیم ، مرتبہ اسٹینلی لین پول صفحہ ۳۷۰ شائع کردہ انٹر انڈیا پبلیکیشنز نئی دہلی سنہ ۱۹۸۳ء
شہنشاہ اورنگ زیب	۱	۱۵۹	النقود الاسلامیہ (سلاطین مغلیہ کے مسکوکات عظیمہ) مصنفہ حکیم سید شمس اللہ قادری مطبوعہ تاج پریس حیدر آباد صفحات ۲۹ ، ۳۰
ایضاً	۲	۱۵۹	ایضاً ایضاً ایضاً

ایضاً	۳	۱۶۰	دی کوائنس آف دی مغل امپررس آف انڈیا کلکٹیڈ بائی چارلس جے راجرس اینڈ پرچیزڈ بائی دی پنجاب گورنمنٹ مرتبہ سر جمس لایال اینڈ سی ایچ فانشیو طبع کردہ منجانب حکومت پنجاب سنہ ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۷۹
ایضاً	۴	۱۶۰	ایضاً ایضاً صفحہ ۱۸۰
اعظم شاہ	۱	۱۶۰	اے میانول آف مسلمان نیومسمیاٹکس مرتبہ او کوڈرنگٹن شائع کردہ دی رائل ایشیاٹک سوسائیٹی لندن سنہ ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۱۱
ایضاً	۲	۱۶۰	سیر گلشن ہند صفحہ ۹۶
کام بخش	۱	۱۶۰	دی کوائنس آف دی مغل امپررس آف ہندوستان ان دی برٹش میوزیم، مرتبہ اسٹینلی لین پول، شائع کردہ انٹر انڈیا پبلکیشنز نئی دہلی سنہ ۱۹۸۳ء صفحہ ۳۷
شاہ عالم بہادر شاہ	۱	۱۶۰	گنج شائیگاں مولفہ محمد رفیع موہانی عالی، مطبوعہ مراد آباد سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۳
ایضاً	۲	۱۶۱	کیٹیلاگ آف کوائنس ان دی پراونشل میوزیم لکھنؤ، مرتبہ سی جے براؤن جلد اول صفحہ ۳۰ شائع کردہ آر سی پبلیر لمیٹڈ سنہ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۳	۱۶۱	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۴	۱۶۱	ایضاً ایضاً ایضاً
عظیم الشان	۱	۱۶۱	ایضاً ایضاً ایضاً
جہاندار شاہ	۱	۱۶۱	سکہ جات سلاطین مغلیہ کے ابیات نوشتہ

			حکیم سید شمس اللہ قادری مطبوعہ شمسی پریس آگرہ صفحہ ۱۸
ایضاً	۲	۱۶۱	دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف ہندوستان اِن دی برٹش میوزیم مرتبہ اسٹینلی لین پول شائع کردہ انٹر انڈیا پبلیکیشنز نئی دہلی سنہ ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۷۱
ایضاً	۳	۱۶۱	دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف ہندوستان اِن دی برٹش میوزیم مرتبہ اسٹینلی لین پول شائع کردہ انٹر انڈیا پبلیکیشنز نئی دہلی سنہ ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۷۱
ایضاً	۴	۱۶۲	دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف انڈیا کلکٹیڈ بائی چارلس جے راجرس اینڈ پرچیزڈ بائی دی پنجاب گورنمنٹ مرتبہ سر جیمس لایال اینڈ ایچ سی فانشیو طبع کردہ منجانب حکومت پنجاب سنہ ۱۸۹۳ء صفحہ ۲۰۰
ایضاً	۵	۱۶۲	گنج شائیگاں مولفہ محمد رفیع موہانی عالی مطبوعہ مراد آباد سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳۶
ایضاً	۶	۱۶۲	قلمی بیاض ملوکہ شاگل خاں کابل
ایضاً	۷	۱۶۲	حدیقۃ الاقالیم تصنیف سنہ ۱۱۹۰ء مخطوطہ در کتاب خانہ آقائی شیخ زادہ مشہد۔ ایران
فرخ سیر	۱	۱۶۲	اے مینوئل آف مسلمان نیومسمیٹکس مرتبہ اوکوڈرینگٹن شائع کردہ دی رائل ایشیاٹک

			سوسائٹی لندن ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۱۲
ایضاً	۲	۱۶۲	مغل ایمپررس مولفہ آر بی وائٹ ہیڈ سکہ نشان ۲۱۳۰
رفیع الدرجات	۱	۱۶۲	اے مینوئل آف مسلمان نیومسمیاٹکس مرتبہ اوکوڈرنگٹن شائع کردہ دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۱۲
ایضاً	۲	۱۶۳	کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی جے براؤن جلد اول صفحہ ۳۱ شائع کردہ آرسی پبلیشر لمیٹڈ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۳	۱۶۳	ایضاً ایضاً صفحہ ۳۲
ایضاً	۴	۱۶۳	مغل ایمپررس مولفہ آر بی وائٹ ہیڈ سکہ نشان ۲۲۷۳
ایضاً	۵	۱۶۳	مفتاح التواریخ مطبوعہ کانپور صفحہ ۳۰۴، مصنفہ مسٹر بیل۔
رفیع الدولہ شاہ جہاں ثانی	۱	۱۶۳	کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی جے براؤن جلد اول صفحہ ۳۲ شائع کردہ آرسی پبلیشر لمیٹڈ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۲	۱۶۳	ایضاً ایضاً ایضاً
نیکوسیر	۱	۱۶۳	تلخیص خافی خاں ترجمہ ڈاوسن (ای ڈی VII ۴۸۲)
محمد ابراہیم	۱	۱۶۴	دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف ہندوستان اِن دی برٹش میوزیم مرتبہ اسٹینلی لین پول صفحہ ۳۷۲

			شائع کردہ انٹر انڈیا پبلیکیشنز نئی دہلی ۱۹۸۳ء
محمد شاہ	۱	۱۶۴	سکہ جات سلاطین مغلیہ کے ابیات نوشتہ حکیم سید شمس اللہ قادری مطبوعہ شمسی پریس آگرہ صفحہ ۱۹
ایضاً	۲	۱۶۴	کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم لکھنؤ، مرتبہ سی جے براؤن جلد اول صفحہ ۳۲ شائع کردہ آرسی بینیر لمٹیڈ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۳	۱۶۴	سکہ جات سلاطین مغلیہ کے ابیات نوشتہ حکیم سید شمس اللہ قادری، مطبوعہ شمسی پریس، آگرہ صفحہ ۲۶
احمد شاہ	۱	۱۶۴	کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم لکھنؤ، مرتبہ سی جے براؤن جلد اول صفحہ ۳۳ شائع کردہ آرسی بینیر لمٹیڈ ۱۹۸۶ء دہلی
عزیز الدین عالمگیر ثانی	۱	۱۶۴	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۲	۱۶۵	مغل ایمپررس مولفہ آر بی وائٹ ہیڈ سکہ نشان ۲۷۶۶
ایضاً	۳	۱۶۵	کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشیل میوزیم لکھنؤ مرتبہ سی جے براؤن جلد اول صفحہ ۳۳ شائع کردہ آرسی بینیر لمٹیڈ ۱۹۸۶ء دہلی۔
ایضاً	۴	۱۶۵	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۵	۱۶۵	سکہ جات سلاطین مغلیہ کے ابیات نوشتہ حکیم سید شمس اللہ قادری مطبوعہ شمسی پریس آگرہ صفحہ ۲۱

شاہ عالم ثانی	۱	۱۶۵	فہرست سکہ جات مرتبہ محمد عبدالعزیز خاں بریلوی وکیل فرخ آباد، بحکم مارک تھارنل جج فرخ آباد صفحہ ۳۵
ایضاً	۲	۱۶۵	ایضاً ایضاً صفحہ ۳۴
بیدار بخت	۱	۱۶۵	کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشل میوزیم لکھنؤ، مرتبہ سی، جے، براؤن، جلد اول صفحہ ۳۴ شائع کردہ آر، سی، سنیر لمیٹیڈ سنہ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۲	۱۶۶	اے میانول آف ملتان نیومسیامکس، مرتبہ اوئی کوڈرنگٹن شائع کردہ دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن سنہ ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۱۳
ایضاً	۳	۱۶۶	گنج شائیگاں مولفہ محمد رفیع موہانی عالی مطبوعہ مراد آباد سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۶
اکبر شاہ ثانی	۱	۱۶۶	کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشل میوزیم لکھنؤ، مرتبہ سی، جے، براؤن جلد اول صفحہ ۳۴ شائع کردہ آر، سی، سنیر لمیٹیڈ سنہ ۱۹۸۶ء دہلی
ایضاً	۲	۱۶۶	سکہ جات سلاطین مغلیہ کے ابیات نوشتہ حکیم سید شمس اللہ قادری مطبوعہ شمسی پریس آگرہ صفحہ ۲۶
ایضاً	۳	۱۶۶	گنج شائیگاں مولفہ محمد رفیع موہانی عالی مطبوعہ مراد آباد سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۶
ایضاً	۴	۱۶۶	سکہ جات سلاطین مغلیہ کے ابیات نوشتہ حکیم سید شمس اللہ قادری مطبوعہ شمسی پریس آگرہ صفحہ ۲۶

بہادر شاہ ظفر	۱	۱۶۶	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۲	۱۶۷	گنج شایگاں مولفہ محمد رفیع موہانی عالی، مطبوعہ مراد آباد سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۸
ایضاً	۳ تا ۶	۱۶۷	ایضاً ایضاً ایضاً
سلطنت خداداد میسور			
ٹیپو سلطان	۱	۱۶۸	گنج شایگاں مولفہ محمد رفیع موہانی عالی، مطبوعہ مراد آباد سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۵۷
ایضاً	۲	۱۶۸	۱. ایضاً ایضاً ایضاً ۲. کیٹلاگ آف دی کوائنس ان دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد چہارم باب دوم صفحہ ۳۰، مولفہ جے آر ہینڈرسن شائع کردہ انڈولاجیکل بک کارپوریشن سنہ ۱۹۷۶ء نئی دہلی، مرتبہ جے ایلن،
نوابان اودھ			
غازی الدین حیدر	۱	۱۶۸	ایضاً ایضاً باب اول صفحہ ۲۷ مولفہ سی جے براؤن۔
نصیر الدین حیدر	۱	۱۶۸	ایضاً ایضاً صفحہ ۳۵
ایضاً	۲	۱۶۸	ایضاً ایضاً صفحہ ۳۴
ایضاً	۳	۱۶۸	گنج شایگاں مولفہ محمد رفیع موہانی عالی، مطبوعہ مراد آباد سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۵
ایضاً	۴	۱۶۹	ایضاً ایضاً ایضاً
محمد علی شاہ	۱	۱۶۹	ایضاً ایضاً صفحہ ۱۱۶
امجد علی شاہ	۱	۱۶۹	ایضاً ایضاً ایضاً

واجد علی شاہ	۱	۱۶۹	کیٹیلاگ آف دی کوائنس اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد چہارم باب اول صفحہ ۴۹، مولفہ سی ایچ براؤن، مرتبہ جے ایلین شائع کردہ انڈولاجیکل بک کارپوریشن سنہ ۱۹۷۶ء نئی دہلی
رمضان علی شاہ برجیس قدر	۱	۱۶۹	گنج شائیگاں مولفہ محمد رفیع موہانی حالی مطبوعہ مراد آباد سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۷
ایضاً	۲	۱۷۰	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۳	۱۷۰	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۴	۱۷۰	ایضاً ایضاً ایضاً
کامروپ (رنگپور آسام) کے حکمران	۰		
رانی پرمتھیشوری	۱	۱۷۰	کوائنس آف اینشینٹ انڈیا اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد اول صفحہ ۳۰۱ مصنفہ وینسنٹ اے اسمتھ شائع کردہ انڈولاجیکل بک ہاؤز دہلی سنہ ۱۹۷۲ء
راجیشور اسمہا	۱	۱۷۰	ایضاً ایضاً صفحہ ۳۰۴
سکھ حکمران			
باندہ سنگھ	۱	۱۷۰	کوائنس مرتبہ پرمیشوری لال گپتا، شائع کردہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی سنہ ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۳۵
جسّا سنگھ	۱	۱۷۱	ایضاً ایضاً صفحہ ۱۳۶

رنجیت سنگھ	۱	۱۷۱	ایضاً ایضاً ایضاً
کشمیر کے ڈوگرا حکمران			
رنجیت دیو	۱	۱۷۱	کیٹلاگ آن کوائنس آفٹر جہانگیر مرتبہ سی جے راجرس جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، شمارہ LIV ۱ حصہ اول صفحہ ۶۴ سنہ ۱۸۸۵ء
روسائے ٹونک			
ابراہیم علی خاں	۱	۱۷۱	کیٹلاگ آف دی کوائنس اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ، جلد چہارم باب سوم صفحہ ۲۷۳، مولفہ سی جے، راجرس، مرتبہ جے ایلن شائع کردہ انڈولاجیکل بک کارپوریشن سنہ ۱۹۷۶ء نئی دہلی
راجگان جودھپور			
تخت سنگھ	۱	۱۷۱	گنج شائیگاں مولفہ محمد رفیع موہانی حالی، مطبوعہ مراد آباد سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲۳
جسونت سنگھ	۱	۱۷۲	ایضاً ایضاً ایضاً
اندور کے حکمران			
جسونت سنگھ	۱	۱۷۲	کیٹلاگ آف دی کوائنس اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد چہارم باب سوم صفحہ ۳۲۳، مولفہ ڈبلیو ایچ والینٹائن، مرتبہ جے ایلن، شائع کردہ

			انڈولاجیکل بک کارپوریشن نئی دہلی ۱۹۷۶ء
صفوی حکمراں			
اسمٰعیل شاہ ثانی	۱	۱۷۲،	تبریز میوزیم کیٹیلاگ جلد سوم صفحہ ۲۱ مرتبہ آقائی جمال ترابی طباطبائی
محمد خدابندہ	۱	۱۷۲	ایضاً ایضاً ایضاً
عباس اول	۱	۱۷۲	ایضاً ایضاً ایضاً
صفی اول	۱	۱۷۳	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۲
عباس ثانی	۱	۱۷۳	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۲	۱۷۳	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۳	۱۷۳	ایضاً ایضاً ایضاً
سلیمان اول (صفی ثانی)	۱	۱۷۳	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۲	۱۷۳	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۳	۱۷۳	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۴	۱۷۳	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۵	۱۷۴	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۶	۱۷۴	ایضاً ایضاً ایضاً
حسین اول	۱	۱۷۴	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۳
ایضاً	۲	۱۷۴	ایضاً ایضاً ایضاً

ایضاً	۳		۱۷۴	ایضاً	ایضاً	ایضاً
طہماسپ ثانی	۱		۱۷۴	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۲		۱۷۴	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۳		۱۷۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً
احمد صفوی	۱		۱۷۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً
عباس ثالث	۱		۱۷۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً
سام صفوی	۱		۱۷۵	ایضاً	ایضاً	صفحہ ۲۴
ایضاً	۲		۱۷۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً
سلیمان ثانی	۱		۱۷۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً
حسین ثانی	۱		۱۷۶	ایضاً	ایضاً	ایضاً
محمد صفوی	۱		۱۷۶	ایضاً	ایضاً	ایضاً
افاغنہ حکمران						
میر اُویس	۱		۱۷۷	البم مرتبہ رابینو صفحہ ۴۱		
میر محمود	۱		۱۷۷	تبریز میوزیم کیٹلاگ جلد سوم صفحہ ۲۵ مرتبہ آقائی جمال ترابی طباطبائی		
ایضاً	۲		۱۷۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۳		۱۷۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۴		۱۷۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۵		۱۷۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۶		۱۷۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً
میر اشرف	۱		۱۷۸	ایضاً	ایضاً	ایضاً

ایضاً	۲	۱۷۸	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۶
ایضاً	۳	۱۷۸	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۵
آزاد خاں باغی	۱	۱۷۸	ایضاً ایضاً صفحہ ۲۶
افشاری حکمران			
نادر شاہ	۱	۱۷۹	اے میانول آف مسلمان نیومسماٹکس، مرتبہ اوکوڈر نگٹن شائع کردہ دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ۱۹۰۴ء صفحہ ۹۹
ایضاً	۲	۱۷۹	گنج شائیگاں مولفہ محمد رفیع موہانی عالی، مطبوعہ مراد آباد ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۲
ایضاً	۳	۱۷۹	دی کوائنس آف نادر شاہ اینڈ درانیز مرتبہ آربی وایٹ ہیڈ سکہ نشان ۵۱
ایضاً	۴	۱۷۹	کیٹیلاگ آف دی کوائنس کلکٹیڈ بائی چارلس جے راجرس اینڈ پرچیزڈ بائی دی گورنمنٹ آف دی پنجاب حصہ دوم صفحہ ۱۶۲' مطبوعہ بیاپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۱۸۹۴ء
ایضاً	۵	۱۷۹	گنج شائیگاں مولفہ محمد رفیع موہانی عالی، مطبوعہ مراد آباد ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۲
ایضاً	۶	۱۷۹	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۷	۱۷۹	ایضاً ایضاً صفحہ ۴۱
عادل شاہ	۱	۱۸۰	تبریز میوزیم کیٹیلاگ جلد سوم صفحہ ۲۸، مرتبہ آقائی جمال ترابی طباطبائی

ایضاً	۲	۱۸۰	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ابراہیم شاہ	۱	۱۸۰	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۲	۱۸۰	ایضاً	ایضاً	ایضاً
شاہ رخ	۱	۱۸۰	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۲	۱۸۱	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۳	۱۸۱	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۴	۱۸۱	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۵	۱۸۱	ایضاً	ایضاً	ایضاً
زند حکمران					
کریم خاں زند	۱	۱۸۱	ایضاً	ایضاً	صفحہ ۳۱
قاچار حکمران					
محمد حسن قاچار	۱	۱۸۲	ایضاً	ایضاً	صفحہ ۳۳
ایضاً	۲	۱۸۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۳	۱۸۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً
آقا محمد قاچار	۱	۱۸۲	ایضاً	ایضاً	صفحہ ۳۴
ایضاً	۲	۱۸۲	ایضاً	ایضاً	صفحہ ۳۳
ایضاً	۳	۱۸۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً
فتح علی شاہ قاچار	۱	۱۸۳	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۲	۱۸۳	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ایضاً	۳	۱۸۳	ایضاً	ایضاً	ایضاً

ایضاً	۴	۱۸۳	ایضاً ایضاً ایضاً
محمد حسن خاں سالار	۱	۱۸۳	ایضاً ایضاً صفحہ ۴۴
ناصرالدین شاہ قاچار	۱	۱۸۳	گنج شائیگاں مولفہ محمد رفیع موہانی عالی، مطبوعہ مراد آباد ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۲
دُرّانی حکمران			
احمد شاہ دُرّانی	۱	۱۸۴	کیٹیلاگ آف دی کوائنس کلکٹیڈ بائی چارلس جے راجرس اینڈ پرچیزڈ بائی دی گورنمنٹ آف دی پنجاب حصہ دوم صفحہ ۱۲۶ مطبوعہ بیاپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۱۸۹۴ء
سلیمان شاہ دُرّانی	۱	۱۸۴	دی کوائنس آف نادر شاہ اینڈ دُرّانیز، مرتبہ آر بی وائٹ ہیڈ سکہ نشان ۳۴۴
ایضاً	۲	۱۸۴	ایضاً سکہ نشان ۳۴۳
ایضاً	۳	۱۸۴	ایضاً سکہ نشان ۳۵۰
تیمور شاہ دُرّانی	۱	۱۸۴	۱۔ کیٹیلاگ آف دی کوائنس کلکٹیڈ بائی چارلس جے راجرس اینڈ پرچیزڈ بائی دی گورنمنٹ آف دی پنجاب حصہ دوم صفحہ ۱۶۹، مطبوعہ بیاپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۱۸۹۴ء۔ ۲۔ دی کوائنس آف نادر شاہ اینڈ دُرّانیز مرتبہ آر بی وائٹ ہیڈ سکہ نشان ۳۵۱
ایضاً	۲	۱۸۴	کیٹیلاگ آف دی کوائنس کلکٹیڈ بائی چارلس جے راجرس اینڈ پرچیزڈ بائی دی گورنمنٹ آف دی پنجاب حصہ دوم صفحہ ۱۷۰، مطبوعہ بیاپٹسٹ

			مشن پریس کلکتہ ۱۸۹۴ء
ہمایوں شاہ دُرّانی	۱	۱۸۵	دی کوائنس آف نادر شاہ اینڈ دُرّانیز' مرتبہ آر بی وائیٹ ہیڈ سکہ نشان ۷۱۵
زماں شاہ دُرّانی	۱	۱۸۵	ایضاً ایضاً سکہ نشان ۷۱۶
ایضاً	۲	۱۸۵	ایضاً ایضاً سکہ نشان ۷۱۷
ایضاً	۳	۱۸۵	ایضاً ایضاً سکہ نشان ۷۱۸
محمود شاہ دُرّانی	۱	۱۸۵	۱. کیٹیلاگ آف دی کوائنس کلکٹیڈ بائی چارلس جے راجرس اینڈ پرچیزڈ بائی دی گورنمنٹ آف دی پنجاب حصہ دوم صفحہ ۱۷۷ مطبوعہ بیاپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۱۸۹۴ء ۲. اے میانول آف مسلمان نیومسمیاٹکس مرتبہ او' کوڈرنگٹن صفحہ ۱۰۳ شائع کردہ دی رائل ایشیاٹک سوسائیٹی لندن ۱۹۰۴ء ۳. دی کوائنس آف نادر شاہ اینڈ دُرّانیز' مرتبہ آر بی وائیٹ ہیڈ سکہ نشان ۱۰۶۰
ایضاً	۲	۱۸۵	ایضاً ایضاً سکہ نشان ۸۸۱
شاہ شجاع دُرّانی	۱	۱۸۶	ایضاً ایضاً سکہ نشان ۱۰۲۰
ایضاً	۲	۱۸۶	ایضاً ایضاً سکہ نشان ۱۰۲۹
ایضاً	۳	۱۸۶	ایضاً ایضاً سکہ نشان ۹۹۸
ایضاً	۴	۱۸۶	ایضاً ایضاً سکہ نشان ۹۷۴
ایضاً	۵	۱۸۶	حدیقۃ الاقالیم تصنیف ۱۱۹۰ھ مخطوطہ در کتاب خانہ آقائی شیخ زادہ مشہد ایران .

قیصر شاہ دُرّانی	۱	۱۸۶	اے میانول آف مسلمان نیو مسمیاٹکس، مرتبہ اوُ کوڈرینگٹن صفحہ ۱۰۳، شائع کردہ دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن سنہ ۱۹۰۴ء
نورالدین شاہ دُرّانی	۱	۱۸۷	اے میانول آف مسلمان نیو مسمیاٹکس، مرتبہ اوُ کوڈرینگٹن صفحہ ۱۰۳ شائع کردہ دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن سنہ ۱۹۰۴ء
ایوب شاہ دُرّانی	۱	۱۸۷	ایضاً ایضاً صفحہ ۱۰۴
ایضاً	۲	۱۸۷	ایضاً ایضاً ایضاً
کامران شاہ دُرّانی	۱	۱۸۷	دی کوائنس آف نادر شاہ اینڈ دُرّانیز، مرتبہ آر بی، وائیٹ ہیڈ سکہ نشان ۱۲۰۷
شہپور شاہ	۱	۱۸۷	ایضاً ایضاً سکہ نشان ۱۲۲۹
بارق زائی حکمران			
امیر دوست محمد	۱	۱۸۸	اے میانول آف مسلمان نیو مسمیاٹکس، مرتبہ اوُ کوڈرینگٹن صفحہ ۱۰۴ شائع کردہ دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن سنہ ۱۹۰۴ء
ایضاً	۲	۱۸۸	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۳	۱۸۸	کیٹیلاگ آف دی کوائنس کلکٹیڈ بائی چارلس جے، راجرس اینڈ پرچیزڈ بائی دی گورنمنٹ آف دی پنجاب حصہ دوم صفحہ ۱۸۲، مطبوعہ بیاپٹسٹ مشن پریس کلکتہ سنہ ۱۸۹۴ء
امیر شیر علی	۱	۱۸۸	اے میانول آف مسلمان نیو مسمیاٹکس

			مرتبہ او' کوڈرینگٹن صفحہ ۱۰۵' شائع کردہ' دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن سنہ ۱۹۰۴ء
ایضاً	۲	۱۸۸	گنج شائیگاں مولفہ محمد رفیع موہانی حالی' مطبوعہ مراد آباد سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۵۴
ایضاً	۳	۱۸۸	اے میانول آف مسلمان نیومسمیاٹکس مرتبہ او' کوڈرینگٹن صفحہ ۱۰۵' شائع کردہ دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن سنہ ۱۹۰۴ء
ایضاً	۴	۱۸۸	ایضاً ایضاً ایضاً
ایضاً	۵	۱۸۹	ایضاً ایضاً صفحہ ۱۰۶
ایضاً	۶	۱۸۹	ایضاً ایضاً صفحہ ۱۰۵
امیر محمد افضل	۱	۱۸۹	ایضاً ایضاً ایضاً
امیر محمد اعظم	۱	۱۸۹	ایضاً ایضاً ایضاً
محمد جان باغی	۱	۱۸۹	ایضاً ایضاً صفحہ ۱۰۶
خانان خوقند			
محمد علی	۱	۱۸۹	قلمی بیاض مملوکہ شنا گل خاں. کابل

فہرست مآخذ متن

نشان سلسلہ	نام کتاب	نام مصنف	صفحات متن
۱.	تاریخ سندھ۔ فارسی۔ قلمی انڈیا آفس لائبریری۔ لندن	محمد معصوم المتخلص بہ نامی	۹
۲.	گنج شائیگاں مطبوعہ مراد آباد ۱۹۰۳ء	محمد رفیع موہانی عالی	۱۳۔ ۳۹۔ ۹۴۔ ۱۰۴۔ ۱۰۶۔ ۱۱۷۔ ۱۲۱
۳.	کیٹیلاگ تبریز میوزیم، مطبوعہ ایران۔ جلد سوم	آقائے جمال ترابی طباطبائی	۱۴
۴.	کیٹیلاگ آف مغل کوائنس، ان دی اسٹیٹ میوزیم لکھنؤ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۵ء	سی آر سنگھال	۱۴.
۵.	دی کوائنس آف دی مغل ایمپررس آف ہندوستان ان دی برٹش میوزیم، مطبوعہ لندن ۱۸۹۳ء	اسٹینلی لین پول	۱۵۔ ۶۴۔ ۷۰۔ ۸۱۔ ۸۴۔ ۹۰۔ ۹۶

نشان سلسلہ	نام کتاب	نام مصنف	صفحات متن
۶.	منٹ ٹاونس اینڈ کوائنس آف دی محمڈنس مطبوعہ لندن ۱۸۸۸ء	یوحین لیگیٹ	۱۵.
۷.	میانول آف مسلمان نیومسمیاٹکس مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۰۴ء	اُو. کوڈرنگٹن	۱۵.
۸.	کیٹیلاگ آف دی کوائنس ان دی انڈین میوزیم کلکتہ، مطبوعہ آکسفورڈ سنہ ۱۹۰۷ء	ایچ نیلسن رائٹ	۱۵. ۱۸
۹.	جرنل آف دی نیومسمیاٹک سوسائٹی جلد ۱۸	آر. بی وائٹ ہیڈ	۱۹.
۱۰.	ہسٹاریکل اسٹڈیز ان مغل نیومسمیاٹکس مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۹۲۳ء	ایس ایچ ہوڈی والا	۱۹.
۱۱.	منتخب اللباب مطبوعہ کلکتہ	خافی خاں	۲۱. ۲۳. ۷۲
۱۲.	تاریخ جہانگیر، شائع کردہ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی سنہ ۱۹۷۹ء	ڈاکٹر بنی پرشاد، مترجمہ رحم علی الہاشمی	۲۱ . ۲۹
۱۳.	تاریخ شاہ جہاں. شائع کردہ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی سنہ ۱۹۸۵ء	ڈاکٹر بنارسی پرشاد مترجمہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین	۲۱ . ۸۳
۱۴.	عالمگیرنامہ - قلمی. مخزونہ اے پی گورنمنٹ اورینٹل مانوسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد	مرزا محمد کاظم	۲۱ . ۸۶ . ۸۷

نشان سلسلہ	نام کتاب	نام مصنف	صفحات متن
۱۵.	البرامکہ مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۶۱ء	عبدالرزاق کانپوری	۲۲. ۲۶. ۳۷. ۳۸
۱۶.	روئیداد ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سنہ ۱۸۸۳ء	اے. کنگھیم	۲۳.
۱۷.	نیو مسمیاٹا اور یشالیا السٹراٹا مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۲۵ء جلد دوم	ولیم مارسڈن	۲۴. ۲۵. ۸۷
۱۸.	پرشین اینڈ عربک ڈکشنری. مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۰۸ء جلد اول	جان رچرڈسن	۲۵.
۱۹.	کتاب الوزراء والکتاب قلمی عربی کتب خانہ اسکول آف اورینٹل اینڈ آفریکن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی	محمد بن عبدوس الجھشیاری	۲۶. ۴۰.
۲۰.	روئیداد ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال، مارچ سنہ ۱۸۸۵ء	جیمس گبس	۲۶. ۸۷
۲۱.	ڈاکٹر غلام یزدانی کمیموریشو والیوم شائع کردہ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد سنہ ۱۹۶۶ء	ڈاکٹر وی ایس اگروال	۲۷.
۲۲.	آئین اکبری مطبوعہ دہلی سنہ ۱۲۷۲ھ	ابوالفضل علامی، مرتبہ سید احمد خاں	۲۸. ۶۵. ۷۹
۲۳.	تزک جہانگیری. مطبوعہ لکھنؤ	شہنشاہ جہانگیر	۲۸. ۷۴
۲۴	تزک جہانگیری مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء جلد دوم	شہنشاہ جہانگیر	۲۹

نشان سلسلہ	نام کتاب	نام مصنف	صفحات متن
۲۵.	تکملہ اکبر نامہ شائع کردہ ایشیاٹک سوسائیٹی بنگال ۱۸۸۶ء انگریزی	شیخ عنایت اللہ	۲۹.
۲۶.	بادشاہ نامہ جلد دوم	عبد الحمید لاہوری	۲۹.
۲۷.	مآثر عالمگیری	مستعد خاں	۳۰. ۸۶
۲۸.	عالمگیر نامہ	مرزا محمد کاظم	۳۰. ۸۶
۲۹.	کوائنس شائع کردہ نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی ۱۹۶۹ء	پرمیشوری لال گپتا	۳۲. ۱۱۹
۳۰.	کارپس آف انڈین کوائنس جلد چہارم دی کوائنس آف گپتا ایمپائر شائع کردہ نیومسمائک سوسائیٹی آف انڈیا بنارس ۱۹۵۷ء	اے ایس. الٹیکر	۳۲.
۳۱.	برٹش میوزیم کیٹلاگ آف گپتا گولڈ کوائنس مطبوعہ لندن ۱۹۱۴ء	جان ایلن	۳۳.
۳۲.	دی ایجنٹ آف انڈیاز ہسٹری نیویارک ۱۹۶۴ء	ٹریوڈ ایمرسن. سین	۳۳.
۳۳.	جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال (نیوسیریز) جلد دہم شمارہ ۶ بابتہ ۱۹۱۴ء	جان ایلن	۳۴
۳۴.	دی گپتا گولڈ کوائنس اِن دی بیانہ ہورڈ شائع کردہ نیومسمائک	اے ایس الٹیکر	۳۴.

نشانِ سلسلہ	نام کتاب	نام مصنف	صفحاتِ متن
	سوسائٹی آف انڈیا ۱۹۵۴ء		
۳۵.	دی ونڈر دٹ واز انڈیا شائع کردہ روپا اینڈ کمپنی نئی دہلی ۱۹۸۷ء	اے۔ ایل باشم	۳۵.
۳۶.	تاریخ ادبیات عربی شائع کردہ مکتبہ فیض العلوم حیدر آباد	ڈاکٹر سید ابوالفضل	۳۷. ۳۸. ۴۰
۳۷.	عرب و ہند کے تعلقات مطبع معارف اعظم گڈھ طبع جدید ۱۹۸۴ء	سید سلیمان ندوی	۳۹.
۳۸.	الذخایر والتحف مطبوعہ کویت ۱۹۵۹ء	قاضی ابن الزبیر مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی	۴۰.
۳۹.	الذیل	ابو محمد فرغانی	۴۲.
۴۰.	الکامل جلد نہم	ابن الاثیر	۴۲.
۴۱.	مسلم مانیومنٹس آف احمد آباد مطبوعہ پونا ۱۹۴۹ء	ایم۔ اے۔ چغتائی	۴۷
۴۲.	کشمیر سلاطین کے عہد میں، مطبع معارف اعظم گڈہ ۱۹۶۷ء	مرتبہ محب الحسن مترجم علی حماد عباسی	۵۲. ۵۳. ۵۴
۴۳.	نیومسمیاٹک کرانیکل XIII، سلاجقہ دی گولڈ کوائنس آف دی سلطانس آف کشمیر	آر۔ بی۔ وائٹ ہیڈ	۵۴. ۵۵
۴۴.	ہسٹری آف میڈی ایول دکن جلد اول شائع کردہ حکومت آندھرا پردیش ۱۹۷۳ء	پروفیسر ہارون خاں شروانی	۵۶. ۶۰

صفحات متن	نام مصنف	نام کتاب	نشان سلسلہ
۵۹	پروفیسر ہارون خاں شروانی	ہسٹری آف میڈی ایول دکن جلد دوم شائع کردہ حکومت آندھرا پردیش ۱۹۷۳ء	۴۵.
۶۱	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	تاریخ گولکنڈہ شائع کردہ سلسلۂ مطبوعات ادبیات اردو حیدرآباد شمارہ ۲۹۶ طبع دوم ۱۹۶۴ء	۴۶.
۶۳ - ۸۷	حکیم سید شمس اللہ قادری	النقود الاسلامیہ مطبوعہ تاج پریس حیدرآباد دکن	۴۷.
۶۹	آر، ایس، پول	دی کیٹیلاگ آف پرشین کوائنس	۴۸.
۷۰	مہر محمد خاں شہاب	دین الٰہی اور اس کا پس منظر شائع کردہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	۴۹.
۷۱	محمد اکرام	رود کوثر طبع چہارم	۵۰.
۷۲	ابوالفضل علّامی	اکبر نامہ قلمی جلد سوم، اے پی گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد	۵۱.
۷۲	محمد حسین آزاد	دربار اکبری شائع کردہ شیخ مبارک علی، لاہور پانچواں ایڈیشن	۵۲.
۷۳ . ۸۴		جینٹ دی کیٹیلاگ فار سیل آف لوٹ گولڈ مہرس آف جہانگیر اینڈ	۵۳.

نشان سلسلہ	نام کتاب	نام مصنف	صفحات متن
	شاہ جہاں۔ جینوا سوئٹزرلینڈ نومبر ۷ ۱۹۸ء	ہیابسبرگ فیلڈمان، ایس اے	
۵۴۔	اکبرنامہ جلد دوم	ابوالفضل علامی	۷۶
۵۵۔	پرشیئن، عربک اینڈ انگلش ڈکشنری لندن۔ ۱۸۵۲ء	فرانسس جان سن	۷۹
۵۶۔	کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی پراونشل میوزیم لکھنؤ۔ مغل امپررس جلد اول، اکسفورڈ ۱۹۲۰ء	سی، جے، براؤن	۸۶
۵۷۔	جرنل آف نیومسمیاٹک سوسائٹی آف انڈیا جلد ۱۶ ۱۹۵۲ء جزو اول		۸۴
۵۸۔	کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی پروونشل میوزیم لکھنؤ، جلد اول شائع کردہ آر سی پبلشر لمیٹڈ دہلی طبع ثانی ۱۹۸۶ء	سی۔ جے، براؤن	۹۱۔ ۹۲۔ ۹۵۔ ۹۸۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۳
۵۹۔	دی لیٹر مغلس۔ جرنل آف نیومسمیاٹک سوسائٹی آف انڈیا، جلد XXIII ۷، جزو اول شمارہ ۱تا۴ ۱۹۳۴ء	ڈبلیو۔ اروِن	۹۴
۶۰۔	کوائنس آف مغل ایمپررس	آر، بی، وائٹ ہیڈ	۹۴
۶۱	کیٹیلاگ آف کوائنس اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد چہارم باب دوم	جے، آر، ہنڈرسن	۹۸۔ ۹۹۔ ۱۱۴

نشان سلسلہ	نام کتاب	نام مصنف	صفحات متن
۶۲۔	دی کوائنس آف دی مغل امپررس آف انڈیا کلکٹیڈ بائی چارلس جے راجرس اینڈ پرچیزڈ بائی دی پنجاب گورنمنٹ، طبع کردہ منجانب حکومت پنجاب سنہ ۱۸۹۳ء	سر جیمس لیال	۱۰۳
۶۳۔	چراغ دہلی مطبوعہ کرزن پریس دہلی دسمبر سنہ ۱۹۰۳ء	مرزا حیرت دہلوی	۱۰۵
۶۴۔	اردوئے معلیٰ مطبع اردو گائیڈ کلکتہ سنہ ۱۸۸۳ء	مرزا غالب	۱۰۵ ، ۱۰۶
۶۵۔	ماہنامہ شاعر "غالب نمبر" غالب کی کہانی	ظ۔ انصاری	۱۰۶
۶۶۔	تاریخ سلطنت خداداد میسور شائع کردہ ہمالیہ بک ہاوز دہلی سنہ ۱۹۷۰ء	محمود خاں بنگلوری	۱۰۸ ، ۱۰۹ ، ۱۱۰ ، ۱۱۳
۶۷۔	نپولین کا خط پیش کردہ در نمائش لندن اکتوبر سنہ ۱۹۹۰ء بحوالہ "بی بی سی"	نپولین بوناپارٹ	۱۱۲
۶۸۔	کیٹیلاگ آف دی کوائنس ان دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد چہارم باب اول، شائع کردہ انڈولاجیکل بک کارپوریشن نئی دہلی سنہ ۱۹۷۶ء	سی، جے، براؤن	۱۱۷

نشان سلسلہ	نام کتاب	نام مصنف	صفحات متن
۶۹۔	کوائنس آف اینشینٹ انڈیا اِن دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد اول شائع کردہ انڈولاجیکل بک ہاؤز دہلی سنہ ۱۹۷۲ء	وینسنٹ اے اسمتھ	۱۱۹
۷۰۔	کیٹیلاگ آف دی کوائنس ان دی انڈین میوزیم کلکتہ جلد چہارم باب سوم شائع کردہ انڈولاجیکل بک کارپوریشن نئی دہلی سنہ ۱۹۷۶ء	ڈبلیو ایچ والنشائن	۱۲۱۔ ۱۲۲
۷۱۔	مسلمان شاہی خاندان اور اُن کے سلسلے۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن سلسلہ مطبوعات ادارہ ادبیات اردو شمارہ ۱۳۶	اسٹینلی لین پول مترجمہ محمد عبدالرحمٰن خاں سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد	۱۲۶۔ ۱۳۸

فہرستِ تصاویرِ سکہ جات

نشانِ لوحہ	نامِ حکمران	نشانِ سکہ	حوالہ شعر		
			صفحہ کتاب	نشانِ شعر	
۱	سمدرا گپتا	۱	۱۴۱	۱	
ایضاً	ایضاً	۲	ایضاً	۲	
ایضاً	ایضاً	۳	ایضاً	۳	
ایضاً	ایضاً	۴	ایضاً	۴	
ایضاً	کاچا گپتا	۱	ایضاً	۱	
ایضاً	چندرا گپتا	۱	ایضاً	۱	
ایضاً	ایضاً	۲	۱۴۲	۲	
۲	کمارا گپتا	۱	ایضاً	۱	
ایضاً	ایضاً	۲	ایضاً	۲	
ایضاً	ایضاً	۳	ایضاً	۳	
ایضاً	ایضاً	۴	ایضاً	۴	
ایضاً	ایضاً	۵	ایضاً	۵	
ایضاً	اسکند گپتا	۱	ایضاً	۱	
۳	محمد شاہ ثانی (گجرات)	۱	۱۴۶	۱	
ایضاً	بہادر شاہ (گجرات)	۱	ایضاً	۱	

۳	حسن شاہ (کشمیر)	۱	۱۴۶	۱	
ایضاً	فتح شاہ (کشمیر)	۱	ایضاً	۱	
ایضاً	محمد عادل شاہ (بیجاپور)	۱	۱۴۷	۱	
ایضاً	محمد قلی قطب شاہ (گولکنڈہ)	۱	ایضاً	۱	ایک ہی شعر والے چار سکوں کی تصاویر دی گئی ہیں ۔
ایضاً	ایضاً	۲	ایضاً	ایضاً	
ایضاً	ایضاً	۳	ایضاً	ایضاً	
ایضاً	ایضاً	۴	ایضاً	ایضاً	
۴	شہنشاہ اکبر	۱	۱۴۹	۶	
ایضاً	ایضاً	۲	ایضاً	۷	
ایضاً	ایضاً	۳	ایضاً	۸	
ایضاً	شہنشاہ جہانگیر	۱	۱۵۰	۴،۳	
ایضاً	ایضاً	۲	۱۵۱	۷،۵	
ایضاً	ایضاً	۳	۱۵۴	۳۳	
ایضاً	ایضاً	۴	۱۵۷	۵۵	
ایضاً	ایضاً	۵	ایضاً	۵۶	
ایضاً	ایضاً	۶	ایضاً	ایضاً	
ایضاً	ایضاً	۷	۱۵۲	۱۵	
ایضاً	ایضاً	۸	۱۵۴	۳۱	
ایضاً	ایضاً	۹	ایضاً	۳۳	
ایضاً	ایضاً	۱۰	ایضاً	ایضاً	
۵، ۶	ایضاً		۱۵۰	۲۰۱	ہزار تولے کی اشرفی
۷، ۸	شہنشاہ شاہجہاں		۱۵۸	۲۰۱	دو سو تولے کی اشرفی

۹	شہنشاہ شاہجہاں	۱	۱۵۸	۳۔۴	ایک سو تولے کی اشرفی
ایضاً	ایضاً	۲	۱۵۹	۶	
۱۰	شہنشاہ اورنگ زیب	۱	ایضاً	۱۔۲	ایک سو تولے کی اشرفی
ایضاً	ایضاً	۲	۱۶۰	۳	
۱۱	ایضاً	۱	ایضاً	۴	
ایضاً	ایضاً	۲			
ایضاً	ٹیپو سلطان	۱۔۲۔۳۔۴	۱۶۸	۲	
ایضاً	نادر شاہ	۱	۱۷۹	۴	
ایضاً	احمد شاہ درّانی	۱	۱۸۴	۱	

پس نوشت

"سکوں پر اشعار" کی کتابت اور طباعت کے سلسلے میں میرے برادر عم زاد میاں سید علی مسعود عابدؔ اکلوی نے جو مفید مشورے دیئے اور سخنے و قدمے جو اعانت کی وہ میرے لئے باعث منت ہے۔

"سکوں پر اشعار" کی تسوید کے دوران مجھے اپنے برادر زادہ میاں سید قطب الدین اکلوی سے جو مدد ملی ہے اس کے لئے بھی میں ان کا احسان مند ہوں۔

میرے دوست محمد ریاست علی تاجؔ صاحب ریسرچ اسکالر نے اس کتاب کے مبیّضہ کی قرأت و سماعت اور تصحیح کتابت میں میری جو مدد کی ہے اس کے لئے میں ان کا سپاس گزار ہوں۔

○

○ امیر خسرو کے چند غیر مطبوعہ مقطعات

ڈاکٹر عبدالرب عرفان

ڈاکٹر عبدالرب عرفان
صدر شعبۂ اردو و فارسی
وسنت راؤ نائیک انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز،
ناگپور (مہاراشٹر)

امیر خسرو کے چند غیر مطبوعہ مقطعات

کثرت تصانیف کے لحاظ سے امیر خسرو (متوفی ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) فارسی کے کم نظیر شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ فیروز شاہ کے مورخ برنی کے بیان کے مطابق ان کی تصانیف سے ایک کتاب خانہ بن سکتا ہے۔[1] میر خورد نے بھی برنی کے اس بیان کی تائید کی ہے۔[2] مولانا جامی کے بقول امیر خسرو کی تصانیف کی تعداد ننانوے (۹۹) ہے۔[3] امین احمد رازی نے مجموعی تعداد ایک سو ننانوے (۱۹۹) تحریر کی ہے۔[4] لیکن ان بیانات کے برعکس خسرو کی تصانیف بہت کم تعداد میں اور جامی کے قول کو قرین صحت تسلیم کر لینے کی صورت میں نصف سے بھی کم دستیاب ہیں۔

۱۹۱۵ء میں نواب اسحٰق خاں نے خسرو کی تصانیف کی تلاش کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا بڑی کدوکاوش کے بعد انھیں خسرو کی صرف پینتالیس (۴۵) تصانیف کا سراغ پانے میں کامیابی ہوئی۔[5] ان میں ان کے پانچوں دیوان بھی شامل ہیں جن کی تدوین خسرو نے اپنی عمر کے مختلف ادوار میں خود اپنے ہاتھوں سے کی اور زمانۂ تدوین کی (بلحاظ سن) مناسبت ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے نام علی الترتیب تحفۃ الصغر، وسط الحیوٰۃ، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایت الکمال تجویز کیے۔ ان دواوین میں سے باستثنائے نہایت الکمال،[6] کوئی دیوان خسرو کے تجویز کردہ نام کے ساتھ علاحدہ شایع نہیں ہوا۔[7] اول الذکر چار دیوانوں کے مشمولات

۱۔ تاریخ فیروز شاہی، تصحیح مولوی سید احمد خاں، کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۳۵۹۔ ۲۔ سیر الاولیا، دہلی ۱۹۰۲ء، ص ۳۰۱۔ ۳۔ نفحات الانس تصحیح مہدی توحیدی پور، تہران ۱۳۳۶ شمسی، ص ۶۱۰۔ ۴۔ ہفت اقلیم، بحوالہ امیر خسرو، ڈاکٹر وحید مرزا، الہ آباد ۱۹۴۹ء، ص ۱۹۲۔ ۵۔ امیر خسرو (ڈاکٹر وحید مرزا، الہ آباد ۱۹۴۹ء)، ص ۱۹۳۔ ۶۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے نہایت الکمال کو بھی غیر مطبوعہ لکھا ہے (امیر خسرو، ص ۲۲۴) لیکن یہ دیوان ۱۳۳۲ھ میں مطبع قیصریہ دہلی سے طبع ہو چکا ہے۔ ۷۔ خواجہ سید محمد اسلام الدین نکالی نے کتاب خانۂ آصفیہ حیدرآباد کے ایک ضخیم قلمی نسخے کے عکس کو دیوان تحفۃ الصغر کے نام سے شایع کیا ہے لیکن راقم الحروف کو اس کے خالصۃً تحفۃ الصغر تسلیم کرنے میں تامل ہے کیونکہ اس نسخے میں امیر خسرو کے دیگر دواوین کے مشمولات بھی شامل ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ محولہ بالا نسخہ بھی انجمن اصلاح الاخبار کاٹی کے نسخے اور خدا بخش لائبریری کے نسخوں (نمبر ۳۳۴، ۳۳۵ اور ۱۸۰۷) کی طرح دواوین خسرو کے انتخابات پر مشتمل ہے۔

کا انتخاب کلیات عناصر دواوین خسروؒ کے نام سے مطبع نولکشور کانپور سے پہلی بار ۱۸۷۱ء میں طبع ہوا، پھر ۱۹۲۶ء تک اس کے تین اور اڈیشن نکلے۔ ۱۳۴۳ شمسی ہجری (۱۹۶۵ء) میں ایران کے مشہور ادیب اور محقق سعید نفیسی نے ایک قدیم قلمی نسخے (سال استنساخ ۱۰۴۳ھ) کی مدد سے دیوان کامل امیر خسرو دہلوی مرتب کر کے شائع کیا۔ اس کی پیش گفتار میں آقائے م۔ درویش بصراحت اعتراف فرماتے ہیں:

"متاسفانہ اشعار نہایت الکمال در ہیچ نسخہ نشانہ ای بدست نیامد"[۱]

۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر انوار الحسن نے امیر خسرو کا دیوان از سر نو مرتب کر کے شائع فرمایا۔ اس دیوان کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں:

"میں نے نولکشوری اڈیشن اور سعید نفیسی کے اس جدید اڈیشن کو سامنے رکھ کر پیش نظر نسخہ مرتب کیا ہے جس میں سعید نفیسی کے مرتبہ اڈیشن میں جو غزلیات شامل نہیں تھیں ان کو بھی شامل کیا۔ اس سلسلے میں قلمی نسخوں سے بھی مدد لی اور خسرو کے دوسرے مجموعوں سے بھی۔"[۲]

اس طرح سعید نفیسی اور ڈاکٹر انوار الحسن کے اڈیشنوں میں غزلوں کی تعداد میں تو معتدبہ اضافہ ہوا لیکن دیگر اصناف یعنی قصائد، قطعات اور رباعیات میں کوئی خاص اضافہ نظر نہیں آتا۔ جہاں تک قطعات کا تعلق ہے، ان جدید اڈیشنوں میں ان کی تعداد وہی ہے جو نولکشوری اڈیشنوں میں نظر آتی ہے۔ یعنی صرف بیس[۳]، جب کہ ڈاکٹر وحید مرزا کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق خسرو کے قطعات کی تعداد سینکڑوں میں ہونی چاہیے۔ صرف "بقیہ نقیہ" میں ہی امیر خسرو دو سو قطعات[۴] شامل ہیں[۵]۔ تحفۃ الصغر، وسط الحیوٰۃ اور نہایت الکمال میں، ڈاکٹر وحید مرزا کے بقول، متعدد قطعات[۶] اور غرۃ الکمال میں بہت سے قطعات شامل ہیں۔ ان بیانات سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ خسرو نے اس صنف میں کتنا سرمایہ چھوڑا ہوگا جس طرح دیوان امیر خسروؒ کے فاضل مرتبین آقائے سعید نفیسی اور ڈاکٹر انوار الحسن نے بعض نسخوں کی مدد سے برصغیر کے اس عظیم شاعر کی ان غزلوں کو ڈھونڈ نکالا جو مطبوعہ دواوین میں شامل نہیں تھیں، اسی طرح دیگر اصناف میں بھی اس کے غیر معروف کلام کو تلاش کر کے فارسی زبان و ادب کی دنیا سے متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔ اسی جہت میں ایک ادنیٰ سی کوشش کے بطور ان اوراق میں حضرت امیر خسرو دہلوی کے چھوٹے بڑے اکاون[۷] غیر مطبوعہ قطعات پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ قطعات "دیوان امیر خسروؒ" کے ایک قلمی نسخے (مملوکہ انجمن اصلاح الافغان، پبلک لائبریری، کاٹھی ـــــ نمبر ۲۱۵) سے دستیاب ہوئے ہیں[۸]۔ اس نسخے میں

۱؎ دیوان کامل امیر خسرو دہلوی، بکوشش سعید نفیسی ۲؎ دیوان امیر خسرو دہلوی، مرتبہ ڈاکٹر انوار الحسن (مقدمہ)، ص ص ۳۳-۳۴ ۳؎ مجلہ امیر خسرو، ڈاکٹر وحید مرزا، ص ۲۲۹ ۴؎ ایضاً، ص ۲۰۷، ۲۱۳، ۲۳۵ ۵؎ ایضاً، ص ۲۲۹ ۶؎ یہ نسخہ جس کا سال استنساخ ۱۰۲۰ھ ہے، شاگرد داغ حضرت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

چھوٹے بڑے ۸۰ قطعات شامل ہیں۔ ان میں سے غیر مطبوعہ مقطعات کو علاحدہ کرنے کے لیے دیوان امیر خسرو کے درج ذیل مطبوعہ نسخوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے:

(۱) کلیات عناصر دواوین خسرو، مطبع منشی نولکشور، کانپور، ۱۹۱۶ء (بار چہارم)۔[1]

(۲) دیوان کامل امیر خسرو دہلوی، بکوشش سعید نفیسی، تہران ۱۳۴۳ شمسی۔

(۳) دیوان امیر خسرو دہلوی، مرتبہ ڈاکٹر انوار الحسن، ۱۹۶۷ء

(۴) دیوان نہایت الکمال، مطبع قیصریہ، دہلی ۱۳۳۲ھ

(۵) دیوان تحفۃ الصغر، باہتمام خواجہ سید محمد اسلام الدین نظامی؛ ناشر، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد نئی دہلی۔ (یہ اڈیشن آندھرا پردیش گورنمنٹ اورینٹل لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ — آصفیہ لائبریری — حیدرآباد کے ایک نسخے کی عکسی طباعت ہے۔)

غیر مطبوعہ مقطعات کی تصحیح میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے نسخۂ دیوان امیر خسرو (ہینڈ لسٹ نمبر ۲۲۵) اور سالار جنگ میوزیم کے نسخے (نمبر ادب / نظم ۲۳۵ — فہرست نمبر ۱۳۸۹) سے مدد لی گئی ہے۔ مقابلے اور تصحیح کے دوران قطعات کی ایک معتدبہ تعداد ایسی پائی گئی ہے جو خدا بخش اور سالار جنگ دونوں ہی کتابخانوں کے مذکورہ بالا نسخوں میں موجود نہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ خدا بخش لائبریری کے جس نسخے کو پیش نظر رکھا گیا ہے وہ امیر خسرو کے صرف تین دیوان — تحفۃ الصغر، غرۃ الکمال اور نہایت الکمال کے مشمولات پر محتوی ہے اور سالار جنگ کا نسخہ صرف غرۃ الکمال اور بقیہ نقیہ پر مشتمل۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ جو غیر مطبوعہ مقطعات دونوں نسخوں میں نہیں پائے گئے وہ (یا ان میں سے بیشتر) دیوان وسط الحیاۃ کے مشمولات میں سے ہیں۔ ایسے غیر مطبوعہ مقطعات کی تعداد تیرہ[۱۳] ہے جو درج ذیل نمبروں کے تحت نقل کیے گئے ہیں:

۶، ۱۲، ۱۷، ۱۸، ۲۱، ۲۵، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹ اور ۵۱۔

مقطعات نمبر ۳، ۲۶، اور ۲۷ نسخہ خدا بخش میں موجود ہیں، نسخۂ سالار جنگ میں نہیں ملے۔ اسی طرح قطعات نمبر ۲۲، ۲۳، ۲۸، ۳۲، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳ نسخۂ سالار جنگ میں شامل ہیں، نسخۂ خدا بخش میں نہیں پائے گئے۔ مقطعات کی تصحیح کے لیے حسب ذیل طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے:

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) مولانا احسن مارہروی گلاؤٹھوی مرحوم کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں تھا۔ کاٹھ کے ایک علم دوست اور شعر و ادب کے قدرداں جناب محمد ظہیر وارثی صاحب کی کوششوں سے انجمن اصلاح الانصار پبلک لائبریری میں منتقل ہوا۔ [1] یہ کلیات جو درحقیقت تحفۃ الصغر، وسط الحیاۃ، غرۃ الکمال اور بقیہ نقیہ کے انتخابات پر مشتمل ہے، پہلی بار ۱۸۷۱ء میں مطبع نولکشوری کانپور سے شایع ہوا۔

(۱) جو مقطعات خدا بخش اور سالار جنگ کے نسخوں یا اُن میں سے کسی ایک نسخے میں موجود ہیں اُن کا انجمن اصلاح الانصار (کاٹی) کے نسخے سے دستیاب شدہ مقطعات سے مقابلہ کر کے درست ترین قرأت کو متن میں نقل کیا گیا ہے اور اختلافات قرأت کی نشاندہی ذیل حاشیے میں کی گئی ہے۔

(۲) کہیں کہیں قیاسی تصحیح بھی کی گئی ہے، بالخصوص ان قطعات کے نقل کرنے میں جو خدا بخش اور سالار جنگ کے نسخوں میں نہیں پائے گئے، اس طریقہ کار کو اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

(۳) اختلافات قرأت کی نشاندہی کے لیے نسخوں کے علامتی ناموں کا استعمال کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہے:

ا ـــ نسخۂ انجمن اصلاح الانصار، پبلک لائبریری، کاٹی۔

خ ـــ نسخۂ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

س ـــ نسخۂ سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد (دکن)۔

مقطعات کی ترتیب اور تسوید میں نسخہ ا کو اصل اور اساس کی حیثیت دی گئی ہے کیوں کہ مقطعات اسی نسخے سے نقل کیے گئے ہیں، نیز یہ جس ترتیب میں پائے گئے ہیں اسے برقرار رکھتے ہوئے دائیں جانب حاشیے میں ورق نمبر کا بھی اندراج کر دیا گیا ہے:

غیر مطبوعہ مقطعات امیر خسرو

(۱)

۲۵۰ ب بشکن دستم بظلم و بشکنم دستت بعدل[۱] | گر مکافات و جزا گم نیست چرخ پیر را
برگ بید انجیر، گفتی، باد را می بشکند | باد هم داند شکستن برگ بید انجیر را

(۲)

چون بزی بکام[۲] گردد کار | راه تندی چرا کسی سپرد
غرضی کان ز مصلحت خیزد | جنگ و کین هرگزش بسر نبرد
کار سوزن نیاید از شمشیر | زان سبب کین بدوزد آن ندرد[۳]

(۳)

بدر سرای شبی دیدم احمقی که بجهد | نشست تا بسحرگاه و پاس سلطان داشت
چو وقت صبح شد و خلق در نماز آمد | نخفت چون سگ و فرض خدای را بگذاشت

(۴)

قلم بجور مران ای وزیر شاه و بترس[۴] | ازان سواد که در نامه سیه[۵] نیزه است کلام
محرری بسیاقت بدیدم و گفتم | که نقش[۶] خلق ازین کلک بوسه نیزه است کدام
جواب داد که اصحاب منصب است ای ظلم | که آب این قلم از چشک چنین نیزه است کدام[۷]

(۵)

ای سلیمان زمان آنچه صبا در سالی | ره رود[۸]، یک تک اسپ تو دو چندان باشد

---

۱ (ب) عقل ؛ خ ، میں یہ قطعہ نہیں ملا ۲ (ب) قلم ۳ (ب) برد ؛ یہ غالباً برد کی مسخ شدہ صورت ہے۔
۴ خ ب ، شہ بترس ۵ خ ب ، کہ ۶ خ ب ، نقش ۷ خ ب ، کہ آب این قلم از چشک نیزہ است ۸ (ب) رہ رود یک اسپ ؛ خ قطعہ ندارد

پیل تو بس کہ جوانی ہمہ از بخت تو یافت — گرچہ صد سال[1] بود نیز بدندان[2] باشد

(۶)

اہل جہاں کنند بشاہ و ملک نگاہ — اہل ہنر نظر بہ ضعیف و گدا کنند
بینا شمر (کساں ؟) کہ بخرداں نظر کنند — زاں کازموں بہ پیش لعشم راز سہا کنند[3] (کذا)

(۷)

نیکی[4] آنست کہ چوں خواجہ شوی — بندہ ایمن بود از دستانت
نیک داری چو فرودستان را — بد ندارند زبر دستانت

(۸)

تو بحرص مال و مرگ اندر کمیں — وہ، کہ کس باشد دلیر از آدمی
۲۵۱ ب چند گنج زر[5] نہی در زیر خاک — خاک را پر بیں[6] بزیر از آدمی
آدمی از خاک گردد سیر لیک — می نگردد خاک سیر از آدمی

(۹)

چو بر دل گشت حرص مال غالب — ز بہرش از ریاضت کن خزانہ
اگر در شرع غلطی عالم بد — ربا[7] خوارت کند از ہر بہانہ
مگس چوں بر سر سلطاں نشیند — مگس راں بایدش، نہ تازیانہ

(۱۰)

ای مبارک روی سلطانی کہ روز عید را — چہرۂ[8] میمون تو آمد مبارک تر ز ماہ
گرچہ شاعر پیشہ ام اما ندارم آں لجاج — کز پی[9] ہر چیز گستاخی کنم[10] در پیشگاہ
من نمی خواہم بعیدی خواستن جرأت کنم — لیک عیدم رنجہ ای دارد کہ معہودم بخواہ

۱؎ ا: صد سال ۲؎ ا: دو چنداں ۳؎ س، ح: قطعہ ندارد — ۳؎ کازموں = (یعنی نان و نفقہ) اور چشم کے ساتھ "لاس" (یعنی آنسو) جیسے الفاظ کی بنا پر میں مصرع کی قرأت یہ ہو سکتی ہے: زاں کازموں نہ پیش کہ چشم لاس سہا کنند ۴؎ خ: نیکو ۵؎ ا: شود ۶؎ ا: مگس بر ۷؎ ا: بیچارہ ۔ ۸؎ ح، س: ربی ۹؎ خ: غرہ، س ندارد ۱۰؎ خ: لا ۱۱؎ ا: "در" ندارد

(۱۱)

۲۵۲ الف بگفت بشیرین بتوان چو دفع دشمن کرد | مگوی تلخ که زخم زبان کند جاهل[1]
فساد خون چو توان کرد کم بخوردن شهد | یکی بگوی که نشتر چرا خورد عاقل[2]

(۱۲)

هرچه از نیک و بد کند مردم | نیک بد باشد ار ز حد گذرد
آب حیوان که مایهٔ عمرست | چون ز سر برگذشت، جان ببرد[3]

(۱۳)

چو خلق[4] است کسی را سیاه رویی و فسق | از او توان بلت آن فعل زشت بردن نه[5]
طپانچه سرخ کند روی را و دل زنگی[6] | بصد طپانچه توان سرخ روی کردن نه[7]

(۱۴)

ایا کسی که دوانی ز بهر بیشی مال | بخانه گرچه مهیاست[8] عشرت و بادست
مدد ز بهر زیادت چو هستی[9] داری | که مادر و پدرت نی[10] ز بهر این زادست
ز بهر نسیه چه پویی بترس از آنکه اجل | بدیگری دهد آن نقد تو که آمادست
گرت میسر نبود رواست دیدن رنج | چو داری آن همه کوشیدنت نه بر بادست
بخور بشادی و ز افلاس غم مخور که بغم | کسی نبندد آن در که رزق بگشادست
تو هیچ دانی کز تو چه می برد[11] این عمر | بداند آنکه خدایش کفایتی دادست
چو بگذرد همه آنگاه دانی از تو چه رفت | که این دم ار چه رشدی[12] پیر هم دلت شادست[13]
چنین حیات ز بهر زری[14] که می بخوری[15] ده | برنج می گذرانی چه کارت افتادست

(۱۵)

هر آدمی که ز دو دست[16] جوهر معنی | بود بپایه ز حد کمال[17] بیرون تر

---

[1] ا، حاصل [2] ا، ناقل [3] ا، نبرد [4] ا، خلقت [5] غ، س، ی، نی [6] ا، و زنگی را [7] غ، س، ی، نی [8] س، مهیاست [9] ا، مرو [10] ا، هستی، غ، س، هستی [11] ا، نه زبهر این، س، نی بهر، غ، از پی من. [12] ا، غ، س، چو گذرد [13] ا، شوی [14] ا، زردی [15] س، نخوری [16] ا، دو دست، غ، س، درو نیست [17] غ، سنگ و کلوخ

ز آدمی هنر آدمی شریفترست[۱] | همای را بود از ذات سایه میمون تر[۲]

(۱۶)

۲۵۲ ب مرده گیر آن زنده را[۳] در مذهب روشندلان | کش بخواب بی غمی شبها بپایان می شود
سوز در تن زندگی باشد نمی بینی که شمع | هر چه می سوزد[۴] ز سر تا پای او جان می شود

(۱۷)

گر سفیهی نگه کنی که بجهل | هر زمان رنج مردمش هوس ست[۵]
هرزه گویی دگر (بد) کار بود | تا بیادش دهد از انکه خس ست
لاف زن داروی سفیه بود | باد بر آن[۶] تا ببک مگس ست

(۱۸)

زر خویش خود خور که اصل و نسب را | پس از تو بسندست فضل خدایی
چو قسام غیرست تو از بهر مردن | چه جان می کنی آخر ای روستایی
بسا کس کزو ایشان بسی ماند زرها | که کردند اولاد ایشان گدایی
بسی از گدایی[۷] که فن بود و اصلش | رسیدند در میری و پادشایی
ولی بی بصیرت[۸] تجارت نداند | که خفاش کورست در روشنایی

(۱۹)

هر دلی کش ز زندگیست نعیبی | هیچ گه[۹] او ز درد فرد نباشد
دردمندی نشان زندگی آمد | مرده را دیده یی که درد نباشد

(۲۰)

بکم خوارگی خوی کن تا ترا | تن از تندرستی توانگر بود
که بیماری اندر تن آدمی | چو[۱۰] از خوردن پر بود گر بود

---

۱ (ا) ترا آدمی هنر شریفترست ۲ (ا) همای رای شوی جهد کن ۳ (ا) زنده را ۴ (ا) می سوزد ۵ (ا) هر زمان رنج مردمش چوست ۶ (ا) باد بزان ۷ (ا) گدیه ۸ (ا) میصرت ۹ (ا) هیچ گی او / خ (ص) آگاه وی ۱۰ (ص) چه

نبی چون ازان صادقانی که جوع — بمعده طعامیست درخور بود

بسیری مکن جهد باری که آن — سوی شهوت و آز رهبر بود

۲۵۳ الف اگر پر خوری، خر بوی یا ستور — ورت لقمه‌ای کمتر از خور بود

بجزی موافق بوی با کسی — که بی توشه خسپد چو بی زر بود

گرفتم که این خود اگر نشنوی — که کم گفته‌هات باور بود

نصیحت بمعقول گویم یکی — کنی آن گرت عقل یاور بود

چو خواهد شدن در شکم روشنت — خورش گر همه شهد و شکر بود

سزد کانچه نوشیش نیازی شنید — ز بن تا گلویت سراسر بود

چو حمال که می شوی، جهد کن — که باری حوالت سبکتر بود

(۲۱)

صبا صبحدم بر گلستان گذشت — بسی گفت مر غنچه را ناسزا

که در پیش بلبل ز گلبانگ او — چرا در تبسم در آیی، چرا

چون این نکته را غنچه بشنید گفت — بسوسن بگوی از من این ماجرا

که هر شب بدوشیزگان چمن — چها می کند تا سحرگه چرا

بچندین حکایات رنگین و خوش — دهان (ن) مرا می گشاید صبا

(۲۲)

هر کرا بوی ز معنی باشد اندر خون و پوست — بس نیاید باد پیمایان پر تزویر را

جز بمجلس خوش توان بستن زبان بدسگال — تا که خالص کند نوشیده بوی سیر را

(۲۳)

۲۵۳ ب شهباز پرتو پیکان تیر — دل دشمن بسودای عنقا ماند

بکوه قاف عنقا رفت تیر — ز عنقا قاف را بر دو عنقا ماند

۱- س، بگر ۲- ۱، اگر ۳- ۱، بخته ۴- ۱، بعقول حکیمی ۵- ۱، رهبر ۶- ۱، نانچه بنوشی ۷- ۱، چرا ۸- ۱، کرمی
۹- ۱، ناله، خ، ناله؛ س، بناله

(۲۴)

دی در حظیره[1] رفتم و بگریستم بدرد[2] — از ہجر دوستاں کہ اسیر فنا شدند
ایشاں کجا شدند، بگفتم، بگنبدش[3] — داد از صدا جواب کہ ایشاں کجا شدند

(۲۵)

راه[4] مخوف (است) مخسپ ای جواں — خیز کہ بگذشت زپل کارواں
توبہ گہ کامروائی خوشست — دولت تقوی بجوانی خوشست
پیر کہ خوبانش نپرسند باز — دل چہ کند گر ننهد بر نماز
مطرب کہنہ بکہ راند نفس — چوں نی او زو نستاند نفس
ہر کہ چراغی بجوانی نسوخت — خانۂ پیریش نباید فروخت

(۲۶)

۲۵۴ الف در جوانمردی و مردی ہر کہ کاری پیش برد — تا جوانمردی بود گر بر زباں آرد سخن
آنکہ او کردو بگفت او را شمر مرد تمام — واں کہ او کردو بگفت اوزن بود لیکن چو پیل
واں کہ نکردو بگفت او را مداں جز نیم مرد — واں کہ ناکرده بگفت او را مخواں[5] جز نیم زن

(۲۷)

ابیات عاشقانہ نگر[6] کن کہ ہر یکی — دارد سواد کوتہ و خوش چوں شب وصال
آں کو نباخت جان و دل در ہوای عشق — یارب مباد[7] در شب و روزش بجز ملال

(۲۸)

۲۵۵ الف پند من اینست ای منعم کہ مالِ خود بخود — تا پس از شام تو دشمن را نباشد وجہ چاشت
گر نگہ می داریش از بہر روز بد مدار — زانکہ روز بد چو آید[8] خود نگہ تو انش داشت

(۲۹)

ایا مرد حریص اندر خوشی کوش — چہ در بند[9] زری و رنج آمال

[1] ا: حضیره [2] ا: زدود [3] ا: تبرتش [4] یہ ابیات (جو صرف ا میں شامل ہیں) مثنوی کی بحر میں ہیں۔ قطعات کے ساتھ ان کے نقل کیے جانے کا سبب شاید وحدت مضمون ہے۔ یہ ابیات س اور خ میں موجود نہیں [5] ا: مداں [6] ا: بگوکن۔ [7] ا: مبار [8] س: زانکہ چوں روز بد آید [9] ا: در بند

بجمع مال خود عمر همه رفت — مگر در گور خواهی خوردن آن مال

(۳۰)

بدی مکن که نه نیکو بود، اگر بتوان — ز بد بتر بود ار مردم نکو بکنند
تو نیکویی کن اگر با تو کس بدی کردست — که نیکی تو سزای بدی او بکنند

(۳۱)

دانی که نیکویی ز بدی به چو خلق را — در نیک و بد به پیش خدا راه جویی ست
نیکی به است گر بکنی ور نه بد مکن[1] — کای دوست آنکه بد نکنی هم نکویی ست

(۳۲)

گرت بگفتن بد جاهلی کشاد زبان[2] را — تو زان حدیث بد و گفت بی فروغ چه رنجی
گر آنچنانی کو گویدت، زراست چه رنجش — در آن نه‌ای که ترا گفت[3] از دروغ چه رنجی

(۳۳)

۲۵۸ الف بده که زر نه ز بهر نگاه داشتن آمد — که فایده ندهد تا نهانست در دل کان زر
بدست خویشتنش پاش تا بروی زمین — که هر چه زیر زمین ماند خاک بر سر آن زر

(۳۴)

گر از برهمن و جوگی کرامتی دیدی — مبند دل که چو دین نیست این همه خلقست
کنیز نیز بصفوت[4] چو آب روی نماست — ولیک فرق همین[5] کین پلید و آن[6] پاکست

(۳۵)

میان بخشش و اسراف[7] هست تفرقه‌یی — بگویم ار شنوی لیک[8] از سر انصاف
اگر بطبع کرم می کنی بدان که سخاست — وگر ز بهر نکو گفت مردمان اسراف[9]

(۳۶)

دوش می گفتند بیداری بر دولت دهد — خفتش اندر مرد اد بار و ملال و خواری است

---

[1] ا، نیکی به است اگر کنی ورنه بدی مکن [2] ا، کشاده زبان شد؛ غ، کشاد زبان شد [3] غ، س، در آن نه‌ای تو کرا و گفت. [4] ا، بصوت [5] ا، همان کان [6] ا، این [7] س، اطراف [8] ا، نیک [9] س، اسراف

پاسباں گفت عمر من بیداری گذشت — من چرا دور از پی مالم که دولت یاری است
گفتم ای نادان مگو اینها که از چشم خرد — گر ببینی خود ہمیں دولت ہماں بیداری است

(۳۷)

گر کریمی ہست مفلس مردم اورا داں ولیں — کز وی آید مردمی گرچه نباتی کم (کذا) بود
ور لئیمی منعم است اورا سگی باید شمرد — کز خیری نان ربایدگر زرش صد خم بود
مردم ار در دلق کہنه است وسگ اندر طوق زر — سگ ہماں سگ باشد و مردم ہماں مردم بود

(۳۸)

خواہی نوای دنیا بارگ آخرت — برگی ہمی رساں بفقیران بی نوا
مرده است زنده ای که نیاسود از وی کسی — زنده است مرده ای که کند حاجتی روا

(۳۹)

گر احمقی بگنج فریدوں توانگر است — در چشم من حقیر تر از خاک در بود
مردم که نیستش ہنر و شرو تیش ہست[۲] — دیوار دان که خشت وی از سیم و زر بود
۲۵۸ ب این ننگ را کجا برم آخر که چوں منی — از بی زری فروتر ہر بی ہنر بود
شاید اگر فرود نیاید بہر خری[۳] — از بہر سیم و زر سر آن کس که سر بود
در کون خر اگرچه نزند یا ردم نہی — چوں نیک بنگریش ہماں کون خر بود
وان کاحترام کون خری را بزرکند — نه کون خر که چیزی از آں گنده تر بود

(۴۰)

کسی که ہست فروتر ز تو سلامش کن[۱] — سلام بی ز خودی خود بصد رضا باشد
اگر توانی با منعماں تکبر کن — که کبر بر سر درویش جمله روا باشد
بر اہل کبر تکبر، بر اہل فقر سلام — تواضع اینت اگر از پی خدا باشد
ولی ترا بره ار منعمی بپیش آید — ز بہر خدمت او قامتت دوتا باشد

---

[۱] خ میں یہ قطعہ نہیں ہے س میں یہ تیسرا شعر ہے اور شعر گفتم ای نادان الخ دوسرے شعر کی حیثیت سے نقل ہوا ہے س ۱ ازاں
مالم [۲] ۱ مردم کسی در و شرو س نیست [۳] س ۱ بہر خسی خری [۵] ۱ بر - [۶] ۱ سلام بکن [۷] ۱ بر [۸] ۱ قامت

دگر براه سلامی کند ترا درویش   علیک نیز نگویی[۱] چنیں روا باشد

(۴۱)

سخی نه یی چو زر از بهر نام و ننگ دهی   کز آں سخاوت بزرگی خویشتن هوس ست
بزر چو نام خری ایں تجارتست، نه جود   خرید نام بزر چوں خرید زر نحس ست
نهفته بخش که پوشیده خود نخواهد ماند   علیه گر همه خود نیم دانه عدس ست
چناں بده که ستاننده هم نداند حال   که بروی آں کرمی بی گشایش نفس ست
مثل اگر دو درم باشد اجرت درزی   کرم بود چو زیادت[۲] دهد کسی که کس ست
دهنده آنرا احسان شمارد و خیاط   گمان مزد برد چوں بغیر ملتمس ست
کسی که خواست بده، وانکه می نیارد خواست[۳]   ز شرم خلق، بدو پیش ده چو دسترس ست
نه منتی بنه و نی بزرگ داں خود را   عطا اگر همه صد گنج یا دو صد فرس ست
چو کردی ایں همه بهر خدای کن کانجا   نه ضایع ست اگر فی المثل پر مگس ست
چو ایں برای خدامی کنی جزا مطلب   که ایں[۴] پذیرش رحمان جزای بنده بس ست

(۴۲)

۲۵۹ الف   مراست[۵] صد هنر و نیست زر بدیں تعلیم   اگر تو طعنه زنی بی هنر نخواهم ماند
(چو علم و فضل خلاص ست، مال و زر بند ست   خلاص دادم و در بند زر نخواهم ماند)
اگر نصیب خرانست در جهاں زر و سیم   من از برای زر و سیم خر نخواهم ماند

(۴۳)

هر که نزد کسی بحاجت رفت   نیک و بد ز و شنیدنی باشد
گر بزرگست کبر خود نکند   کبر جاییست گردنی باشد
واں دنی از دماغ گنده خویش   هر چه بنمود دیدنی باشد
زانکه هر کو بآبخانه رود[۶]   بوی گندش شنیدنی باشد

---

۱ س: بگوی ۲ س: زیاد ۳ س: او ۴ س: بهار بجای کراین ۵ خ میں یہ قطعہ نہیں ہے۔ اس دو شعر (اول اور سوم) میں۔ شعر دوم س سے نقل کیا گیا ہے اسلیے اسے قوسین میں رکھا گیا ہے۔ س میں اس قطعے کی ردیف "شد" ہے۔ اسے ا کے مطابق "ماند" سے بدل دیا گیا ہے۔ ۶ ا: زانکه به کو آب خانه رود؛ خ، س: ندارد

(۴۴)

کسی کہ زخم زد او ہم ز زخم خود بشکست — کسی کہ زخم کشید او بجان درست بماند
ہزار چوگان دیدم شکست بر یک گوی — کہ گوی مسکین خود ہمچناں درست بماند

(۴۵)

۲۵۹ ب ہر کار کز قضیۂ عدلی کشد بظلم — از حکم شرع ظالم آں را زبوں کنند
لیکن چو حکم شرع ز تزویر یافت لوث — آں مایۂ پلیدی از و چوں بروں کنند
ہر جا آن شود پلید نمازی کنند ز آب[1] — آب ار شود پلید، نمازش چوں کنند

(۴۶)

مفلسان مسکین شکار (کبر) فرمانبر بوند — دیدہ باشی ایں تجارت در خلایق سر بسر
مالداران را بود کبر و دماغ و عجب و خشم — ہر کہ بدتر (ز) ہی صفتہا جملہ در وی بیشتر
کبر بر دوزخ نماید راہ و مسکین بخلد — خواہ ایں را باش و خواہ آں را سخن شد مختصر

(۴۷)

۲۶۰ الف نازکی تن مردم بجہاں چند (اں) نیست — کہ نکرد ست بر او محنت ایام گذر
حال نیکو ز حوادث چو بدل گشت ببد — بکشد ہر کہ نکوتر ز بدی ہر چہ بتر
آنکہ ز آلودن صندل شدہ آسودہ[1] سرش — چوں فتد پارہ کنند کندۂ ہیزم بتر
آنکہ دشوار نمودیش بسر ناز کسی — گل نمود اورا خروار مغیلاں بر سر
راست گفتند بزرگاں خردمند کہ ہست — نازنین تر ز گل و سخت تر از سنگ بشر

(۴۸)

صوفی آنست کش بود گہ مال — دل پر چشم ..... (کرم خوردہ)! ..... باز
مایۂ صوفیاں نیاز بود — پیش حق کی برد مانش ناز[2]
دامن از صوفی بچیں کو را — آستیں کوتہست و دست دراز

---

1 ا: شدن آلودہ ؛ خ ، س : ندارد 2 ا : نیاز

(۴۹)

هر آن مال کز حرص گرد آوری — خوش ست اول و در نهایت عذاب
چو آبی که مستسقی درکشد — بلب[1] شربت و در جگر زهر ناب

(۵۰)

یارب این جاهلان بی معنی — که کنند از متاع دنیا ناز ۲۶۰ ب
زان قلیلی[2] که حاصل دنیاست — سهل باشد چه سان رسید فراز
تا ازان عجب ننگرند[3] بخلق — چشمشان خود بکس نگردد باز
پارسی شان درست نی وز جهل — علما را شده مواخذه ساز
چون زبن تا گلو[4] جوال کنند — بچه گردند معجب و طناز
وای و صد وای برنگون بختی — که گذر سوی شان کند بنیاز
گر سلامی بگوید[5]، از لبشان — بر نیاید علیک را آواز
گاو و خر نه، کلوخ یا سنگند — یافته نزد جاهلان اعزاز
سنگ را گر کسی سلام کند — تو چه گویی[6] علیک گوید باز

(۵۱)

ناقابلست آنکه بدولت نمی رسد — ورنه زمانه در طلب مرد قابلیست
در کنج حجره گر نه رسد نور آفتاب — آن حجره مانعست ز خورشید نه بخلیست

---

۱ ا: بیب ۲ ا: قلیل ۳ ا: شکرند ۴ خ: جوال ۵ خ، س: اگر بگوید سلامی ۶ ا: بگوی.

خدا بخش لائبریری کی چند اہم مطبوعات

مطبوعات اردو

● **من موہن کی باتیں** (قرآن مجید کا ترجمہ): مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی۔ ۱۵ روپے ● **صراط مستقیم**: (ملفوظات) مرتبہ پروفیسر قمر استان خان۔ ۳۰ روپے ● مولانا ابوالکلام آزاد کا نادر اخبار **پیغام** (مکمل فائل)۔ ۱۰۰ روپے ● **تصوف برصغیر میں**: ہندو پاک اور بنگلہ دیش میں موجود مخطوطات نادر اور اہم غیر مطبوعہ مخطوطات پر تحقیقی مقالات کا مجموعہ۔ ۱۵۰ روپے ● **طب اسلامی**: ہندو پاک اور بنگلہ دیش میں موجود مخطوطات طب پر تحقیقی مقالات کا مجموعہ۔ ۱۵۰ روپے ● **قطعات دلدار**: (عہد میر و سودا کے صوفی شاعر شاہ دلدار کا کلام)۔ ۱۵ روپے ● **یادگار روزگار** (تذکرہ مولانا شمس) از سید بدر الحسن (دو حصے ایک جلد میں)۔ ۲۰۰ روپے ● **قومی یکجہتی کی روایات**: بشمبر ناتھ پانڈے۔ ۵۰ روپے ● **ہندستانی مسلمانوں کے مسائل** از سید حامد۔ ۳۰ روپے ● **اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر**: ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد (اورنگ زیب عالمگیر کی شخصیت پر لگائے گئے الزامات کا مدلل اور مفصل جواب)۔ ۱۵ روپے ● **مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علیگڑھ میں**: رشید احمد صدیقی۔ ۲۰ روپے ● **ایک نادر روزنامچہ**: از مولوی ظفر علی سندیلوی (انیسویں صدی کے نصف آخر سے بیسویں صدی کے ربع اول تک) تحقیق ڈاکٹر انوار الحسن ہاشمی۔ ۳۰ روپے ● **داستاں میری**: از ڈاکٹر اقبال حسین: بہار کے مسلمانوں کی پچھلے سو برسوں کی ادبی تہذیبی سماجی تاریخ۔ ۳۰ روپے ● **ہندستانی مسلمان عصری دستاویزات کی روشنی میں**: (پہلی جلد آزادی کے بعد علی گڑھ کا نقشہ)۔ ۱۰ روپے ● **فارسی اور ہندستان**: از پروفیسر نذیر احمد۔ ۱۰ روپے ● **العصر لکھنؤ**: ۱۹۱۱-۱۹۱۳ (انتخاب و تعارف)۔ ۵۰ روپے ● **ادیب الہ آباد**: ۱۹۱۰-۱۹۱۳ (انتخاب و تعارف)۔ ۱۵ روپے ● **صبح امید لکھنؤ**: ۱۹۱۸-۱۹۲۱ (انتخاب و تعارف) ۵۰ روپے ● **معیار**: قاضی عبدالودود کا رسالہ (مکمل فائل) ۱۹۳۶۔ ۵۰ روپے ● **نگار** کا جدید غزل نمبر ۱۹۴۰۔ ۳۵ روپے ● **زبان گجرات**: ۱۹۲۸-۱۹۳۶ (مکمل فائل)۔ ۵۰ روپے ● پنڈت موتی لال نہرو کا ۱۹۱۰ کا **خطبہ صدارت**: ۱۰ روپے ● **رقعات رشید صدیقی**: مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خان۔ ۲۰ روپے ● **مقدمہ طلسم ہوشربا**: ۲۰ روپے ● **طلسم ہوشربا** مع مقدمہ (آٹھ جلدیں)۔ ۸۰۰ روپے ● **ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت**: منشی رام پرشاد ماتھر اعلیٰ۔ ۲۰ روپے ● **جنید احمد کی آٹو گراف بک**: ۱۰ روپے ● **دیوان مصحفی**: منتخبہ اکبر حیدری کاشمیری۔ ۵۰ روپے ● **شخصیات و واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا**: جنید احمد۔ ۲۵ روپے ● **گیتا اور قرآن**: پنڈت سندر لال۔ ۲۵ روپے ● **تحفۃ السعداء**: خواجہ کمال (م ۸۰۲ھ)، پیشکش حکیم حسین خاں شفا۔ ۲۰ روپے ● **بہار اردو لغت**: یوسف الدین احمد بلخی۔ ۱۵ روپے ● **تاریخ نادر العصر**: منشی نولکشور، تقدیم ڈاکٹر انوار الحسن۔ ۲۵ روپے۔

مطبوعات فارسی

● **قطعات حسرت**: ۱۵ روپے ● **کنز تواریخ**: شاہ غلام عظیم آبادی کے تاریخی قطعات۔ ۱۰ روپے ● **مجمع النفائس**: سراج الدین علی خاں آرزو۔ ۱۰ روپے ● **باغ معانی**: تذکرہ شعرائے فارسی (نقش علی)۔ ۱۰ روپے ● **صحف ابراہیم**: تذکرہ شعرائے فارسی، علی ابراہیم خاں خلیل۔ ۱۰ روپے ● **فرہنگ زفان گویا**: مرتبہ پروفیسر نذیر احمد۔ ۵۰ روپے ● **دیوان حافظ**: (شاہان مغلیہ کے ذاتی نسخے کی عکسی اشاعت)۔ ۲۰۰ روپے

مطبوعات ہندی

● **من موہن کی باتیں**: مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا ترجمہ قرآن۔ ۱۰ روپے ● **دلدار کے دوہے**: ۱۸ویں صدی ہجری کے مشہور صوفی کا کلام۔ ۱۰ روپے ● **اورنگ زیب**: ایک نئی درشٹی: ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد۔ ۱۵ روپے ● **بھارت میں قومی ایکتا کی پرمپرائیں**: بی۔ این۔ پانڈے۔ ۵ روپے ● **مولانا آزاد کی یاد میں**: ۱۵ روپے ● **اقبال ہندستان اور پاکستان**: پروفیسر سید حسن احمد۔ ۱۵ روپے ● **بھارتیہ راشٹریہ آندولن اور مولانا ابوالکلام آزاد**: ڈاکٹر ایس۔ انوم۔ ۲۰ روپے ● **سامپردایکتا اور دیش کی ایکتا**: ہندو مسلم فسادات کو کیسے روکا جائے (قومی یکجہتی پر سیاسی سماجی دانشوروں کے مقالات کا مجموعہ)۔ ۱۵ روپے ● **خدا بخش لائبریری ایک پریچے**: لائبریری پر پہلی کتاب ہے جسے ایک انگریز نے اب سے ساٹھ سال قبل لکھا تھا، از سر نو ترجمہ کر کے لایا گیا ہے۔ ۱۵ روپے

مطبوعات انگریزی

● **ایک مشرقی کتب خانہ**: ۵ روپے ● **اسلام اور ہندستانی تہذیب**: بی۔ این۔ پانڈے۔ ۱۵ روپے ● **عہد سلطنت کے صوفی ادب کا جائزہ**: بروس لارنس۔ ۱۰ روپے ● **صوفیا کے مکتوبات اور ملفوظات**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۱۰ روپے ● **ملفوظ الوسائل**: ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب۔ ۱۰ روپے ● **افکار اسلامی بدلتی دنیا میں**: پروفیسر سید وحید الدین۔ ۱۰ روپے ● **مجموعہ مقالات**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۱۰ روپے ● **بہار میں اسلام اور مسلمان عہد وسطیٰ میں**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۲۵ روپے ● **بہار عہد سلطنت اور مغل دور میں**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۵ روپے ● **اسلامی تقویم کی تشکیل نو**: ڈاکٹر ہاشم امیر علی۔ ۱۰ روپے ● **مشرق و مغرب**: پروفیسر آصف علی اصغر فیضی۔ ۱۰ روپے ● **خدا بخش**: ۱۰ روپے ● **مغل آرٹ**: ۱۵ روپے ● **حضرت امیر خسرو**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۲۵ روپے ● **فارسی ادب میں ہندستان کا حصہ**: پروفیسر نورالحسن عابدی۔ ۱۰ روپے ● **وہابی تحریک اور دوسرے مقالات**: از علی اشرف۔ ۱۵ روپے ● **ٹیپو سلطان، حیدر علی، کشمیر**: ڈاکٹر محب الحسن۔ ۱۵ روپے ● **خدا بخش لائبریری کا مخطوطات**: عربی فارسی اردو مخطوطات کے توضیحی کیٹلاگ: ۳۳ جلدیں، قیمت ہر جلد ۵۰ روپے۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

مخطوطات شناسی

- آزاد بلگرامی کی تصنیف 'غزلان الہند'
  - ڈاکٹر سید حسن عباس
- فن تعمیر اور کتبہ شناسی پر ایک اہم کتاب: گورمبلہ
  - جناب فرخ جلالی
- داستان امیر حمزہ کا ایک قدیم نسخہ (انگریزی)
  - ڈاکٹر سید نعیم الدین

ڈاکٹر سید حسن عباس
خیابان انقلاب، خیابان ۱۶ آذر
کوچہ پارسی، پلاک ۹ تہران

آزاد بلگرامی کی تصنیف "غزلان الھند"
ایک جائزہ

میر غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶ــ۱۲۰۰ھ) برصغیر کے اس طبقۂ فضلا سے تعلق رکھتے ہیں جن کی برصغیر میں عربی اور فارسی ادب کی روایت پر ایک ساتھ تنقیدی نظر ہے۔ انھیں جو "حسان الہند" کہا گیا ہے تو یہ عربی شاعری میں ان کے اعلیٰ مرتبے کی بنا پر ہے جب کہ فارسی شعر و ادب کے لیے بھی ان کی خدمات کچھ کم بلند پایہ نہیں۔ اُن کے مؤلفہ تین اہم تذکرے "سرو آزاد"، "خزانۂ عامرہ"، اور "ید بیضا" تراجم شعرا اور نقد شعر کا عمدہ مآخذ ہیں۔ آزاد کو شاعری کے فنی پہلوؤں سے جو آگاہی تھی اور ان کی طبیعت میں شعری صنایع و بدایع کا جو رجحان تھا وہ ان کی ایک نادر تصنیف غزلان الھند سے عیاں ہے۔ یہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے۔ یہاں ہم اس کا ایک تفصیلی تعارفی جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

غزلان الھند علم بدیع اور صنایع شعری سے متعلق ایک مختصر سی کتاب ہے جو آزاد کی عربی تالیف سبحۃ المرجان فی آثار ھندوستان[1] کی آخری دو فصلوں کا فارسی ترجمہ ہے۔ سید شمس الدین حسن الحسینی بنارسی نے بنارس کے راجا ایسر پرساد کے حکم پر سبحۃ المرجان کا فارسی ترجمہ کیا تھا بظاہر وہ ابتدائی دو فصلوں کا ہی ترجمہ کر پائے تھے۔ اس ترجمے کا مخطوطہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں نمبر ۶۵۳ کے تحت موجود ہے۔ سبحۃ المرجان چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی اور دوسری فصل میں آزاد نے اپنے دو مستقل رسالے شمامۃ العنبر اور تسلیۃ الفواد درج کیے ہیں۔ پہلا رسالہ (فصل) قرآن مجید کی تفاسیر اور کتب احادیث میں وارد ہندستان سے متعلق اشارات پر مبنی ہے جب کہ دوسرے رسالے (فصل) میں ۴۳ علمائے ہند کے حالات اور مصنف کے قصائد نقل ہوئے ہیں۔ تیسری فصل میں محسنات کلام یعنی صنایع و بدایع (سنسکرت)، مصنف کی دریافت یا ایجاد کردہ صنعتوں کا ذکر ہے اور چوتھی فصل میں نایکا بھید کا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عربوں کو ہندستانی

[1] یہ کتاب پہلی بار ۱۳۰۳ھ میں بمبئی سے اور دوسری بار ۱۹۷۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے باہتمام جناب فضل الرحمن ندوی شایع ہوئی۔

علما اور فنون شعری سے متعارف کیا جائے۔ سبحۃ المرجان کی تصنیف (۱۱۷۷ھ) کے ایک سال بعد آزاد نے اپنے دو عزیز شاگردوں میر عبدالقادر مہربان اورنگ آبادی اور لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی کے کہنے پر اس کی آخری دو فصلوں کا فارسی ترجمہ غزلان الھند کے تاریخی نام (= ۱۱۷۸ھ) سے کیا۔ اس ترجمہ کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے خود آزاد نے لکھا ہے:

"نوای دلکش اسی طوطیان ہند را بگوش صاحب طبعان فرس باید رسانید[1]۔"

ترجمہ پر آزاد نے ایک مقدمے کا اضافہ کیا اور مندرجات کو بھی از سر نو مرتب کیا۔ غزلان الھند دو مقالات پر مشتمل ہے اور ہر مقالے کو چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مقدمہ میں آزاد نے جزیرۂ سراندیپ میں نزول حضرت آدمؑ اور اس سلسلے میں مختلف کتابوں مثلاً تفسیر دُرِّ منثور سیوطی اور محاضرۃ الاوائل و مسافرۃ الاواخر شیخ علی رومی وغیرہ سے ہندستان سے متعلق تفاسیر و احادیث و روایات کا ذکر کیا ہے اور علم ریاضی و علم موسیقی میں اہل ہندستان کے کمالات کی ستائش کی ہے اس کے بعد سنسکرت میں علم عروض پر مختصر سی روشنی ڈالی ہے پھر علم بدیع کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علمائے فارس نے فن بدیع عربوں سے حاصل کیا ہے اور جس شخص نے عرب میں اس فن کی ایجاد کی اور اس فن کا نام "بدیع" رکھا وہ عبداللہ بن المعتز عباسی (م: ۲۹۶ھ) تھا۔ اس نے ۲۷۴ھ میں اس فن میں ایک کتاب تالیف کی اور سترہ صنعتوں کا ذکر کیا۔ اس کے معاصر قدامہ بن جعفر کاتب نے بھی اسی راہ میں قدم رکھا اور بیس صنعتیں ایجاد کیں البتہ سات صنعتیں توارد کے زمرے میں آتی ہیں اس طرح مجموعی طور پر تیس صنعتیں ہوئیں بعد کے لوگوں نے مذکورہ دونوں مخترعین کی پیروی کی۔ ابوہلال عسکری (م: ۳۹۵ھ صاحب کتاب الاوائل و کتاب الصناعتین) نے ۳۷ اور ابوعلی حسن بن رشیق قیروانی (م: ۴۵۶ھ یا ۴۶۳ھ مؤلف کتاب العمدۃ) نے بھی تقریباً اتنی ہی صنعتیں جمع کیں۔ ان کے بعد شرف الدین تیفاشی (م: ۶۵۱ھ) نے اسے ستر تک پہنچا دیا۔ پھر ابومحمد زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالواحد ابی الاصبع صاحب کتاب تحریر التحریر (م: ۶۵۴ھ، کشف الظنون میں زکی الدین کے بجائے رکن الدین آیا ہے۔) نے مزید تیس صنعتیں استخراج کیں۔ اس طرح صنائع کی تعداد نوّے ہو گئی اس کے بعد بھی اس کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ ڈیڑھ سو سے زیادہ ہو گئی لیکن فن بدیع کے ہندستانی مخترعین نے نہ تو خرمن عرب سے خوشہ چینی کی اور نہ ہی ساغر فارس سے کوئی قطرہ لیا بلکہ ہندی علم بدیع کی تاریخ بہت پرانی ہے یہ

---

1. غزلان الھند نسخۂ خطی کتابخانۂ مجلس شورائے ملی (اسلامی) تہران ش ۳۱۱۱، ص ۳۔

قبل از اسلام وجود میں آچکا تھا۔ ہندستان کے قدیم علما نے بہت سے معنوی اور لفظی صنایع کا مختلف قسم کے کلام سے استخراج کیا۔ آزاد نے عربی اور ہندی صنایع کا بغور مطالعہ کیا۔ انھیں تین قسمیں نظر آئیں:

الف: بعض صنائع تو عرب و ہند میں مشترک ہیں مثلاً ایہام، حسن تعلیل، تجاہل عارفانہ، مراجعت، استعارہ، تشبیہ، جناس وسجع...

ب:۔ بعض صنائع عرب سے مخصوص ہیں مثلاً استخدام، مضمر، حسن، تخلص و تاریخ بہ قاعدۂ جمل وغیرہ۔

ج: اور بعض ہندستان سے مخصوص ہیں۔ آزاد نے آخری قسم کو سبحۃ المرجان میں ہندی سے عربی میں نقل کرنے کا ارادہ کیا اور اس قسم کی ستائیس صنایع کا انتخاب کیا۔ ہر ایک کا نام تجویز کرنے کے علاوہ اس کی تعریف بھی کی ہے اور مثال میں سبحۃ المرجان میں عربی شعرا کے کلام سے اور غزلان الہند میں فارسی شعرا کے دواوین سے کثرت سے شواہد پیش کیے ہیں[2]۔ یہاں وہ صنعتیں مع نام، تعریف اور مثال درج کی جارہی ہیں۔

۱۔ **الاستبداد**: لغت میں استبداد کے معنی استقلال ہے اور اصطلاح میں اپنے وجود میں معلول مستقل ہو اور بغیر علت کے ظاہر ہو۔ مثال از غنی کشمیری:

عزتی داریم در شہر جنوں کز راہ دور | سنگ می آید باستقبال ما از ہر طرف

۲۔ **الاعتساف**: لغت میں اعتساف کے معنی بے راہ روی ہے اور اصطلاح میں، علت میں تاثیر پذیر نہ ہو (بلکہ) اس کے علاوہ اثر مرتب کرے اور اس صنعت کے لیے استبداد اور طغیان لازم ہے۔ مثال از صائب تبریزی: عشق می چیند ز دلسوزی بلای حسن را | در دل بلبل نہد خاری کہ در پای گل است

۳۔ **اضمار النہی**: قرائن کے مطابق متکلم کی مراد امر و نہی ہو[1]۔ مثال از آزاد بلگرامی:

گر می روی بدست خودم قتل کردہ رو | نعش مرا بزیر زمیں ہم سپردہ رو

۴۔ **الانتزاع**: مشبہ سے مشبہ بہ نکالا جائے۔ مثال از مظہر جانجاناں:

جوش زد مستی ز چشم دلبراں میخانہ شد | مشت خاک می پرستاں چرخ زد پیمانہ شد

۵۔ **براعۃ الجواب**: اس سے مراد یہ ہے کہ متعدد سوالوں کا مشترک لفظ میں جواب دیا جائے۔ یہ صنعت صنعت صرف الخزانہ میں بھی پائی جاتی ہے (جس کا ذکر آئے گا) فرق یہ ہے کہ اس میں متعدد سوالوں کا

۱۔ آزاد کہتے ہیں کہ اضمار النہی کی اس سے پہلے تعریف نہیں کی گئی ہے جب کہ صاحب توضیح نے امر کا استعمال سوال معنی میں کیا ہے از انجملہ تمہید (غزلان الہند ص ۴۷)

۲۔ مجموعی طور پر آزاد نے اس مختصر کتاب میں ۲۹۶ شعرا کے ۷۰۰ اشعار بطور مثال پیش کیے ہیں جن میں ۵۲ اشعار نامعلوم شعرا کے ہیں۔ سب سے زیادہ اشعار صائب تبریزی کے اور اس کے بعد خود آزاد کے ہیں۔

ایک لفظ میں جواب دیا جاتا ہے۔ مثال از آزاد بلگرامی :

چہ در خور است در جود و بخل را گفتم　　　جواب داد کریمی فراز می باید

۶ التاویل : کوئی فعل مواخذہ کے متوجہ ہونے کے وقت وجہ اصلی کے بغیر کسی فعل کی توجیہ کرے۔ مثال از آزاد بلگرامی :

زاہد بکوی سادہ رخاں عاشقانہ رفت　　　پند نگاہ مست بتاں را بہانہ ساخت

۷ التسلط : علت ناقصہ، علت تامہ کی جگہ لے لے اور معلول ایجاد کرے اس صنعت کے لیے صنعت استبداد ضروری ہے لیکن تسلط میں متکلم کا مقصد علت ناقصہ کے استقلال کا بیان ہے اور استبداد میں بغیر علت کے معلول کا وجود۔ مثال از امیر خسرو دہلوی :

قامتت راست چو تیر است و عجایب تیری　　　کہ ز من دور و مرا از دل و جاں می گذرد

۸ تشبیہ الاستغنا : مشبہ کے وجود سے مشبہ بہ مستغنی ہو۔ مثال از صائب تبریزی :

حاجت دام و کمندی نیست در تسخیر ما　　　گردش چشمی بود بس حلقۂ زنجیر ما

۹ تشبیہ البرہان : متکلم دعویٰ کرے کہ مشبہ عین مشبہ بہ ہے اور اس دعوے کی دلیل پیش کرے۔ مثال از شیخ سعدی :

بہشتی درختی تو اے بادشاہ　　　کہ افگندۂ سایہ یکسالہ راہ

۱۰ تشبیہ التقویہ : متکلم مشبہ بہ پر ایسے قیود کا اضافہ کرے جس سے مشبہ کی تقویت ہوتی ہو اور وہ زیادہ واضح ہوتا ہو۔ مثال از آزاد بلگرامی :

نگاہ یار ز دل بی درنگ می گذرد　　　چو تیغ تیز اصیل فرنگ می گذرد

۱۱ تشبیہ التمنی : مشبہ بہ، کمال مشبہ ہونے کی آرزو کرے۔ مثال از آزاد بلگرامی :

اگر بہار خط عنبر آرزو دارد　　　مکن نگاہ بتقصیر او کہ سودائیست

۱۲ تشبیہ التسلیب : مشبہ بہ کے بعض متعلقات اس سے سلب کر لیے جائیں اور مشبہ ثابت کیے جائیں۔ مثال از شکیبی صفاہانی :

بیا ساقی آں آب حیواں بدہ　　　ز سرچشمۂ خان خاناں بدہ
سکندر طلب کرد لیکن نیافت　　　کہ در ہند بود و بظلمت شتافت

۱۳ تشبیہ الشیٔ بنفسہ : یہ ہے کہ مشبہ و مشبہ بہ ایک ہو۔ مثال از ظہوری ترشیزی :

چوں ظہوری بجز ظہوری نیست   در محبت یگانہ می باشد

۱۴ تشبیہ النفی : اس کے تین اقسام ہیں:

۱ نفی مشبہ واثبات مشبہ ۔ مثال از شفیق اورنگ آبادی :

شمشاد نیست اینکہ بگلشن دمیدہ است   آہ از چمن بیاد کسی سر کشیدہ است

۲ نفی مشبہ بہ واثبات مشبہ ۔ مثال از مہربان اورنگ آبادی :

ساقی خدری کن از گذارش   لخی ز دل است ایں عیب مست

۳ نفی مشبہ واثبات مشبہ بہ متعدد بہ تردید ۔ مثال از آزاد بلگرامی :

نیست زلف عنبریں عارض سیمین او   سنبل آشفتہ یا آہ پریشان من است

۱۵ تفضیل التغایر : اس کی دو قسم ہے ۔

(الف) باوجود مفضل، مفضل علیہ کی جانب سے کسی کی سرزنش کی جائے ۔ مثال از خان زمان امانی :

بیاد کعبہ چہ سری زنی خدا اینجاست   بطوف مروہ کجا می روی صفا اینجاست

(ب) اس شخص کی سرزنش کی جائے جو دوسرے سے خود کو افضل سمجھتا ہے حالانکہ دوسرا اس سے افضل ہے ۔
مثال از آزاد بلگرامی :

ماہ را چیست کہ خود راز تو بہتر داند   خجل از روی تو خورشید قیامت باشد

۱۶ التفضیل علی التفضیل : یہ ہے کہ متکلم کسی (ہم جنس) چیز پر کسی چیز کو فضیلت دے اس کے بعد تیسری (غیر ہم جنس) چیز کو مفضل پر فضیلت دے ۔ مثال از آزاد بلگرامی :

در فلزات اگر فوق ہمہ زر باشد   خاک کوی تو ز زر بیش بہا تر باشد

۱۷ تقبیح الملیح : کوئی نیک کو برا جانے ۔ مثال از صائب تبریزی :

مخمور ترا در دل من نشۂ جاں بخش   زہریست کہ پنہاں شدہ در زرنگینی

۱۸ التقوی : متکلم ضعیف سے قوی عمل کے صدور کو ثابت کرے ۔ مثال از صائب تبریزی :

کم نیست جگر داری پیراں ز جواناں   کار دم شمشیر کند پشت کماناں

۱۹ تملیح القبیح : کوئی برے کو اچھا جانے ۔ مثال از آزاد بلگرامی :

نیست عاشق را بہشتی بہتر از قید بتاں   از خدا آزاد خواہد سیر گلدام شما

۲۰ التنزیہ : کسی چیز کو پاک کرنا، قول الٰہی، لیس کمثلہ شیء کے مشابہ ہے۔ مثال از آزاد بلگرامی:

غیرت از یکتائی او بس بلند افتادہ است — صورت معشوق را تصویر کردن خوب نیست

۲۱ التنوع : ایک چیز متعدد ماہیت اور مختلف جہات کی حامل ہو۔ مثال از صائب تبریزی:

پردۂ خواب است بر چشم تو فلکہا — در چشم من ایں دایرہ یک دیدۂ بازاست

۲۲ ثمرۃ الخلاف : عمل کا نتیجہ اس کے مطابق نہ ہو[1]۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

۱ نیکی کا بدلہ برائی سے دینا۔ مثال از صائب تبریزی:

زنام من بغلط ہم دہن نسازد تلخ — ہماں کہ یاد بش نقل محفل است مرا

۲ برائی کا بدلہ نیکی سے دینا۔ مثال از طالب آملی:

دشنام خلق را ندہم جز دعا جواب — ابرم کہ تلخ گیرم و شیریں عوض دہم

۲۳ جمع الخزانہ وتفریقہا : عبارت ہے اس سے کہ امر واحد میں لفظ مشترک کے معنی جمع کر دیے گئے ہوں۔ اس کے بعد جمع کے سلسلے میں تفریق کی گئی ہو۔ اس کا نام الجمع مع التفریق الھندی بھی ہے۔ عربی میں یہ صنعت بہت پسندیدہ واقع ہوئی ہے۔ مثال از آزاد بلگرامی:

بادشاہاں را مزدہ آمد رکاب — روز جنگ دشمناں وقت سحاب

۲۴ صرف الخزانہ : عبارت ہے اس سے کہ مشترک لفظ سے متعدد معنی کا ارادہ کیا جائے اور اس کے معنی کے مطابق اس کا استعمال کیا جائے[2]۔ مثال از آزاد بلگرامی:

دست طلب زعنبر و گوہر کشید نیست — یک بادطرۂ سخن او شنید نیست

۲۵ الطغیان : معلول، علت تامہ کی نافرمانی کرے اور سر تسلیم خم نہ کرے اور یہ صنعت عکس استبداد ہے۔ مثال از انیسی شاملو ہروی:

دارم از شمشیر او زخمی کہ بعد از سوختن — گر بیفشارند از خاکسترم خوں می چکد

۲۶ قلب الماھیہ : کسی چیز کی حقیقت کسی اور چیز میں مبدل ہو جائے۔ مثال از غنی کشمیری:

---

۱ آزاد کا خیال ہے کہ اسے محسنات کلام میں شمار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس میں متکلم کو عمل دخل حاصل نہیں ہے (غزلان الھند ص ۵۲) ۲ آزاد کا خیال ہے کہ علمائے فارس کے یہاں اس صنعت کی کوئی مثال نہیں ملی لہذا جو اشعار انھوں نے بطور مثال پیش کیے ہیں وہ خود ان کے ہی ہیں۔ (غزلان الھند ص ۳۲)

نصیب ما ز باغ آفرینش میوۂ غم شد　　نہالی را کہ پروردیم آخر نخل ماتم شد

۲۷ المخالطہ : امر صادق سے امر کاذب کی تعلیل کی جائے۔ اہل ہند نے اس کی تعریف یہی کی ہے لیکن آزاد نے امعان نظر کے بعد اسے مبالغہ کے معانی میں پایا ہے۔ مثال از قاسم شہدی :

بسکہ افتاد از غمت شوریدگی در کار ما　　بر سر ما خود بخود وا می شود دستار ما

۲۸ موالاۃ العدد[1] : علت، اپنے معلول کی ضد پسند کرتی ہے۔ مثال از طالب کلیم :

سپاہ غمزہ ات را در ہزیمت فتح می باشد　　شکست افتاد بر دلہا چو برگردید مژگانت

ان کے علاوہ خود آزاد نے ۳۵ صنایع کا استخراج کیا ہے جن کی فہرست، تعریف اور مثال درج کی جا رہی ہے۔

۱ الاعتذار : کوئی اپنے عمل کے سلسلے میں عذر کرے جو دوسرے کی مرضی کے برخلاف ہو اور اپنے عذر کو خوش آیند تعلیل سے معلل کرے خواہ حقیقی ہو خواہ غیر حقیقی۔ مثال از صائب تبریزی :

تلخ اگر باشد حدیث من مرا معذور دار　　ریخت بر من آسمان زہر یکہ در شیشہ داشت

۲ الافحام : لغت میں دلیل سے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے معنی میں ہے جب کہ اصطلاح میں کسی امر کے واقع ہونے کے سلسلے میں متکلم دلیل لائے جو خصم مستحیل یا مستبعد کے قریب ہو۔ مثال از انوری :

در جہانی و از جہان بیشی　　ہم چو معنی کہ در بیان باشد

۳ الاقتسام : متکلم متعدد اشیاء کو متعدد اشخاص میں تقسیم کرے۔ مثال از امیر خسرو دہلوی :

از صحن خانہ تا بلب بام ازان من　　از پشت بام تا بہ ثریا ازان تو

۴ التحول : دو امر کے درمیان مقررہ معاملہ منقلب ہو جائے۔ مثال از حافظ شیرازی :

ای فروغ ماہ حسن از روی رخشان شما　　آبروی خوبی از چاہ زنخدان شما

۵ التشبث : فنائے علت کے بعد معلول باقی رہے۔ مثال از حسن دہلوی :

کاری کہ بود با تو مرا پیشتر نرفت　　سر رفت در ہوای تو ایں درد سر نرفت

۶ التسویہ : متکلم دو اضداد کو ایک بار میں پہچان لے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دے۔ مثال از صائب تبریزی :

کعبہ و بت خانہ یکساں است پیش چشم من　　سنگ کم در پلہ میزاں نمی باشد مرا

---

[1] آزاد نے اہل ہند کی ستائیس صنایع کا ذکر کیا ہے اور موالاۃ العدد کے بارے میں لکھا ہے یہ اہل ہند کی صنعت کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ مخترعات مؤلف تک سے ہے۔ (غزلان الغزل ص ۴۴)

۷ **التشبیک** : لغت میں انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کرنے کے معنی میں ہے جب کہ اصطلاح میں تہنیت وتعزیت جیسی دو مخالف چیزوں کو جمع کرتا ہے۔ مثال از فائض ابہری :

گل رفت و عندلیب از و یادگار ماند — دادیم گر ز دست یکی از ہزار ماند

۸ **تشبیہ الاثر** : متکلم دعوی کرے کہ مشبہ عین مشبہ بہ ہے اور مشبہ سے مشبہ بہ کا کوئی اثر طلب کرے۔ مثال از صائب تبریزی :

می تواند کشت ما را قطرہ ای سیراب کرد — ایں قدر استادگی ای ابر دریا دل چرا

۹ **تشبیہ الترقی** : متکلم کسی چیز سے مشبہ کو تشبیہ دے پھر اس سے رجوع کرے اور اسے کسی اور چیز سے تشبیہ دے جو مشبہ اول سے بہتر ہو۔ مثال از نوعی خبوشانی :

دست فرسود تمنا دل شیدائی نیست — ایں گل طور بود لالۂ صحرائی نیست

۱۰ **تشبیہ الاجتہاد** : مشبہ بہ، مشبہ کے مرتبہ پر پہونچنے کی سعی کرے۔ مثال از آزاد بلگرامی :

ہلال ایں ہمہ سعی کمال ہر جا کرد — کہ رفتہ رفتہ فروغ رخ تو پیدا کرد

۱۱ **تشبیہ الاحتراز** : متکلم دعوی کرے کہ مشبہ عین مشبہ بہ ہے اور مشبہ، مشبہ بہ کے بعض اوصاف سے احتراز کرے خواہ وہ اچھی صفات ہوں یا بری۔ مثال از شیدا فتحپوری :

تو گر آفتابی کہ بر من نتابی — وگر نیز خوابی بچشمم نیابی

۱۲ **تشبیہ الاستخدام** : اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک استخدام مظہر، جس کی تعریف یہ ہے کہ متکلم واحد شے کو واحد شے یا لفظ مشترک میں مندرج متعدد اشیاء سے تشبیہ دے۔ مثال از آزاد بلگرامی :

ہمچو جم تا می توانی عشرت ایام کن — زندگانی با پری زادان و با گلفام کن

دوسری استخدام مضمر۔ اور اس کی تعریف یہ ہے کہ مشبہ بہ ضمیر استخدام واقع ہوا ہو۔ مثال از آزاد بلگرامی :

از کسانیکہ آہوی دارند — رم نمودن چو او مزور تراست

۱۳ **تشبیہ الاستدلال** : متکلم دو چیزوں میں باہم مماثلت کا دعوی کرے اور اس کے لیے دلیل قائم کرے۔ مثال از صائب تبریزی :

ہم چشم حبابم کہ درین قلزم خونخوار — کسب من سرگشتہ ہمیں کسب ہوائی است

۱۴ **تشبیہ الاستفادہ** : مشبہ بہ، مشبہ کے بعض اوصاف استعمال کرے یا بر عکس۔ مثال از سلمان ساوجی :

بادِ سحر از بوی تو دم زد ہمہ جاں شد　　　آبِ خضر از لعل تو جاں یافت رواں شد

۱۵ **تشبیہ الانتقال** : متکلم دعوی کرے کہ مشبہ عین مشبہ بہ ہے اور مشبہ کے علاوہ مشبہ بہ کے بعض لوازم کی نشاندہی کرے۔ مثال از امیر معزی :

گر نور مہ و روشنی شمع تراست　　　بس کاہش و سوزش من از بہر چراست
گر شمع توی مرا چرا باید سوخت　　　گر ماہ توی مرا چرا باید کاست[1]

۱۶ **التفاول**[2] : فعل کے ساتھ قول سے خبر کا استنباط ہے۔ مثال از آزاد بلگرامی :

نسیم گفت بمن نو بہار می آید　　　گرفت فال دل من کہ یار می آید

۱۷ **تفضیل الاستخدام** : اس کی دو قسمیں ہیں :

۱۔ متعلق بہ استخدام مظہر : یعنی واحد یا اشیائے متعدده کو مشترک لفظ میں موجود اشیائے متعدده پر فضیلت دی جائے۔ مثال از آزاد بلگرامی :

ساغر ما چشم تر آئینہ ما دل بود　　　کیست جم تا دم زند از رتبۂ والای ما

جم یعنی جمشید و سکندر۔

۲۔ استخدام مضمر : اس میں مفضل علیہ ضمیر استخدام واقع ہوا ہو۔ مثال از آزاد بلگرامی :

سال و ماہش بہ ابد باد قرین　　　چشم بد دور کہ روشن تر از وست

ماہ بمعنی شہر و ضمیر او بمعنی قمر۔

۱۸ **تفضیل الشیء علی نفسہٖ** : مفضل و مفضل علیہ ایک ہوں۔ مثال از ظہوری ترشیزی :

نتواں گفت ز خوباں دگری می باشد　　　ہم توی از تو اگر خوب تری می باشد

۱۹ **تفضیل المشروط** : کسی چیز پر کسی چیز کو فضیلت دی جائے مگر شرط کی قید کے ساتھ جیسا کہ ارباب بدیع

---

[1] آزاد نے لکھا ہے کہ یہ رباعی صاحب حدائق السحر نے تشبیہ الاضمار کی مثال میں پیش کی ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ شاعر کسی چیز کو کسی چیز سے تشبیہ دے لیکن ظاہر کرے کہ اس کا مقصود کچھ اور ہے نہ کہ یہ تشبیہ۔ اور اس کی ضمیر میں تشبیہ مقصود ہو۔ چنانچہ مذکورہ رباعی میں شاعر نے بظاہر اظہار تعجب کیا ہے لیکن بباطن معشوق کو ماہ و شمع سے تشبیہ دی ہے اور صاحب فہم پر روشن ہے کہ تشبیہ انتقال اور تشبیہ الاضمار میں بُعد مشرقین ہے۔ (غزلان الھند ص ۸۶) نیز ملاحظہ ہو۔ حدائق السحر فی دقائق الشعر بہ تصحیح عباس اقبال تہران ۱۳۶۲ش ص ۴۹۔ [2] آزاد کا خیال ہے کہ یہ صنعت عرب و فارس کے کلام میں موجود ہے لیکن کسی نے اس صنعت کو علیحدہ استعمال نہیں کیا ہے۔ (غزلان الھند ص ۵۳)

نے تشبیہ مشروط کا ذکر کیا ہے۔ بقول شاعرے :

زخمی اگر از تیغ تو آید بسرِ ما　　　بہتر ز گل تازہ شناسد نظرِ ما

۲۰ التصدیر المعنوی : شعر کے آخر میں کوئی مرادف لفظ لایا جائے یا وہ لفظ جو مصرع اول یا مصرع ثانی کے درمیان میں واقع ہو اور تصدیر معنوی اور رد العجز علی الصدر میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر کی تاکید مرادف پر اور موخر الذکر کا زور بعینہٖ لفظ پر ہوتا ہے۔ مثال از شفیعای اثر :

خاتم دولت زمانی بیش در دست تو نیست　　　بے خبر افتادہ ای از بازی انگشتری

۲۱ التنزیل : صغیر کو کبیر یا قلیل کو کثیر کیا جائے۔ یہ صنعت شیخ زکی الدین ابن ابی الاصبع کی اختراع ہے اور انھوں نے اس کا نام "حصر الجزئی والحاقہ بالکلی" رکھا ہے آزاد نے اسے صرف جزئی کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مثال از آزاد بلگرامی :

از و عنایت کم بے شمار می دانم　　　چو عندلیب یکی را ہزار می دانم

آزاد نے اس کے برعکس اختراع کی ہے یعنی تنزیل کبیر بہ منزلۂ صغیر و تنزیل کثیر بہ منزلۂ قلیل۔ مثال اول از صائب تبریزی :

آسماں گرچہ وسعتی دارد　　　چشمۂ سوزن است دلہا را

مثال ثانی از آزاد بلگرامی :

فوج دشمن در نگاہ ما غبار بیش نیست　　　صد سوار برق جولاں نیسواری بیش نیست

۲۲ التوصیہ : کوئی کسی کو مامور کرے کہ مذہب عشق کی آرزو کرے یا آمر کی موت کے بعد (اپنی تمنا پوری کرے) مثال از امیر خسرو دہلوی :

سیہ بادام را ہر سو میفگن در نظر بازی　　　نگہدارش کہ روزی بر سر تابوتم اندازی

۲۳ جر التثقیل : متکلم دعوی کرے کہ محال ممکن ہے اور ممکن، محال پس متکلم دو ثقیل کو اپنا رہا ہے۔ مثال از صائب تبریزی :

خرمن بی حاصلاں از خوشۂ پروین گذشت　　　دانۂ امید صائب ہمچناں زیر گل است

۲۴ حسن النصیحہ : متکلم کی مراد، غیر کی خیر خواہی کے بجائے اپنی خیر خواہی ہو۔ مثال از ابو طالب کلیم :

مرا سوز کہ نازت ز کبر یا افتد　　　چو خس تمام شود شعلہ ہم ز پا افتد

۲۵ الخارق : عقل یا عادت کے مطابق کسی امر کا وقوع پذیر ہونا مستحیل ہو۔

آزاد کا خیال ہے کہ ادبائے فارس نے تعجب کے نام سے ایک صنعت نکالی ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ شاعر اپنے

کلام میں کسی تعجب خیز بات کا ذکر کرے اس سے واضح ہے کہ صنعت تعجب میں، کلام میں تعجب خیز چیز موجود ہو، برخلاف اس کے خارق جس میں اظہار تعجب ضروری نہیں ہے اور تعجب کبھی خلاف عادت نہیں ہوتا۔ مثال از آزاد بلگرامی :

ہلاک حیرتم از شوخی ناز آفریں طفلی　　　کند صد رنگ بازی در زمیں صفحۂ تصویرش

۲۶ عکس الانتزاع : مشبہ بہ سے مشبہ نکالا جائے۔ مثال از غنی کشمیری :

شکست از ہر در و دیوار می بارد مگر گردوں　　　ز رنگ چہرۂ ما ریخت رنگ خانۂ ما را

۲۷ عکس المغالطۃ : امر صادق سے امر کاذب کی تعلیل کی جائے۔ مثال از آزاد بلگرامی :

چشم بیباک تو سیہ کار افتاد　　　آں قدر بادہ کشی کرد کہ بیمار افتاد

۲۸ الغبطۃ : کسی کی تبدیلیٔ حالات کی تمنا کرنا۔ مثال از باقی ملحق :

چو او را تکیہ بر دیوار دیدم مردم از حسرت　　　کہ ایں فرسودہ قالب خشت آں دیوار بایستی

۲۹ الغصب : کوئی شئے غیر کی خاصیت اختیار کر لے۔ مثال از حافظ حکاک کرمانی ،

فروغ ماہ رخت دیدہ ام پر آب کند　　　کسی ندید کہ مہ کار آفتاب کند

۳۰ کلام الروح : متکلم خود کو میت فرض کرے اور اپنے نفس ناطقہ سے کلام کرے۔ مثال از بیدل عظیم آبادی :

براہت مردہ ام اما زیارت خانہ ای ننگم　　　تو می آئی و من آسودہ آتش در مزار من

۳۱ النذر : کوئی شخص مذہب عشق کے مطابق کسی کام کے ہونے کی صورت میں کوئی کام کرنے کی شرط رکھے۔ مثال از سلیم طہرانی :

عہد کردم کہ گر ایں بار بکوی تو رسم　　　سرمۂ دیدہ کنم سایۂ دیوار ترا

۳۲ الوفاق : عبارت ہے اس سے کہ دو ضد باہم موافقت کریں اور ایک دوسرے پر صادق آئے۔

آزاد نے اس صنعت کا استخراج طباق کے مقابلے میں کیا ہے۔ مثال از خان احمد گیلانی : رباعی۔

از گردش چرخ داژگوں می گریم　　　وز جور زمانہ بیں کہ چوں می گریم

با قد خمیدہ چوں صراحی شب و روز　　　در قہقہہ ام و لیک خوں می گریم

قہقہہ' یہاں قلقہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے لہذا وفاق لفظی ہے۔

۳۳ المزاح : متکلم اپنے کلام سے دوسروں کو خوش کرے۔ مزاح استہزا سے مختلف ہے اور کسی نے اسے علیحدہ صنعت نہیں قرار دیا ہے۔ آزاد کا خیال ہے کہ انھوں نے اسے خلعت استقلال عطا کیا ہے۔ انکے نزدیک بہترین مزاح وہ ہے جو فحش سے خالی ہو اس حد تک کہ اگر جوان لڑکی سنے تو اسے شرم دامن گیر نہ ہو۔ مثال از نعمت خاں عالی :

رباعی۔ عالی از غمت اشک نہ ریزد چہ کند   وز ہجو تو شوخی نہ گریزد چہ کند
پیراست و تو پشت می کنی جانب او   انصاف بدہ کہ بر نہ خیزد چہ کند

۳۴ **المعارضہ**: کوئی شخص کسی شخص کی کسی دلیل کے خلاف کوئی دلیل پیش کرے۔ مثال از عمر خیام: رباعی۔

مے می خورم و مخالفاں از چپ و راست   گویند مخور بادہ کہ دشمن دیں راست
چوں دانستم کہ مے عدوی دین است   واللہ خورم خون عدو راکہ رواست

۳۵ **المفاضلہ**: متکلم کسی چیز کو کسی دوسری چیز پر ترجیح دے پھر کسی اور کو اول پر فضیلت دے۔ مناظرۂ سیف و قلم، مناظرۂ فقر و غنا اور مناظرۂ روز و شب اسی زمرے میں ہے جسے شعرا نے نظم کیا ہے۔ مثال از آزاد بلگرامی

قلم دراز تر از رمح او است در احسان   سناں دراز تر از خامہ در صف ہیجا

ان صنایع کے علاوہ آزاد نے پانچ مزید صنعتوں کا اضافہ کیا۔

بوقلمون: یہ امیر خسرو دہلوی کی ایجاد کردہ ہے۔

دو یا دو سے زائد معنی والا لفظ جس کا انجام مبہم ہو۔ یا وہ لفظ جو مختلف زبانوں میں مختلف معنی رکھتا ہو اور شاعر اسے اپنے مطابق استعمال کرے۔ مثال از امیر خسرو دہلوی:

گفتم کہ دریں خانۂ مامون تو باشم   گفتا کہ بلائی است دریں خانۂ ممانی

تین قدیم صنعتیں:

۱ بینات۔ ۲ دائرۂ تاریخ۔ ۳ زبرہ۔ ۴ تشبیہ التذکیر: اس کا ذکر سبحۃ المرجان میں نہیں آیا ہے۔

کتاب غزلان الہند کی افادیت:۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کا موضوع علم بدیع ہے اور شاعری میں وہ چاہے جس زبان کی ہو اس فن کا بہت عمل دخل ہوتا ہے اور اسے شاعری کے زیور یا کلام کی زینت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس فن کی مختلف کتابوں سے رجوع کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلتی ہے کہ آزاد نے جس طرح "سبحۃ المرجان" کی تالیف کے ذریعہ عربی فن بدیع کو غنی بنانے کی کاوش کی ہے بالکل اسی طرح اس کا فارسی ترجمہ کر کے اور فارسی شعرا کے کلام سے بے شمار مثالیں اور شواہد پیش کر کے فارسی میں اس فن کی بے شمار صنایع کا اضافہ کیا ہے۔ کیونکہ سنسکرت کی جو صنایع ہیں وہ بہر طور فارسی میں اس سے پہلے کہیں نظر نہیں آتیں، ملے دے کر ایک کتاب "تحفۃ الہند" تالیف میرزا خان ابن فخر الدین محمد[1] میں ایک باب "در علم سنگار رس یعنی علم عاشق و معشوق و بیان احوال عاشق و

---

[1] تحفۃ الہند تالیف میرزا خاں ابن فخر الدین محمد (سال تالیف احتمالاً در زمانہ اورنگ زیب) بہ تصحیح و تحشیہ ڈاکٹر نور الحسن انصاری، جلد اول، انتشارات فرہنگ ایران ۱۳۵۴ش۔ باب چہارم۔

ومعشوق "ملتا ہے جو غزلان الھند کے مقالۂ ثانی کے عنوان" در بیان نایکا بھید" سے قدرے مشابہ ہے۔ لیکن جو صنعتیں آزاد نے استخراج کی ہیں اور اسی طرح "معشوقات مستخرجۂ مؤلف" یقیناً آزاد کی جدت فکر اور وسیع مطالعے کا نتیجہ ہے اس طرح فارسی علم بدیع میں غزلان الھند اپنی افادیت کے پیش نظر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

غزلان الھند کے قلمی نسخے: اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں پہلے ان تین نسخوں کا ذکر کر رہا ہوں جو میرے پیش نظر رہے اور جن کے عکس میرے پاس موجود ہیں۔

۱۔ ایران۔ قم۔ کتاب خانۂ مرعشی نجفی، شمارہ ۱۳۹۱، نستعلیق، بقلم شیخ امتیاز علی بن شیخ بھولی بلگرامی، ۱۲۴۷ھ پہلے صفحہ پر ایک بیضوی مہر ہے "کتابخانہ سید علی اصغر بلگرامی و ابن علی م۔" ۷۳ ورق، ۱۷ س

۲۔ تہران۔ کتابخانہ مجلس شورائے ملی (اسلامی) ۱۔ شمارہ ۳۱۱۱، نستعلیق، بقلم سید عبد اللطیف، ۱۲۵۷ھ، ۸۱ ورق۔ یہ نسخہ درمیان سے ناقص ہے۔ اسکے پہلے صفحہ پر آیر کا ۱۶ اشعار کا ایک قصیدہ ہے۔ یہ نسخہ حکیم محمد نور الدین کی ملکیت تھا۔

۳۔ تہران۔ کتابخانۂ مرکزی دانش گاہ تہران، شمارہ ۴۴۳۳، نستعلیق بقلم سید محمد جلال الدین، ۲۲، جمادی الثانی ۱۳۱۹ھ، ۵۰ ورق۔ ۱۹ سطر۔

ان کے علاوہ اس کتاب کے چند نسخے درج ذیل کتب خانوں میں بھی موجود ہیں۔

● کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد، شمارہ ۱۶۴ و ۱۰۵ (دو نسخے) سال کتابت ۱۱۹۰ ● پاکستان نیشنل میوزیم، کراچی، شمارہ ۲/۱۳-۱۹۶۸، NM مکتوبہ میر غلام حسین ۱۵ محرم ۱۲۳۳ھ ● رام پور، کتب خانہ عبد السلام خاں صاحب سال کتابت ۱۲۵۲ (بحوالہ مقالہ "رام پور کے دو کتب خانے" از مولوی محمد شفیع، مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین ۲:۲/۱۹۲۶ء، ومقالات مولوی شفیع ج ۲: ص ۱۰۱) ● سالار جنگ میوزیم حیدرآباد شمارہ ۱۰۵۷/BSM/۱۸ نستعلیق مکتوبہ محمد بہار الدین ۱۱۷۵ و شمارہ ۱۰۵۸/A.N/۱۹۹ و شمارہ ۱۰۵۹/A.N/۱۹۸ (تین نسخے) ● ندوۃ العلما لکھنؤ شمارہ ۳۵ مکتوبہ محمد یوسف علی ابو الحامد ۱۲۹۳، بھوپال ● بانکی پور خدا بخش لائبریری شمارہ ۲۳ و ۲۴۷ ● مولانا آزاد لائبریری (حمیدیہ) بھوپال شمارہ ۳۳۳ ● برلن لائبریری شمارہ ۱۰۵۱ (۲۰۳) ● برٹش میوزیم لندن، ج ۲: ۹۷۱ ● انڈیا آفس، لندن شمارہ ۲۱۳۵ ● جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دو نسخے) ● ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری دہلی ● بوہار کلکتہ (ناقص، در مجموعہ)

••

جناب فرخ جلالی
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

فن تعمیر اور کتبہ شناسی پر ایک اہم کتاب

گوڑنامہ مؤلفہ منشی شیام پرشاد

اس مخطوطہ کا اصل نام گوڑ نامہ (گوڑھ نامہ) ہے اور یہ گوڑ پاونڈا (پانڈا) کی مختصر تاریخ ہے۔ اس کے مصنف منشی شیام پرشاد ہیں اور انھوں نے ۱۸۱۰ء کے آس پاس فرنکلن کی فرمائش پر اس کو لکھا ہے۔ آج تک اس کتاب کا اصل نام معلوم نہیں تھا۔ خدابخش لائبریری میں بھی اس کا نام خلاصہ احوال عمارت لکھا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا نسخہ لندن میں ہے۔ اس نسخہ کے اصل نام کی اطلاع وہاں پر بھی نہیں ہے۔ لندن کا نسخہ کافی غلط نقل ہے۔ پروفیسر دانی نے اپنی کتاب جو بنگال کے فن تعمیر کی تاریخ ہے اس میں اس مخطوطہ کو چھاپا ہے لیکن تو شاید مخطوطہ ہی غلط نقل ہوا تھا دوسرے طباعت و ترتیب میں بھی الفاظ و تراکیب غلط شائع ہوئے ہیں۔

میں نے اس مخطوطہ پر انڈین ہسٹری کانگرس منعقدہ دہلی ۲۳ فروری ۱۹۹۲ء کو ایک مقالہ پیش کیا۔ منشی شیام پرشاد نے اس میں بنگال کے مخصوص کتبے جن کو ہندستان میں پڑھنا مشکل خیال کیا جاتا ہے وہ صحیح پیش کیے ہیں۔ میں نے اس مخطوطہ کی چار اہم خصوصیات کی طرف توجہ دلائی۔

۱ ــــ گمشدہ کتبوں کے متن
۲ ــــ عہد سلطنت کی عمارتوں کا تذکرہ
۳ ــــ شاہجہاں کے عہد کی عمارتوں کا تذکرہ (آنند سرور میں شجاع کی عمارتیں)
۴ ــــ فن عمارت کی بعض خصوصیات اور اصطلاحوں کا بیان

میں نے اس مخطوطہ کے متن کو ایڈٹ کر لیا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس مخطوطہ کا کوئی دوسرا متن ہندستان کی کسی لائبریری میں مل جائے اگر خدابخش لائبریری پٹنہ اس مختصر مخطوطہ کو چھاپے تو اچھا ہے۔ اس فن پر کتابیں ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہیں۔

اس مخطوطہ کی تلاش کا موقع اور آسانی ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے فراہم کی اور اس کو پیش کرنے کی سہولت پروفیسر ضمیرالدین صدیقی صدر شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے عطا کی۔ ان حضرات کو ہندستان کے عہد وسطی کے مآخذ تلاش کرنے میں جو دلچسپی ہے وہ اہل علم کی طرف سے امتنان اور شکریہ کا باعث ہے اور یہ ہندستان کے کلچر کی بڑی خدمت تو ہے ہی۔ ●●

کشمیریات

ڈاکٹر صدیق نیازمند
شعبۂ فارسی، کشمیر یونیورسٹی
سرینگر

شرح حال و آثار و ارزیابی انتقادی سبک شعر ملا ساطع کشمیری

سرزمین کشمیر از نظر رشد زبان و ادبیات فارسی بسیار بارور و زرخیز بوده است. این زبان شیرین در عهد پادشاهان شهمیری که اولین خانوادهٔ پادشاهان مسلمان محلی آن دیار می باشد، مقارن با عهد تیموریان در ایران به آن خطهٔ دلپذیر راه یافت و در عهد پادشاهی سلطان زین العابدین (بڈشاه = شاه کبیر) این زبان برسمیت شناخته شد و حتی دیری نگذشت که جای زبان سانسکریت را که زبان رسمی این دیار بود، گرفت. بدین منوال زبان فارسی اولین بار در کشمیر بعنوان زبان اداری و درباری رایج گشت. در طول مدت شش قرن اخیر یعنی از ۷۲۵ هجری قمری تا نیمهٔ دوم سدهٔ چهاردهم هجری قمری در جنبه های گوناگون از شعر و سخن و علوم و ادبیات گرفته تا طب و نجوم و هیئت، شخصیت های برگزیده بوجود آمدند و تمام اینها انگیزه های خود را باین زبان شیوا ابراز نمودند.

دربار مغولان گورکانی هند از نظر تقویت شعر و بزرگترین تربیتگاه شاعران این عصر یکی از دوره های بسیار پر ارج بشمار میرود، زیرا شاعران نامدار و نثرنویسان چابکدست در همین عصر بوجود آمدند. از نمونه های برجستهٔ نثری و شعری آنها می توان باین نکته پی برد که یکی از سبک ها و روش های ویژهٔ این عصر که بنام سبک هندی موسوم است، در هند استحکام پذیرفت و باوج خود رسید. ناگفته نگذریم که بعلت یورشهای پی در پی ارتش مغول، کشمیر در سال ۹۹۴ هجری قمری استقلال خود را در زمان فرمانروایی اکبر شاه گورکانی از دست داد و بعنوان یکی از ایالات با هند منسلک گردید. چون سخنسرایان مغول بکشمیر آمد و شد داشته اند و در نتیجه آن شاعران فارسی گوی کشمیر تحت تاثیر شاعران دربار مغول قرار گرفتند، لذا از نتیجهٔ تاثیرپذیری و آمیزش با شاعران دربار مغول، سبک هندی مزبور که در هند نفوذ فوق العاده پیدا کرده بود و برای شاعران این دیار بکلی تازه و نو وارد بود، مورد توجه و تقلید شاعران کشمیری نژاد قرار گرفت. شاعرانی مانند مظهری کشمیری، فانی کشمیری، غنی کشمیری، جویا و گویا پیدا شدند که سبک هندی را پیروی نموده اند. ملا ساطع کشمیری یکی از شاعران همین دسته بوده است که در اشعار خود پیروی از سبک هندی نموده و با پشتکاری فوق العاده و بزحمات خود یکی از شاعران ممتاز این سبک درآمده و بعنوان ستارهٔ درخشان در آسمان ادب فارسی درخشید. تذکره نویسان راجع به اسم ساطع اختلاف نظر دارند. گروهی از تذکره نویسان وی را بنام ابوالحسن یاد میکنند[۱] و دستهٔ دیگر از تذکره نویسان اسم وی را ملا عبدالحکیم نوشته اند. محمد اعظم دیده مری صاحب واقعات کشمیر، که با ساطع روابط دوستانه و صمیمانه داشته است و تقریباً

بیست سال از محضر وی استفادهٔ علمی می کرده است. (بعلاوه، در اغلب اوقات از وی اصلاح شعر هم می گرفت). می نگارد که اسمش عبدالحکیم بوده است [۲۲] اصلح میرزا مؤلف تذکرهٔ شعرای کشمیر که خود را بعنوان شاگرد ساطع معرفی نموده است، تائید میکند که اسم ساطع ملا عبدالحکیم است [۲۳] اینکه بعضی از تذکره نویسان وی را ابوالحسن می پندارند، کنیت وی است نه اسم وی، در حالیکه در تائید این امر ما دلیل و براهین قاطعی بدست نداریم.

همانطور که تذکره نویسان در بارهٔ اسم ساطع با هم اختلاف نظر دارند، در بارهٔ اسم پدر ساطع هم با همین مشکلات روبرو هستیم. بعضیها اسم پدر ساطع، ملا محمد علی کشمیری نوشته اند در صورتیکه محمد اعظم دیده مری و بعضی از تذکره نویسان و مورخان ساطع را پسر آخند الب می پندارند [۲۴]

ساطع چطور ایام کودکی خود را بسر برده، ما در بارهٔ آن اطلاع قاطعی بدست نداریم و بدرستی نمی توان حدس زد که شاعر کی چشم بجهان گشوده است. اطلاعاتی که در بارهٔ ایام کودکی و طالب علمی وی بدست میرسد این است که وی تحصیل علم میکرد و طبع موزون داشت. شعر میگفت و در وهلهٔ اول شاگردی لاله ملک شهید اختیار نمود. بهمین تربیت استاد در کمترین زمان در این فن تبحر پیدا کرد. حتی در فن شعر گوئی چنان پیشرفت نمود که لاله ملک شهید خود را شایستهٔ تربیت او نیافته، و وی را بخدمت میرزا داراب جویا فرستاد [۲۵] بدین نحو ساطع شاگردی جویا را اختیار نمود. ساطع بکمک و معاونت میرزا داراب در جلسه ها و محافل علمی و ادبی آن زمان شرکت می جست. حتی که صحبت و مجالست با استاد و بعضی از استادان معاصر آن روزگار، طبع موزون ساطع را جلا بخشید، در شعر گوئی ترقی نمایان کرد و بر اقران خود فائق شده [۲۶] ساطع در بارهٔ استاد خود و نیز در مورد نکته سنجی خود که از جویا اخذ نموده است، می گوید:

مرا جو بند استادان ز هر نکته سنجیدن   همین بس حجت ساطع، که جویا بود استادم [۲۷]

ممدوحان ساطع :

چون ساطع در کشمیر زندگانی خود را با نهایت فقیری گذرانید لذا مسافرت به پشاور نمود تا کسب معاش کند. در اثنای راه با ملا محمد سعید اشرف که یکی از شاعران بنام روزگار خود بوده است ملاقات نمود. چون طبع ملا را موزون و وی را در شعر گوئی استاد یافت شاگردیش اختیار نمود و اصلاح شعر از وی گرفت [۲۸] پسر دوم عالمگیر محمد معظم در آن روزگار ناظم پشاور بود. وی هم شعر شناس بود و هم شاعران و سخن سرایان را بسیار دوست می داشت. ساطع این موقع را غنیمت شمرده، اول تقرب اسلام خان که میر آتش محمد معظم شاه بهادر بود، پیدا کرد و بعداً برفاقت وی به دربار شاه بهادر پیوست و رسالهٔ مختصری بنام گلشن اسلام به نثر فارسی باسم اسلام خان نوشت [۲۹] ساطع بیشتر قصاید خود را بمدح همین اسلام خان سروده است. یک نمونه های از آن در اینجا می آوریم :

۱- اسلام خان بهادر عالی جناب را   زیبا بود ز حلقهٔ چشم ظفر رکاب[10]

۲- من از نواب عالی دودمان اسلام خان گفتم   کز آمد آسمان با ماه عید از جبههٔ سلیمانش[11]

۳- یعنی آن نواب عالی دودمان اسلام خان   کز محیط همتش گردون بود کم از حباب[12]

ساطع از اسلام خان مزبور احسان فراوان دیده است - خود می گوید:

گرچه فیض مهر یکسان میرسد ذرات را   ساطع ما دیده از نواب احسان بیشتر

وقتیکه عالمگیر فوت نمود، محمد معظم بنام قطب الدین محمد معظم بهادر شاه[13] بر تخت سلطنت هند جلوس نمود، شعر ساطع بیش از پیش رونق یافت و بدربار وی منسلک شد - قطب الدین محمد معظم بهادر شاه ۱۹ ماه محرم ۱۱۲۴ هجری قمری فوت نمود و بعد از هرج و مرج بسیار که نه ماه طول کشید فرخ سیر پادشاهی یافت[14] ساطع در مدح وی نیز شعر گفته و بعرض وی بعنوان وسیلهٔ تقرب و انعام و بخشش رسانده است بعلاوه ساطع سه مثنوی مختصر را نیز از نظر همین پادشاه گزرانیده و جائزه های فاخر بدست آورده است[15] اشعار زیر که بمدح این پادشاه از کلیات ساطع برگزیده شده است بهترین دلیل برای این امر میباشد:

ز توصیف شه اقبال مندی   بدیوان میبرم شعر بلندی
زبان پیوسته میگردد بکامم   دهد نخل ثنا بار سلامم
بدرگاه شهنشاه حق آگاه   شه فرخ سیر غازی جمجاه[16]

—•—

بکام ساطع مدحت سرانجام   زبان گویاست بهر شکر انعام
بیا ساطع زبان رنگین بیان کن   رگ ابر قلم گوهر فشان کن
بمدح آنکه آمد در شهان طاق   شه فرخ سیر غازی آفاق
ز مهر و مه ستاند تاج شه باج   که برد این سرفرازانما معراج
چو دست شاه آمد گوهر افشان   فلک گردید سرتاپای داماں[17]

درمیان ممدوحان ساطع باید عبد العظیم خان و رضوی خان و امیر الامرا صمصام الدوله خان دوران و برادر وی مظفر خان را اسم برد - ساطع در کلیات خود اشعار متعددی در مدح اینها دارد - وی رضوی خان را اینطور توصیف میکند:

رضوی خان که مهر مدحش کرد   مطلعم را مشارق الانوار[18]

در توصیف عبد العظیم خان می گوید

دید آفتاب کوکبهٔ عبدالعظیم خان | شان مبارزان فلک اقتدار را[۱۹]

در جای دیگر میگوید :

کجا بهدیه برد طبع من جواهر مدح | مگر بدرگه عبدالعظیم خان آرد[۲۰]

آخرین ممدوح ساطع امیرالامرا صمصام الدوله خان دوران بوده است. وی الطاف و بخشش های این امیر بهرهٔ بسیار برده و چون دوری از وطن و سفرهای طولانی هند وی را ناراحت ساخته و از هوای سوزاندهٔ هند بسیار دل شکسته بود، لذا بفکر مراجعت کشمیر افتاد. بالآخر صمصام الدوله شاعر را اجازه برای مراجعت بکشمیر داد[۲۱]. صاحب سفینهٔ هندی مینویسد:

"آخر بدامن عالیجاه امیرالامرا خان دوران خان بهادر پرداخته و بهمین تفضلات آن عالیجاه خدمتی در کشمیر یافت، آنجا رفت. چون قدری جاگیر هم در آنجا یافته بود، معیشت بخاطر جمع نمود"[۲۲].

صاحب روز روشن میگوید که: "بمدح صمصام الدوله قصیده های بلیغه گفته، بجائزه اش سیورغالی در وطن حاصل نمود"[۲۳].

اشعاری که ساطع در مدح صمصام الدوله سروده است بتعداد زیاد است ما در اینجا نمی توانیم آنها را نقل کنیم. اینک فقط نمونه هائی نقل میگردد :-

۱- نه مخصوص سکندر بود اقبال جهانگیری | که ساطع خان دوران سپهسالار هم دارد[۲۴]

۲- بمدح خان دوران چون معانی را بیان سازد | بساطع کی رسد سحبان فصاحت هم خبر دارد[۲۵]

۳- ثنای خان دوران بهادر پیشه کن ساطع | که غیر از مدح او مقصود ما زین فن نمی باشد[۲۶]

۴- قطع مشکل کند از بهر تو یکدم ساطع | خان دوران که ظفر خواند بصمصام او را[۲۷]

دیوان رتن؟ هم یکی از ممدوحان ساطع بوده است. کلیات ساطع قطعه ای دارد که در مدح وی سروده شده است. یک بیت از آن در اینجا نقل میکنیم :

بجز تو مدح و ثنا را بدرگه که برم | که مرجع نبود شعر را بجز دیوان[۲۸]

مسافر تهائی ساطع :

چنانکه قبلاً اشاره شد ساطع بعلت کمبود سرمایهٔ زندگی و برای بدست آوردن معاش، راه مسافرت را پیش گرفت در ابتدا به پیشاور رفت و چندین سال پشت سرهم در آنجا ماند و بالآخر توسط اسلام خان که میر آتش بود، بدربار شاه بهادر پیوست و تقرب وی حاصل نمود. هنگامی که ممدوحش بدهلی رفت، ساطع هم بهمراهی وی راهسپار دهلی گردید. و تا زمان قتل فرخ سیر که در سال ۱۱۳۱ هجری قمری بوقوع پیوست، در دهلی ماند. گفتیم وی از مسافر تهائی طولانی بسیار خسته و دلگیر شده و نیز هوای گرم و

سوزاندهٔ هند ویرا از پا در آورده بود، چنانچه کیفیت هوای پشاور را در اشعار خود اینطور بیان میکند:-

قصد هلاک کرده هوای پشاورم
از تب نکنده بود در آتش سپند وار [29]

جای دیگر دربارهٔ هوای گرم هند گله دارد و میگوید:-

در هوای هند از نشو و نمای من مپرس
از گداز خود چو نخل شمع آبم داده اند [30]

گویا ساطع از سفرهای دراز بستوه آمده بود و خودش را در هند زنده بگور تصور میکرد چنانکه میگوید:-

زنده در گور کرد این سفرم
درد شد صاف کامرانی من [31]

و چون آرزوی برای برگشتن بوطن خود او را بیقرار کرد ــــ نیایش بدرگاه ایزد متعال میکند تا بوسیلهٔ حضرت امام موسی کاظم راهی پیدا شود تا مراجعت بکشمیر کند.- درین مورد باشعار زیر توجه کنید:-

شب از خرابی احوال خویش میگفتم
که می نخورده بدینسان کسی مباد خراب

سفر نموده تنک مایه ام چنانکه مرا
بجز هوای وطن نیست در گره چو حباب

خرد بگوش دلم این سخن نهانی گفت
که عرض حال بکن پیش آن رفیع جناب

امام موسی کاظم که مدح او ز قلم
نمود وقف کلیدی برای فتح ابواب [32]

جای دیگری گوید:-

نیم آن ریگ که در شیشهٔ ساعت باشد
روز و شب از چه سفر کردن من دور وطنست [33]

از اشعار زیر بر می آید که خان دوران، بالاخر موافقت نموده تا وی ــــ بکشمیر مراجعت نماید.- دراین ضمن می گوید:-

فرستادی بگلگشت بهشت آباد کشمیرم
که غیر از همت بخشنده مور را سلیمانی [34]

درعوض خدماتی که ساطع در دربار شاه بهادر انجام داده است، پادشاه ویرا در کشمیر جاگیر تفویض نمود.- چنانکه بعد بار همین پادشاه بوده است که ساطع تقاضانامهٔ خود را برای اجرای جاگیر فرستاده است.- نقلی از همین تقاضانامهٔ او بالغ بر یک برگ در موزهٔ بریتانیا اشتباهاً با یک نسخهٔ نثری توطئری مشهدی مضبوط است و شمارهٔ آن برگ ۸۰ می باشد.- [35]

صاحب مجمع النفائس می نویسد که صمصام الدوله ساطع را در کشمیر جاگیر تفویض نمود.- ولی چنانکه از اشعار ساطع روشن میگردد، تفویض شدن جاگیر در حق وی از لطف و عنایات شاه بهادر بوده است.- زیرا هنگامیکه شخص ظالمی دست تطاول بسوی آن دراز کرده بود، ساطع برای دادرسی اشعار زیر را بدربار پادشاه فرستاده بود.- وی میگوید:-

مور در پیش سلیمان عرض حالی میکند
ذره پیش آفتاب آسمان عز و جاه

چند روزی شد که در دفتر خط انور رسید — گشت نازل گوئیا خط الشعاع از مهر و ماه
باوجود این چنین لطفی که شد در حق من — باوجود این عنایات جناب پادشاه
ظالم از جاگیر من دست تصرف بر نداشت — من بدار العدل انصاف توی کردم پناه[۳۶]

تجرّد ساطع :

در کلیات ساطع به بعضی از اشعار بر می خوریم که دال بر آن است که وی متاہل بنوده بلکه در تجرید زندگی بسر برده است. آنجا که در شعر زیر جور و جفای روزگار را بیان می کند در ضمن آن اشاره به مجرّد بودن خود هم میکند :-

بر نتابد از تجرّد کلبه ام سامان فقر — موج سیلابست نقش بوریا در خانه ام[۳۷]

از اشعار زیر هم تجرید شاعر ہویدا میگردد :-

۱- گرچه تن چون صورت دیبا بکسوت داده ام — لیک میدارد تجرد همچنان عریان مرا[۳۸]
۲- هوای عالم تجرید در سر دارم آن طفلم — که باشد دامن صحرای امکان کاغذ بادم[۳۹]
۳- مرا عریان تجرد با جنون وارد درین وادی — نمی گنجم به پیراهن ز بس بالیدم از شادی[۴۰]
۴- منصب آوارگی دارم تجرد مشربم — گرد باد دشت عشقم خانه بر دوش توام[۴۱]

فقر و گرسنگی ساطع :

چنانکه گفته شد ساطع از ممدوحان خود لطف و مهربانیهای فراوان دیده است ولی از اشعارش روشن میشود که وی زندگی خود را با نهایت فقر و گرسنگی بسر میبرد - به اشعار زیر توجه فرمائید -

وحشتم دارد لباس فقر گویا بافتند — از نی مژگان آهو بوریای خانه ام
فقر کی ساطع برد ما گوشه گیران را ز جای — این کشاکش بر نیارد چون کمان از خانه ام[۴۲]

چون ساطع از روزگار و اهل روزگار زجرها دیده است لذا از آنها نالان و بیزار بود - اشعار زیر به همین مناسبت در اینجا نقل می گردد

۵ خصم سرکش کی حریف دیده گریان ماست — چهره گردون کبود از سیلی طوفان ماست
نان ما نو نابه نوشان الاس ان داغ دلست — هر که غم خوردن گوارایش بود مهمان ماست[۴۳]

وفات ساطع :

درباره تاریخ وفات ساطع مانند تاریخ ولادت وی تذکره نویسان باهم اختلاف نظر دارند - صاحب روز روشن سال وفات ساطع را ۱۱۵۶ ہجری قمری نوشته است[۴۴] و در سفینه خوش گو وصف ابراہیم تاریخ درگذشت وی ۱۱۵۰ ہجری قمری

درج است.[۴۵] این اختلاف حتی تا آنجا رسیده است که بنظر بعضی از تذکره نویسان می نویسند که ساطع در دهلی فوت کرد.[۴۶]
دربارهٔ سال وفات ساطع منبع قابل ملاحظه ای که از نظر تاریخی بسیار پر ارج هست، «واقعات کشمیر» است که نویسندهٔ آن خواجه محمد اعظم دیده مری میباشد. دیده مری نه تنها معاصر ساطع بوده است بلکه میان وی و ساطع روابط دوستانه برقرار بود. علاوه براین، دیده مری از وی در شعر اصلاح هم میگرفت. در هنگام وفات ساطع، دیده مری زنده بوده است. آنچه که وی دربارهٔ ساطع می نگارد از روی شواهد عینی است. لذا روایت وی بر تمام تذکره نویسان فوقیت دارد. دربارهٔ وفات ساطع وی مینویسد.

«(ساطع) بیست و یکم رمضان سال چهل و سه هجری (۱۱۴۳ھ) رحلت نمود. عالمی را از خویش و بیگانه گرفتار تأسف و تلهف فرمود، بتخصیص راقم حروف را که قریب بیست سال بفرط محبت و اتحاد مجلس آرائی صحبت و باده پیمائی الفت بذکر اشعار آبدار و طرح قافیه های هدایت شعار، چه در حضور و غیبت بزم لطف طبع را راحت افزائی حاصل بود، قرین درد فراق گذاشت و این تاریخ را راقم حروف بمجالسهٔ برصفو کبرت نگاشته. تاریخ: نور ایمان برقدش ساطع[۴۷]»

نور ایمان برقدش ساطع برابر است با ۱۱۴۳ پس بر طبق روایت معتبر مذکور، ساطع، روز بیست و یکم رمضان المبارک سال ۱۱۴۳ هجری قمری در کشمیر جهان را بدرود گفت.

آثار ساطع :

طبع ساطع به سرودن اشعار فارسی موزون بوده است. وی از آغاز زندگی بشعر و سخن علاقه داشت. پیروی از استادان بزرگ و سخنسرایان نامدار فارسی کرده تقریباً در تمام اصناف شعر مهارت بدست آورده بود. بروایت تذکره نگاران وی دیوان شعر دارد. مؤلف سفینهٔ خوشگو دربارهٔ وی می نویسد که دیوانی ضخیم دارد.[۴۸] صاحب ریاض الشعراء میگوید که دیوانش از سه هزار بیت متجاوز است.[۴۹] و اما سراج الدین خان آرزو دربارهٔ دیوان اشعار او می نویسد که وی دیوان مختصری دارد.[۵۰] صاحب مخزن الغرائب تعداد اشعار ساطع را قریب چهار و نیم هزار مینویسد.[۵۱] کلیاتی که ساطع از خود باقی گذاشته است شامل قصاید، غزلیات، قطعات، ترکیب بند، رباعیات، مثنویات و منشآت است. علاوه بر نظم و نثر ساطع در علم لغت نیز آشنائی داشت، چنانکه وی کتاب معروف لغت «برهان قاطع» را تلخیص نموده و سرنو آنرا ترتیب داده است و اسم آن کتاب را «محبت ساطع» گذاشته بود.[۵۲]

نسخهٔ کامل از کلیات ساطع در کتابخانهٔ سازمان تحقیق و اشاعت استان جموں و کشمیر سری نگر بشماره و بدر همین کتابخانه نگهداری میشود. کلیات مورد بحث اول الذکر ۳ مثنوی، ۳۹۰ قطعه، ۴۶ قصیده، ترکیب بند، ۴۰ رباعی، تقریباً چهار صد غزل و منشآت به نثر فارسی دارد. این نسخه دارای ۳۱۶ برگ است هر برگ ۱۲ سطری کاغذ نسخه کشمیری برنگ نخودی جلد چرمین برنگ قهوه ای

اسم کاتب و سنهٔ استنساخ ندارد. سه مهر روی این نسخه ثبت است مهری که برگ ۴۵ الف دارد متن آن این است "سبع رام سهها ۱۸۰۹ بکرمی" برگ ۱۷ ب مهر محمد منور و سنه ۱۲۳۶ھ دارد.

با در نظر گرفتن عبارات و متن مهرهای فوق میشود حدس زد که این نسخه قبل از سال ۱۲۳۶ھ استنساخ شده باشد.

علاوه بر آن دو نسخهٔ مزبور، از سه نسخهٔ دیگر دیوان ساطع هم اطلاع داریم، اما هر یکی از اینها گزیده ای است لذا لازم است که هر سه دیوان را در اینجا اجمالاً معرفی بکنیم.

یک نسخه از دیوان ملا ساطع کشمیری در Andhra Pradesh Govt. Oriental Manuscript Library and Research Institute, (Ratan Mahal No: 5-8-599 Abids) Hyderabad.

بشماره ۴۰۴ ثبت است تعداد اوراق ۹۷، کاغذ کشمیری، جلد رنگ مشکی سرلوح مطلا. نسخهٔ جدولدار دارای ۳۲۰ غزل و ۴ رباعی.

نسخه دوم دیوان ملا ساطع که در موزه سالار جنگ حیدر آباد (آندهرا پردیش) بشماره ۲۲۹۱ مضبوط است، دارای ۱۰۷ برگ است. هر صفحه دارای ۱۰ سطر بخط نستعلیق متوسط استنساخ شده است. نسخه مورد بحث ۱۲ قصیده، ترکیب بند، تقریباً چهار صد غزل و چهار رباعی دارد.

نسخه سوم از دیوان ساطع در کتابخانه رضا رامپور ثبت است و ۱۴۹ برگ دارد. چنانکه گفته شد که ساطع نثر خوبی هم مینوشت و در آن مهارتِ وافر داشت. در فن نثر نویسی بی همتا بود، محمد اعظم دیدہ مری درباره نثر نویسی وی می نگارد که "در نثر هم بی نظیر وقت بود"[۵۲] بقول صاحب قرآة آفتاب نما ساطع نثر خوب مینوشت[۵۳] بروایتِ سفینهٔ هندی ساطع در نثر برابرِ نصیرای همدانی عبارت را رنگین می نوشت.[۵۴]

یک نسخه خطی بخط نستعلیق از منشأت ملا ساطع کشمیری در کتابخانه دیوان هند بریتانیا بشماره ۲۹۴۲ مضبوط است که دوازدهم ماه ربیع الثانی ۱۱۷۷ هجری قمری استنساخ شده است گویا نسخهٔ مزبور فعلاً قدیم ترین نسخه خطی از منشیات ملا ساطع کشمیری است. نسخهٔ دوم از منشأت ملا ساطع همانست که در آخر کلیات وی قرار میگیرد و در سازمان تحقیق و اشاعت استان جموں و کشمیر نگهداری میشود.

مسلک ساطع :

از قصاید، غزلیات و قطعات ساطع چنان برمی آید که وی شیعه بوده است و با نهایت احترام و تمام جذبه و شوق آل محمد صلعم را در اشعار خود ستوده است ولبسا اوقات در صورت درگیریها و پیش آمدهای خود از اینها کمک غائبانه جسته است در

مدح حضرت علیؑ میگوید۔

غافل از ینکه مهر شہنشاه دین علیؑ — محفوظ دارد م ز بلا ہای روزگار
والی که مهر اوست برأت نجات ما — از ہول قبر و تلخ حساب و عذاب نار[۵۵]

در مدح امام جعفرؑ می گوید۔

امام جعفر صادقؑ که از سحاب کفش — چکد بزرع امید سایل آب بقا[۵۶]

درباره امام موسی کاظمؑ می گوید۔

امام موسی کاظمؑ که مدح او ز قلم — نمود وقف کلیدی برای فتح الباب[۵۷]

در منقبت امام علی موسی رضاؑ می گوید۔

ساطع بیا و جبهۂ امید را بسا — در درگه امام علی موسیٰ رضا
شاہی که از سحاب کفش گر رقم زنم — در بحر شور خامۂ من میکند شنا[۵۸]

در تعریف امام محمد باقرؑ می گوید۔

چراغ ساقی کوثر محمد باقر — کز و چو ساغر بودم ز مهر مالا مال[۶۰]

امام مهدی را اینطور توصیف می کند۔

بروز مقدم مهدی ہادی آنکه کفش — محیط گوہر فیضست اصابعش انہار[۶۱]

باید اینجا متذکر بدہیم که ساطع در کلیات خود از میان خلفای راشده بجز حضرت علی کرم الله وجهه اسم ہیچ کس را نبرده است در حالیکه از اشعار مندرج بفوق معلوم شد که وی دوازده امام را بسیار ستوده است و این خود نمایان گر این امر است که ساطع شیعۂ اثنا عشری بوده است۔

سبک شعر ساطع :

ملا ساطع کشمیری در غزلیات خود پیروی از استادان بزرگ سبک ہندی نموده است۔ وی در اکثر اشعار خود باین نکته اشاره نموده است۔ چون این سبک در روزگار ساطع یکی از متداول ترین سبکہای فارسی بشمار میرفت و اکثر شاعران فارسی گوی آن عصر بہ تتبع ہمین سبک شعر سروده اند و ساطع نیز بر طبق روش آن زمان برای ابراز انگیزه ہای درونی خود سبک مزبور را برگزیده۔ شکی نیست که سبک ہندی در زمان ساطع قبولیت عام پیدا کرده بود و اما باید در نظر داشته باشیم که بعلت بکار بردن اصطلاحات دور دست و از تراکیب مغلق و پیچیدۂ این سبک بحد ابتذال رسیده، تازگی و چاشنی خود را از دست داده بود۔ بعلت بکار

بردن کلمات مُغلق وتراکیب دوردست عدهٔ زیادی از اشعار سبک هندی مجهول افتاده واز انگیزه‌های درونی بشر فاقد مانده است ، اینگونه اشعار لامحاله لطمهٔ سنگین بر سبک هندی ببار آورده است

سبک هندی با بسیاری از ویژگیها برخوردار است ـ این سبک چطور بوجود آمد موضوعیست جدا و ما نمی خواهیم در اینجا پیرامون چگونگی بوجود آمدن آن بحث کنیم ـ اما اینقدر لازم است کتذکر بدهیم که این سبک بدنبال سبک عراقی بوجود آمد و اکثر شاعران این سبک از سرزمین هند برخواسته اند و بعضی ها از ایران مهاجرت نموده بدربار مغولان گورکانی هند پیوسته اند ـ فهم ترین ویژگیهای این سبک همان باریک آفرینی ، خیال بافی ، نکته پردازی استعارات مشکل و پیچیده ، تشبیهات نادر و دوردست و تازه آوریست ـ چنان معلوم میشود که اشعار ساطع از تمام ویژگیهای فوق برخوردار است ـ شکی نیست که اگر ساطع را یکی از استادان و مقلدان این سبک تصوّر بکنیم ـ زیرا وی در اشعار خود نکته های باریک ، معنی های تازه ، استعارات لطیف و نازک و تشبیهات نادر و تازه را بمهارت کامل بکار برده است و تتبع از کلیم همدانی ، سلیم تهرانی ، صائب تبریزی ، غنی کشمیری ، آشنا کشمیری ، طالب آملی ، جلال اسیر و حلالی نموده است ـ ساطع در اشعار خود اسمهای اینهمه استادان را با کمال شوق می برد ـ با این سبک ساطع بستگی پیدا کرده بود و آماده بوده است که از طرز و روش شعر صائب تبریزی انحراف بکند چنانکه میگوید :ـ

توازطریقهٔ صائب برون مرو ساطع کناره گرد خطرهای بیکران دارد[۹۲]

ساطع در نکته پردازی و معنی آفرینی دستگاه کامل داشت ـ در فن نکته پردازی کسی دیگر را غیر از خود ماهر تر نمی دانست گویا استاد نکته پرداز زمان خود بوده است ـ واما اعتراف می کند که در این فن غنی کشمیری را تتبع نموده و وی را استاد خود می پندارد (مثل غالب که در ریختهٔ (غزل) استادی میر تقی را مسلم میداند :ـ

ریختی کے تم ہی نہیں استاد غالب کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا)

ساطع درباره غنی کشمیری گفته است :ـ

نکته پردازی اگر ہست فقیر است امروز پیش ازین عہد شنیدم که غنی ہم بوده است[۹۳]

ساطع گاہی طبع شاعرانهٔ خود را با سلیم ، و فکر و اندیشهٔ خود را با صائب مقایسه میکند و میگوید :ـ

زبان شد ناطق و طبعم سلیم اندیشه ام صائب منیر از شمع معنی ، دل چو فانوس خیالی شد
شده ساطع معانی لب سحابی چشم گریانم جنونی آشنا و دل اسیر و تن ہلالی شد[۹۴]

ولی در جای دیگر طبع خود را از کلیم کاشانی کمتر میداند :ـ

طرفی از طبع نبستم چو کلیم ای ساطع چکنم گوہر مقصود درین دریا نیست[۹۵]

ساطع در اکثر اوقات مفاهیم و مطالب و مضامین اشعار شاعران متذکرهٔ فوق را گرفته باندازی در قالب شعری خود میریزد که احتمال میشود که مضامین از خود ساطع بوده است در حالیکه معلوم است که ساطع از مفاهیم اشعار آنها تقلید می نماید۔ ما در زیر برای مقایسه چند تا شعر را نقل میکنیم تا حقیقت حال روشن گردد :۔

غنی	ساطع
اگر شهرت هوس داری اسیر دام عزلت شو	حصار عافیت خواهی برو در کنج درویشی ۶۶
که در پرواز دارد گوشه گیری نام عنقا را	که اینجا آفت سر میشود چون شمع افسرها

صائب	ساطع
دست نیاز دراز کنی پیش هر کسی	خواهی غنی شوی نکشی خواری طلب
پل بسته ای که میروی از آبروی خویش	دریا شوی چو جمع کنی آبرو خویش ع۶۷

طبع موزون ساطع :

طبع ساطع برای سرودن اشعار فارسی موزون بوده است وی چه در غزلیات وچه در قصاید طبع موزون خود را بسیار ستوده است وگاه آنرا طبع خداداد میگوید و گاهی آنرا الطبع هنرپرور یاد میکند۔

۱۔ جلای طبع من از فیض استاد ازل باشد — چو مه سرپنجهٔ خورشید شد آئینه پردازم ۶۸

۲۔ بدامان هنرپرورده شد طبع سلیم ما — ز غلطانی بود گهوارهٔ در یتیم ما ع۶۹

مباهات و خودستائی های اغراق آمیز ساطع :

در اشعار اکثر شاعران سبک هندی چیزی که از همه بیشتر توجه خواننده را جلب میکند توصیف های شاعران از طبع خود و خودستائی های اغراق آمیز آنها در بارهٔ نکته آفرینی است عجب است که استادان بزرگ سبک هندی و شاعران صاحب سبک هم از آن مبالغه آمیزی و دروغ گوئی ها خود را نتوانسته اند کنار بکشند. متاسفانه در کلیات ساطع هم عدهٔ زیادی ازین گونه اشعار اغراق آمیز وجود دارد۔ شاعر در اینچنین اشعار مباهات می کند که طبعش موزون، خیالش بکر و بلند، اشعارش روان و معنیش رنگین است در اینجا تنها به چهار مثال اکتفا میکنیم۔

۱۔ در بارهٔ بلندی خیال شاعر گفته است :۔

گرد دار دیوان بانگ فرستی آفاق گیر — چون سلیمانست اقبال خیال من بلند ۷۰

۲۔ در بارهٔ معنی و لفظ رنگین می گوید :۔

چو برگ گل ز رنگ و بوز لفظ و معنی رنگین | زبان ساطع خوش گفتگو بر خویش می بالد[۶۱]

۳- در عبارت متین معنی رنگین آورده است می گوید :-

در عبارات متین معنی رنگین ساطع | چون نگاریست که بسیار نمکین باشد[۶۲]

۴- دربارهٔ زبان و طبع بلند خود میگوید :-

زبانم بلبل شیراز و طبع خود گلستانم | چو لفظ از معنی رنگین بود گل در گریبانم[۶۳]

برای نمونه ها و امثال دیگر رجوع شود به برگ های ۵۶ / الف ، ۵۸ / ب ، ۴۴ / ب ، ۶۵ / ب ۶۶ / الف ، ۳۶ / ب ، ۳۶ الف ، ۱۴ / الف ، ۱۴ / ب ، ۲۰ الف ، وغیر آن از دیوان ساطع نسخهٔ آندهرا و از کلیات نسخهٔ کشمیر برگ ۲۹ / الف ، ۲۰ / الف ، ۲۰ / ب ، ۳۰ ، ۳۳ / ب وغیر آن -

بعضی از ویژگیهای شعر ساطع :

بهترین اشعار ساطع همان است که از طبع وی با درد و سوز جولان زده و به سادگی و روانی ارایه گردیده است - در اینگونه غزلیات ساطع رنگ ویژه ای دارد و آن رنگ عاشقانهٔ اوست - وی عشق می ورزد و از جمال خوب و نگار زیبا لذت می برد - و در این گونه غزلیات نگار ساطع از همین گوشت و پوست که ما داریم ترکیب یافته است - لذا عشقی که ساطع می ورزد ، عشقیت زمینی و هیچ سروکاری بعشق الهی و حقیقی ندارد - وی اغلب اوقات در اینگونه غزلیات خود از جور و جفای دلدار فریاد میکشد - گاه از رعنائی خال و خط دلدار می سوزد و گاهی از بوی آن بیقرار و سرگردان می ماند - چشمهای انتظار براه وی دوخته ، دیوانه وار ناله های عاشقانه خود را بفراق وی ابراز می کند چون اینگونه غزلیات انگیزه های درونی و از سوز نهانی ساطع آمیخته است لامحاله مملو از درد و سوز وی است -

کبابم میکند ناز آفرینی مست عیاری | نگار تند خوئی فتنه جوئی شعله دیداری
سخن پیرا تبسم شیر مستی لب شکر طفلی | عجب شیرین زبان طوطی بیان آئینه رخساری
پی جان غمزه جاسوسی نگاری جلوه طاوسی | قیامت قامتی سروی تذروی کبک رفتاری
نظاره وحشت آمیزی بمژگان خون دل ریزی | خم گیسو دلاویزی کمند اندر جراری
عجب شمشاد بالائی قیامت جلوه رعنائی | سیه فامی ، گل اندامی ، بهاری چهره گلناری
بغمزه ترک غمازی بمژگان ناوک اندازی | دل عاشق هدف سازی کمان ابرو ستمگاری
نگه غارتگر هوشی بغمزه مست و مدهوشی | ز رنگ گل قبا پوشی بهشتی جلوه گلزاری[۶۴]

دراشعار زیر رنگ تغزل را ملاحظه کنید و در ضمن این یکی از نمونه های برجستهٔ غزلیات عاشقانهٔ ساطع است :-

ای رخ جلوه طراز تو بهار گل ناز   زلف مشکین تو هم سلسلهٔ عمر دراز
چه بود روی تو، شمع طرب محفل حسن   چه بود موی تو، شیرازهٔ مجموعهٔ ناز
نرگس سحر طراز تو بجادو هم چشم   قامت فتنه خرامت ز قیامت ممتاز
جلوهٔ حسن یکی صد بنظر می آرد   چشم من کز دل صد پاره شده آئینه ساز
یاد و قتی که دلم سعی رهای میکرد   بود مژگان تو گیرنده تر از چنگل باز[۵]

بنظر ساطع عشق مجاز در حقیقت رهنمای عشق اللهیست۔ عاشق تا وقتیکه عشق مجاز را نچشیده باشد، بعشق اللهی رسیدن برایش محال است وی می گوید۔

مرا عشق مجازی از حقیقت کی کند غافل   دهان غنچه میبوسم کز و بوی تو می آید[۶]

آهنگ و موسیقی در غزلیات :

ساطع گاهی شعر را بکمک کلمات مناسب و موزون آهنگ خاصی می بخشد۔

در کلیات وی میتوان عدهٔ زیاد از اینگونه اشعار دریافت نمود۔ ولی در اینجا دو شعر را نقل میکنیم در شعر زیر لفظ "م" که چندین بار تکرار شده است موجب آهنگ خاصی است بروزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن در بحر رمل :

ساقی را باده پیما در ازل دیدم هنوز   بیخودم مستم خرابم عاشقم دیوانه ام[۷]

تکرار "گ" در شعر زیر بروزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن باز در بحر رمل :-

تا فروغ شمع از شرم جمالت آب شد   گرد سر گردیدن پروانه ها گرداب شد[۸]

نازک آفرینی ساطع :

چنانکه قبلاً اشاره شد که خیال بافی و نازک آفرینی یکی از مهمترین ویژگی سبک هندی است۔ و اشعار ساطع از این ویژگی برخوردار است۔ مثلاً

۱- دلی دارم نهالی کرده چشم گریه آلودش   شده تخم امیدم سبز از ابر کف جودش[۹]

(مطلب این است که دل را از گریه خود استحکام می بخشم)

۲- گر نه گرداند بکام خواهشم افلاک را   گوئیا هفت آسیا آبست جوی دیده ام[۱۰]

(اگر افلاک از خواهش مانمی چرخند اشکهای نیست هفت آسمان یعنی هفت آسیا از آب چشمهای خود خواهم چرخاند)

۳ - از گوشهٔ ابروی تو زاهد چه گشاید　　مفتاح هلال رمضان قفل دهانست[۸۱]

(زاهد از مشاهدهٔ ابروی تو چطور دهن خود را باز خواهد نمود ابرو گویا هلال رمضان است که قفل بر دهان مردم می گذارد)

۴ - در چنین عهدی که اوضاع جهان نادیدنیست　　دیدهٔ تصویر اگر باز است جای حیرتست[۸۲]

۵ - از سر طوفان حسن دل نتواند گذشت　　پل ز چه رو ساختند ابروی پیوسته را[۸۳]

تشبیهات تازه در شعر ساطع :

ساطع اکثر اوقات در اشعار خود تشبیهات تازه بکار می برد اما در عین حال ساطع تشبیهات پیچیده را هم آورده است که موجب ابتذال و انحطاط شعروی قرار گرفته است مانند ـ

۱ - ناچار خط سبز و معد گرد دهانت　　از تنگی جا مغز درین پسته نگنجد[۸۴]

(در این شعر پسته را به دهان و مغز پسته را بزبان تشبیه داده است)

۲ - لبت میوسم و خواهم نگاه سرمه سا پشت　　مقیم در بدخشان و نظر بر اصفهان دارم[۸۵]

(لب را به بدخشان و نگاه سرمه سا را به اصفهان تشبیه نموده)

استعارات :

شعر عالی آنست که آمیخته با درد و سوز شاعر باشد و اینگونه شعر تاثیر هم بجای می گذارد و باوج خود هم میرسد اما تا وقتی که شعر استعارهٔ خوب نداشته باشد باوج نمی رسد ـ پس زبان شعر عالی زبان استعاره است ـ ساطع بعضی موارد یک استعارهٔ دل انگیز یک دنیای معنی را در شعر خود نهفته نگهدارد ـ تا طائر عقل بآنجا پر نزند تفهیم و درک کردن آن ممکن نیست به اشعار زیر توجه بفرمائید :ـ

۱ - سپاه هند پنداری بتسخیر فرنگ آمد　　شبیخون عجب آورده خط بر کشور رنگش[۸۶]

(سپاه هند استعاره برای رنگ سیاه خط محبوب که بر عارضش نمودار می گردد)

۲ - لب آن طوطی شیرین زبان چون در سخن آید　　شود پنهان چو مغز پسته در شکر خط سبز شی
ز دست انداز او اقلیم دل تا تا چه پیش آید　　کشید امروز لشکر بر شه خاور خط سبزش[۸۷]

(شه خاور استعاره است برای خورشید)

تمثیل گوی ساطع :

در اشعار اکثر شاعران که پیروی از سبک هندی نموده اند به ادعا و برهان (دعوی و دلیل) برمی خوریم یعنی شاعر در مصرع اوّل شعر برای چیزی ادعا میکند و بعد آ در مصرع ثانی برای ادعای خود دلیلی می آورد. این روش در اشعار سبک هند شیوع یافته و رواج کامل بدست آورده بود. اکثر شاعران بتقلید آن شعر سروده اند. چون ادعا و برهان در شعر سبک هندی یکی از مهمترین ویژگی بشمار می آید و ملا ساطع هم به تقلید آن اشعار خوبی دارد لذا نمونه های چند از کلیات وی در اینجا نقل میکنیم باید اینجا توضیح بدهیم که تعداد اینگونه شعر در کلیات ساطع بسیار است و ما مشتی از خرواری گزیده ایم :

۱ - بکن ترک عیال خود اگر از گوشه گیرانی — نمی بینی کمان از خانه داری کشمکش دارد[88]

۲ - هر که رنجی کشد از اهل سر میگردد — تن بسختی چو دهد قطره گهر میگردد[89]

۳ - شگفتنهای صاحبدل بود ساطع ز خاموشی — غریبست اینکه پیش از وا شدن این غنچه گل باشد[90]

طنز از شیخ :

چون رفتار ملایان بی مروت، زاهدان ظاهری و شیخان قلابی در هر زمان و مکان مشکوک بوده است لذا القربها در تمام ادوار تاریخی هدف طنزهای گزنده و تمسخرهای سرسخت شاعران فارسی گوی قرار گرفته اند. ساطع نیز نظر خوبی در بارهٔ زاهدان مزبور ندارد و بهدف طنزهای وی قرار گرفته اند. اما وی بروش بسیار ساده بطنز اینها میپردازد و در عین حال معنی های رنگین و تازه ابداع میکند :

۱ - حرمت دختر رز را احدی منکر نیست — شیخ مرد است کند ثابت اگر حرمت خویش[91]

۲ - میکشی خمیازه تا کی شیخنا ساغر مکش — پا مزن بر شیشه حرمت دار این بر سر مکش[92]

۳ - ای شیخ ریاکار هر آن دام که ارشید — در سبحه نهان کردهٔ زنار نباشد[93]

۴ - زاهد قدش بذکر توکل که حلقه شد — مانند تار سبحه چرا در بدر شد است[94]

۵ - دوش ملا بار ردا را نتوانست کشید — بکشد شیخ که افتاده بگردن او را[95]

توصیف اغراق آمیز ساطع از دهان معشوق :

چون اساساً سبک هندی برای نو آوری در شعر بوجود آمده است لذا هر شاعر پیرو این سبک سعی نموده است تا مفاهیم تازه در شعر ارایه بدهد. دهان معشوق هم موضوعی است که شاعران پیرو این سبک آنرا مورد توجه قرار داده و در توصیف آن کار به جا رسانیده اند که از توصیف اغراق آمیز آنها دهان معشوق گم شده و تنها شعر مانده است. ساطع نیز به پیروی استادان این سبک دهان معشوق را ستوده است البته با اغراق :

۱- نیست موجود دهانت و زکم حرفیها — هر که خاموش نشیند بر ما گویا نیست[96]

۲- ناچار خط سبز دمد گرد دهانت — از تنگی جا مغز درین پسته نگنجد[97]

شاعر دهان را به پسته تشبیه داده است و زبان را به مغز از تنگی دهان پسته هم در آن نمی گنجد یعنی زبان.

۳- خوابیده سبزه خط گرد دهان تنگش — یا مغز پسته غلطید در شکر تبسم[98]

تراکیب تازه ساختهٔ ساطع:

تاثیر زیری شعر بستگی دارد بر چگونگی استفاده از تراکیب تازه و کاربرد اصطلاحات نادر. هر قدر که شاعر بر زبان قادر باشد حتماً تراکیبش همان قدر خوب و ارزنده خواهد بود. زیرا همین جاست که شاعر چابکدستی خود بخرج می دهد. اصولاً ترکیب تازه نه تنها شاعر را تا دیر باز زنده نگه می دارد بلکه خود زبان هم بکمک تراکیب تازهٔ ساختهٔ وی وسعت می یابد. ساطع در بعضی موارد شعر خود را با تراکیب و اصطلاحات نوین خود بازور رواج می سازد. اینک ما در اینجا بنقل بعضی از اشعار وی می پردازیم:-

۱- تراکیب مانند نگاه و نرگس جادو، آفت محشر خرام و قامت دلجو در شعر زیر.

فتنهٔ دوران نگاه نرگس جادوی اوست — آفت محشر خرام، قامت دلجوی اوست[99]

۲- چشم گریه آلود، تخم امید و ابر کف جود در شعر زیر ملاحظه شود.

دلی دارم نهالی کرده چشم گریه آلودش — شده تخم امیدم سبز از ابر کف جودش[100]

۳- به تراکیب مانند حسن فکر، مصر معنی و تنگنای بیت توجه کنید در شعر زیر:-

حسن فکرم مصر معنی را تصوف میکند — تنگنای بیت را زندان یوسف میکند[101]

۴- تراکیب تار نگه، شاهد یاد و نخل آرزو در ابیات زیر ملاحظه فرمائید:

از حیا پوشیده ام چشم و ز شوق روی دوست — می طپد تار نگه مانند نبضم زیر پوست

شاهد یادش چو بزم آرائی دل سر کند — استخوان چون شمع فانوسم بسوزد زیر پوست

کی رود از خاطرم سرو قیامت جلوه ات — ریشه اش در سرزمین دل چو نخل آرزوست[102]

حسن تعلیل:

حسن تعلیل شعر را در اکثر موارد باوج میرساند لو اینکه در ادای آن دقت رعایت شود. حسن علت آوردن در شعر ظاهراً آسان بنظر میرسد ولی تمام سخن سرایان نمی توانند آنرا بخوبی بکار برند ساطع آنجا که حسن تعلیل را بکار برده است یک دنیای رموز را در آن نهفته نگه می دارد:-

در مذاق بوسه لعلت گریه آب زندگیست — میخورد دل آب از آن، چاه زنخدان بیشتر[103]

مراعات النظیر؛ ساطع برای ایجاد معنی خاصی در شعر استفاده از مراعات النظیر می کند منظور از مراعات النظیر آنست که کلماتی را در شعر بکار بردن که با نفس موضوع مطابقت داشته باشند مثلاً کلمات گل گلزار سنبل خار، لاله داغ، غنچه در شعر زیر ملا ساطع ملاحظه کنید:

رفتی از گلزار و دور از جلوه ات گل خار خار　　لاله داغ و غنچه دلتنگی و سنبل تاب داشت [۱۰۴]

تبحر ساطع در فن تعمیه و تاریخ گوی :

فن تعمیه در اشعار سبک هندی بکمال خود رسیده است و تقریباً هر شاعر پیرو این سبک دست به این فن شریف زده و شعرهائی سروده اند که تاریخ بوقوع پیوستن پیش آمدی بحساب ابجد میتوان از آن اخذ نمود. چنانکه معلوم میشود که اینگونه شعر در موقعیت خاصی از طبع شاعر ترشح می کند لذا تاثیر آن هم تا یک موقعیت خاصی باقی می ماند. و این گونه اشعار دیگر ارزش تاریخی را حفظ می کنند ساطع نیز چنانکه از کلیاتش روشن است در فن تعمیه نبوغ داشت و در بعضی موارد با در نظر گرفتن موقعیت خاص آنها۔

شعرهای بسیار نغز سروده است. و این اشعار حالا ارزش تاریخی دارند. ما در اینجا نمونه های برجسته ی را از کلیات ساطع بزیر نقل می کنیم۔

۱۔ پادشاه فرخ سیر در سال ۱۱۲۵ هجری قمری بر تخت سلطنت هند جلوس نمود. ساطع سال جلوس وی را بمهارت استادانه در شعر خود این طور بیان میکند۔

خیال تازه در صیدگاه مدح می بندم　　کمند هستی از فکر رسا امروز بر دوشم [۱۰۵]

بدست آورده دل دامان جاه از فکر تاریخش　　همایون باد جشن فتح اقدس گفت در گوشم

"همایون باد جشن فتح اقدس" بحساب ابجد برابر است با ۱۱۲۵ هجری قمری۔

۲۔ در سال ۱۱۰۹ هجری قمری کارمندان دولت از مردم جذیه گرفتند. ساطع عکس العمل خود را علیه این استبداد طوری در شعر بیان نموده است که در عین حال از آن تاریخ هم بدست می رسد ساطع می گوید۔

اگر تاریخ اخذ جذیه پرسند　　بگو ساطع که "فوت یافت اسلام"

فوت یافت اسلام بحساب ابجد برابر است با ۱۱۰۹ هجری قمری۔

۳۔ از اشعار زیر معلوم میشود که صمصام الدوله خان دوران در سال ۱۱۳۰ هجری صاحب اولاد شد. چون وی یکی از ممدوحان ساطع بوده است لذا وی برای بدست آوردن بخششها این موقعیت ویژه ای را باین نحو در سلک شعر خود کشیده است :-

شکر الله خان دوران بهادر را بباغ　　نو گلی از نو بهار لطف یزدان آمده

عمر خضر و دولت جم اقتضای دور اوست　　کوکب بخت همایونش بسامان آمده"

"بلند اقبال نور چشم دوران آمده" بحساب ابجد برابر میشود با ۱۱۳۰ هجری قمری۔

تعلیقات و پاورقیها

(۱) - تذکره روز روشن و تذکره بینظیر بحوالۀ تذکرۀ شعرای کشمیر از حسام الدین راشدی ۱/۲۹۷-۲۹۸ اقبال اکادمی کراچی ۱۳۴۶ھ ش
(۲) واقعات کشمیر از محمد اعظم دیده مری صفحه ۱۴۹ چاپ سنگی سرینگر کشمیر، (۳) تذکره شعرای کشمیر از اصلح میرزا بتصحیح سید حسام الدین راشدی صفحه ۱۱۰ اقبال اکادمی کراچی ۱۳۴۶ھ ش (۴) واقعات کشمیر از محمد اعظم دیده مری صفحه ۱۴۹،

تاریخ کشمیر از خلیل مرجانپوری برگ ۱۴۲ ب نسخه خطی کتاب خانه تحقیق و اشاعت سرینگر شماره نسخه ۱۰۷/۴ (آتحایف الابرار) تاریخ کبیر از محی الدین مسکین برگ ۱۳۱۵ نسخه خطی شماره ۲۲۴۰ کتابخانه تحقیق و اشاعت سرینگر شماره نسخه تاریخ حسن از پیرزاده غلام حسن ۱/۳۴۴ چاپ سنگی - سازمان و اشاعت سرینگر -

(۵) واقعات کشمیر صفحه ۱۴۹

لاله ملک شهید یکی از شاعران معروف کشمیر بوده است در فن تاریخ گوی مهارت داشت و درین فن سحرکاری میکرد - دیوان اشعار ناتمام وی در کتابخانه تحقیق و اشاعت استان جمون و کشمیر بشماره ۱۷۶۹ مضبوط است ملاحظه شود تاریخ حسن ۴/۲۴ واقعات کشمیر صفحه ۲۰۰،

میرزا داراب بیگ متخلص به جویا پسر ملا سامری و برادر کامران بیگ گویا است - جویا یکی از شاعران نامدار سخن سنج و صاحب علم و فراست بوده است جویا در سال ۱۱۱۸ هجری قمری فوت نموده است - کلیات وی بدست دکتر محمد باقر یک بار بچاپ رسیده است - این کلیات شامل دیباچه قصائد حمد و نعت و مناقبت مثنویات مقطعات، متفرقات غزلیات، رقعات، دیباچه مرقع، دیباچه بر دیوان صائب - دیباچه سفینه (۶) ایضاً (۷) دیوان ساطع از ملا ساطع کشمیری برگ ۶۶ الف کتابخانه نسخه های خطی انستی تیتو تحقیقی حیدرآباد آندهرا پردیش شمارۀ نسخه ۴۴۴ (۸) واقعات کشمیر صفحه ۱۴۹ (۹) مجمع النفائس سراج الدین خان آرزو بتصحیح عابد رضا بیدار صفحه ۲۵ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ -

باغ معانی از نقش علی بتصحیح عابد رضا بیدار صفحه ۱۰۲ چاپ سنگی خدابخش پٹنہ، روز روشن از مولوی محمد مظفر حسن صبا تصحیح محمد حسین رکن زاده صفحه ۱۴۴، چاپ تهران، سفینه هندی بحوالۀ تذکره شعرای کشمیر صفحه ۲۹۸، و اما مؤلف صحف ابراهیم گلشن اسلام

را مثنوی خوانده است ملاحظه شود تذکرهٔ شعرای کشمیر صفحه ۲۹۷ ، (۱۰) کلیات ملا ساطع کشمیری برگ ۱۹ ب نسخهٔ خطی سازمان تحقیق و اشاعت استان جمو و کشمیر شماره نسخه ۵۳۵ ، (۱۱) ایضاً برگ ۲۰ الف ، (۱۲) ایضاً برگ ۴۰ الف (۱۳) بهادرشاه پسر دوم عالمگیر میباشد وی در سال ۱۰۵۳ هجری قمری بدنیا آمد در آغاز پادشاهی عالمگیر وی ناظم خراسان بود - در یورش حیدرآباد دکن بعلت نقشهٔ ابوالحسن خان وی تا هفت سال محبوس ماند اما وقتی که آزاد شد به سمت ناظم و حاکم کابل پشاور ملتان و لاهور تعیین گردید بعد از فوت عالمگیر وی بنام قطب الدین محمد معظم بهادرشاه در سال ۱۱۱۹ هجری قمری بعنوان پادشاه هند جلوس نمود ملاحظه شود تاریخ حسن ۲/۵۵۴ ، (۱۴) فرخ سیر بنام معین الدین محمد فرخ سیر در ۱۱۲۵ هجری قمری بر تخت سلطنت هند جلوس نمود - خودش شعرفهم بوده است و از اشعار شاعران لذت میبرد - وی در سال ۱۱۳۱ هجری قمری بقتل رسید - از "سادات بوی نمک حرامی کردند" تاریخ فوت فرخ سیر یعنی ۱۱۳۱ هـ بدست می آید - تاریخ حسن ۲/۵۷۲ و ۶۵۵ ، (۱۵) واقعات کشمیر صفحه ۱۴۹ ، (۱۶) کلیات ملا ساطع کشمیری برگ ۵ الف نسخهٔ خطی سازمان تحقیق و اشاعت شماره ۵۳۵ ، (۱۷) ایضاً برگ ۷ الف ، (۱۸) کلیات ملا ساطع کشمیری برگ ۲۰ ب

(۱۹) ایضاً برگ ۲۷ ب ، (۲۰) ایضاً برگ ۳۲ ب ، باید در اینجا تذکر بدهیم که عبدالعظیم خان یکی از اکابر ایران بود و صاحب کمال وی به سمت دیوان صوبه کشمیر گماشته شده بود تاریخ حسن ۲/۵۶۷ ، واقعات کشمیر از محمد اعظم ۲۱۸ ، (۲۱) مجمع النفائس صفحه ۵۵ سفینهٔ خوشگو بحوالهٔ تذکرهٔ شعرای کشمیر ۱/۲۹۲ ، باغ معانی صفحه ۱۰۳ ، صاحب تذکرهٔ حدائق الشعرا می نویسد که ساطع ندیم صمصام الدوله بود رجوع شود به تذکرهٔ حدائق الشعرا تالیف میرزا بیگ بنارس برگ ۱۶۳ الف نسخهٔ خطی کتاب خانهٔ ایشیاتک سوسایتی بنگال شماره نسخه ۲۰۷ ، (۲۲) سفینهٔ هند صفحه ۱۰۶ بحوالهٔ تذکرهٔ شعرای کشمیر ۲/۲۹۸ ، (۲۳) روز روشن صفحه ۳۴۰

(۲۴) دیوان ملا ساطع برگ ۲۴ ب نسخهٔ آندهرا پردیش کتاب خانهٔ نسخه های خطی (۲۵) ایضاً برگ ۳۰ الف ، (۲۶) ایضاً برگ ۴۴ الف ، (۲۷) ایضاً برگ ۳ الف ، (۲۸) کلیات ملا ساطع کشمیری برگ ۹ ب نسخهٔ خطی سازمان تحقیق و اشاعت جمون و کشمیر ، (۲۹) ایضاً برگ ۴ ب ، (۳۰) دیوان ملا ساطع برگ ۳ ب آندهرا پردیش مینسکرپٹ لائبریری (۳۱) کلیات ملا ساطع برگ ۲۹ الف نسخهٔ سازمان تحقیق و اشاعت جمون و کشمیر (۳۲) کلیات ملا ساطع برگ ۱۴ الف نسخهٔ کشمیر ، (۳۳) دیوان ساطع برگ ۲۷ الف نسخهٔ آندهرا پردیش (۳۴) کلیات ملا ساطع برگ ۶۹ ب نسخهٔ کشمیر -

(۳۵) Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum By Charles Rieu, Vol.II, Add. 16.852. page 743. London 1881

(۳۶) - کلیات ملا ساطع برگ ۶۹ ب نسخهٔ کشمیر (۳۷) دیوان ملا ساطع کشمیری برگ ۴۰ ب نسخهٔ آندهرا پردیش -

(۳۸) کلیات ساطع برگ ۹، الف نسخهٔ کشمیر (۳۹) دیوان ملا ساطع کشیری برگ ۴۶ الف نسخهٔ آندھرا (۴۰) ایضاً برگ ۷۷ب
(۴۱) ایضاً ۴۶ ب (۴۲) کلیات ساطع برگ ۳۴ ب نسخهٔ کشمیر (۴۳) ایضاً (۴۴) روز روشن صفحہ ۳۲۱، (۴۵) سفینهٔ خوشگو وصحف ابراہیم بحوالہ تذکرہ شعرای کشمیر ۱/۲۹۷، (۴۶) ریاض الشعرا بحوالہ تذکرہ شعرای کشمیر ۱/۲۹۳،
(۴۷) واقعات کشمیر از محمد اعظم دیده مری صفحہ ۲۴۹ چاپ سنگی سرینگر پیرامون وفات ساطع صاحب واقعات کشمیر قطعهٔ تاریخ زیر نوشته است:

مهر اوج سخنوری ساطع	از صفا ذہن انورش لامع
رایت عالی فصاحت را	بود رای متین او رافع
صحبتش وقت نکته پیرائی	بفقیر و غنی بی نافع
از علو فطانتش استاد	بود جویای او زی طالع
بزم آرائی شعر شد یکچند	آن باصناف معرفت جامع
شده مقراض موت آخرکار	صفحات بقایش را قاطع
پردهٔ جسم ارچه خالی گشت	روح قدسش شده بحق راجع
گفت اعظم بسال تاریخش	نور ایمان بمرقدش ساطع

(۴۸) سفینهٔ خوشگو بحوالہ تذکرہ شعرای کشمیر ۱/۲۹۳ (۴۹) تذکرہ شعرای کشمیر ۱/۲۴۳، ریاض الشعرا (۵۰) مجمع النفایس صفحہ ۵۷،
(۵۱) مخزن الغرائب ۲/۱۸۰ (۵۲) منتخب الطایف رحم علیخان بتصحیح سید محمد جلالی نائینی و سید امیرحسن عابدی صفحہ ۲۳۳، چاپ تهران ۱۳۴۹ تهران مجمع النفایس، ۵ روز روشن صفحہ ۳۲۰، سفینهٔ ہندی بحوالہ تذکرہ شعرای کشمیر ۱/۲۹۸،
(۵۳) واقعات کشمیر صفحہ ۲۲۷، (۵۴) مرآۃ آفتاب نما بحوالہ تذکرہ شعرای کشمیر ۱/۲۹۸ (۵۵) سفینهٔ ہندی بحوالہ تذکرہ شعرای کشمیر ۱/۲۹۰
(۵۶) کلیات ملا ساطع کشمیری برگ ۴۳ ب نسخهٔ کشمیر، (۵۷) ایضاً برگ ۱۴ ب، (۵۸) ایضاً برگ ۴۴ ب، (۵۹) ایضاً برگ ۳۰
(۶۰) ایضاً برگ ۵۶ الف (۶۱) ایضاً برگ ۵۳ ب، (۶۲) دیوان ساطع برگ ۳۶ ب آندھرا پردیش (۶۳) دیوان ملا ساطع برگ ۳۰ ب آندھرا (۶۴) ایضاً (۶۵) کلیات ملا ساطع برگ ۹۰ الف نسخهٔ کشمیر، (۶۶) دیوان ملا ساطع برگ ۵ الف آندھرا پردیش،
(۶۷) دیوان ساطع برگ ۵۴ ب آندھرا (۶۸) دیوان ملا ساطع کشیری برگ ۶۸ ب آندھرا، (۶۹) دیوان ملا ساطع ۴ ب،
(۷۰) دیوان ملا ساطع ۳۵ الف آندھرا (۷۱) دیوان ساطع ۳۳ الف آندھرا، (۷۲) دیوان ساطع ۳۶ الف آندھرا، (۷۳) دیوان ملا ساطع برگ ۶۹ الف (۷۴) دیوان ملا ساطع برگ ۵، ب آندھرا (۷۵) کلیات ملا ساطع برگ ۵۲ الف (۷۶) ایضاً
(۷۷) دیوان ملا ساطع برگ ۶۳ ب آندھرا (۷۸) دیوان ملا ساطع ۹۴ الف آندھرا، (۷۹) مطلب این است که دل را از

گریہ خود را ستم کام می بخشم۔ دیوان ساطع برگ ۵۴ر الف (۸۰) دیوان ساطع برگ ۶۶ (۸۱) ایضاً (۸۲) دیوان ساطع برگ ۱۶
الف آندھرا، (۸۳) دیوان ساطع ۷ الف آندھرا (۸۴) دیوان ساطع برگ ۱۵ ب (۸۵) منقیم دیوان ساطع ۶۲، (۸۶)
دیوان ساطع برگ ۵۵ الف آندھرا، (۸۷) دیوان ساطع برگ ۵۵ ب آندھرا (۸۸) دیوان ملا ساطع برگ ۳۷ر الف آندھرا، (۸۹)
ایضاً ۸۴ر الف (۹۰) دیوان ملا ساطع ۵۰ ب آندھرا، (۹۱) دیوان ملا ساطع ۵۴ ب آندھرا (۹۲) دیوان ملا ساطع ۵۵ ب آندھرا
(۹۳) دیوان ملا ساطع برگ ۴۷ الف (۹۴) دیوان ملا ساطع برگ ۳۰ر ب آندھرا (۹۵) دیوان ملا ساطع برگ ۳۰ر الف آندھرا
(۹۶) کلیات ساطع برگ ۹ر الف نسخہ کشمیر (۹۷) دیوان ساطع برگ ۱۵ر الف آندھرا (۹۸) دیوان ساطع برگ ۱۰ر الف آندھرا
(۹۹) دیوان ساطع برگ ۱۵ ب آندھرا۔ (۱۰۰) دیوان ساطع برگ ۴۵ الف آندھرا (۱۰۱) دیوان ملا ساطع ۴۳ ب آندھرا
(۱۰۲) دیوان ملا ساطع برگ ۱۹ الف و ب آندھرا، (۱۰۳) دیوان ملا ساطع ۱۵ ب آندھرا، (۱۰۴) دیوان ملا ساطع برگ ۱۵
ب آندھرا، (۱۰۵) کلیات ساطع برگ ۸۰ر الف نسخہ کشمیر۔

جناب عارف نوشاہی
ادارہ معارف نوشاہیہ، ۶۹، ماڈل ٹاؤن اسلام آباد
(حال مقیم تہران)

احوال و آثار بدرالدین بدری کشمیری

بدرالدین متخلص بہ بدری کشمیری کے بارے میں جہاں تک اس احقر کو علم ہے ہمارے یہاں پاکستان میں صرف ایک اطلاع چھپی ہے یعنی سید حسام الدین راشدی[1] کا بیان جو انہوں نے حرف بہ حرف سعید نفیسی[2] سے نقل کیا ہے۔ عبدالغنی میرزایف نے ان دونوں تحریروں کا تعاقب کیا اور ایک مفصل مقالہ ایران میں چھپوایا[3]۔ ذبیح اللہ صفا نے بھی اپنی تصانیف میں بدری کی رزمیہ شاعری کے حوالے سے لکھا ہے[4]۔ راشدی نے محض نقل قول کیا ہے۔ نفیسی نے اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔ میرزایف کی معلومات کا انحصار بدری کی مثنوی ظفرنامہ کا نسخہ دوشنبہ ہے۔ صفا نے بلوشہ کی فہرست مخطوطات پیرس[5] اور بدری کی مثنوی اسکندرنامہ کے مخطوطۂ پیرس سے استفادہ کیا ہے۔ بدری نے مذکورہ دونوں مثنویوں میں اپنی تصانیف کا حال بیان کیا ہے[6]۔

ہمیں بدری کی منثور تصنیف سراج الصالحین ملقب بہ معراج الکاملین کے نسخۂ اسلام آباد[7] تک رسائی حاصل ہوئی ہے۔ اس میں بھی مصنف نے اپنے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ ہم یہاں اپنے پیشرو محققین کے فضل تقدم ان ہی کو حاصل ہے۔ کی جمع کردہ معلومات اور سراج الصالحین سے حاصل ہونے والی جدید اطلاعات کو اکٹھا پیش کر رہے ہیں۔

بدری کی تاریخ ولادت و وفات کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ اس کی کتابوں سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ ۹۰۰ھ سے ۱۰۰۱ھ تک زندہ تھا۔ سراج الصالحین کے دیباچے میں اس نے اپنا نام "بدرالدین بن سید ابراہیم الحسینی" لکھا ہے، اور اس کتاب میں درج غزلوں میں تخلص بدری استعمال کیا ہے۔ ۹۰۰ھ میں وہ کشمیر سے طواف کعبہ کے ارادہ سے نکلا۔ قندھار پہنچا تو حاجی نظر علی خجندی سے ملاقات ہوئی جو مولانا لطف اللہ کا مرید تھا۔ خجندی نے بدری سے کہا کہ مرو[8] میں خواجہ محمد اسلام بخاری کے خلفا میں سے ایک بزرگ شیخ یونس محمد صوفی اپنی کرامات اور مقامات کے باعث معروف ہیں، تم ان کی صحبت میں جاؤ اور ملازمت اختیار کرو۔ بدری شیخ کی خانقاہ میں مرو پہنچا، شیخ نے اس پر نظر التفات کی۔ خانقاہ میں حلقہ مریدین میں اپنے قریب دائیں ہاتھ بٹھایا اور کھانا کھلایا۔ بدری چالیس دن تک شیخ کی خدمت میں رہا۔ تا آنکہ شیخ یونس محمد نصف اوّل ماہ ربیع الاول ۹۰۱ھ میں وفات پا گئے[9]

شیخ یونس محمد صوفی : وہ سلسلہ نقشبندیہ احراریہ کے شیوخ طریقت میں سے تھے۔ اُن کا نسب طریقت تین واسطوں سے خواجہ عبید اللہ احرار (م ۸۹۵ھ) سے جا ملتا ہے۔ اس طرح: یونس محمد ۔ محمد اسلام بخاری ۔ مولانا احمد کاسانی ۔ مولانا محمد قاضی ۔ خواجہ احرار ۔ بدری کی تصنیف سراج الصالحین شیخ یونس محمد ہی کے حالات و مناقب و کرامات پر مبنی ہے۔

بدری جب کشمیر میں تھا تو چھوٹی عمر سے سلسلہ کبرویہ کے طریقۂ امیر سیّد علی ہمدانی پر کاربند تھا۔ جب مرو پہنچا تو یونس محمد کی توجہ سے سلسلۂ نقشبندیہ کی طرف مائل ہوگیا۔[11] یونس محمد کی وفات کے بعد بدری خواجہ سعید الدین سعد جویباری (م ۹۹۲ھ) فرزند خواجہ محمد اسلام بخاری (م ۹۷۱ھ) کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگیا۔ ان کی مدح میں بدری کا قصیدہ سراج الصالحین میں موجود ہے" اور ان کے مناقب پر بدری کی علیحدہ تصنیف کا ذکر آگے آئے گا۔

مسکنِ بدری : بدری ۹۷۰ھ میں کشمیر سے محض سفرِ حج کی نیت سے نکلا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے جب ماوراءالنہر پہنچا تو یہاں کے صوفیاء سے تعلق کے باعث یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ۹۸۶ھ میں وہ سراج الصالحین لکھ رہا تھا تو بتایا ہے: "ہوائے دیار و ہوس یار در سر سودا غالب شدہ است"[12] لگتا ہے بڑھاپے کے باعث واپس کشمیر نہ جا سکا۔ اس کی دستیاب آخری تصنیف ظفرنامہ ۱۰۰۱ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ ماوراءالنہر کے حاکم ابوالغازی عبد اللہ بہادر خان (حکومت ۹۹۱-۱۰۰۶ھ) کے نام معنون ہے جس سے یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ مذکورہ سال تک ماوراءالنہر میں ہی تھا۔

آثارِ بدری : بدری ایک پُرکار شاعر اور نثر نویس تھا۔ اس نے ۹۷۶ھ سے ۱۰۰۱ھ تک گیارہ تصانیف تیار کیں جن میں کم از کم دو لاکھ اشعار تھے۔ ذبیح اللہ صفا اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں[13]۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انہیں بدری کی صرف ایک مثنوی۔ اسکندرنامہ ۔ دستیاب تھی۔ اب اس کے علاوہ تین کتابوں کا سراغ ملا ہے (ذکر آگے آئے گا) خود بدری نے اپنے قلم کی تیز رفتاری کا نقشہ یوں کھینچا ہے: ؎

یکدم نگر بچشم یقین سرعت قلم   کز چشم سر رود برہ صد ہزار سال

از جلوہ گاہ کن فیکون بر بساط صنع   دارد گذر چو برق مجلا بقیل و قال

بر لوح آفتاب زند نقش بے نظیر   اوصاف حضرت ملک الملک ذی الجلال

ثالث زروی معجزہ طوبیٰ و سدرہ است   نخل قلم کہ ہست برش میوۂ کمال

بدری بفکر دوات و بار تمام او   پُر کرد از شراب شفق ساغر ہلال[14]

بدری کی دستیاب اور ناپید تصانیف کی فہرست بہ ترتیبِ سالِ تصنیف حسب ذیل ہے:

۱۔ **شمع دل افروز**: بدری نے یہ مثنوی ۹۷۶ھ (مادۂ تاریخ "فضل اللہ") میں بحر ہزج مسدس میں صرف تین ماہ

میں لکھی۔ میرزایف نے اس کے اشعار کی تعداد پچاس ہزار پانچ سو اور صفا نے پانچ ہزار پانچ سو بتائی ہے۔ صفا کا بیان درست ہے۔ یہی مثنوی بدری نے اپنے سبعہ میں شامل کر لی تھی (اس کا ذکر آگے آئے گا)۔

۲۔ **معراج الکاملین**: ۹۸۱ھ (= خواجہ سعد کبیر) یا ۹۸۳ھ (بحوالہ سراج الصالحین) میں چھ ماہ کی مدت میں لکھی۔ یہ خواجہ سعید الدین سعد کے مناقب پر مشتمل ہے۔ گو کتاب نثر میں لکھی ہے لیکن بدری نے جگہ جگہ اپنے قصائد اور غزلیں بھی شامل کی ہیں۔ سراج الصالحین میں کئی مقامات پر اس کتاب کا ذکر آیا ہے۔ ایک جگہ تو مصنف نے اس کی پوری کیفیت بیان کر دی ہے۔ وہ لکھتا ہے: "تفسیر این قضیه (= معنی لا اله الا الله) غایتی ندارد ولیکن در کتاب معراج الکاملین که نود و نه جزو مصنف به قطع وزیری به مسطر پانزده سطری در تاریخ نه صد و هشتاد و سیوم به اتمام رسیده و اختتام یافته مرقوم گشته است. در قسم چهارم مقدمه اش بر برسه فصل احوال حسن و جمال و اسرار عشق و [جلال] به قلم اجمال تحریر کرده ام باید کرشمه ای از حقیقت از آنجا طلب دارند"[15]

۳۔ **روضۃ الجمال**: ۹۸۳ھ (= فرزانہ) میں آٹھ ہزار ابیات کا یہ مجموعہ پانچ ماہ میں تیار ہوا۔ اس میں بدری کے قصائد، غزلیات، قطعات، رباعیات اور مفردات کے علاوہ منشآت بھی ہیں۔

۴۔ **سراج الصالحین**: مصنف نے اس کا لقب بھی معراج الکاملین رکھا ہے۔ "مسمی شد به سراج الصالحین و ملقب گشت به معراج الکاملین"[16] یہ ۹۸۶ھ (= ذکر اللہ) میں تصنیف ہوئی۔

پی تاریخ تألیفِ کتابش — قلم بر لوح زد ده ذکر اللہ[17]

یہ یونس محمد صوفی مروی کے حالات و کرامات پر مبنی ہے۔ بظاہر یہ کتاب تصنیف کرتے وقت بدری مقالاتِ امام محمد علی حکیم ترمذی سے متاثر تھا۔ بدری کے ایک جملے سے میں نے یہی اخذ کیا ہے۔[18]

ایرج افشار نے کتاب سراج الصالحین و معراج الکاملین کے نسخۂ برٹش میوزیم، نمبر OR. 15893 مکتوبہ قرن ۱۱ھ کا ذکر بغیر مصنف کے نام اور دیگر تفصیلات کے کیا ہے۔[19] شاید مراد یہی کتاب ہے۔ ہمارے پیش نظر سراج الصالحین کا مخطوطہ کتابخانۂ گنج بخش، اسلام آباد شمارہ ۱۰۸۵ ہے، جس کی مدد سے ہم اس کتاب کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ لکھیں گے۔

سببِ تالیف: مصنف چالیس دن یونس محمد کی خدمت میں رہا۔ اس مدت میں ان کی زبان سے جو کچھ سنا اور ان کے احوال و مقامات کا مشاہدہ کیا اُسے چوبیس سال تک دل میں چھپائے رکھا۔ مگر ربع صدی گذرنے کے بعد مناسب نہ سمجھا کہ معلومات کے اس خزانے کو اپنے ساتھ قبر میں لے جائے۔ لہذا سب کے استفادے کے لیے یہ کتاب تصنیف کی۔[20]

تاریخِ تالیف: یہ کتاب ۹۸۶ میں لکھی گئی۔ مگر حیرت ہے مصنف نے مقدمے میں عبداللہ بہادر خان بن

اسکندر شیبانی کی مدح پادشاہ وقت کے طور پر کی ہے۔ حالانکہ وہ ۹۹۲ھ میں سریر سلطنت پر بیٹھا تھا۔

ترتیب کتاب: یہ کتاب ایک "طغرا"، چار "لوح" اور ایک "توقیع" پر مشتمل ہے۔ ان کے مندرجات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

طغرا: اُن آیات کی تفسیر اور احادیث کی تشریح پر مبنی ہے جن پر عمل کر کے طالب مطلوب تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ حصہ کتاب چالیس فصول پر مبنی ہے جو مصنف نے چالیس دن میں لکھا (ص ۲۰)۔ فصلوں کی ترتیب و تفصیل یہ ہے: ۱۔ حقیقت آدم ۲۔ حقیقت اصحاب الیمین و اصحاب الشمال ۳۔ محبت اصحاب الیمین ۴۔ خروج روح از بدن ۵۔ علم ۶۔ عمل ۷۔ ادب ۸۔ عبادت ۹۔ طلب ۱۰۔ نیہ ۱۱۔ عُجب ۱۲۔ ریا ۱۳۔ آہنہ ابا طلہ ۱۴۔ نفاق ۱۵۔ بُخل ۱۶۔ سخاوت ۱۷۔ عدل ۱۸۔ ظلم ۱۹۔ صبر ۲۰۔ شکر ۲۱۔ رضا ۲۲۔ توکل ۲۳۔ صدق ۲۴۔ خوف ۲۵۔ قبض ۲۶۔ بسط ۲۷۔ کشف ۲۸۔ وصال ۲۹۔ فراق ۳۰۔ یقین ۳۱۔ ولایت ۳۲۔ استغفار ۳۳۔ توبہ ۳۴۔ عدد انفاس ۳۵۔ ذکر ۳۶۔ جذبہ ۳۷۔ عشق ۳۸۔ توحید ۳۹۔ معرفت ۴۰۔ فقر و غنا۔ مذکورہ مضامین نے کتاب کا تقریباً نصف حصہ لے لیا ہے۔ (صفحہ ۲۰ تا ۲۴۶) اس کے بعد مصنف اپنے اصل موضوع کی طرف آیا ہے اور یونس محمد صوفی کا تذکرہ لکھنے کی سات وجوہ بتائی ہیں (ص ۲۴۶-۲۵۶)

لوح اوّل: در ذکر آبا و اجداد شیخ یونس محمد۔ یہ مزید پانچ فصلوں پر مشتمل ہے۔ ۱۔ اوصاف حمیدۂ شیخ خدای بردہ جد یونس محمد (ص ۲۵۶-۲۵۷) ۲۔ رفتن میرزا ابوسعید بہ مصاف اوزن حسن بر سر ولایت عراق (ص ۲۵۸-۲۵۹) ۳۔ قتل میرزا ابوسعید (ص ۲۶۰-۲۶۱) ۴۔ بیان خلافت سلطان حسین میرزا (ص ۲۶۱-۲۶۲) ۵۔ واقعات سلاطین خراسان (۲۶۲-۲۶۷)۔

لوح دوم: احوال بدایت و آثار طلب و اسباب توبہ و انابت یونس محمد۔ یہ مزید سولہ کیفیوں پر مشتمل ہے: ۱۔ ذکر مشایخ سلسلۂ خواجگان (ص ۲۶۸-۲۷۵)، یونس محمد کا شجرۂ طریقت آنحضرت (ص) تک لکھا ہے ۲۔ طلب درد و ترک دنیائے یونس محمد (ص ۲۷۵-۲۷۶) ۳۔ از مجاز گذشتن و بہ حقیقت پیوستن آن بزرگ (ص ۲۷۶-۲۷۷) ۴۔ ملاقات کردن باشاہ صوفی (ص ۲۷۷-۲۷۹) ۵۔ وجہ تسمیہ شاہ صوفی و جذبات و حالات و کرامات و خارق عادات او (ص ۲۷۹-۲۸۱) ۶۔ احوال سفر شاہ صوفی بہ طرف ترکستان برای زیارت خواجہ احمد یسوی (ص ۲۸۱-۲۸۳) ۷۔ واقعات یونس محمد بعد از وفات شاہ صوفی در ترکستان (ص ۲۸۳-۲۸۴) ۸۔ واقعہ کاروانی کہ یونس محمد در ایام طلب بہ سفر ترکستان در آن کاروان بودہ است (ص ۲۸۴-۲۸۶) ۹۔ رفتن یونس محمد از ولایت شہر سبز بہ بخارا بہ زیارت مزارات آنجا (ص ۲۸۶-۲۸۸) ۱۰۔ یونس محمد در خواب خواجہ محمد اسلام بخاری

رای بیند (ص ۲۸۸-۲۹۰) ۱۱- بیان ملاقات یونس محمد با خواجہ محمد اسلام (ص ۲۹۰-۲۹۱) ۱۲- خدمات یونس محمد درحین ملازمت وارادت بہ محمد اسلام (ص ۲۹۱-۲۹۴) ۱۳- مکالمۂ خواجہ محمد اسلام با یونس محمد (ص ۲۹۴-۲۹۶) ۱۴- انعام واکرام محمد اسلام بہ یونس محمد (ص ۲۹۶-۲۹۷) ۱۵- رخصت ارشاد ودعوت خلق بحق کہ محمد اسلام بہ یونس محمد دادہ (ص ۲۹۷-۲۹۰) ۱۶- عزیمت یونس محمد بہ اجازت واشارت خواجہ محمد اسلام از بخارا بہ مرو ونشستن بر سجادۂ ارشاد (ص ۲۹۰-۳۰۳)۔

لوح سوم: الفاظ وکلمات یونس محمد۔ مصنف نے شیخ کی صحبت میں چالیس دن میں جو کلمات سنے (ص ۳۰۳-۳۲۴)۔ اس میں ۱۸ تاریخی، عرفانی اور معاشرتی ملفوظ ہیں۔

لوح چہارم: کرامات وخارق عادات یونس محمد (ص ۳۲۴-۳۸۲) اکیس ۲۱ کرامتیں لکھی ہیں۔

توقیع: احوال واخبار موت مشتمل بر مقدمہ وسہ فصل وخاتمہ۔ مقدمہ در احوال ابتدائی مرض وسکرات وارتحال وانتقال یونس محمد (ص ۳۸۳-۳۹۰) فصل اول در یاد کردن مرگ واوصاف ملک الموت وتلخی جان کندن (ص ۳۹۰-۴۰۸) فصل دوم در سوال منکر ونکیر واحوال گور (ص ۴۰۸-۴۱۷) فصل سوم: در تعبیر خوابہای کہ حالی ان بعد از وفات درویشان وبزرگان دیدہ اند۔ خاتمہ در تشریح قول لا ارادلقنا ئہ ولامعقب لحکمہ (ص ۴۲۸-۴۴۹)۔

ماخذ کتاب: مصنف نے اپنے ماخذ کا کہیں یکجا ذکر نہیں کیا۔ تاہم کتاب میں جگہ جگہ مولوی، سعدی، خسرو، حافظ کا کلام بطور شواہد ملتا ہے۔ منثور کتابوں میں تذکرۃ الاولیا عطار، گلستانِ سعدی، ذخیرۃ الملوک ہمدانی، لمعاتِ عراقی، فصل الخطاب پارسا، مقامات خواجہ بہاء الدین نقشبند، انسیہ یعقوب چرخی اور نفحات الانس جامی کے حوالے ملتے ہیں جو سب متداول کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف نے ایک نادر ماخذ کی نشاندہی کی ہے جو بظاہر اب موجود نہیں ہے۔ یہ شیخ میرجان واعظ کا مولفہ تذکرۂ مشایخ خراسان ہے۔ میرجان، یونس محمد صوفی کا مرید اور شیخ زین الدین خوافی (م ۸۳۸ھ) کی اولاد سے تھا۔ ظاہری وباطنی علوم سے آراستہ، متقی، پرہیزگار، متوکل، اکثر لوگ اس کے عقیدت مند تھے۔ وہ تین سال تک یونس محمد کے والد میر بلتہ بہادر کے مزار واقع مرو پر مجاور رہا۔ اس کی وفات ۹۷۹ یا ۹۸۰ھ میں ہوئی۔ قبر حصار بخارا سے باہر اس ٹیلے پر واقع ہے جہاں سیف الدین باخرزی کی آخری آرام گاہ ہے۔ بدری نے شیخ خدای بردی (جد یونس محمد) کی کرامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی تفصیل شیخ میرجان واعظ کے تذکرۂ مشایخ خراسان میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے[۲۲]۔

اہمیت کتاب: ہم نے کتاب کے مندرجات کی جو تفصیل درج کی ہے اس سے اس کی اہمیت کا کسی قدر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں صرف اس نکتے پر زور دوں گا کہ کتاب کا مقدمہ (طغرا) اور موخرہ (توقیع) چھوڑ کر بقیہ کتاب خراسان میں تصوف کی ترویج، مشایخ اور سلاطین کے تعلقات اور دیگر معاشرتی حالات پر اہم دستاویز ہے۔

۵۔ دیوان بدری، ۱۰۰۰ھ میں سات ہزار اشعار پر مشتمل قصاید و غزلیات کا مجموعہ ترتیب دیا ہے۔ اس میں حمد و نعت اور مناقب آل رسول و خواجگان ہیں۔

۶۔ روضۃ الرضوان و حدیقۃ الغلمان، خواجگان جویبار کا یہ تذکرہ ایک سال کے عرصے میں، ۹۹۱ھ (= خوش کلام) میں لکھا۔ یہ خواجہ محمد اسلام بخاری اور ان کے بیٹے خواجہ سعید الدین اسعد جویباری کے حالات اور سلاطین ماوراء النہر کے ساتھ ان کے تعلقات پر اہم ماخذ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ اکادمی علوم ازبکستان تاشقند میں شمارہ ۲۰۹۴ کے تحت موجود ہے۔[۳۲]

۷۔ سبعہ یا مثنویات هفتگانہ بدری موسوم بہ بحر الاوزان، بدری نے یہ سبعہ ۹۹۱ھ (= نظام) میں کہنا شروع کیا اور ۱۰۰۱ھ (= نظامی) میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔[۳۳] یہ سبعہ مجموعی طور پر ایک لاکھ ستر ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ مثنویات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ منبع الاشعار، بحر سریع میں نظامی کی مثنوی مخزن الاسرار کی تقلید میں لکھی۔

۲۔ ماتم سرای، بحر رمل مسدس میں عطار کی منطق الطیر کا تتبع کیا ہے۔

۳۔ ناهره و خورشید، بحر خفیف میں سنائی کے حدیقۃ الحقیقہ کی پیروی کی ہے۔

۴۔ شمع دل افروز، بحر ہزج مسدس میں امیر خسرو دہلوی کی خسرو و شیریں کو پیش نظر رکھا ہے۔

۵۔ مطلع الفجر، بحر رمل میں جامی کی سبحۃ الابرار کا استقبال کیا ہے۔

۶۔ لیلی و مجنون، بحر ہزج مسدس میں ہاتفی کی لیلی و مجنوں کا جواب دیا ہے۔

بدری کی مذکورہ بالا چھ مثنویات کے اشعار کی تعداد دس ہزار بیت ہے۔

۷۔ رسل نامہ، بحر متقارب مثمن میں سعدی کی بوستان کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ مگر اس کا موضوع تاریخ ہے۔ یہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار ابیات پر مشتمل اور چار دفتروں پر منقسم ہے:

دفتر اول: صفی نامہ تینتیس ہزار (۳۳۰۰۰) بیت، ابو البشر آدم سے لے کر عیسیٰ ابن مریم تک انبیائے بنی اسرائیل کے واقعات ہیں۔

دفتر دوم: اسکندر نامہ سات ہزار بیت، بدری نے اسے ابو الغازی عبداللہ بہادر خاں دوم کو پیش کیا ہے، مقدمے میں خواجہ محمد اسلام بخاری اور اس کے بیٹے خواجہ سعید الدین اسعد کے مناقب بیان کیے ہیں، کتاب کا اصل موضوع قصۂ ذوالقرنین ہے جسے مسلمان داستان سراؤں نے اسکندر رومی کے ساتھ خلط کر دیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ قومی کتب خانہ پیرس میں

بہ ذیل شمارہ SUP. 501 موجود ہے۔[۲۵]

دفتر سوم: مصطفیٰ نامہ، ایک لاکھ چار ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ چالیس ہزار اشعار رسول اکرم کی ولادت سے وفات تک واقعات سے متعلق ہیں۔ تیس ہزار ابیات خلافت حضرت ابوبکر صدیق سے شہادت امام حسین تک واقعات و غزوات و محاربات سے متعلق ہیں۔ چونتیس ہزار ابیات خلافت معاویہ سے شیبانی خاں کے خروج تک ملوک عرب و عجم کے واقعات سے متعلق ہیں۔

دفتر چہارم: ظفر نامہ، ۱۰۰۱ھ میں سولہ ہزار ابیات میں مکمل ہوا۔ یہ بدری کے ممدوح ابوالغازی عبداللہ بہادر خاں کے واقعات و محاربات پر مشتمل ہے اور چھیاسٹھ ابواب پر تقسیم ہوا ہے۔ اس کے انسٹھویں (۵۹) باب میں بدری نے خواجہ سعد کا مرثیہ لکھا ہے۔ ظفر نامے کا قلمی نسخہ اکادمی علوم تاجکستان ـــــ میں بہ ذیل شمارہ ۹۰۰ موجود ہے۔[۲۶]

بدری کی شاعری: جیسا کہ ہم نے دیکھا بدری کی بیشتر تصانیف منظوم ہیں۔ اس نے ظفر نامے میں اپنے ایک خواب کا ذکر کیا ہے کہ ربیع الاول ۹۸۰ھ میں اس نے دیکھا کہ خواجہ محمد اسلام بخاری اسے نصیحت کر رہے ہیں کہ آئندہ صرف اشعار لکھا کرو۔

ڈاکٹر صفا نے اسے متوسط درجے کا شاعر قرار دیا ہے جو غزل کو بھی قصیدے کے رنگ میں کہتا ہے۔ ہر چند ڈاکٹر صفا کے پاس بدری کی کسی غزل کا نمونہ نہیں تھا۔ سراج الصالحین میں بدری نے اپنی متعدد غزلیں نقل کی ہیں جو اخلاقی مضامین کی حامل ہیں۔ ظاہر ہے یہ مضامین مقبول غزل کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ اسی کتاب میں بدری کے چند ملمعات (ایک مصرعہ عربی فارسی) اور قصاید بھی درج ہوئے ہیں۔ ہم بدری کی ایک غزل بطور نمونہ پیش کر رہے ہیں:

غزل

بیا کہ آئینہ پرورد کش صاف است — کشای دست ارادت کہ وقت الطاف است
زمشک نافۂ عبدالمناف ناف زمین — معطر است ولی مشک صاف در ناف است
شراب ساقی حبل الورید لی باقی — بجام عشق بر بندد کہ دور اسراف است
روا بود کہ از اسرف کار خیر کنی — بدین معاملہ فتوی اہل کشاف است
چو ملک جم طلبی جام جم بدست آور — کہ آں محیط اقالیم قاف تا قاف است
ہوای خلا چہ خواہی کہ اہل دوزخ را — ہزار تنگ ز ہمسایگی اعراف است

ببین بدیدۂ انصاف بدریا امروز
کہ لرزہ بر دل خورشید چرخ تا انصاف است

••

حواشی

(۱) حسام الدین راشدی، تذکرۂ شعرای کشمیر، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۳ء، طبع دوم ۱: ۳۳۲-۳۳۳ (۲) سعید نفیسی، تاریخ نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی تا پایان قرن دہم ہجری، انتشارات فروغی تہران، ۱۳۶۳ش، طبع دوم ۱: ۴۴۴-۴۴۵ (۳) عبدالغنی میرزایف "بدرالدین کشمیری و اشتباہاتی در تعیین تالیفات او" در وحید، تہران جلد ۱۱ شمارہ ۹، صفحات ۶۹۹-۷۰۱، اس مقالے میں تین سہو پائے جاتے ہیں، اولاً بدری کا سال ولادت ۹۶۱ھ لکھا گیا ہے (ص ۷۰۰)، یہ صحیح نہیں، اس سال میں تو بدری کشمیر سے ماوراءالنہر پہنچا تھا۔ ثانیاً سبعۂ بدری کا عرصۂ تالیف پندرہ سال بتایا گیا ہے (ص ۷۰۰)، جب کہ یہ عرصہ دس سال ہے۔ ثالثاً مثنوی شمع دل افروز کے مادۂ تاریخ "فضل اللہ" سے ۹۴۳ عدد نکالے ہیں حالانکہ یہ ۹۷۷ ہوتے ہیں۔ (۴) ذبیح اللہ صفا، حماسہ سرائی در ایران از قدیم ترین عہد تاریخی تا قرن چہاردہم ہجری، موسسہ انتشارات امیرکبیر، تہران، ۱۳۶۳ش، طبع چہارم، ص ۳۵۳، وہی: تاریخ ادبیات در ایران، انتشارات فردوس، تہران، ۱۳۶۳ش، ۵/۲: ۱۳۷۰-۷۱، (۵) E. Blochet, Bibliotheque National: Catalogue des Manuscripts Persians, Paris, 1928, Vol. III (۶) اس نسخے کا اولین تعارف احمد منزوی نے فہرست نسخہ ہای خطی کتابخانہ گنج بخش، اسلام آباد، ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء، جلد چہارم، صفحات ۲۱۲۲-۲۱۲۳ میں کرایا۔ نسخے کا نمبر ۱۰۸۵ ہے۔ (۷) بدرالدین کشمیری، سراج الصالحین، قلمی، کتابخانہ گنج بخش، اسلام آباد، شمارہ ۱۰۸۵، صفحہ ۱۵۰۔ آگے اس کا حوالہ صرف سراج الصالحین کے نام سے آئے گا۔ (۸) مرو، قدیم خراسان کا ایک آباد شہر جو اب وسطی ایشیا کی جمہوریہ ترکمنستان میں واقع ہے۔ اہل خراسان اسے مرو زیگی کہتے ہیں اور وہاں سے منسوب کو مروزی۔ احمد رنجبر، خراسان بزرگ (بحثی پیرامون چند شہر از خراسان بزرگ)، موسسہ انتشارات امیرکبیر، تہران، ۱۳۶۳ش، ۲۲۷-۲۵۱۔ (۹) سراج الصالحین ۱۵۰، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۰۹۔ (۱۰) ایضاً ۳۷۶-۳۷۷۔ (۱۱) ایضاً ۱۲۰، خواجہ محمد اسلام اور خواجہ سعد کے حالات کے لیے: محمد ہاشم کشمی، نسمات القدس من حدائق الانس، قلمی، کتابخانہ گنج بخش، اسلام آباد، شمارہ ۴۰۰، صفحات ۱۳۲-۱۳۳۔ (۱۲) ایضاً ۲۵۲۔ (۱۳) تاریخ ادبیات در ایران ۵/۲: ۷۱۰۔ (۱۴) مقالہ میرزایف۔

۴۰۷- یہ اشعار مثنوی ظفرنامہ کے ہیں۔ (۱۵) سراج الصالحین، ۵۷۔ (۱۶) ایضاً، ۱۸ (۱۷) ایضاً، ۲۶۔ (۱۸)
این کتابیست کہ بدرالدین مسکین ... از انعکاس اسرار و انکشاف انوار مقامات امام محمد علی حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ تصنیف کردہ و
تالیف نمودہ سراج الصالحین، ۲۱۔ (۱۹) نسخہ ہای خطی نشریہ دانشگاہ تہران، ۱۳۴۴ش، دفتر ۴ ص ۶۷۰۔ (۲۰)
سراج الصالحین ۲۵۲۰-۲۵۳۔ (۲۱) ایضاً، ۳۲۰۔ (۲۲) ایضاً، ۲۷۷۔ (۲۳) فہرست کتب خطی ازبکستان، مطبوعہ تاشقند
۱۹۵۲ ج ۱ ص ۷۷۔ (۲۴) ڈاکٹر صفا نے لکھا ہے کہ بدری نے اپنے سبعہ کی پہلی چھ مثنویات ۹۰۰ھ میں مکمل کیں اور ۹۰۹ھ (=
حافظ) میں رسل نامہ لکھنا شروع کیا۔ تاریخ ادبیات در ایران، ۵/۲: ۵۱۷۔ (۲۵) Bl ochet, Vol. III,
PP. 352-354 (۲۶) میرزا ایف، فہرست کتب خطی اکادمی علوم تاجیکستان، مطبوعہ استالین آباد، ۱۹۶۰ء
جلد ۱ ص ۷۳۔ (۲۷) سراج الصالحین، ۲۹۵-۲۹۶۔

••

ڈاکٹر غلام رسول جان
استاد شعبۂ فارسی
کشمیر یونیورسٹی سرینگر

مولانا اوجی کشمیری

ملا اوجی نامی کے نامی گرامی فرزند تھے[1]۔ جس طرح سے ملا یا مولانا نامی کا پورا نام اب تک گوشۂ خفا میں رہا ہے، بالکل اسی طرح سے تذکرہ نویسوں نے صرف ملا اوجی یا مولانا اوجی لکھنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ ان کا پورا نام صراحت کے ساتھ کسی بھی تذکرہ میں نہیں آیا ہے، البتہ ان کا لقب اور شاعرانہ تخلص تو واضح ہے۔

مولانا اوجی کا محل تولد کشمیر بتایا جاتا ہے۔ البتہ یہ واضح نہ ہو سکا کہ کشمیر کے کس گوشہ میں ان کی ولادت واقع ہوئی۔ ان کے سال ولادت کے سلسلے میں تذکرہ نویسوں نے کوئی خامہ فرسائی نہیں کی ہے۔ البتہ تذکرہ "مے خانہ" کے مطالعہ سے ان کے سال ولادت

---

[1] یہ امر تحقیق طلب ہے کہ اوجی کس ملا نامی کے نامی فرزند تھے۔ کیونکہ ایک ہی دور سے تعلق رکھنے والے ملا نامی اول اور ملا نامی ثانی جیسے شعراء و علماء کا تذکرہ تذکروں میں آیا ہے۔ "واقعات کشمیر" کے مصنف کے بقول حسین شاہ چک (۹۷۱-۹۷۷ھ) کے دربار کے ساتھ ملا نامی اول اور ملا نامی ثانی بحیثیت شاعر وابستہ رہے ہیں۔ (ملاحظہ ہو واقعات کشمیر ورق ۱۳۸/ب و تاریخ حسن جلد ۴ ص۳ بھی دیکھئے)۔

موصوف کے بقول ملا نامی اول حسین شاہ چک کا مداح و مصاحب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک گمنام اور فقیرانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسے عرف و نحو پر پوری دسترس حاصل تھی۔ چنانچہ دیگر تذکرہ نویسوں نے بھی ملا نامی کے متعلق ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ایسے تذکروں میں "ہفت اقلیم" (قلمی)، "صحف ابراہیم" (قلمی ورق ۱/۳۴۴) "صبح گلشن" (چاپی ص۵۳۶) وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اصلح مرزا اپنے تذکرہ "شعرائے کشمیر" میں ملا عبدالغفور نامی نام کے تحت یوں رقمطراز ہیں "ملا عبدالغفور نامی نام نامیش نام آور ان کشور سخندانی او در کنج خمول گمنامی منزوی و متواری گردانده" (ملاحظہ ہو تذکرہ شعرائے کشمیر از اصلح مرزا ص۴۹۹)۔

گو کہ موصوف نے گمنامی اور فقیری میں زندگی بسر کرنے والے جس شخص کا تذکرہ نامی نام کے تحت کیا ہے اس کے ساتھ ملا عبدالغفور نام کی مہر بھی ثبت کی ہے جبکہ دیگر سبھی تذکروں میں صرف مولانا نامی نام آیا ہے۔ چنانچہ موصوف نے دیگر تذکرہ نویسوں سے ہٹ کر دیگر چند اشعار کو بھی مولانا نامی کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ جن میں سے ایک شعر کو حوالہ یہاں پر دیا جاتا ہے ۔

حرف پر پیچ کو آشفتگی صاحب ہنر باشد
زخم یک جیبا ملاست پی آب گہر باشد

اس کے علاوہ دیگر تذکروں میں جو اشعار مولانا نامی کے ساتھ منسوب کیے جاتے ہیں انہیں بطور نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے تاکہ قارئین کرام ان کے شاعرانہ رتبہ سے واقف ہو جائیں۔

غزل ؎

هر گز دلم ز بسیر تو زائل نمی شود
در دیده نقش روی تو زائل نمی شود

از دوریت چو یار کرد این عهد فا برین
اسلامیان محمد و تو حائل نمی شود

دستم بریده باد چکار آدم بگو
در گردن بتان چون حمائل نمی شود

مثنوی ؎

خردمند کاست مقاشادی انجمن اگر
کر جوان روان داد کا بین او

بخاموشی چهره از بانی ده
بجز قوت زور جوانی دهد

چو بیدست و چون عروس را گیر
کا آتش گریبان کند شاندیر

(ملاحظہ ہو "ہفت اقلیم" قلمی، "واقعات کشمیر" ورق ۱۳۸/ب، تعارف مخطوطات اس کے علاوہ "ریاض الشعراء" ۴۱۴ اور "صبح" ص۵۳۶ بھی ملاحظہ ہو)۔

(باقی حاشیہ ص۳۱۰ پر)

کے بارے میں ایک واضح اشارہ یوں ملتا ہے۔ خود مصنف کے بقول کہ "چون در سنہ خمس عشرین والف (۱۰۲۵) لاہور رسیدم طاعون گرم شدہ بود۔ از بیم وبا بلا توقف ازاں بلدہ بکشمیر رواں شدم۔ وقتی کہ بداں سرزمین عشرت آئین رسیدم قریب بدو سال درانجا ماندم"[1]۔ اس عبارت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عبدالنبی صاحب تذکرۂ مے خانہ ۱۰۲۵ھ میں وارد کشمیر ہوئے اور یہاں ان کا قیام قریباً دو سال رہا" اور پروفیسر محمد شفیع صاحب تذکرۂ مے خانہ کے ورود کشمیر کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں: "دراوائل سال ۱۰۲۵ھ لاہور رسید در لاہور آں روزہا طاعون بسیار شدت داشت بنابراین فوراً بکشمیر رواں شد چوں خویشاوند او میرزا نظامی بخشی کہ دیوان کشمیر بود در ایام اقامت کشمیر کتاب "دستور الفصحا" خود را از سواد بیاض برد در اواخر سال ۱۰۲۶ھ تقریباً بعد از دو سال اقامت در کشمیر با میرزا نظامی بہ ہندوستان آمد"[2]۔ اس عبارت سے واضح ہے کہ ملا عبدالنبی صاحب تذکرۂ مے خانہ ۱۰۲۵ھ کے اوائل میں کشمیر آئے اور یہاں ان کا قیام قریباً دو سال کا رہا۔ ۱۰۲۶ھ کے اواخر میں کشمیر سے اپنے رشتہ دار میرزا نظامی کیساتھ ہندوستان آئے۔ واضح رہے کہ اپنے اس قیام کے دوران ملا عبدالنبی صاحب تذکرۂ مے خانہ کی ملاقات مولانا اوجی سے ہوئی۔ ان دنوں جب یہ ملاقات واقع ہوئی مولانا اوجی کا سن ۵۵ برس کو پہنچ چکا تھا[3]۔ اگر دونوں میں ملاقات ۱۰۲۵ھ کے اوائل میں ہی ہوئی ہے تو اُس وقت مولانا اوجی کا سن ۵۵ برس کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی ولادت ۹۷۰ھ میں ہوئی ہوگی۔ یا اگر ۱۰۲۶ھ کے یقینی سال میں یہ ملاقات وقوع پذیر ہوئی ہے تو اس صورت میں ان کی ولادت ۹۷۱ھ میں دکھائی دیتی ہے۔

مولانا اوجی کی پرورش تعلیم و تربیت اور دیگر خاندانی حالات وغیرہ سے متعلق تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ لیکن اُن کے نام کے ساتھ مولانا کا لقب اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انھوں نے مروجہ علوم و فنون میں مہارت تام حاصل کی تھی جب ہی تو اس لقب سے ملقب ہوئے۔

مولانا اوجی کے والد ملا نامی کا شمار اپنے وقت کے شاعروں کے علاوہ علماء و فضلا میں ہوتا تھا جب ہی تو وہ مولانا یا ملا کے لقب سے

بقیہ حاشیہ ص ۳۰۹

جیسا کہ ابتدا میں بیان ہوا کہ حسین شاہ چک کے دربار کے ساتھ ایک اور ملا نامی نام کا شاعر وابستہ رہا ہے، جو کہ تذکروں میں ملا نامی ثانی کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ شاہی دربار سے وابستہ ہو کر بھی وہ بڑا گستاخ لیکن بادشاہ کے مقربین میں سے تھا۔ چنانچہ بادشاہ حسین شاہ چک، جو خود بھی ایک شاعر تھا، کے ساتھ اس کی شاعرانہ نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ تذکروں میں یہ واقعہ صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ ایک دفعہ عید کے موقع پر بجائے دو خلعت عیدین [illegible] بھیجا استدعا یوں کی ہے ع

خلعت شاہی مرا ایں رسد بازیں رسد

بادشاہ نے جواب میں لکھ بھیجا ع ایں چنیں کم فہم را ناں رسد نہ ایں رسد (ملاحظہ ہو واقعات کشمیر قلمی ورق ۱۰۹ / تاریخ حسن جلد دوم ص)

اب رہا سوال کہ مولانا اوجی کس ملا نامی کے فرزند تھے۔ تذکرۂ مے خانہ کا مصنف ملا عبدالنبی 'مولانا اوجی' کے بارے اپنے تذکرہ میں "درد مند درویش نہاد" اور "صوفی مشرب پاکیزہ اعتقاد" جیسے القاب استعمال کرتا ہے۔ واضح ہے کہ موصوف نے اپنے قریباً ۲ سال قیام کشمیر کے دوران مولانا اوجی کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ لہٰذا جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے اپنے تذکرہ میں قلمبند کیا۔ ملا نامی اوّل جیسا کہ پہلے ہی لکھا گیا کہ وہ گمنامی اور فقیری کے عالم میں رہتے تھے لہٰذا مولانا اوجی جیسے "درد مند درویش نہاد" و "صوفی مشرب پاکیزہ اعتقاد" جیسے اولاد کی حق فرزندی ان کے ساتھ قرار پانا ایک حقوق فطری امر کا متقاضی ہے۔

1. تذکرۂ مے خانہ چاپ تصحیح شدہ از گلچین معانی ص ۷۷۰ 2. دیباچہ تذکرۂ مے خانہ از پروفیسر محمد شفیع چاپ لاہور 3. تذکرۂ مے خانہ ص ۷۲۳

یاد کیے جاتے ہیں۔ اوجی نے اپنی مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ دیگر علوم و فنون حتیٰ کہ شاعری میں بھی اپنے ہی والد سے کسب فیض کیا ہوگا۔ تذکروں میں ایسی کوئی شہادت موجود نہیں ہے جس میں اوجی کے کسی استاد کا باضابطہ تذکرہ موجود ہو۔ مولانا اوجی نے صغر سنی میں ہی شعر گوئی شروع کی تھی اور سن بلوغیت کو پہنچتے پہنچتے انھوں نے شاعری میں اپنا نام حاصل کیا تھا جب ہی مرزا جعفر آصف خاں جیسے دانشمند اور دانش دوست نے اوجی کو اپنی خدمت میں لیکر اس کی قدردانی کی تھی[1]۔ آصف خاں کی قدردانی کے ہی نتیجے میں اوجی نے شاعری میں کمال دکھایا اور کافی ترقی کی۔ بقول صاحب تذکرۂ بے خانہ "جو کچھ اس زمانے میں لکھا وہ کسی زبردست حالت سے کم نہیں[2]۔"

مولانا اوجی کا شہرۂ آفاق کارنامہ "ساقی نامہ" جو کہ ایام شباب میں ہی اُس وقت جبکہ مرزا جعفر آصف خاں جیسے دانشمند اور قدردان کی خدمت میں تھے منصۂ شہود پر آیا۔ اوجی کا یہی وہ مشہور زمانہ کارنامہ ہے جس پر نہ صرف معاصرین بلکہ بعد میں آنے والے لوگ عش عش کرنے لگے۔ صاحب تذکرہ بے خانہ کے بقول "یہ ضعیف (ملا عبدالنبی) ایک دن اجمیر میں مولانا محمد صوفی کی خدمت میں حاضر تھا کہ کشمیر کے لوگوں میں سے ایک عزیز نے کسی تقریب کے سلسلے میں مولانا اوجی کا یہ شعر پڑھا ؎

مرا دامن خویش زنجیر شد　　　　مرا دست در آستین پیر شد[3]

اس پر منصف بالانصاف (مولانا محمد صوفی) یہ دو مصرعے سنکر پیچ و تاب کھانے لگے اور فرمایا کہ "اس سے پہلے کہ میں ساقی نامہ کہہ دوں اگر یہ شعر سنتا تو ساقی نامہ کو نظم کرنے کا ارادہ نہ کرتا[4]۔" مولانا اوجی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے ہی وطن میں گذارا۔ تذکرۂ بے خانہ کے مصنف کے بقول "اس (اوجی) دردمند نے سیر و سفر کم کیا۔ لیکن کشمیر کے گرد و نواح کی کافی سیاحت کی۔ ایک بار لاہور گئے لیکن پھر اپنے وطن کو واپس گئے[5]۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اوجی نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام کشمیر میں ہی گذار دیے۔ چنانچہ جب صاحب تذکرۂ بے خانہ کشمیر آیا تو اس وقت اوجی کا سن ۵۵ برس کو پہنچ چکا تھا اور بقول مصنف موصوف کہ افیون کی لت پڑ جانے کی وجہ سے وہ مرتبۂ شعر سے گر گئے تھے۔ اگر کوئی ایک دو شعر کہہ بھی دیتے وہ دل پر اپنا اثر نہیں کرتے[6]۔ اس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اوجی کا جو

---

۱ تذکرۂ بے خانہ ص۳۲، مرزا جعفر آصف خاں کے علاوہ دیگر امرا نے بھی اوجی کی نسبت قدردانی کا اظہار کیا، جن کی تفصیل میری نظروں سے نہیں گذری۔　۲ تذکرۂ بے خانہ ص۳۲،　۳ ایضاً ص۳۲،

۴ بے خانہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ملا عبدالنبی کشمیر وارد ہونے سے پہلے اجمیر میں ہی قیام پذیر تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اوجی کے اس شعر نے بھی اسے بیحد متاثر کیا اور اسے کشمیر آنے کی تحریک دی۔

اور انتخاب مثنوی میں صاحب تذکرۂ بے خانہ نے یہ شعر اس طرح لکھا ہے ؎

مرا اشک دامن گلستان شد است　　　　مرا دست خصم گریبان شد است

مرا دست در آستین پیر شد　　　　مرا دامن خویش زنجیر شد

۴ بے خانہ ص۳۳،　۵ ایضاً ص۳۲،　۶ بے خانہ ص۳۳،

بھی فخریہ کارنامہ رہا ہوگا وہ اس کا ابتدائی زندگی کا کلام ہی ہوگا۔

بہرحال یہ واضح نہ ہو سکا کہ مولانا اوجی نے اپنی زندگی کے کتنے شب و روز دیکھے، اس سلسلے میں بھی تذکرہ نویسوں کو تامل ہے۔ البتہ تذکرۂ مے خانہ جو کہ ۱۰۲۸ھ میں رشتۂ تحریر میں آیا ہے، اس میں اوجی کے سال وفات کے سلسلے میں کچھ درج نہیں ہوا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اوجی ۱۰۲۸ھ میں ابھی بقید حیات ہی تھے۔ دیگر تذکرہ نویسوں نے بھی اوجی کا سال وفات نہیں لکھا ہے، ماسوائے 'واقعات کشمیر' کے مصنف کے۔ واضح رہے کہ 'واقعات کشمیر' ۱۱۶۰ھ میں رشتۂ تحریر میں آئی ہے اور اس کا سب سے قدیم نسخہ خدابخش لائبریری پٹنہ کی زینت بنا ہوا ہے اور مصنف کی زندگی میں ہی کتابت ہوا ہے۔ سال کتابت ۱۱۷۹ھ ہے[٢]۔ اس میں مولانا اوجی کا سال وفات ۱۰۳۲ھ درج ہوا ہے[٣]۔

جیسا کہ اولاً بیان ہوا کہ مولانا اوجی نے صغر سنی میں ہی شعر کہنے شروع کر دیے تھے اور اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں ہی ان کی شاعری پروان چڑھی۔ چنانچہ گھر کا ماحول ہی شاعرانہ تھا۔ جہاں مولانا نامی جیسے شاعر استاد نے اس کی تربیت کی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ایام شباب کو پہنچتے پہنچتے ان کی شاعری کا شاہکار 'ساقی نامہ' معرض وجود میں آیا۔ چنانچہ ساقی نامہ کے اس شعر ؎

مرا دست در آستین پیر شد مرا دامن خویش زنجیر شد

نے معاصرین تو کیا بعد میں آنیوالوں کو عش عش کرنے پر مجبور کیا۔ "ساقی نامہ" جس کا مفصل انتخاب صاحب تذکرہ مے خانہ نے اپنے تذکرہ میں درج کیا ہے کے علاوہ مولانا اوجی نے قصیدے اور غزلیں بھی خوب کہی ہیں۔ البتہ ان کا کوئی مفصل قصیدہ حتیٰ کہ کوئی پوری غزل کسی تذکرہ کا عنوان نہیں بنی ہے البتہ متفرق اشعار کا جو جا بجا انتخاب تذکروں میں ملتا ہے اس سے کما حقہٗ ان کی شاعری کے مرتبہ پر کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے۔

صاحب 'میخانہ' کا قول ہے کہ اوجی کے اشعار صرف قصیدہ اور غزل وغیرہ تین ہزار ابیات پر مشتمل ہیں اور موصوف کا مزید کہنا ہے کہ اوجی نے اپنا دیوان ترتیب نہیں دیا ہے[٤]۔ جبکہ 'واقعات کشمیر' کے مصنف نے اوجی کو صاحب دیوان بتایا ہے[٥]۔ سردست اوجی کا دیوان میری نظروں سے نہیں گذرا۔ ہندوستان کے اہم کتابخانوں میں خدابخش لائبریری پٹنہ، نیشنل لائبریری کلکتہ، رضا لائبریری رامپور اور آصفیہ حیدرآباد قابل ذکر ہیں۔ ان میں بھی اوجی کا دیوان موجود نہ پایا۔ البتہ برٹش میوزیم کے کیٹلاگ کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ مولانا اوجی کا سترہویں صدی عیسوی کا کتابت شدہ دیوان تحت شمارہ ۲۲۸ OR مذکورہ کتابخانے میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ کسی نجی کتابخانے میں اس کا کوئی نسخہ موجود ہو۔ بہرحال ان کے کلام کی غزل الشکیا مثنوی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اوجی کا دیوان ایڈٹ ہونے کے بعد شائع کیے جانے کا مستحق ہے۔

---

[٢] واقعات کشمیر کا قلمی نسخہ تحت شمارہ ۲۳۹ موجود ہے۔ میں نے دوران قیام پٹنہ اسی قلمی نسخے سے استفادہ کیا۔

[٣] "واقعات کشمیر" قلمی ورق ۵۵/ا۔ تاریخ حسن جلد ۴ ص۳ بھی ملاحظہ ہو۔ [٤] "تذکرۂ مے خانہ" ص۳۲-۷۳۳

[٥] "واقعات کشمیر" قلمی ورق ۵۵/ا

مولانا اوجی کی شاعری سے متعلق کسی بھی تذکرہ میں مفصلاً کچھ نہیں ملتا۔ بعضوں نے برسبیل تذکرہ کسی خاص دور کے ساتھ منسوب کیا ہے اور بعضوں نے اُن کی شاعری سے متعلق اختصاراً چند جملے لکھ کر کچھ اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے۔ "ریاض الشعرا" کے مصنف نے اوجی کو ہمایوں کے دور سے منسوب کیا ہے[1]۔ اور "صحف ابراہیم" کے مصنف نے اسے اکبر اور جہانگیر کے دور کا گردانا ہے[2]۔ استاد سعید نفیسی کا کہنا ہے کہ اوجی کشمیری دسویں صدی ہجری کے بہترین غزل سراؤں میں سے تھے[3]۔ بہرحال اتنا تو واضح ہے کہ مولانا اوجی کی شاعرانہ نمو ابتدائی مغل عہد میں جڑ پکڑنے لگی اور جہانگیر کے آخری ایام تک برقرار رہی۔

سردست ان کا دیوان اشعار میرے پیش نظر نہیں ہے، لہٰذا ان کی شاعری پر مفصلاً تنقیدی نکتہ نگاہ سے بحث کرنا فی الحال ممکن نہیں۔ البتہ یہاں پر ان چند تذکرہ نگاروں کے حوالے سے بات کی جائے گی جنھوں نے ان کی شاعری کے بارے میں تذکرے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ "عرفات العاشقین" جو کہ مولانا اوجی کی زندگی کے آخری ایام میں رشتۂ تحریر میں آیا ہے، کا مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ "بحر طبعش در نہایت موج و کوکب ادراکش در غایت اوجست۔ موج بیانش زور شد و اوج کلامش بلند واقع است[4]۔" موصوف نے اوجی کے چھ (۶) اشعار درج کر کے اپنے بیان کو تقویت دی ہے۔ اصلح مرزا کا بیان ہے کہ "اوجی پایۂ سخن را بمعراج کمال رسانیدہ، ہر مصرعش در عالم علوی چوں ہلال شہرتی دارد[5]۔" اور "واقعات کشمیر" کے مصنف کا خیال ہے کہ "اوجی کشمیری مہر اوج بلاغت و ہنرپروری بود[6]۔"

بہرحال مولانا اوجی سے متعلق جتنے بھی اشعار تذکروں میں ہم تک پہنچے ہیں اُن میں سے چند ایک کا انتخاب کر کے قارئین کی نذر کیے جاتے ہیں ؎

تبسم گو زمی دیدم کہ از چاک گریبانت	درے خانۂ عشرت بردیم باز بود امشب
از زلف یار شکوۂ زنجیر می برم	سیل جنون بخانۂ ہوشم رسیدہ است
گریہ تحسین نگہی چشم تو پرساز کند	نغمہ را تربیت سامعہ خوش آواز کند
ہر سر کہ بستۂ غم فتراک او بود	دانم یقین کہ روز جزا سرخ رو بود
از کس خیال زلف تو در سینہ جا گرفت	آہی کہ سر زند ز دلم مشک بو بود

[1] "ریاض الشعرا" قلمی ورق ۳۰۔ [2] "صحف ابراہیم" ص ۳۵۰ چاپی۔ [3] تاریخ نظم و نثر در ایران از استاد سعید نفیسی چاپ تہران۔
[4] "عرفات العاشقین" قلمی ورق ۱۲۹/الف۔ [5] "تذکرۂ شعرائے کشمیر" از اصلح مرزا مرتب شدہ از حسام الدین راشدی چاپ لاہور۔ [6] "واقعات کشمیر" قلمی ورق ۱/۵۵۔

انتخاب از مثنوی ساقی نامۂ اوچی: مولانا اوچی نے ساقی نامہ کا آغاز اس طرح کیا ہے:

چنین تا بکی ترک ساغر کنیم ۔۔۔ لب دل زخون جگر تر کنیم
یکی توبہ را در شکست آوریم ۔۔۔ دل می پرستان بدست آوریم
زیارت کنم بانۂ خانہ را ۔۔۔ ببوسم سراپای مے خانہ را
ازین فرقت آباد تا بودہ ام ۔۔۔ جز از زہر غم لب نیا بودہ ام
کنارم پر از اشک چون اخگرست ۔۔۔ زخون خوردن دل، دماغم ترست
زہم پر نخوست و من نو سفر ۔۔۔ ہمہ زاد رہ، پارہ ہای جگر
بجز گریہ گشودہ ام دیدہ را ۔۔۔ کہ ذوق نظر نیست غم دیدہ را

....

مرا ز اشک، دامن گلستان شداست ۔۔۔ مرا دست خصم گریبان شداست
مرا دست در آستین پیر شد ۔۔۔ مرا دامن خویش زنجیر شد

اور درج ذیل اشعار میں مولانا رومی کا جوش و جذبہ صاف نظر آتا ہے:

فغان کاندرین لاجوردی رواق ۔۔۔ من و نی لبالب شدیم از فراق
اگر ضبط نا کردہ دم، دم زنم ۔۔۔ جہان را بیک بار برہم زنم

ساقی کوثر حضرت علیؓ کے ساتھ اپنی محبت اور ولا کا اظہار ان اشعار میں اس طرح کیا ہے:

فلک مست و سرخوش برقص اندر است ۔۔۔ زکیف ساقیؑ کوثر است
ولیؑ خدا شاہ مردان علی ۔۔۔ لبالب زمہرش، خفی و جلی
زکشت عطایش فلک دانہ ای ۔۔۔ زشمع رخش مہر پروانہ ای
شناسندۂ فرزندان علیست ۔۔۔ شہنشاہ اقلیم احسان علیست
علیؑ مظہر عین فرزانگی است ۔۔۔ علیؓ گوہر کان مردانگی است
از ان پیش کہ آمیخت جان در گلم ۔۔۔ بمہر علیؓ شد مخمر دلم
مرا داغ او بر جبین دل است ۔۔۔ مرا مہر او از جہان حاصل است

جناب محمد الدین فوق مرحوم

کشمیری پنڈتوں کی ذاتیں

ملماسی پنڈت:

، رازداں، خزانچی، کچلو، ہنڈو، ریزہ، بٹ، کول، کاٹجو، مٹو، بھنڈاری پنڈت، آخون، بھان، مٹو، شنگلو، گجو، چوکو، چک۔

بان ماسی پنڈت:

درابی، بام زئی، ایما، کاک، رازداں، مٹو، فوطہ دار، گنجو، کاچرو، لگرو، بخشی۔

قسطباشی پنڈت:

کھر، دیوان، ملا (بمعنی احمق)، مشران۔

مزید ذاتیں پنڈتوں کی:

منٹو، چکبست = (چک = زمین، بست = بندوبست کے افسر)

منٹو: اس لفظ کا تعلق من وٹی طبقہ کے ساتھ ہی ہے۔ جس کا ذکر قسطباشی پنڈتوں کے طبقہ میں ہو چکا ہے۔ کہتے ہیں ان کا کوئی بزرگ ایک ہی وقت شرط باندھ کر تم اسیر یا من وٹی چاول کھا گیا تھا۔ اس وقت سے ان کا نام منٹو پڑ گیا۔ اس قوم میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے من وٹی چاول کھانے والا بزرگ دراصل پنڈت تھا۔ اس کی اولاد سے جو مسلمان ہوا وہ بھی منٹو ہی کہلایا۔

چکبست: کشمیر میں چک ایک قوم ہے جس نے کئی سال تک کشمیر میں حکومت کی ہے۔ لیکن چک زمین کے ایک طویل و عریض ٹکڑے کو بھی کہتے ہیں۔ چک آباد کرنے کا رواج آج سے کچھ عرصہ پیشتر تک رہا ہے۔ ان زمینوں پر جو چلوک کے آباد کرنے کے لیے زمینداروں یا اور لوگوں کو دی جاتی تھیں، جو افسر تعینات ہوتے تھے ان کو چکبست کہتے تھے۔ ایسے افسروں کے پاس عطائے چلوک کی باقاعدہ کتاب ہوا کرتی تھی۔ مسلمانوں میں تو کوئی چکبست نہیں سنا گیا۔ البتہ پنڈتوں میں اور وہ بھی کشمیر کے مہاجر لکھنوی پنڈتوں میں ایک چکبست خاندان موجود ہے۔ جس کے ایک قابل و ممتاز فرد پنڈت برج نرائن چکبست

(آنجہانی) نے اپنی پاکیزہ شاعری سے کشمیر کا نام روشن کیا ہے۔ یہ شعر بھی چکبست آنجہانی ہی کا ہے ؎

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہمان نواز راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

__سپرو:__ بادشاہ بڈشاہ کشمیر کے عہد سے پیشتر کشمیر کے ہندو مسلمانوں کو اور ان کی زبان کو اجنبی زبان اور اجنبی حکومت سمجھتے رہے۔ لیکن جب بڈشاہ نے ان کو خاص مراعات عطا کیں اور نظم و نسق سلطنت میں شامل کرنے کے لیے فارسی پڑھنے پر جو اس وقت کشمیر کی سرکاری زبان تھی، ان کو مجبور کیا۔ تو برہمنوں کے جس گروہ نے سب سے پہلے فارسی علم میں مہارت تامہ حاصل کی وہ سپرو کہلایا۔ کشمیر میں اب بھی پڑھنے کو پرنا کہتے ہیں۔ سپر کا مطلب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے سب کچھ پڑھ لیا ہے۔ سپرو کے معنی یہ بھی بتائے جاتے ہیں کہ وہ لڑکا جو چھوٹی عمر میں بڑوں کی سی ذہانت دکھائے۔ کشمیر میں ہر NICK NAME واؤ پر ختم ہوتا ہے۔ جیسے ٹکو، ہندو، مٹو، ہرو۔ اسی طرح سپر سے سپرو مشہور ہو گیا۔

__فوطہ دار:__ فوطہ فارسی، عربی زبان کا لفظ ہے۔ لغات فیروزی میں اس کے حسب ذیل تین معنی بتائے گئے ہیں:

(۱) کمربند (۲) لنگی (۳) محاصل

اس خاندان کا تعلق تیسری شق یعنی محاصل سے ہے۔ اس خاندان کے بزرگ مغل بادشاہوں کے زمانے میں خزانہ شاہی کے افسر ہوتے تھے اور خزانہ کو چونکہ محاصل کے ساتھ تعلق ہے اور محاصل کو فوطہ بھی کہتے ہیں۔ اسی لیے زمانہ سابق میں افسر خزانہ فوطہ دار کہلاتے تھے۔ دراصل فوطہ دار طبقہ کا تعلق مٹو خاندان سے ہے۔

__کاٹجو:__ کاٹلیشور واقع ٹنکی کدل سرینگر ایک بڑا تیرتھ تھا۔ جہاں اب ایک نیا مندر پرانے مندر کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ چونکہ یہ خاندان اسی محلہ میں بستا تھا اور اب تک بھی اس کے اکثر افراد یہیں بود و باش رکھتے ہیں، اس لیے کاٹجو کے نام سے موسوم ہو گیا۔ کاٹجو خاندان کا گوتر سوامن دار تنگنے ہے۔

__ٹلا یا ٹلہ:__ پنڈتوں کی ایک مشہور ذات ہے۔ بعض کہتے ہیں ٹیار سے یہ لفظ نکلا ہے۔ بعض کہتے ہیں جو لوگ ٹلپوری محلے رہنے والے ہیں وہ ٹلا کہلاتے ہیں۔ یہ محلہ گنپت یار کے پاس سرینگر میں واقع ہے۔ ہندوستان کے صوبہ متحدہ (یو۔ پی) میں اس قوم کے لوگوں نے بڑا نام پایا ہے۔

__زتشی:__ علم جیوتش کے جاننے کو کہتے ہیں۔ کشمیر کے جیوتشی زتشی کہلاتے تھے۔ علم سنسکرت میں صاحب کمال ہونے کی وجہ سے مشہور تھے۔

__کچلو:__ کچلو کشمیری زبان میں لمبی داڑھی کو کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں کسی شخص کی بہت زیادہ لمبی داڑھی ہو گی۔ اسی وجہ سے اس کا نام کچلو پڑ گیا۔ لاہور میں بھی دیوان کشن کور کا خاندان ایسا ہے جس کا داڑھی کے ساتھ تعلق ہے۔ چنانچہ دیوان امر چند

داڑھی والا مہاراجہ رنجیت سنگھ کے معزز درباریوں میں تھا اور لمبی داڑھی ہونے کی وجہ سے اس کا نام داڑھی والا ہی مشہور تھا۔

کشمیر کے کچلو خاندان سے جو شاخ مسلمان ہو گئی (اس کا نام اتشیلا) کنول کیلو سے کمال کچلو ہو گیا۔ لیکن تبدیلی مذہب اسم پر زینی کچلو کے لفظ پر کوئی اثر نہ کر سکا۔ اب کشمیر اور پنجاب اور یوپی وغیرہ کے کشمیری پنڈتوں میں بھی کچلو ہیں اور کشمیری مسلمانوں میں بھی کچلو خاندان موجود ہیں۔ اسی قبیلہ کے نام پر شمالی کشمیر تحصیل ہنڈواڑہ میں ایک گاؤں کچلو آباد ہے۔

<u>کول</u>: کشمیری پنڈتوں کی یہ بہت قدیم گوت ہے۔ سنسکرت کتب میں اس گوت کے متعلق لکھا ہے کہ کول اسے کہتے ہیں جو دنیاوی خواہشات کو نیست و نابود کرنے والا ہو۔ یہ گوت دتاتریہ رشی کی نسل ہے۔ یہ رشی زمانہ سلف میں ایک نہایت متبرک ہستی کی شہرت رکھتا تھا۔

<u>مٹو</u>: کاچرو، فوطہ دار اور مٹو خاندان کا گوتر پت ساممن کورشک ایک ہی ہے۔ کاچرو اور فوطہ دار شاخ کا ذکر علاحدہ کیا جا چکا ہے۔ لفظ مٹو کی وجہ تسمیہ میں مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں جو قرین قیاس ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں کشمیر میں جگہ سنسکرت کے دارالعلوم تھے، علمی درسگاہیں اور مذہبی عمارات مٹھ یا مٹھ کہلائی جاتی تھیں۔ اس طبقہ کا کوئی بزرگ ان ایام میں یا تو کسی بیت العلوم یعنی مٹھ کا بانی ہوا ہو گا یا مذہبی عمارت کا مہتمم رہا ہو گا۔

<u>رازدان فیملی</u>: یہ لفظ دراصل راجانک ہے۔ بگڑتے بگڑتے رازدان ہو گیا۔ تاہم یہ ایک معزز اور بامعنی لفظ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اب تو اکثر اصحاب رازدان کو بھی انگریزی لباس پہنا کر رازڈن بنا رہے ہیں۔

رازدانوں کے کئی قبیلے اور گروہ اپنے صفاتی ناموں کی بدولت اب اپنی علاحدہ ہستی رکھتے ہیں۔ مگر ان سب کی اصل رازدان ہی ہے۔ لیکن یہ سب پنڈت ہی ہیں۔ ان میں مسلمان کوئی نہیں ہے۔

<u>دتاتریہ</u>: پنڈتوں کی ایک قدیم اور مشہور ذات۔

<u>کاک</u>: کشمیری زبان میں بڑے بھائی اور کسی بزرگ کو احتراماً کاک کہتے ہیں۔ چنانچہ بڑے بھائی کے لیے لفظ کاک اور بھا دجہ کلاں کے لیے کاکن استعمال ہوتا ہے۔

عرصہ دراز کا ذکر ہے کہ ایک پنڈت جو اپنی عبادات اور نیک نفسی کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتا تھا، جب سادھو ہو گیا تو ملک کے تمام لوگ اس کو احتراماً کاک جی کہنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کا عرف عام ہی کاک جی مشہور ہو گیا، بلکہ ان کے بیٹے اور پوتے بھی کاک ہی کہلانے لگے۔ ریزہ، کول، رازدان وغیرہ کئی ذاتوں اور گوتوں کے لوگ کاک جی کے عقیدت مندوں میں تھے۔ اب کاک ہی کہلاتے ہیں۔ بہت سی ذاتوں کا مجموعہ ہونے کے باوجود کاک اب ایک علاحدہ گوت شمار ہوتی ہے۔

<u>در فیملی</u>: کشمیر کے ہندوؤں میں ایسی گوتیں اور ذاتیں بہت تھوڑی تعداد میں ہیں۔ جو اکثر نام سے خالی ہوں۔ انھی میں

کشمیری پنڈتوں کی مشہور گوت درز بھی ہے۔ جو کسی آل کے بجائے اپنے اصلی نام سے مشہور ہے۔

اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ ایک بڑا رشی گذرا ہے۔ جس کا نام دربھار دواج تھا۔ کہتے ہیں اس کی دو عورتیں تھیں جن میں ایک برہمن زادی بھی تھی۔ اس کے بطن سے جو اولاد ہوئی وہ برہمن کہلائی۔

دربھار دواج ہی کے نام پر یہ قوم درز کہلاتی ہے۔ اور دربھار دواج کی اولاد ہی دربھار دواج برہمن کے نام مشہور ہے۔

قریشی: صاحب غیاث اللغات نے لفظ "قرش" کو قریش کی طرف منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ نام عرب کے ایک قبیلہ کا ہے، جس کا جد نضر بن کنانہ تھا۔ اسی قبیلہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام حتیٰ کہ فخرِ عالم و عالمیان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کیے۔

قرش یا قریش ایک بحری جانور کا نام ہے۔ جو تمام دریائی جانوروں پر غالب اور زیرِ آب دنیا کا بادشاہ ہے۔ نضر بن کنانہ کے بیٹے بھی چونکہ اپنی تمام قوم پر غالب تھے اور اس قبیلہ کو چونکہ عرب کے تمام قبائل پر فضیلت و برتری حاصل تھی اس لیے یہ قبیلہ بھی اپنی غیر معمولی شجاعت کی وجہ سے اسی بحری جانور کے نام پر قریشی مشہور ہوگیا۔

جیسے سادات اور بعض دوسری اقوام بیرونی ممالک سے آکر کشمیر میں آباد ہوئی ہیں۔ اسی طرح قریشی بھی باہر ہی سے آئے ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر میں سب سے پہلے جو قریشی آیا اس کا نام سید محمد قریشی تھا اور وہ رفقائے حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی سے تھا۔ چنانچہ صاحبِ تاریخ اعظمی لکھتے ہیں:

"از رفقائے حضرت امیر بود۔ بسیار بزرگ و صاحبِ حالات بہ امر حضرت امیر بت خانۂ کج بہارہ را کہ بسیار مزیّن و مکلّف بود و مبلغ خطیر صرف آں شدہ ویران کردند و سر صد و شصت بت کلاں و خورد آں را بشکست و در آں جا مسجد جامع کلاں ... ساختند و متصل مسجد مقبرۂ ایشاں است۔" (تاریخ اعظمی صفحہ ۴۹)

خاندانِ رفیقی: کشمیر کے اس نامور خاندان کا سلسلہ خواجہ سنگین سے ملتا ہے جو عشائی طبقہ کے بانی تھے۔ اس لحاظ سے عشائی اور رفیقی ایک ہی خاندان کی دو شاخیں ہیں۔

خواجہ طاہر رفیق عشائی سہروردی جن کی طرف سارا خاندانِ رفیقیہ منسوب ہے خواجہ سنگین کے پڑپوتے تھے۔

خواجہ رفیق اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ ان کی صرف ایک لڑکی مریم نامی تھی، جس کی شادی اپنے دادا خواجہ طاہر کے بھائی خواجہ عبدالقوی کے پوتے شیخ احمد سے کردی تھی۔ شیخ ابو محمد شریف اسی لڑکی کے بطن سے تھے۔ موجودہ رفیقی خاندان سب انہی کی اولاد سے ہے۔

راتھر یا راٹھور: کشمیر کی تاریخوں میں راتھر، راٹھور، راتور اور دیتھر کے نام سے جو لفظ درج ہے اس کی اصل ایک ہی ہے۔

اور یہ سب الفاظ دراصل راٹھور کے بگڑے ہوئے نام ہیں۔ راٹھور راجپوتوں کا ایک مشہور فرقہ ہے۔ جو پہلے ہندو ہی تھا لیکن اب اس کا کثیر حصہ مسلمان ہے۔

سر لارنس نے شیوخِ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "راتھر بھی کشمیر کے ان شیوخ میں سے ہیں جو کھشتریوں سے مسلمان ہو گئے تھے۔"

ٹھکری، ٹھکری اور کھشتری دراصل ایک ہی قوم کا نام ہے اور ہندوؤں کی ممتاز اور جنگجو قوم راجپوت ہندوؤں کے اسی ورن سے نکلی ہے۔

کشمیر میں راٹھور قوم کے لوگ کب سے آباد ہیں، اس کے متعلق کوئی صحیح واقفیت بہم نہیں پہنچ سکی۔ وہ یقیناً ہندو راجگانِ قدیم کے زمانہ میں کشمیر میں موجود تھے۔

<u>پرے</u>: ۱۸۹۱ء کی رپورٹ مردم شماری کے صفحہ ۱۳۱ پر لون کو راجپوتوں کی شاخ ظاہر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ: "پرے ذات بھی راجپوتوں کی ایک شاخ ہے"۔ صفحہ ۱۳۰ پر لکھا ہے کہ: "پرے ذات بھی دیگر ذاتوں لون وغیرہ کی طرح زراعت پیشہ اور اعلیٰ قابلیت رکھنے والی ہے"۔ اسی رپورٹ کے صفحہ ۱۴۸ پر لکھا ہے کہ: "پرے اور لون کشمیر کی مسلمان قوموں میں جو پہلے راجپوت تھے"۔

پرے نام کی وجہ تسمیہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ پرے ہستہ پورہ یا پرسپورہ میں عموماً قدیم راجپوتوں ہی کی آبادی تھی۔ جب وہ مختلف وجوہات سے اپنے گاؤں سے نکل کر ادھر ادھر منتشر ہوئے تو اپنے گاؤں کے نام پر پرے ہی کہلائے۔

<u>رینہ</u>: ۷۲۵ھ میں حضرت بلبل شاہؒ کشمیر آئے تو رنچن، کوترانی، راون چند اور ان کے اعزہ و اقربا نے اسلام قبول کیا۔ رینہ کا لفظ اسی خاندان کے راون چندر کے نام کے ساتھ تاریخ میں سب سے پہلے آتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کبیر کشمیر میں جہانگیر رینہ کے ذکر میں لکھا ہے:

"ملک جہانگیر رینہ بن ہمت رینہ نبیرۂ راون رینہ از احفاد راجہ ہائے چندر بنسی بود" (صفحہ ۴۵)

جہانگیر رینہ سلطان حسن والئ کشمیر کی طرف سے ملک کا خطاب ملنے کی وجہ سے ملک جہانگیر رینہ کہلاتا تھا صاحب سیاست واقتدار رئیس گذرا ہے۔

رینہ قوم کی تعداد کشمیر ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۳۲۶۴ تھی، بیس سال کے بعد یعنی ۱۹۳۱ء میں اس قوم کی تعداد ۳۰۸۲۰ افراد ہو گئی ہے۔

<u>بھٹی</u>: اس امر کو تمام مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ کشمیر میں عرصۂ دراز تک راجپوتوں کے مختلف خاندانوں نے حکومت کی ہے۔ اور اس امر سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان خاندانوں کی ذریات بھی کسی نہ کسی طرف یا ال کی صورت میں کشمیر میں اب تک موجود ہیں۔

اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ بھٹی راجپوت بھی کشمیر میں موجود نہ ہوں۔ گو یہ صحیح ہے کہ صدیوں تک وطنیت کشمیر نے خدوخال اور طرز تمدن اور لباس و زبان کی تبدیلی سے ان کی شناخت محال کردی ہے۔

سر والٹر لارنس اور دیگر مورخین نے کشمیر میں قدیم کھشتریوں کے خاندانوں کی موجودگی تسلیم کی ہے۔ پنڈت کلہن کی راج ترنگنی نے بھی جو آٹھ سو سال پیشتر کی تصنیف ہے، کشمیر میں کشتری خاندانوں کی حکومت کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن مختلف عرفوں اور مختلف القاب نے اصل گوتوں پر اس قدر پردہ ڈال رکھا ہے کہ کسی قدیم کشتری خاندان کی اصل ذات معلوم کرنا عقدۂ لاینحل ثابت ہو رہا ہے۔ ڈانگر، ڈار، تانترے، ماگرے وغیرہ کئی اقوام جن کو سب نے کشتری تسلیم کیا ہے، اپنی اصل گوت بتانے سے عاری ہیں۔ ڈانگر کی ابتدا ڈامر سے ہوتی ہے۔ ڈامر کو کسی نے خطاب بتایا ہے، کسی نے سرکش اور خود سر ہونے کی وجہ سے اس گروہ کا یہ نام رکھا ہے۔ ڈامر ہی سے ڈانگر بن گیا ہے۔ ڈانگر سے اب ڈار عرفِ عام ہے اور چونکہ تاریخ کشمیر لفظ ڈامر کا استعمال دو ہزار سال سے بھی پیشتر کا بتا رہی ہے اس لیے گوت کی اصلیت کا پتہ چلانا فی الواقع بہت دشوار ہے۔

صرف ایک گروہ ایسا ہے جو اب تک اپنی اصلی گوت سے کشمیر میں نہیں بلکہ پنجاب میں مشہور ہے۔ اس کا نام بھٹی ہے۔ بھٹی چندر بنسی خاندان سے ہیں۔

حکومت جموں و کشمیر نے ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں مسلمان اقوام کے صرف چند ہی نام بتائے ہیں۔ اگر تمام اقوام کی نام بنام مردم شماری بتائی جاتی تو شاید کشمیر میں بھی بھٹی قوم کا وجود نظر آجاتا۔ چند اقوام کے نام بتا کر آخر میں "مسلمانوں کی دیگر اقوام" لکھ کر ان کی مردم شماری ۳۲۳۹۲۱م بتا دی گئی ہے۔ البتہ ڈریو صاحب نے اپنی کتاب جموں و کشمیر میں کشمیر کے بھٹی راجپوتوں کا وجود تسلیم کیا ہے۔

کشمیر میں جس طرح اور اقوام آٹھویں صدی ہجری میں مسلمان ہو گئی تھیں، اسی طرح یہ قوم بھی جس کی سیاسی و زرعی حیثیت دیگر زمیندار اقوام سے کم نہ تھی، انہی ایام میں مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی۔

__لون__: آج سے تقریباً ایک سو پچاس سال پیشتر سب سے پہلے اسی قوم کا نام راج ترنگنی میں بعہد راجہ ہرش (۱۱۰۱ء) لوینا نام سے آتا ہے۔ چنانچہ راج ترنگنی حصہ اول کے صفحہ ۳۲، پر فٹ نوٹ میں سٹین صاحب لکھتے ہیں:

"لوینا قوم کے لوگ جن کا ذکر اس جگہ پہلی مرتبہ آیا ہے، ان ملکی تقاریب میں بہت سا حصہ لیتے رہتے ہیں، جن کا ذکر راج ترنگنی میں آیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ کشمیر کی دیہاتی آبادی کا نہایت اہم حصہ تھے۔ چنانچہ تنتریوں (موجودہ نام تانترے) کے نام کی طرح ان کا نام بھی آج تک لون یا لون کی صورت میں برابر قائم ہے۔"

ان طبقہ کس زمانہ میں مشرف بہ اسلام ہوا؟ اس کے متعلق قیاساً یہی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے کشمیر آنے سے پیشتر اور بہت زیادہ ان کے قیام کشمیر کے دوران دیگر اقوام کے ساتھ مسلمان ہو گئے ہوں گے۔ رپورٹ مردم شماری جموں و کشمیر بابت

۱۸۹۱ء میں لون قوم کو راجپوت تسلیم کیا گیا ہے۔

ڈار: سر والٹر لارنس "دی ویلی آف کشمیر" میں لکھتے ہیں: "وہ شیوخ جو کھتریوں سے مسلمان ہوئے ہیں، اپنے رگوں میں جنگجو خون رکھتے ہیں اور ان کی اعلیٰ ذاتیں حسب ذیل ہیں: ڈار، تانترے، ماگرے، ڈانگر، ریچہ، راتھر، ٹھاکر، نائیک"۔

تاریخ حسن کے مصنف نے بھی ڈار قوم کو راجپوتوں کی ایک اعلیٰ شاخ تسلیم کیا ہے۔ تاریخ گلشن کشمیر میں ڈار قوم کے متعلق لکھا ہے: "ڈار طبقہ کھتریوں کی ایک بڑی شاخ ہے اور اس قوم نے قدیم ہندو راجگان اور سلاطین کشمیر کے زمانے میں جس جنگی قابلیت کا ثبوت دیا ہے، وہ بھی ان کو کھتری ہی ثابت کرتی ہے"۔

ڈار قوم سارے کشمیر میں پھیلی ہوئی ہے اور کشمیر سے باہر بھی اس قدیم بڑا قوم کے افراد پائے جاتے ہیں۔

وار: کشمیر میں بہت سی ذاتیں اور گوتیں ایسی ہیں کہ ان کے ناموں ہی سے ان کی کیفیت اور وجہ تسمیہ معلوم ہو جاتی ہے۔ بعض ایسی ہیں کہ تاریخ کے عمیق مطالعے سے بھی کچھ معلوم نہیں ہو پاتا کہ ان کی کیفیت یا وجہ تسمیہ کیا ہو سکتی ہے۔ ایسی ہی ایک ذات وار ہے۔

ویسے اس نام کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وار اور ڈار دراصل ایک ہی نام ہے۔ کسی زمانہ میں کسی بزرگ کے نام کے ساتھ ڈار کی جگہ غلطی سے وار لکھا گیا۔ پھر نقل در نقل ہوتے ہوئے ڈار کا وار ہی رہ گیا۔ وار قوم کی آبادی بھی زیادہ نہیں ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی علاحدہ قبیلہ نہیں ہے، بلکہ کسی قبیلہ کی شاخ ہے جو کسی نامعلوم وجہ سے اپنے مرکز سے علاحدہ ہو گئی ہے۔

کشمیر کے دیہات و قصبات میں اس قوم کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ سرینگر خاص میں عالی کدل اور راجوری کدل میں ان کے چند گھر پائے جاتے ہیں۔

پال: مصنف تاریخ راجور نے پال قوم کے بارے میں لکھا ہے:

"پال راجپوتوں کی ایک قوم ہے۔ جہانگیر کے زمانہ میں یہ قوم مسلمان ہو گئی تھی"۔

اس وقت کشمیر میں یا پنجاب میں جو پال خاندان موجود ہیں ان کا بھی بیان ہے کہ وہ راجپوت ہیں اور ان کے بزرگ شمالی ہند میں راج کیا کرتے تھے۔

کشمیر میں پال طبقہ کے گھر کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ مولانا خواجہ شمس الدین چک بادشاہوں کے زمانہ میں کشمیر کے ایک نامور عالم گزرے ہیں۔ یہ بھی پال طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مصنف تاریخ اعظمی نے ان کے متعلق لکھا ہے:

"اعلم علمائے وقت و مرجع فضلائے شہر بود۔ در زمان مرزا حیدر بسبب حق گوئی از میان علما امتیاز داشت و محنت ہائے با علمائے میرزا کرد و غالب شد"۔

کشمیر کے چند ایک پال خاندان پنجاب میں بھی ہیں۔ (حوالہ تاریخ اقوام کشمیر مؤلف محمد الدین فوق ص ۵۰۰)

••

بیانِ ملکیت سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل اور دیگر تفصیلات
مطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقام اشاعت : خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۴

۲۔ وقفہ اشاعت : سہ ماہی

۳،۴ پرنٹر و پبلشر کا نام : مصطفیٰ کمال ہاشمی

قومیت : ہندستانی

پتا : اسسٹنٹ لائبریرین، خدا بخش لائبریری، پٹنہ

۵۔ ایڈیٹر کا نام : عابد رضا بیدار

قومیت : ہندستانی

پتا : ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۔ ۴

۶۔ ملکیت : خدا بخش لائبریری، پٹنہ ۔ ۴

میں مصطفیٰ کمال ہاشمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے ساتھ درست ہیں

دستخط پبلشر : مصطفیٰ کمال ہاشمی

یکم فروری ۱۹۹۲ء
یکم جولائی ۱۹۹۲ء

- ○ پاکستان کی بابری مسجد — ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی
- ○ مسجد شہید گنج — جناب محمد عبداللہ قریشی
- ○ حال شہید گنج — جناب نور احمد چشتی

شاہجہاں کے عہد کی بنوائی ہوئی مسجد شہید گنج جو ۱۷۶۲ء تک مسجد کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن تیرہ
چودہ سال بعد پاکستان بنا تو ——— اور اس کے بعد آج تک کسی پاکستانی حکومت نے اُسے مسجد نہیں بنایا ———
اس لیے کہ عدالت کے فیصلے کے بموجب وہ مسجد ۱۷۶۲ء میں گوردوارہ قرار دیدی گئی تھی۔ صرف اس بنا پر کہ سکھوں
کے عہد میں ایک طویل مدت تک وہ مسجد نہیں رہی تھی۔ پھر پاکستان بننے کے بعد آج ۱۸ سال ہونے کو آئے، پاکستان
کی قرآنی اسلامی حکومت نے عدالت کے فیصلے کا احترام اور اس سے بھی زیادہ اپنے بین الانسانیت کے ایک
عالمی نشان کے طور پر بھی اُسے نظر بھر کے دیکھا بھی نہیں۔ اس کو مسجد بنانے کا تو سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے!
بڑا بھائی چھوٹے بھائی کی جاگیر کی حفاظت ہی نہیں کرتا، اُسے جاگیر پر بھی تحفظ دیتا ہے۔ بڑا احسان کرنا پڑتا
ہے چھوٹے بھائی کو!

• مطرب

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی مرحوم

پاکستان کی بابری مسجد

مسجد شہید گنج کا قضیہ

لاہور کے ریلوے اسٹیشن سے دہلی دروازے کی طرف جائیں، تو ٹیکنیکل اسکول کے عقب میں جہاں لنڈا بازار شروع ہوتا ہے، ایک بہت پرانی مسجد کھڑی تھی، جسے عام طور پر مسجد شہید گنج کہا جاتا تھا۔ یہ مسجد شاہجہاں کے عہد میں ایک شخص عبداللہ خاں نے تعمیر کی تھی۔ جو دارا شکوہ کا خانساماں تھا اور اپنے آقائے نامدار کی مہربانی سے کچھ عرصے کے لیے لاہور کا کوتوال بھی بن گیا تھا۔

جب تک لاہور پر سکھوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا مسلمان اس مسجد میں باقاعدہ نماز پڑھتے تھے۔

پنجاب کے مغل صوبیدار نواب معین الملک نے جب پنجاب سے سکھوں کی شورش مٹانے کے لیے جنگ وجدال کا سلسلہ شروع کیا، تو مسجد سے متصل کوتوالی تھی، جہاں مجرموں کو سزا دی جاتی تھی۔ تعزیر وتادیب کے اسی دور میں بھائی تارو سنگھ کو بھی اس مقام پر مارا گیا۔ بھائی تارو سنگھ سکھوں کی نگاہ میں ایک بڑی مقدس اور برگزیدہ ہستی تھی چنانچہ سکھوں نے اس جگہ کو شہید گنج کا نام دے دیا۔ اور وہاں ایک سمادھی بھی تعمیر کردی۔ رنجیت سنگھ کے ورود سے پہلے جب ر ملکان لاہور کی حکومت قائم ہوئی (گوجر سنگھ لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ بھنگی مسل کے تین سکھ تھے انھوں نے لاہور کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اپنے اپنے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا ۱۷۶۵ تا ۱۷۹۹ء)۔ تو سکھوں نے بھائی تارو سنگھ کی سمادھی کے قریب سے فائدہ اٹھا کر اس مسجد پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ اس وقت سے یہ مسجد سکھوں کے قبضے میں چلی آرہی تھی۔

مولوی نور احمد چشتی نے اپنی کتاب تحقیقاتِ چشتی ۱۸۶۴ء میں مکمل کی تھی۔ ان کے بیان کے مطابق ۱۸۶۴ء میں اس مسجد پر گنڈا سنگھ اور گرودت سنگھ دو بھائی قابض تھے جو مسجد کی دکانوں کا کرایہ بھی وصول کرتے تھے اور مسجد کے صحن اور دالان کو لنگر خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مسجد کے صحن میں لوہے کی ایک بہت بڑی کڑاہی ہر وقت بھنگ سے لبالب بھری رہتی تھی۔ جہاں سکھ مسافر بیٹھ کر بھنگ پیتے تھے۔

جون ۱۹۳۵ء میں یکایک پنجاب کے مختلف حصوں سے سکھوں کے جتھے لاہور آنا شروع ہوئے۔ اور ساتھ ہی شہر میں افواہ اڑنے لگی کہ سکھ مسجد شہید گنج کو مسمار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ افواہیں پایۂ یقین کو پہنچ گئیں تو مسلمان لیڈروں کے ایک وفد نے گورنر کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس مسجد کو محکمۂ آثارِ قدیمہ کی تحویل میں دے دیا جائے اور جب تک

کہ اس تجویز پر باضابطہ عمل نہ ہو حکومت کو چاہیئے کہ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کردے تاکہ مسجد کا فوری انہدام رک جائے۔ سر ہربرٹ ایمرسن پنجاب کے گورنر تھے۔ انھوں نے بات کو ٹال دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے وفد نے سکھ لیڈروں سے گفتگو کی۔ تو سکھوں نے کم از کم اس بارے میں مسلمانوں کو مطمئن کردیا کہ جب تک شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی مسلمانوں کی اس تجویز پر اچھی طرح غور نہیں کرے گی اس وقت تک مسجد مسمار نہیں کی جائے گی۔

ابھی یہ گفت و شنید جاری تھی۔ کہ ۴ اور ۵ جولائی کی درمیانی شب میں سکھوں نے یکایک مسجد کو گرانا شروع کردیا اور عجیب بات یہ ہوئی کہ انہدام سے قبل حکومت نے مسجد کے چاروں طرف مسلح فوج اور پولیس متعین کردی تھی تاکہ مسلمان سکھوں کے اس فعل میں مداخلت نہ کرسکیں۔ گویا مسجد کا انہدام فوج اور پولیس کی نگرانی میں ہوا۔ جب مسلمانوں نے یہ نقشہ دیکھا تو بغیر کسی ضبط و نظم اور ترتیب کے مسجد کی طرف جانے لگے فوج نے بار بار گولی چلائی اور بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔

اس کے ساتھ ہی حکومت نے مولانا ظفر علی خاں، ملک لال دین قیصر، میاں فیروز الدین احمد، ملک لال خاں، سید سرور شاہ گیلانی، سید حبیب، سید محمد شاہ وغیرہ کو گرفتار کرکے صوبے کے مختلف مقامات پر نظر بند کردیا۔ اس کے بعد یہ تحریک ذمہ دار لیڈروں کے ہاتھ سے نکل کر بعض من چلے نوجوانوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ حکومت نے مسلمان اخبارات پر سنسر شپ بھی عائد کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واقعات کی صحیح اطلاع ہندستان کے دوسرے علاقوں میں نہیں پہنچ سکتی تھی۔

جن چند نوجوانوں کے ہاتھ میں یہ تحریک چلی گئی تھی انھوں نے شاہی مسجد کو اپنا صدر مقام قرار دے کر سول نافرمانی شروع کردی۔ دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں مسلمان رضا کار شاہی مسجد سے نکل کر شہید گنج کی طرف بڑھتے تھے تو پولیس انھیں گرفتار کرلیتی تھی۔ ۱۹۳۶ء کے اوائل تک یہی صورت حال قائم رہی۔ اور سیکڑوں نہیں ہزاروں رضا کار جیلوں میں چلے گئے۔ اس وقت پنجاب کی حکومت پر تین بڑے مسلمان قابض تھے۔ ایک ملک فیروز خاں نون جو وزیر تعلیم تھے۔ دوسرے نواب مظفر خاں جو سر سکندر کی جگہ ممبر بنادیئے گئے تھے۔ اور تیسرے چودھری شہاب الدین جو مجلس قانون ساز کے صدر تھے۔ اگر ان تینوں میں سے کسی کے اندر بھی قومی حمیت و غیرت کی رمق ہوتی، تو اس حادثۂ خونچکاں سے متاثر ہوکر فوراً اپنے سرکاری منصب پر لات مار دیتا۔ لیکن یہ لوگ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔

۲۱ فروری ۱۹۳۶ء کو مسٹر جناح اس قضیے کا حل تلاش کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے۔ ان کی تشریف آوری کے پس منظر میں یہ بات واضح کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے سے اپنے اس خیال کا اظہار کردیا تھا کہ جب تک لاہور کے مسلمان یہ جھگڑا چکانے کے لیے انھیں خود مدعو نہیں کریں گے اور اس بات کا وعدہ نہیں کریں گے کہ وہ مسٹر جناح کے فیصلے کے پابند رہیں گے، وہ لاہور نہیں جائیں گے۔ مشہور مسلم لیڈر مسٹر خالد لطیف گابا اس زمانے میں مرکزی اسمبلی کے رکن تھے۔

انھی کے توسل سے لاہور کے مسلمان لیڈروں نے مسٹر جناح کو لاہور آنے کی دعوت ارسال کی تھی۔

لاہور پہنچنے کے بعد مسٹر جناح نے تحریک کے لیڈروں اور صوبے کے گورنر سے ملاقات کی۔ گورنر نے کہا کہ اگر سول نافرمانی بند کردی جائے، اور مسلمان مسجد کی بازیابی کے لئے آئینی طریق سے جدوجہد کریں تو وہ تمام قیدی رہا کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ تحریک کے کارکن سول نافرمانی بند کرنے پر رضامند ہو گئے، اور رات بھر میں جیلوں سے تمام قیدی اور دور دراز مقامات سے نظر بند لیڈر رہا ہو کر لاہور پہنچنا شروع ہو گئے۔

ساتھ ہی ساتھ مسٹر جناح نے سکھ لیڈروں سے بھی ملاقاتیں شروع کیں اور انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ جذبہ مصالحت اور ہم وطنی کا خیال کر کے مسلمانوں کے ساتھ کوئی معقول سمجھوتہ کر لیں۔ مسٹر جناح نے انھیں سمجھایا کہ ملکی مفاد کے پیش نظر فرقہ وارانہ کشیدگی نہ سکھوں کے لیے مفید ہے نہ مسلمانوں کے لیے۔ چنانچہ سکھ لیڈروں نے جو کسی کی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے، مسٹر جناح کی بڑی آؤ بھگت کی اور انھیں اپنے ہمراہ شہید گنج دکھانے کے لیے لے گئے حالانکہ وہ کسی مسلمان کا شہید گنج کے پاس سے گزرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

مسٹر جناح نے کم و بیش دو ہفتے لاہور میں قیام کیا۔ ۵ مارچ ۱۹۳۶ء کو دیال سنگھ کالج کی یونین نے انھیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ کالج کا ہال کھچا کھچ سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ یونین کے صدر پروفیسر لاجپت رائے نے مسٹر جناح کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھیں ہندوستان کے مشہور لیڈر گوکھلے سے تشبیہ دی اور کہا کہ ہندوستان کی نجات کے لیے مسٹر جناح جیسا راست باز اور دلیر ڈکٹیٹر درکار ہے۔ جواب میں مسٹر جناح نے جو تقریر کی اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"میں اس کالج کی فضا کو اپنے لیے بالکل سازگار پاتا ہوں۔ یہ درس گاہ جیسا کہ فاضل مقرر نے ابھی کہا ہے، فرقہ پرستی کی بنیادوں پر قائم نہیں کی گئی۔ میرا ابتدا سے یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی نجات فرقہ پرستی کے ذریعہ سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ میں ماضی میں بھی اس عقیدے کا حامل رہا ہوں۔ اب بھی میرا یہ عقیدہ ہے۔ اور آئندہ بھی اسی عقیدے کا پیرو رہوں گا۔ آپ نے مسولینی اور ہٹلر ایسے ڈکٹیٹروں کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اس ملک کا ڈکٹیٹر بننے کی دعوت دی ہے۔ بحالاتِ موجودہ ہم ہندوستان میں ڈکٹیٹر شپ قائم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ملک کا حقیقی ڈکٹیٹر وہی شخص بن سکتا ہے جس کے پاس ایسی قوت ہو کہ ہر خطا کار کو سزا دینے پر قادر ہو، اور وطن کی خدمت کرنے والوں کو انعام و اکرام سے سرفراز کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوت ہم میں سے کسی شخص کے پاس بھی نہیں۔

"اس ملک میں کسی بے اصول، خائن اور بددیانت لیڈر کے لیے عوام کو اُلّو بنا لینا، اور ان سے حسب منشا کام لینا چنداں مشکل نہیں، بشرطیکہ وہ ان کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے فن سے واقف ہو۔ اس لیے جب تک ہم

عوام کے معتدبہ حصے کی ذہنی اخلاقی اور سیاسی تربیت نہ کریں، اور جب تک عوام کا تربیت یافتہ عنصر صحیح لیڈر کی پہچان سے بہرہ ور نہ ہو، اور خود غرض رہنماؤں کو قیادت کی گدی سے علیحدہ کرنے کا شعور نہ رکھتا ہو، اس وقت تک ہم صحیح معنوں میں نمائندہ حکومت قائم نہیں کر سکیں گے۔ آپ نے گوکھلے کا ذکر بھی کیا ہے کاش اس ملک میں اس عظیم الشان لیڈر کے پائے کے دو چار انسان اور ہوتے ... ہندوستان میں ہر چیز کی افراط ہے۔ خدا نے ہمیں سب کچھ دے رکھا ہے۔ لیکن انسان نے اس خطہ ارضی کی نیک نیتی سے خدمت نہیں کی۔ اب بھی اگر انسان ہندوستان کی بے لوث خدمت کرنے پر آمادہ ہو جائے تو ہمارا مستقبل درخشاں ہو سکتا ہے۔" (سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۲ مارچ ۱۹۳۶ء)

۴ مارچ کو باشندگانِ لاہور نے مسٹر جناح کو خوش آمدید کہنے اور ان کی مصالحانہ کوششوں پر اظہار مسرت کرنے کے لیے ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ کیا۔ جس کے صدر لاہور کے بشپ تھے۔ اس اجتماع کو دیکھ کر جس میں ہندو، سکھ اور مسیحی بڑھ چڑھ کر مسٹر جناح کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے اس بات کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں تھا کہ مسٹر جناح کس غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ ایسی حالت میں کہ شہید گنج کے حادثۂ فاجعہ کی وجہ سے فرقہ وارانہ کشیدگی زوروں پر تھی اور دلوں پر کدورت کی تہ جمی ہوئی تھی، سکھوں کا مسٹر جناح کی مدح و ستائش میں رطب اللسان ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مقررین میں سردار سمپورن سنگھ، سردار اجل سنگھ، پنڈت نانک چند اور مسٹر کے ایل رلیارام شامل تھے۔

پنڈت نانک چند نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا تھا کہ "افسوس ہے کہ مسٹر جناح کانگریس سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ اگر وہ کانگریس میں رہتے تو ملک کی حالت یقیناً آج سے کہیں بہتر ہوتی۔" جواب میں مسٹر جناح نے تقریر کی۔ تو پنڈت نانک چند کے ان الفاظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"... جب میں پہلی مرتبہ کانگریس میں شامل ہوا تھا اس وقت سے لے کر اب تک میرے خیالات میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی۔ ممکن ہے گاہے گاہے مجھ سے غلطیاں سرزد ہوئی ہوں، لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا اس میں فرقہ پرستی کی روح کار فرما نہ تھی۔ میرے پیش نظر صرف مادرِ وطن کی بہتری اور فلاح و بہبود تھی یقین جانئے کہ آئندہ بھی ہندوستان ہی کی خدمت میرا مدعا و مقصود رہے گا۔ اور دنیا کی کوئی طاقت مجھ کو اس معین اور واضح راستے سے ایک انچ ادھر اُدھر نہیں ہٹا سکتی۔" (دیال سنگھ کالج اور ٹاؤن ہال کی تقریروں کے اقتباس یہاں درج کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں مسٹر جناح کے سیاسی خیالات و عزائم کیا تھے۔ اور وہ اپنے ملک کی خدمت کس خطوط پر کرنا چاہتے تھے صرف ڈیڑھ سال کے بعد یعنی ۱۹۳۷ء کے

وسط میں کانگریس کی غلط اور تباہ کن پالیسی نے اس کوہ پیکر شخصیت کو اس قدر مایوس کر دیا کہ اسے مجبوراً اپنی قوم کے حفظ و بقا کے لیے نئی راہ تلاش کرنا پڑی)۔ (سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۶ء)

مسٹر جناح ۳ مارچ کو واپس دہلی تشریف لے گئے۔ واپسی سے پہلے انھوں نے شہید گنج مصالحتی بورڈ کے نام سے ایک کمیٹی بنا دی تھی جس کے ارکان مندرجہ ذیل اصحاب تھے۔

علامہ اقبال، مولوی عبدالقادر قصوری، میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا، راجہ نریندر ناتھ، پنڈت نانک چند بیرسٹر ایٹ لا، سردار بوٹا سنگھ ایڈووکیٹ، سردار اجل سنگھ، سردار سمپورن سنگھ، میاں احمد یار خاں دولتانہ (کنوینر)۔

رخصت ہوتے وقت مسٹر جناح نے اخبارات کو ایک طویل بیان دیا۔ اور فرقہ وارانہ مصالحت پر زور دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ:

"۔۔۔ یہ جھگڑا دو افراد میں نہیں بلکہ دو بڑے فرقوں کے درمیان ہے اس لیے دونوں فرقوں کی آرا کی جانچ تول کرنے کے لیے وقت درکار ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس دوران میں ہمیں اپنی مصالحانہ کوششوں کو بدستور جاری رکھنا چاہیے تاکہ باہمی تصفیہ جلد از جلد ہو سکے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس غرض کے لیے مختلف قوموں کے ذمہ دار افراد پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا جائے جس کا نام شہید گنج مصالحتی بورڈ ہو۔ اور اس بورڈ کے ذمے یہ کام ہو کہ افہام و تفہیم سے تصفیہ کا کوئی قابل قبول حل تلاش کرے۔ میری خدمات اس بورڈ کے لیے ہر وقت حاضر ہیں۔ اگر آئندہ میرا یہاں آنا ضروری ہوا تو میں سو کام چھوڑ کر لاہور پہنچ جاؤں گا۔"

مسٹر جناح کی کوشش سے پنجاب میں صلح و آشتی کی جو فضا پیدا ہو گئی تھی اس پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے لاہور کے اینگلو انڈین اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کے انگریز ایڈیٹر کو بھی یہ لکھنا پڑا کہ پنجاب کے مقامی مسلمان لیڈروں کی ناکامی اور مسٹر جناح کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ مسٹر جناح کا بڑے سے بڑا مخالف بھی انھیں "سرکار پرستی" کا طعنہ نہیں دے سکتا۔ انھیں ہمیشہ "بائیں بازو" (لفٹسٹ) کا لیڈر سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کے "بائیں بازو" کے سیاسی رجحانات ہی کی وجہ سے بیک وقت سکھوں اور مسلمانوں نے ان کی بات کو سننا اور ماننا منظور کر لیا ہے۔ (سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۶ء)

سول نافرمانی ہی کے زمانے میں شہید گنج لیگل ڈیفنس کمیٹی کے اہتمام سے لاہور کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر سیل کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا گیا تھا۔ بنائے دعوے یہ تھی کہ چونکہ شرع اسلام کی رو سے مسجد ہمیشہ مسجد رہتی ہے اور کوئی شخص اس پر قابض ہو کر مسلمانوں کو وہاں نماز پڑھنے سے منع نہیں کر سکتا لہٰذا مسلمانوں کو مسجد شہید گنج میں نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ ملک برکت علی اور ڈاکٹر محمد عالم اس دعوے کی پیروی کر رہے تھے۔

۵ مئی ۱۹۳۶ء کو مسٹر سیل نے مسلمانوں کا دعویٰ خارج کر دیا اور مسجد شہید گنج پر سکھوں کا قبضہ مخالفانہ تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ عام جائداد غیر منقولہ کی طرح مسجد بھی فریق ثانی کے مخالفانہ قبضے میں جا کر اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔

اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔

۳۰ نومبر ۱۹۳۷ء کو لاہور کی عدالتِ عالیہ کے فل بنچ کے سامنے جس میں چیف جسٹس ینگ، جسٹس بھڈے اور جسٹس دین محمد شامل تھے، شہید گنج کی اپیل پیش ہوئی اور کئی روز تک بحث جاری رہی۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۳۷ء کو چیف جسٹس نے کہا کہ بحث کے دوران میں چند نئے متنقیح طلب امور سامنے آئے ہیں جن پر عدالت عالیہ فریقین کے مزید دلائل سننا چاہتی ہے۔

وہ چند امور یہ تھے:

۱ــــ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس دعوے پر قانونِ میعاد کا اطلاق ہوتا ہے تو کیا اس تاریخ سے جب مسجد شہید گنج مسمار کی گئی تھی، نئی میعاد کا آغاز ہونا چاہیے؟

۲ــــ اگر محولہ بالا شق تسلیم کی جائے، تو کیا مسجد یا مسجد میں نماز پڑھنے والوں کو یہ حق ہے کہ مدعا علیہم کے نام عدالت سے اس نوع کے حکم امتناعی کے اجرا کی درخواست کریں کہ مدعا علیہم مسجد کو دوبارہ تعمیر کریں۔

۳ــــ اگر ایسا حق موجود ہے تو کیا عدالت اس نوع کا حکم امتناعی جاری کرنے کی مجاز ہے؟

۴ــــ کیا عدالت اس نوع کا حکم امتناعی جاری کر سکے گی، اور کیا اس حکم امتناعی پر عملدرآمد ہو سکتا ہے؟

ملک برکت علی نے آئندہ پیشی کے لیے کچھ مہلت طلب کی تا کہ بیرون پنجاب سے کسی اچھے قانون دان کی مدد حاصل کی جا سکے۔ چیف جسٹس نے ملک صاحب سے کہا: "آپ نے اب تک نہایت فاضلانہ بحث کی ہے۔ تاہم آپ کوئی اور وکیل بلانا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اب سوال یہ تھا کہ باہر سے کس کو بلایا جائے۔ غلام رسول خاں نے ۱۹ دسمبر کو ذیل کا خط مسٹر جناح کو لکھا:

"ڈیر مسٹر جناح! شہید گنج کی اپیل اب ایک نہایت اہم منزل پر پہنچ گئی ہے۔ ہائی کورٹ کے سامنے بحث مکمل ہو چکی ہے۔ لاہور کے مسلمانوں کی خواہش ہے کہ اب کہ امید کی ایک کرن پھوٹتی نظر آئی ہے آپ خود یہاں تشریف لائیں تا کہ اس عمارت کی آخری اینٹ آپ کے مضبوط ہاتھوں سے رکھی جائے۔ ہماری اور مسلمانانِ لاہور کی طرف سے ملک برکت علی آپ سے ملنے کے لیے بمبئی حاضر ہوں گے اور تفصیل سے زبانی سب کچھ عرض کریں گے۔

میں یہاں ایک چھوٹی سی بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ابتدا میں جب ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں مسجد کا دعویٰ دائر کیا گیا تھا تو ملک برکت علی اور ڈاکٹر محمد عالم پیروی کرتے تھے۔ اس دوران میں ڈاکٹر محمد عالم نے تو مجلسِ اتحادِ ملت کے

ٹکٹ اور مسجد شہید گنج کے نام پر اپنی الکشن بھی جیت لی تھی۔ لیکن جب وہ اسمبلی کے ایوان میں داخل ہوئے تو تمام وعدے وعید فراموش کر کے کانگریس پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ان کے اس فعل سے مسلمان سخت برافروختہ ہوئے۔ چنانچہ جب مسجد کی اپیل ہائی کورٹ میں پہنچی تو مدعیوں نے ڈاکٹر عالم سے مختار نامہ واپس لے لیا اور اب تنہا ملک برکت علی پیش ہو رہے تھے۔

کرسمس کی تعطیل شروع ہوئی تو ملک برکت علی بمبئی روانہ ہوئے تاکہ مسٹر جناح سے مل کر زبانی گفتگو کریں۔ ان کے ارشاد کی تعمیل میں راقم التحریر بھی ان کے ہمراہ بمبئی گیا۔ مسٹر جناح سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ وہ اس سے قبل فروری ۱۹۳۶ء میں ایک ثالث بالخیر بن کر لاہور گئے تھے تاکہ سکھوں اور مسلمانوں میں مصالحت کرا سکیں۔ اُن کی اسی حیثیت کی وجہ سے سکھوں اور ہندوؤں نے بھی بڑی گرم جوشی سے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ اب اسی جھگڑے میں ایک فریق کا وکیل بن کر لاہور جانا ان کے لیے مناسب نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے مشورہ دیا کہ بمبئی کے ایک انگریز بیرسٹر مسٹر الیف بے کولٹ مین کی خدمات حاصل کر لی جائیں تو بہتر ہوگا۔

۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو شہید گنج کی اپیل پر عدالتِ عالیہ میں مزید بحث ہوئی اور مسٹر کولٹ مین پیش ہوئے۔ ۲۶ جنوری کو عدالت عالیہ نے اپنا فیصلہ سنایا اور اپیل خارج کر دی۔ چیف جسٹس ینگ اور جسٹس بھڈے نے متفقہ فیصلہ کیا کہ جہاں تک قبضہ مخالفانہ کا تعلق ہے، مسجد کو عام جائداد غیر منقولہ سے الگ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے مسلمانوں کا شہید گنج میں نماز پڑھنے کا حق مدت ہوئی ساقط ہو چکا ہے۔ جسٹس دین محمد نے اس رائے سے اختلاف کیا اور اپنا فیصلہ الگ لکھا۔

انھوں نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ قانونِ میعاد ہند یا پنجاب لاز ایکٹ نے اس ضمن میں شرع محمدی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اور بدیں وجہ جب مسجد کو عام دنیاوی اغراض سے الگ کر کے محض خدائے واحد کی عبادت کے لیے وقف کر دیا جاتا ہے تو قانون رائج الوقت کے تحت بھی اس کی حرمت و تقدیس ابدالآباد تک قائم رہتی ہے۔

۳۰ جنوری کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تاکہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے سے جو تشویشناک صورت پیدا ہو گئی تھی اس پر غور کیا جائے۔

اعلان کیا گیا کہ مسجد شہید گنج کی بازیابی ہندستان کے مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ بن چکا ہے۔ اس لیے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک اجلاسِ خصوصی عنقریب اس مسئلہ کا تصفیہ کرنے اور آئندہ کے طرز عمل پر غور کرنے کے لیے منعقد کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ یکم فروری کو ہندستان بھر میں "یوم شہید گنج" منایا جائے اور مسلمان جگہ جگہ جلسے کر کے مسلم لیگ کی اس قرارداد کی تائید کریں۔

ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے بعد لاہور کے مسلمانوں میں سخت اضطراب پھیل گیا، اور جلوس پر جلوس نکلنے لگے۔ ملک برکت علی نے تحفظ مساجد کا مسودہ قانون مرتب کر کے اسمبلی میں پیش کرنے کا نوٹس دے دیا۔ ملک برکت علی کے بل نے پنجاب بھر

میں جوش و خروش کی ایک لہر طاری کر دی تھی۔ اپنے اور بیگانے دونوں بڑے اضطراب سے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن سر سکندر نے تمام قیاس آرائیوں کا خاتمہ کر دیا۔ انھوں نے گورنر کو مشورہ دیا کہ بل اسمبلی میں پیش کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ چنانچہ گورنر نے اپنے اختیاراتِ خصوصی کو کام میں لا کر اعلان کر دیا کہ بل اسمبلی میں پیش نہیں کیا جا سکے گا۔

۱۶ر مارچ ۱۹۳۸ء کو سر سکندر نے پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں اپنے اس رویے کی حمایت میں ایک زبردست تقریر کی۔ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر گورنر کی آنکھ کا اشارہ دیکھ کر سر سکندر کے ہم نوا بن چکے تھے۔ یہاں تک کہ ان تمام ممبروں نے اسمبلی کی رکنیت سے استعفے لکھ کر سر سکندر کے حوالے کر دیے تھے

سر سکندر نے اپنی تقریر میں ملک برکت علی کے بل پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا کہ اگر آج مسلمان اسمبلی میں خاص قانون بنا کر شہید گنج پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تو کل کو ہندو بھی یہ مطالبہ کریں گے کہ جن مندروں پر مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں قبضہ کر لیا تھا وہ ان سے واپس لیکر ہندوؤں کے حوالے کیے جائیں۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ ہندوستان کے گیارہ میں سے سات صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے۔ اگر پنجاب کے مسلمانوں نے اپنے صوبے کی اقلیت سے اچھا سلوک نہ کیا تو سات صوبوں میں مسلمانوں کی حالت سخت خراب ہو جائیگی۔ تیسرا اعتراض یہ تھا کہ صوبے کی سب سے بڑی عدالت جو فیصلہ کر چکی ہے۔ اس کو مجلس قانون ساز کے زور سے توڑ دینا کسی قاعدے سے جائز نہیں۔

سر سکندر نے اپنی تقریر کے دوران میں کئی دفعہ ملک برکت علی کی طرف دیکھ کر کہا: "اگر اسمبلی کے مسلمان ممبروں کی اکثریت کو میرے اس طرزِ عمل سے اختلاف ہے تو میں اور میرے دونوں مسلمان وزیر ابھی مستعفی ہونے کو تیار ہیں۔ ... میں اس سے بھی ایک قدم آگے جا کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر میرے اور میرے دونوں مسلمان وزیروں کے مستعفی ہونے سے شہید گنج مسلمانوں کو واپس مل سکتی ہے تو ہم ابھی استعفا دینے کو تیار ہیں"۔

ملک برکت علی سب کچھ سن رہے تھے اور بار بار یونینسٹ پارٹی کے ان مسلمان ممبروں کی طرف دیکھتے تھے جنھوں نے ابھی چند روز ہوئے اخباروں میں اعلان کیا تھا کہ وہ تحفظِ مساجد کے بل کی حمایت میں جانیں لڑا دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک برکت علی چاروں طرف سے نرغۂ اعدا میں گھر گئے تھے۔ مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے سر سکندر کو مبارکباد کے تار بھیجے تھے۔ کانگریسی اور مہاسبھائی ہندو، اکالی اور غیر اکالی سکھ نیشنلسٹ اور یونینسٹ مسلمان سبھی سر سکندر کی حمایت میں آوازیں بلند کر رہے تھے۔

(ماخذ "اقبال کے آخری دو سال" از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی
کراچی ۱۹۶۹ء)

جناب محمد عبداللہ قریشی

مسجد شہید گنج

لنڈا بازار میں جس جگہ کو اب شہید گنج کہتے ہیں وہاں مزار شاہ کاکو چشتی متوفی ۸۸۲ھ / ۱۴۷۷ء، مقبرہ میر معین الملک عرف میر منو[1] وفات ۱۱۶۶ھ / ۱۷۵۳ء اور ایک پختہ مسجد ہوتی تھی جس کے ساتھ حمام بھی تھے۔ مسجد کے تین گنبد اور تین محرابیں تھیں۔ یہ مسجد دارا شکوہ کے خان ساماں عبداللہ خاں[2] نے ۱۰۶۳ھ / ۱۶۵۳ء میں بنوائی تھی۔ بعد میں وہ لاہور کا کوتوال ہو گیا تھا اور اسی مسجد کے قریب نخاس میں جلوس کیا کرتا تھا۔ سکھوں نے اپنے اقتدار کے زمانے میں اس مسجد اور مقبرہ کو گوردوارہ میں تبدیل کر کے شہید گنج نام دے دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس جگہ مغلوں کے آخری گورنر نواب میر معین الملک عرف میر منو نے فرخ سیر بادشاہ کے زمانے میں سکھوں کو قتل کیا تھا اور وہ ان کی یاد باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے میر منو کا مقبرہ جو بارہ دری کی صورت میں تھا اسی وقت مسمار کر کے اس کی لاش ضائع کر دی تھی مگر باقی اسلامی عمارتیں انگریزوں کے عہد تک کسی نہ کسی طرح برقرار تھیں۔ مسلمان ان کا مطالبہ کرتے تھے مگر سکھ نہیں مانتے تھے۔ آخر ۹ جولائی ۱۹۳۵ء کی رات کو ماسٹر تارا سنگھ کے مشورے سے اکالی جماعت نے انگریزی کرنیوں اور انگریزی پولیس اور فوج کی حفاظت میں اس مسجد اور مزار شاہ کاکو چشتی کو مسمار کر دیا۔

---

1. میر منو نواب قمر الدین خاں وزیر محمد شاہ کا فرزند تھا۔ وہ بڑا بہادر اور دلیر تھا۔ سکھ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ اس کا مزار ایک بارہ دری کی صورت میں تھا۔ راجہ شیر سنگھ کے عہد میں اس کی قبر اکھاڑ کر اس کی آرام گاہ مٹا دی گئی اور اس کی جگہ شراب کی دکان قائم کر دی گئی۔

2. عبداللہ خاں دراصل سعید خاں بہادر ظفر جنگ کا چھوٹا لڑکا تھا۔ اسے اپنے والد کی وفات پر جو شاہ جہاں کے بیسویں سال میں واقع ہوئی منصب اور [illegible] سے سرفراز کیا گیا۔ وہ شہزادہ اورنگ زیب کے ہمراہ کابل گیا۔ اس کے بعد کابل کا والی بھی مقرر ہوا۔ آخر عہد شاہجہانی میں شہزادہ سلیمان شکوہ کے ساتھ رہا۔ جنگ تخت نشینی کی ابتدا میں سموگڑھ کے مقام پر وہ دارا شکوہ کے ساتھ تھا۔ جب دارا شکوہ لاہور آیا تو وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر اورنگ زیب کے ہمراہ ہو گیا اور بھکر میں رہا۔ ممکن ہے اس نے اپنے قیام لاہور کے دوران یہ مسجد تعمیر کرائی ہو۔ —— لاہور کے آثار قدیمہ از عبداللہ چغتائی [illegible] ۱۹۵۵ء

مسلمان اس واقعہ پر بلبلا اُٹھے۔ ان کی آنکھوں سے اشکوں کی بجائے خون برسنے لگا۔ وہ جتھے بنا بنا کر مسجد حاصل کرنے کی خاطر شہید گنج کی جانب روانہ ہوئے۔ حکومت نے انھیں روکنے کے لیے سڑک پر خاردار جنگلے لگا دیے۔ مولوی ظفر علی خاں، ملک لال خاں، مولانا سیّد حبیب اور اس تحریک کے دیگر پُرجوش رہنماؤں کو نظربند کر لیا اور ۱۹-۲۰ جولائی کو کئی سرفرودش گولیوں کا نشانہ بنا کر شہید کر دیے۔ اس وقت ایمرسن صاحب پنجاب کے گورنر اور مسٹر الیس پرتاب ڈپٹی کمشنر لاہور تھے جو خود بھی سکھ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

اس واقعہ کے بعد سے تقسیم پاک و ہند تک پولیس کی خاص چوکیاں گوردوارہ شہید گنج اور سکھوں کی حفاظت کرتی تھیں۔ اب بھی یہ جگہ سکھوں کے لیے محفوظ ہے اور مسلمان سپاہی پہرا دیتے ہیں۔ —— (ماخذ "نقوش" لاہور، فروری [illegible])

جناب نور احمد چشتی مرحوم

حال شہید گنج

(ص ۶۹۲) دہلی دروازہ کے باہر، شرق رویہ بازار لنڈا و سرائے محمد سلطان ٹھیکہ دار سرکار انگریزی جنوب رویہ سرائے ایک مسجد قدیم پختہ ریختہ کار کھڑی ہے۔ عہد چغتائی میں یہ نواح بنام چوک دارا مشہور تھا کیونکہ حویلیاں محمد دارا شکوہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہاں ہی تھیں۔ بعد نظامت عبداللہ خاں برادر نواب خاں بہادر، جس کو خاتمہ حکومت اہل اسلام کہنا چاہیے، مسجد ہذا پر قبضہ موسراں چلا آتا ہے۔ قابض حال مسمی گنڈا سنگھ۔ نیچے مسجد ہذا دیوار بدیوار آٹھ دکانیں بھائی جیون سنگھ پدر گنڈا سنگھ نے سمت ۱۸۸۰ بکرماجیتی میں بنوائی تھیں جو تاحال موجود ہیں۔ روبرو اس مسجد کے مکان شہید گنج معبد سکھاں ہے۔ چونکہ وہاں اکثر اوقات آمد و شد سکھاں رہتی ہے اس باعث سے یہاں بھی ایک چھوٹا سا بجائے خود بازار آباد ہو گیا ہے۔

دروازہ مسجد شمال رویہ سر راہ محرابی خشتی۔ اس کی بغلوں میں بطرف شرق و غرب دو کوٹھڑیاں اس کے اوپر ایک مکان سر منزلہ ہے۔ جس کی سقف اول میں بھائی کاہن سنگھ صاحب کا پلنگ بچھا ہوا ہے۔ یہ کاہن سنگھ بڑا مستعبد فقیر تھا۔ عرصہ چھ سال کا گذرا ہے کہ وہ زاویہ نشین عدم ہو گیا ہے۔ اس پلنگ پر وہ استراحت فرمایا کرتے تھے۔ اس باعث سے تمام سکھ لوگ اس کا ادب کرتے ہیں۔ اور مسجد کے تین گنبد۔ اب محرابوں کو بند کر کے طاق تختے سکھوں نے لگائے ہیں۔

بعد تلاش مالاکلام معلوم ہوا کہ بانی اس مسجد کا مسمی عبداللہ خان خانساماں دارا شکوہ کا تھا۔ شمال رویہ مسجد کے فیمابین مکان رسول شاہیاں شہید (ص ۶۹۳) بنگلہ ایک حمام پختہ عالیشان گنبد کلاں دلآبیبنہ دارا شکوہ عبرت افزائے دیدہ نظارگیان دشوار پسند کھڑا ہے۔ کرایہ اس کا اب گنڈا سنگھ و گوردت سنگھ لیتے ہیں۔ سبحان اللہ والحمد للہ۔ وہ حمام باہتمام عبداللہ خان ۱۰۴۰ میں تعمیر ہوا تھا۔ بعد اتمام اس حمام کے یہ مسجد ۱۰۴۳ میں اسی تقریب سے اس نے بنا کرائی کہ چند عرصہ کے واسطے وہ عبداللہ خان کوتوال لاہور مقرر ہو کر مقام نخلس میں جلوس کیا کرتا تھا۔ اب اس مقام نخلس کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ ابتدائے عملداری انگریزی میں ایک دروازہ کلاں عالیشان اس نخلس کا کاشی کار ہم شکل دروازہ مسجد وزیر خان مرحوم سر راہ شمال رویہ اس سڑک کے قائم کھڑا تھا مگر محمد سلطان صاحب کی مہربانی میں داخل ہو مسمار کرایا گیا۔

(ماخذ: تحقیقات چشتی، از نور احمد چشتی لاہور، ۱۸۶۴ء)

مسلمان اور سائنس

علم کیمیا کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام

تصنیف : ڈاکٹر فواد سیزگین
ترجمہ : ڈاکٹر خورشید رضوی

'ارسطو کی گاڑی کے قلیوں' نے

کیا خود بھی کچھ کام کیا ہے؟

فلسفہ میں، منطق میں،

اور خاص کر سائنس میں!

سیگمن نے اس موضوع پر جو مفید خطبات دیے ہیں، پاکستان کے صفِ اوّل کے مذہبی 'فکر و نظر' نے انھیں اپنے چند شماروں میں ترجمہ کر دیا۔ موضوع ایسا ہے جس پر بہت کم لکھا گیا اور لوگوں کو پیاس رہتی ہے اسلیے ہم نے مناسب جانا کہ 'جرنل' میں پیش کر دیں۔

● ادارہ

علم کیمیا کی تاریخ میں مسلمانوں

اور عربوں کا مقام

ڈاکٹر فؤاد سیزگین

ترجمه : ڈاکٹر خورشید رضوی

علم تاریخ میں تاریخ علوم کی حیثیت ایک نسبة جدید شاخ کی ہے۔ تہذیب اور علوم کی عظیم الشان عمارت کی تشکیل میں حصہ لینے والی مختلف اقوام کی کارکردگی پر بالعموم صادر کئے جانے والے فیصلے بڑی حد تک نادرست ہیں ۔ ایسے فیصلے علم کیمیا کے حصہ میں بھی دیگر علوم سے کچھ کم نہیں آئے مگر یہاں ایک خاص مسئلہ درپیش ہے۔ وہ یہ ہے کہ علم کیمیا کے مؤرّخین اس کے ظہور کا تعلق اہل یونان سے نہیں جوڑ سکتے جیسا کہ دیگر علوم میں ان کے ہم چشموں کا دستور بن گیا ہے۔

دور جدید میں تاریخ کیمیا پیش کرنے کی اولین کوشش کا سہرا سویڈن کے عالم Torbern Bergman کے سر ہے جس نے ۱۷۷۹ اور ۱۷۸۲ء کے درمیانی وقفے میں اس موضوع پر دو کتابیں شائع کیں ۔ اُس کی رائے میں حضرت آدم علیہ السلام پہلے کیمیا دان تھے اور اس شعبۂ علم کے پھلنے پھولنے اور ترقی پانے میں اہل مصر کا ، خصوصاً ہرمس کا بہت بڑا حصّہ تھا ۔ وہ ایک ایسے شخص سے بھی واقف تھا جو لاطینی دنیا میں Geber کے نام سے معروف تھا اور اُس کے خیال میں عربی الاصل تھا تاہم وہ تاریخ کیمیا میں اس کے مقام کا کچھ ذکر نہیں کرتا ۔

اس کا جرمن جانشین Joh. Christian Wiegleb جس نے ۱۷۹۰ ۔ ۱۷۹۲ء کے زمانے میں اس کی کتاب کی تکمیل کی ، اس بات کا قائل تھا کہ Geber اپنی کتاب Summa Perfectionis Magisterii کے سبب تاریخ کیمیا کی سب سے بڑی شخصیت تصور کیا جاتا ہے ۔

چند سال بعد ، یعنی ۱۷۹۷ اور ۱۷۹۹ء کے درمیان ، تاریخ کیمیا پر ایک اور کتاب سامنے آئی جو جرمنی کے Joh. Fr. Gemelin کی تالیف تھی۔اس نے علم کیمیا کی تاریخ کا آغاز بارھویں صدی عیسوی سے کیا تھا کیونکہ دورِ قدیم میں اس علم سے متعلق کوئی اہم چیز اسے معلوم نہ تھی ۔ وہ بھی Geber کو ، جو اس کے خیال میں بارھویں صدی عیسوی کا آدمی تھا ، تاریخ کیمیا کی سب سے بڑی شخصیت تصور کرتا تھا ۔ ۱۸۳۰ ۔ ۱۸۳۱ء میں شہر Glasgow میں Thomas Thomson کا یہ کہنا تھا کہ صحیح معنوں میں جن لوگوں نے کیمیا پر کام کیا وہ بلاشبہ عرب تھے اور یہ چیز باعث حیرت ہے کہ ہم دیکھتے ھیں کہ کیمیا کے بہت سے حقائق کیمیا دان Geber کے علم میں تھے ۔ اور ان حقائق کو ناروا طور پر بہت بعد کے علماء سے منسوب کیا جاتا

رہا ۔ انیسویں صدی عیسوی میں علم کیمیا کے بعض اور مورخین نے بھی موقف اختیار کرتے ہوئے کہا کہ Geber سے مراد ,,جابر،، ہے اور اس کی اہمیت علم کیمیا کی مجموعی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے ۔ پھر فرانس کا ایک کیمیا دان M. Berthelot آیا اور ۱۸۹۳ء میں La Chimie au Moyen Age کے عنوان سے تاریخ کیمیا پر ایک ضخیم کتاب تین جلدوں میں تالیف کی ۔ جن میں سے ایک میں ، ہالینڈ کے مستشرق O. Houdas کی مدد سے ، جابر بن حیّان کی بعض عربی تحریریں مع فرانسیسی ترجمے کے شائع کیں ۔ یہ شخص برتلو [Berthelot] کہتا ہے کہ یہ بات ممکن نہیں کہ جابر بن حیّان جس نے کیمیا پر عربی میں کتابیں لکھیں وہی ان لاطینی کتابوں کا بھی مولّف تھا جو Geber کے نام سے ہم تک پہنچی ہیں ۔ کیونکہ علمی سطح نیز مسائل پر بحث اور پیش کش کے اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق ہے ۔ مزید براں یہ محال ہے کہ عربوں کو یہ اہلیّت حاصل ہو کہ ایسی کتابیں تالیف کر سکیں ۔ جس لاطینی شخص نے یہ کتابیں تالیف کیں اس نے جابر سے منسوب کر کے اپنی کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرنا چاہا اور ایسا کر کے اس شخص نے کیمیا کی ساری تاریخ میں ہمارے لئے گڑ بڑ پیدا کر دی ۔ برتلو کا یہ انداز کلام ایسا تھا گویا علوم عرب کی تاریخ ، بتمام و کمال ، اس حد تک اس کے علم میں تھی کہ وہ افکار پر حکم لگانے کی اہلیت رکھتا تھا اور یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ عرب فکر ہے اور یہ غیر عرب ۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں Julius Ruska نے جابر بن حیّان اور اس کے تاریخی [وجود کے] مسئلے سے متعلق کئی مقالات تحریر کئے ۔ روسکا ایک جرمن عالم ہے جس نے کمال نیاز مندی کے ساتھ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۳۰ء تک علوم عرب کی تاریخ پر کام کیا ۔ تاہم

سائنسی علوم سے مسلمانوں کے شغف کی ابتداء کے مسئلے پر اس کا نقطۂ آغاز ہی درست نہ تھا ۔ اور اسی سبب سے اس کی تاریخ میں طرح طرح کے اُلجھاوے پیدا ہوئے ۔ وہ اپنے پہلے سے بنے بنائے خیالات سے متصادم نظریات کا سامنا کرنے کے قابل نہ تھا ۔ چنانچہ اس نے برتلو کے خیالات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تاآنکہ Holmyard نے ۱۹۲۳ء میں جابر کی کتابیں اور ان پر تحقیقات شائع کرنی شروع کیں ۔

ہومیارڈ نے برتلو کے جواب میں کہا کہ اس نے جابر پر حکم لگانے اور لاطینی کتب کی اُس سے نسبت کو رد کرنے میں بے سوچے سمجھے جلد بازی سے کام لیا ۔ ہومیارڈ نے کوشش کی کہ اس امر کا ثبوت بہم پہنچائے کہ یہ جابر ہی کی تالیفات کے تراجم ہیں ۔ اس نے جابر بن حیّان کی شخصیت میں ایک ایسے سائنسدان کو دیکھا جو دور جدید میں Pristley Lanoisier اور Boyle جیسے قدر آور کیمیا دانوں سے کسی طرح کم نہ تھا ۔ روسکا جو پہلے برتلو کا پیرو تھا ، اب ہو میارڈ کا پیرو بن کر تاریخ علوم میں جابر بن حیّان کے مقام کا دفاع اور اسے مسلمان علماء میں سے ایک بہت بڑی شخصیت تصوّر کرنے لگا۔ اس نے یہ اعتراف کر لیا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے سابقہ نظریات سے رجوع کر چکا ہے ۔ ۱۹۳۰ء تک وہ اسی کیفیت پر قائم رہا تاآنکہ اس کے ایک شاگرد P. Kraus نے برلن میں جابر بن حیّان کی بعض کتابوں پر تحقیق کی اور اپنا وہ خیرہ کن مقالہ لکھا جسے اس کے استاد روسکا نے ,,جابر بن حیّان کے افسانے کا خاتمہ ،، (۱) کے عنوان سے شائع کیا ۔ اب روسکا اس کا ہم نوا ہو گیا اور اپنی تمام سابقہ تائیدات سے جن میں اس نے ہومیارڈ کی ہمنوائی کی تھی ، دست برداری کا اعلان کر دیا اور ان تائیدات کو یہ کہہ کر کالعدم قرار دے دیا کہ اب وہ اپنی سابقہ آراء کی صحت کا قائل نہیں رہا ۔

اس ضمن میں کراؤس کے نظریات کی طرف متوجّہ ہونے سے پہلے میں چاہوں گا کہ یہاں اس امر واقع کی طرف توجہ دلاتا چلوں کہ جو بحث جابر بن حیّان کی تاریخی شخصیت کے حقیقی ہونے کے ثبوت پر جاری ہے،بڑی حد تک اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے مترادف ہے کہ علم کیمیا کی بنیادوں کی تعیین کیونکر کی جائے۔

علم کیمیا کے تمام مؤرخ جن کا ذکر ہوا ، یہی رائے رکھتے تھے کہ اس میدان میں تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر Boyle اور Lavoisier جیسے جدید کیمیا دانوں کے عہد تک جو معلومات بھی ہمیں حاصل ہیں اور زیرِ بحث لائی جاتی ہیں سب کا سلسلہ بالآخر Geber سے جا ملتا ہے جس کی کتابیں بارھویں صدی عیسوی میں متداول تھیں۔ جو لوگ اس نظریے کے حق میں ہیں کہ Geber کی لاطینی کتابوں کا عربی سے کوئی تعلق نہیں اور اس علمی سطح کا عربوں میں پایا جانا محال ہے،انہوں نے خود سے کبھی یہ سوال نہیں کیا کہ ایک غیر معروف شخص میں یہ اہلیّت کہاں سے آ گئی کہ وہ یکا یک ایسا علم لاطینی دنیا میں پیش کر سکے ، جہاں وہ تمام حالات اور بنیادیں موجود نہ تھیں جو ایسی کتب کی تالیف کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اور پھر اس شخص کی کتابوں کی علمی سطح بھی تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اس کے بعد آنے والے مشاہیر مثلاً :

Thomas Von Aquin, Roger Bacon, Albertus Magnus, Raymundus Lullus.

سے برتر ہے، جنھیں رازی اور ابن سینا وغیرہ کی کتابوں سے استفادے کا موقع بھی ملا تھا۔ (۲)

اسی طرح جو لوگ جابر بن حیّان کی تاریخی شخصیت کو ایک

حقیقت تسلیم کرتے ہیں — یعنی یہ کہ وہ دوسری صدی ہجری میں زندہ رہا اور وہی ان کتابوں کا حقیقی مؤلف ہے جن پر اس کا نام ثبت ہے — انہیں یہ مشکل درپیش ہے کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ کیونکر ایک نئے علم کی داغ بیل ڈال سکا جبکہ نہ حالات سازگار تھے اور نہ ماضی کے ایسے مصادر موجود تھے جو اسے ایسا کرنے میں مدد دے سکتے۔

موضوع سے اس ناگزیر گریز کے بعد، میں جابر بن حیّان کے مسئلے پر کراؤس کے موقف کی طرف پلٹتا ہوں۔ کراؤس نے، جس کا مقالہ شائع ہونے سے علمِ کیمیا پر تحقیق کے ایک نئے مرحلے کا آغاز ہوا،اس مقالے میں جابر بن حیّان کے صرف چار چھوٹے چھوٹے رسالوں پر انحصار کیا تھا جنھیں ہومیارڈ نے، جس کا ذکر اوپر ہوا، شائع کیا تھا۔ یہ ہمارے علم کے مطابق جابر کے ابتدائی رسالوں میں سے تھے۔ کیونکہ جابر نے ایک تو اپنی کتابوں کی ایک فہرست چھوڑی ہے جس کی ترتیب زمانی ہے۔ علاوہ ازیں اس کا دستور ہے کہ اپنی کتابوں میں مسلسل اپنی گذشتہ کتابوں کے بیانات کا حوالہ دیتا رہتا ہے اور بعض افکار کو غیر واضح اور لائقِ اصلاح یا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ منسوخ تصور کرتے ہوئے، ان کی تصحیح بھی کرتا رہتا ہے [اور اس طرح اس کی کتابوں کی ترتیب زمانی متعین ہو جاتی ہے] کراؤس نے بعض ایسے الفاظ اور افکار کا سہارا لیا ہے جن کا مفہوم وہ ٹھیک طور سے نہیں سمجھ پایا — اور بعض عبارتوں کی من مانی تاویل کر کے بزعمِ خویش حقیقت کا سراغ لگایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جابر کی کتابوں کا مولّف ایک اسماعیلی شخص تھا جس کا زمانہ تیسری صدی ہجری کے اواخر یا چوتھی صدی ہجری کا ہے۔ کراؤس نے یہ موقف ۱۹۳۰ء میں اختیار کیا جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں۔

بعد ازاں اس نے اپنی زندگی جابر بن حیّان پر تحقیق اور اس کی کتابوں کی اشاعت کے لئے وقف کر دی۔

یہ شخص جو بڑا مستقل مزاج ، محنتی ، ذہین ، کثیر المطالعہ اور وسیع العلم تھا،میری رائے میں تاریخی واقعات پر حکم صادر کرنے اور نتائج برآمد کرنے میں ضرورت سے زیادہ اجتہاد اور آزادیٔ رائے سے کام لیتا تھا اور اس کے پہلے سے نکالے ہوئے من پسند نتائج کے برخلاف جس قدر مواد موجود ہوتا تھا اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا تھا۔

جب انسان — ضروری احتیاط کے ساتھ — ان دو ضخیم جلدوں کا مطالعہ کرتا ہے جو کراؤس نے ۱۹۴۲ء ، ۱۹۴۳ء میں جابر بن حیّان پر اپنی تحقیقات کے نتیجے میں بزبان فرانسیسی شائع کیں ، تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ مولّف اسی ذہنی تصوّر کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہے جسے وہ تسلیم کر چکا ہے اور جس کی صحت پر شک کرنے کے لئے وہ تیار نہیں۔ تصانیف جابر بن حیّان کے حقیقی ہونے کے مسئلے پر جو نتیجہ کراؤس نے نکالا اور اس آخری تحقیق میں دنیائے علم کے سامنے پیش کیا اس کا لب لباب یہ ہے کہ یہ کتابیں کیمیا کے ایک اسماعیلی مدرسے کی پیداوار ہیں جنھیں اس مدرسے نے ۲۵۰ سے ۳۵۰ ہجری کے درمیانی عرصے میں وضع کیا۔

کراؤس نے اپنے تصوّرات کی حمایت میں اپنی آخری تحقیق میں جو دلائل اور مفروضے پیش کئے ہیں،وہ دو قسم کے ہیں اور تقریباً وہی ہیں جو اس نے اپنے پرانے مقالے میں پیش کئے تھے۔ یہ دو قسمیں عبارت ہیں ان دلائل سے جن کا استنباط جابر کی کتابوں کی عبارتوں سے کیا گیا ہے اور ان مفروضوں سے جو علوم عربیہ و اسلامیہ کے ارتقاء و پیش رفت کو اس کے خاص انداز میں سمجھنے کا نتیجہ ہیں۔ میں

نے اس کے تمام دلائل کا تتبع کیا ہے اور دیکھا ہے کہ بعض عبارتوں کو تو اس نے ٹھیک سمجھا نہیں ۔ اور بعض سے نتائج ایسے نکالے ہیں جو قابلِ قبول نہیں ۔ میں نے اپنی کتاب ,,تاریخ التراث العربی ،، کی چوتھی جلد میں ان سب پر بحث کی ہے ۔

رہے وہ مفروضے جو وہی ہیں جنہیں پہلے مقالے میں بھی پیش کیا گیا تھا سو ان کا خلاصہ یہ ہے کہ : اس امر کو تسلیم کرنا کہ جابر بن حیّان کی کتابیں عملاً دوسری صدی ہجری میں لکھی گئیں؛ ان تمام معلومات کے خلاف ہو گا جو ہمیں اب تک اس صدی میں لوگوں کے مبلغ علم نیز تصنیفی سرگرمی سے متعلق حاصل ہیں ۔ یہاں کراؤس کا نقطۂ آغاز ہی ایک غلط تصور پر قائم ہے ۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے ہاں تصنیفی سرگرمی دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل میں شروع ہوئی ۔ یہ خیال اب تک بعض لوگوں کے ذہن پر غالب ہے حالانکہ یہ تاریخی حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ۔

کراؤس یہ بھی کہتا ہے کہ اس بات کو تسلیم کرنے سے یہ بھی فرض کرنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں اہل یونان کے جملہ علوم اخذ کرنے کا عمل دوسری صدی ہجری میں مکمل ہو چکا تھا ۔ یہ استنباط ناقابلِ تسلیم ہے کیونکہ جابر کے علم میں یونانیوں کی بہت کم کتابیں تھیں یعنی تیسری صدی ہجری میں مسلمانوں کے علم میں جو کچھ تھا اس کا تھوڑا سا حصہ ۔ اور یہ تو الٹی اس امر کی دلیل ہے کہ جابر کی کتابیں مسلمانوں کے ہاں تیسری صدی کی کتابوں سے پہلے ظاہر ہوئیں ۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہمیں اس امر کا انکار کرنا ہو گا کہ عربی میں ہندوستانی ہندسے داخل کرنے والا شخص الخوارزمی تھا ۔

ہندوستانی ہندسوں کا الخوارزمی کی طرف سے داخل کیا جانا ایک ایسا دعویٰ ہے جس کا کوئی جواز نہیں کیونکہ مسلمانوں کے ہاں ریاضیات کی تاریخ میں یہ ایک معروف بات ہے کہ ہندوستانی حساب مسلمانوں تک ,,سندھ ہند،، کے عربی ترجمے کی وساطت سے زیادہ سے زیادہ ۱۵۶ ھ تک ــ یعنی الخوارزمی سے کم از کم نصف صدی قبل ــ پہنچا۔

کراؤس کہتا ہے: ,,لیکن ہم یہ فرض کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ عربی زبان میں علمی اصطلاحات کو بالآخر تشکیل دینے والا [ادارہ] حنین بن اسحاق کا مدرسۂ ترجمہ نہ تھا،،۔ یہ بھی ایک ایسا دعویٰ ہے جو تاریخی حقائق سے ہم آہنگ نہیں لیکن صرف کراؤس نے ایسا دعویٰ نہیں کیا۔ میری رائے میں تو ایسے مدرسے کا تصوّر ایک طرح کی خیال آرائی ہے کیونکہ اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں تھا۔ میں اس امر کی طرف اشارہ خاص اس موضوع پر ایک لیکچر میں کر چکا ہوں جو دس برس پیشتر شائع ہوا۔

کراؤس مزید کہتا ہے:

,,لیکن ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ علومِ اسلامیہ کے اوائل میں ایک ایسی شخصیت کو رکھیں جس کے بارے میں یہ فرض کریں کہ وہ آئندہ نسلوں میں ہونے والے علمی ارتقاء پر سبقت لے گئی اور اسے بے فائدہ بنا گئی،،۔

اس استدلال سے بطور خاص واضح ہوتا ہے کہ کراؤس اپنی تحقیق میں ان تصورات کا اسیر تھا جو اس نے علوم اسلامیہ کے ارتقاء کے مسئلے پر قائم کر رکھے تھے۔ اگر کراؤس کو اس ارتقاء کا صحیح علم ہوتا تو وہ دیکھ سکتا کہ جابر بن حیّان ــ ہر چند کہ ہمیں اس کی علمی شخصیت کی عظمت نیز اس امر کا اعتراف ہے کہ وہ ہر

ممکن حد تک علم کو سمیٹ لینے کی سخت خواہش رکھتا تھا۔ بہرحال بیشتر ایسی معلومات سے واقف نہ ہو سکا جو مسلمان اور عرب علماء کو تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں حاصل تھیں۔ یہ موازنہ بذات خود اس امر کی وضاحت کے لئے کافی ہونا چاہئے کہ جابر بن حیّان کی کتابیں دوسری صدی ہجری ہی کی ہو سکتی ہیں۔

جہاں تک تصانیفِ جابر کے علمی مواد پر کراؤس کی آخری تحقیق کے نتائج کا تعلق ہے سو اس کی علمی شخصیت کے خط و خال پہلے سے بڑھ کر نمایاں ہو گئے ہیں اور وہ سائنس کی تاریخ کی عظیم ترین شخصیات میں شمار ہونے لگا ہے۔ اور یہ علمِ کیمیا کے میدان تک محدود نہیں بلکہ اس کی توجہ علوم کے سب گوشوں کی طرف مبذول ہوئی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں پیش رفت ہوئی۔ چنانچہ بالآخر وہ طبیعیات کے ایک مفکّر کی حیثیت سے ابھرا۔ بلکہ جابر، علم سے اپنی طویل دل چسپی کے دوران اہل یونان اور دیگر اقوام کی کتابوں کے ترجموں سے حاصل ہونے والی معلومات سے اخذ و اکتساب ہی تک محدود نہ رہا کیونکہ اس نے علوم کی ترتیبِ نو کا آغاز کیا اور بڑے بڑے یونانی علماء مثلاً، ارسطو، افلاطون، سقراط اور جالینوس پر تنقید اور ان کی تصحیح کی۔ اس نے اپنے تخیّل سے بعض نئے علوم کی بنیاد رکھنے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے ایک کتاب تالیف کی جو جانوروں کی تقریباً سات سو آوازوں پر مشتمل تھی۔ انسانی علم کی حدود سے متعلق اس کا اصول یہ تھا کہ انسانی علم اور دریافت میں اضافے کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی اور اسے لازم ہے کہ ساری کائنات کے اسرار دریافت کر لینے کی کوشش کرے اور اس دنیا سے ماورا جو اسرار ہیں ان سب کا کھوج لگانے کی صلاحیت اسے

عطا کی گئی ہے۔

کراؤس نے اپنی کتاب میں بار بار اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جابر کی تمام کتابوں میں وہ داخلی ترتیب و تسلسل اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے جس سے اس جیسی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ تاریخِ علوم میں اس کی مثال شاذ ھی کہیں مل سکتی ہے۔ لیکن اس نے خود سے یہ سوال نہیں کیا کہ داخلی تسلسل اور ہم آہنگی اور شخصیت کی یہ عظمت کیا ایک ایسے مفروضہ مدرسے سے منسوب لوگوں کے ھاں پائے جانے کا اتفاق ھو سکتا ہے جس نے پوری ایک صدی کے عرصے میں سینکڑوں کتابیں تالیف کی ھوں۔ کیا ایسے مدرسہ کا وجود عالم اسلام، یا کسی بھی اور ماحول یا تاریخ کے کسی بھی دور میں ناممکن نہ ھو گا؟۔

بہرحال کراؤس نے اپنی آخری کتاب میں اسلامی سائنس کی تاریخ سے متعلق کئی ایک حیرت انگیز نتائج برآمد کئے ھیں تاھم اس کا جابر بن حیّان کو ایک افسانوی شخصیت قرار دینا ایک ایسا امر تھا جس نے لوگوں کے روبرو جابر کی حقیقت کو مجروح کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے جابر بن حیّان کے تاریخی مسئلے پر کراؤس کے مفروضے کو بتمام و کمال قبول کر لیا یا یوں کہہ لیجئے کہ قبول کرنے پر مجبور کر دیئے گئے۔

میں سمجھتا ھوں کہ اب مجھے، نہایت اختصار کے ساتھ، جیسا کہ اس خطبے کے موضوع کا تقاضا ہے، کیمیا میں جابر کے موقف پر بات کرنی چاھئے۔ ظاھر ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں میں صرف اھم اصولوں کی نشان دھی ھی کر سکوں گا۔

جابر تمام کیمیائی مظاھر کو قانون سببیّت کے تابع جانتا تھا۔ اس کی رائے میں کیمیا دان کو چاھئے کہ استقرائی اور استخراجی دونوں

طریقوں سے ہر ممکن حد تک کام لیتے ہوئے اسباب، کا کھوج لگانے کی کوشش کرے۔ اس سے بھی اہم اس کا وہ بنیادی اصول ہے جسے وہ ,,المیزان،، کا نام دیتا ہے اور جو آج ,,نسبتوں کا قانون،، [Law of Proportions] کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس کی رائے میں تمام اشیاء کے خوّاص ، خصوصاً کیمیا کے میدان میں ، قابلِ قیاس ہیں اور ایسی نسبتوں پر مبنی ہیں جن کا عددی تعین ممکن ہے۔ مثال کے طور پر اگر سرکے کی کھٹاس اس میں سیسے کی تختیاں بھگونے سے ختم ہو جاتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ درحقیقت سرکے کی ایک خاص معیّن ترکیب ہے جو ایک ایسے عدد سے حاصل ہوتی ہے جس میں سیسے کی تختیوں کے داخل ہونے سے فرق آ جاتا ہے اور ان تختیوں کے سلسلے میں عددی تعین اپنی جگہ پر ممکن ہے۔ ان خوّاص کا ظہور، یعنی ، اس مثال میں ، سیسے کی تختی کی یہ قابلیت کہ وہ سرکے میں تغیّر پیدا کر دے ، محض اتفاق نہیں ہے بلکہ یہ مادّے کی ساخت کے تابع ہے اور تدبیر کیمیائی کا مقصود یہی ہے کہ اس ساخت میں مرضی کے مطابق تبدیلی عمل میں لائی جا سکے۔ اگر ہم خواصِ اشیاء کی عددی توجیہ کر سکیں تو گویا ہم نے اس تدبیر کیمیائی کی خشتِ اوّل درست رکھ دی۔ اسی بنیاد پر اشیاء کی قیاسیّت کا اصول قائم ہوتا ہے یعنی اشیائے کائنات کی حسابی یقینیّت کے ,,میزان،، [توازن] کا اصول۔ یہ اصول اشیاء اور ان کی ہم آہنگی کے ایک معقول نظام کی وضاحت کرتا ہے جو ایک طرف تو ہر ہر شئے میں ظہور کرتا ہے اور دوسری طرف کائنات کا مجرّد اساسی مفہوم ہے ,,المیزان،، نظام کائنات کی کلید ہے اور خوّاص اشیاء کی صرف ایک ہی توجیہ مل سکتی ہے اور وہ حسابی توجیہ ہے۔ یہ توجیہ واضح اور دو ٹوک ہے کیونکہ اس کا کبھی یوں اور کبھی ووں نظر آنا ممکن

نہیں ۔ ,,المیزان ،، کی ایک ھی قسم ہے اور وہ مخلوقات کے ایک حسابی قانون سے عبارت ہے جس کا آغاز اوپر سے نیچے کی طرف ہوتا ہے۔ (۲)

ایسی بنیادی بات سمجھ لینے کے بعد کیمیا دان اس قابل ہو جاتا ہے کہ ھماوی ارضی دنیا میں ہر ممکن حد تک تدبیر مواد میں دخل انداز ہو سکے ۔ معدنیات اس کی نظر میں ایسے مادّے ھیں جو پارے اور گندھک کا مرکب ھیں اور مختلف معدنیات میں ان دونوں کی کمیّت کا اختلاف خود ان معدنیات نیز ان کے خالص ہونے کے مدارج میں اختلاف کا سبب ہے۔ علمِ کیمیا کا کام یہ ہے کہ معدنیات میں مقداروں کی کمیّت جو کچھ بھی ہے اس کا تعین کرے اور اُن میں تصرّف کرے ۔ اسی بنا پر جابر کم از کم نظری سطح پر سونا بنانے کو ناممکن نہیں سمجھتا اگرچہ تجربی سطح پر یہ ناممکن ہو۔

جابر کے ھاں علمِ کیمیا کا ایک نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ وہ اکسیر غیر عضوی کے مقابلے میں اکسیر عضوی پر اعتماد کرتا ہے۔ (۳)

یہاں میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ جابر کے ھاں کیمیائی تدابیر تیزابوں اور ان معدنی نمکیات کی اقسام کی کیا تعداد تھی جو اس کے علم میں تھے ۔ میں صرف یہی کہنے پر اکتفاء کروں گا کہ جابر بن حیّان پہلا شخص تھا جس نے علم کیمیاء کو اس حیثیت سے پہچانا کہ اس میں عملی اور نظری دونوں پہلوؤں کا اشتراک درکار ہے اور یہ کہا کہ اگر اس عمل میں نظریے کو اس کا لازمی مقام حاصل نہ ہو تو محض تجربہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچاتا ۔

اس مجمل سی گفتگو سے میرا مقصد یہ تھا کہ آپ کو یہ تاثّر مل جائے کہ جابر بن حیّان کی کتابوں میں ہم جدید علمِ کیمیا کے اصولوں کا سراغ پاتے ھیں جن کا اعتراف بعض محققین کر چکے ھیں ۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک امکانی سوال کا جواب دے دوں جو آپ کے ذہن میں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ جابر ایسے علم کی بنیاد رکھنے پر کیونکر قادر ہو سکا ۔ ؟ یہ سوال بہت سے محققین کے ذہن پر چھایا رہا اور انہیں اس مفروضے کے قبول کرنے پر آمادہ کر دیا کہ علم کیمیا کا ایک خاص مدرسہ وجود رکھتا تھا جو تیسری صدی کے اواسط سے لے کر چوتھی صدی ہجری کے اواسط تک ایک صدی کے عرصے میں اس کام کی انجام دھی کے لائق ہوا ۔

جابر ، علماء کی اس نہایت نادر صف سے تعلق رکھتا ہے جنھوں نے اپنی نشوونما کے مسئلے پر ابہام و خفا کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اس کی کتابوں کے مطالعے کے دوران تسلسل سے ملنے والے اس کی سابقہ تالیفات کے حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مؤلف ان معمولی سے عناصر سے آغاز کرتا ہے جو اس کے عہد میں معروف تھے۔ وہ تنہا بھی نہیں تھا بلکہ اس میدان میں اس کے کچھ استاد بھی تھے اور کچھ شاگرد بھی ۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ غیر اقوام کے قدماء کے افکار کی طرف اشارہ کرتا ہے مثلاً سقراط ، افلاطون ، ارسطو ، ھرمس اور ان کے علاوہ اور بہت سی معروف و غیر معروف شخصیات ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان علماء کا میدان علم کیمیا نہیں رہا بلکہ ان میں بعض تو افسانوی شخصیات ہیں اور اسی سبب سے محققین کو ان حوالوں کی صحت میں شک ہوا اور یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں اور عربوں نے خود کچھ کتابیں گھڑ کر انہیں دوسروں سے منسوب کر دیا اور بعد ازاں ان سے استفادہ کرتے رھے اور انہی کی بنیاد پر بات کو آگے بڑھاتے رھے ۔ تاھم ان محققین نے خود سے یہ سوال کرنے کی زحمت نہیں کہ مسلمانوں نے کب اور کیسے اور کیوں یہ کتابیں گھڑ کر دوسروں سے منسوب کر دیں ؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ جعلی کتابیں جن کے حوالے عربی کتب میں ملتے ھیں ، اور جن میں سے ایک بڑی تعداد آج تک باقی ہے ، یہ من گھڑت کتابیں مسلمانوں کی گھڑی ہوئی نہیں بلکہ انہیں علاقہ بحیرۂ روم کے علمی حلقوں نیز ھندوستانیوں ، سریانیوں اور ایرانیوں نے ظہورِ اسلام سے دو تین سو سال پہلے وضع کیا ۔ یہ کتابیں علوم کے اس آخری مرحلے کی عکاسی کرتی ھیں جس تک وہ اسلام سے فوراً قبل کے زمانے میں پہنچ سکے تھے ۔ یہی کتابیں جابر کے اساتذہ ، اور خود جابر اور اس کے ھم چشموں کے لئے اوّلین مصادر کی حیثیت رکھتی تھیں ، اگرچہ ان میں رطب و یابس بھی کچھ بھرا پڑا تھا ۔ اس امر سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہ آیا ان کے مؤلفین اس رتبے کے تھے بھی سہی کہ کوئی اھم چیز تشکیل دے سکیں ، ان کتابوں میں ارتکاز اور داخلی ھم آھنگی کا فقدان ہے ۔

اس کام کے لئے خاص قسم کے حالات اور ایک نیا معاشرہ درکار تھا جس میں ایک نئے علمی مرحلے کے آغاز کے لئے ضروری عناصر مہیا ہو چکے ہوں ۔ جابر بن حیّان کی کتب کے مطالعے سے اس حقیقت کی تصویر بہترین طریقے پر ھمارے سامنے آ جاتی ہے اور یہ واضح ہو جاتی ہے کہ اس عالم کے لئے یہ کیونکر ممکن ہوا کہ وہ اپنا مواد ان مصادر سے جمع کرنے کے بعد اس پر اضافہ بھی کرے اور ایک عظیم الشان عمارت کھڑی کر سکے ۔

جابر کے بعد مسلمانوں کے ھاں علم کیمیا کی پیش رفت سے متعلق ھماری معلومات ناکافی ھیں اور اس پہلو پر تحقیق و مطالعہ کی ضرورت ہے ۔

جابر کے بعد آنے والوں میں ابوبکر رازی کو دور جدید کی تحقیقات میں خاصی توجہ ملی ۔ چنانچہ جولیس روسکا [Julius

[Ruska نے، جس کا ذکر اوپر ہــوا رازی کا خصوصی مطالعہ کیا ہے اور اسے کیمیائے تجربی کا بانی قرار دیا ۔۔ (۵) اگرچہ اُس نے جابر بن حیّان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا اور اس دعویٰ میں کراؤس کی پیروی کی کہ جابر سے منسوب کتابیں بعد کے زمانے کے ایک مدرسے کی پیداوار ہیں ۔

لیکن آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رازی کے ہاں علمِ کیمیا درحقیقت ان تجربی عناصر اور ان بلند افکار و نظریات کی ایک تلخیص سے زیادہ کچھ نہیں ، جو جابر کی کتابوں میں موجود ہیں ۔ اس نقطۂ نظر کی روشنی میں یہ تصوّر کرنا غلط نہ ہو گا کــہ رازی کی اســاسی کتاب یعنی کتاب ,,سر الاسرار،، کیمیائے تجربی کا اولین مآخذ ہے جیسا کہ اس موضوع پر ہومیارڈ نے اپنے آخری مقالے میں کہا ہے ۔ (٦)

اس ضمن میں میں ابن سینا کا نام بھی لوں گا خصوصاً ایک دھات کے سچ مچ کسی دوسری دھات میں تبدیل ہو جانے کے امکان کے خلاف اس کی انوکھی توجیہ جو اس کے بعض رسائل میں ملتی ہے نیز اس رتبے کا ذکر کرنا چاہوں گا جو لاطینی دنیا میں کتاب الشفاء کے حصۂ معدنیات کو حاصل ہوا ۔

آخر میں میں یہ مسئلہ اٹھانا چاہوں گا کہ عربوں کے علم کیمیا نے یورپ میں اس علم کی اُٹھان پر کیا اثرات مرتب کئے ۔ جو کوئی سترھویں صدی عیسوی کے اواسط تک یورپ کے کیمیا دانوں کی کتابوں کو کھنگالتا ہے،اس پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم کیمیا کا آغاز بارھویں صدی عیسوی یا تیرھویں صدی کے نصفِ اول میں Geber کی کتابوں سے ہوتا ہے اور تیرھویں صدی میں طبیعیات کے اکثر فلاسفہ انہی سے سیراب ہوتے ہیں اور بڑے کیمیا دانوں کی حیثیت

سے شہرت پاتے ہیں - یہی حال چودھویں اور پندرھویں صدی میں ان کے جانشینوں کا رہا اور یہ ایک معروف بات ہے،کیونکہ کیمیا پر ان دونوں صدیوں کی کتابوں میں ان سے پہلے کے مقابلے میں کوئی نئی چیز نہیں ملتی -

سولھویں صدی عیسوی کی کتبِ کیمیا میں جو تبدیلی ہوئی وہ اسلوب اور بلند بانگ دعوؤں کی کثرت کی تبدیلی تھی - ایک نئے مرحلے کا آغاز غالباً سترھویں صدی عیسوی کے نصفِ ثانی میں Boyle کے ہاتھوں اور بالخصوص اٹھارویں صدی میں Lovoisier کے ظہور سے ہوا،جس نے یہ ثابت کیا کہ پانی دو عناصر یعنی آکسیجن اور ہائیڈروجن سے عبارت ہے -

علم کیمیا کی تاریخ میں ایک معروف و مسلّم حقیقت یہ ہے کہ جس کیمیا دان کی کتابیں لاطینی زبان میں ,,گیبر" کے نام سے عام ہوئیں،وہ ایک ایسے عجیب مقام پر فائز ہے کہ جو کیمیا دان اسی کو اپنی اساس بتاتے ہیں ان کے لئے اتنا بھی ممکن نہیں کہ جو بلند اصول اور کیمیائی تدابیر اس کی کتابوں میں درج ہیں ان کو سمجھ کر جذب ہی کر سکیں - ان کتابوں کے مولّف کے دفاع میں آج تک چلا آنے والا یہ مسلسل اور بضد اصرار کہ وہ لاطینی تھا اور اس کی کتابوں کو جابر بن حیّان سے منسوب کرنا ایک تاریخی ظلم ہے — نہ صرف تاریخی حقائق سے بلکہ منطق کی طرف سے بھی آنکھیں بند کر لینے کے مترادف ہے - ہمارے لئے یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ جو کچھ تدابیر و نظریات Geber کی کتابوں میں ملتے ہیں سب کے سب جابر بن حیّان کے ہاں اسی طرح پائے جاتے ہیں - اس مسئلے کی توضیح کا بیڑہ اٹھانے والے مؤرّخِ علوم پر لازم ہے کہ وہ اسے یورپ میں عربی و اسلامی علوم سے اخذ و اکتساب کے ذیل

میں رکھے ۔ وہ دیکھے گا کہ لاطینی یا تو عربی کتابوں کے سرقے کے مرتکب ہوتے تھے یا حرف بہ حرف ان کا ترجمہ کرتے تھے یا ناپختگی کے ساتھ ایسا ترجمہ کرتے تھے جس میں تحریف ہوتی تھی یا انھیں غیر حقیقی مصنّفین سے منسوب کر دیتے تھے ، یا یہ کہ وقت گزرنے کے ساتھ وہ خود کو بھی اس قابل پانے لگے تھے کہ کچھ نئی کتابیں تالیف کر لیں اگرچہ وہ بدستور اپنے عرب اساتذہ کے مقلد ہی تھے ۔

یہاں یہ ذکر ہونا چاہئے کہ کیمیا پر رازی سے منسوب کتنی کتابیں لاطینی زبان میں متداول رہیں ۔ اور اس علم سے متعلق کتنی کتابیں ایسی تھیں جنھیں Raymundus Lullus نے اپنی طرف منسوب کر لیا اور ھماری صدی میں آکر یہ کھلا کہ وہ عربی کتابوں کا سرقہ ھیں ۔ یہاں بر سبیل مثال ابن سینا کی کتاب الشفاء کے حصہ معدنیات کا ذکر بھی ہو سکتا ہے جو کئی صدیوں تک یورپ کے کیمیا دانوں میں ارسطو کی تحریر کی حیثیت سے متداول رہا ۔

لاطینی مغرب نے عربی علوم کو ایسی بنیاد پر اخذ کیا ۔ اس کے برخلاف مسلمانوں نے یونانیوں اور دیگر پیشروؤں سے جو کچھ اخذ کیا وضاحت اور دیانت داری کی اساس پر کیا ۔

بہرحال اہم نکتہ تو یہ ہے کہ یہ ہوں یا وہ یعنی لاطینی ہوں یا عرب ، دونوں ھی اخذ و اکتساب کے مرحلے سے گزرے اور اس قابل ہوئے کہ ایک نیا امتزاج پیدا کر سکیں اور تاریخِ علوم میں دو نئے مرحلوں کا افتتاح کر سکیں ۔

حواشی

(1) RUSKA, Der Zusammenbruch der Dschabir-Legende. Die bisherigen Versuche, das Dschabir-Problem zu losen von J. RUSKA. Dschabir ibn Hajjan und die Isma'ilijja von P. KRAUS, in: Dritter Jahresbericnt, Berlin 1930, 9-22, 23-42.

(2) H. KOPP, Beitrage zur Geschichte der Chemie, Braunschweig 1869, 65ff.

(3) P. KRAUS, Dschabir ibn Hajjan und die Isma'ilijja, in: Dritter Jahresbericht, Forschungs-Institut fur Geschichte der Naturwissenschaften, Berlin 1930, 25-26.

(۴) غالباً اسی پہلو کی طرف Dictionary of Scientific Biography میں یوں اشارہ کیا گیا ہے: (مترجم)

"According to Jabir's developed theory, ingrediants of the elixir are not exclusively (Dictionary of Scientific Biography, American Council of Learned Societies, Chief Ed. C.C. Gillispie, New York, 1981, 7/41.

(۵) ماخذ کے لئے دیکھئے میری کتاب "تاریخ التراث العربی" - جلد چہارم (ص ۲۲۵ - ۲۸۲)۔

(6) Alchemisten des Islams im Mittelalter, Endeavour 14/1955/123.

(ماخذ "فکر و نظر" اپریل ۱۹۹۳ء)

★★★

آثار قاضی عبدالودود

○ کچھ رقعے کچھ یادداشتیں

● قاضی عبدالودود

○

قاضی صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے اردو دانشور تھے۔ اپنے پیچھے انھوں نے اچھا خاصا تحریری سرمایہ چھوڑا ہے۔
آخری زمانے میں عالم یہ تھا کہ لکھتے تھے اور ادھر اُدھر ڈال دیتے تھے۔ کبھی کبھی اسی نوشتہ کے سامنے نہ رہنے کے سبب دوبارہ سہ بارہ لکھتے تھے۔ اگنت موضوعات پر ان کی یہ یادداشتیں ہزاروں چھوٹے بڑے پرزوں کی شکل میں موجود ہیں۔ انھیں وقتاً فوقتاً پیش کیا جاتا رہے گا، شاید کوئی چیز کسی کے کام آجائے۔ ان یادداشتوں میں کئی ایسی ہیں جو کسی نہ کسی مضمون کی شکل میں آچکی ہیں، کچھ بالکل نئی چیزیں ملیں گی۔ کچھ رقعے بھی۔

——— ادارہ

— آثارِ غالب (غالب کی کتاب نظم و نثر کا مجموعہ) مرتبہ قاضی عبدالودود ۔ یہ کتاب بنام آثار غالب علیگڑھ
میگزین کے غالب نمبر سنہ ۱۹ء میں شامل تھی بعد کو اس کا علم ہوا تو وہ کئی جو الگ سے چھپی تھی آثار غالب کے نام
سے شائع ہوئے ۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ آثار میں ایک سرورق زیادہ ہے اور کچھ [illegible] بعنوان التماس
کا اضافہ ہے ۔ ص ۱۶۸ ۔ (ض حالات (ایک صفحہ) کے بعد حصہ اول تا ص ۱۴ ۔ اردو نثر ا دیباچۂ لطائف غیبی
دیباچۂ تیغ تیز، ایک استفتا (ماخوذ از تیغ)، خط بنام میر ولایت علی [illegible] کی معلوم ہے عکس
(ماخوذ از حواشی کلیات نظم فارسی سنہ ۱۳ء) ۔ اردو نظم ا اشتہار پنج آہنگ (ماخوذ از اسعد الاخبار)
غزل (ماخوذ از دیوان معروف)، ہجو سعادت علی (۲ ابیات ماخوذ از لطائف)، فردیات (ایک ماخوذ
از [illegible] ایک ماخوذ از لطائف) ۔ فارسی نثر ا تقریظ مطلع برہان (۱۸)، تقریظ اسکندر نامہ
[illegible] ۔ فارسی نظم : [illegible] (کلیات میں [illegible] ماخوذ) ۲ [illegible]
رباعی (ماخوذ از سبد چین [illegible]) فردیات فارسی (ایک ماخوذ از لطائف، ایک ماخوذ از [illegible]
کا کوری) ۔ حصہ ۲ [illegible] تا ص ۱۴) ۔ خطوط فارسی ۳۳ ۔ [illegible] بنام احمد بیگ خاں ۳۶ [illegible]
[illegible] (اس میں ایک خط [illegible] کی طرف سے لکھا گیا) بنام [illegible] ، مکتوب الیہ
نامعلوم ۔ ہر خط کے ساتھ مکتوب الیہ کا نام [illegible] کی بنا پر [illegible] کیا گیا ہے
باقی معلومات میں [illegible] ۔ ص ۵۴ ۔ حکیم حبیب الرحمن خاں جہانگیر نگری کے پاس ایک مجموعہ تھا جس کی نقل [illegible] خود
کی تھی ۔ آثار کے ۳۳ خطوط فارسی اسی مجموعے میں ہیں ۔ اس میں [illegible] کا ایک خط جو پنج [illegible] (کلیات
نظم) میں ہے [illegible] ، اور [illegible] کی [illegible] روایت (۲) بھی موجود ہیں ۔ [illegible]
[illegible] وقت ترتیب مجموعے سے متعلق مزید معلومات حاصل نہ ہو سکیں ۔ مجموعے میں نام کاتب اور زمانۂ
کتابت درج نہیں ۔ کاتب ظاہراً ذی علم نہیں ۔ [illegible] پرستش کو پرستش ، بالجملہ کو بالکل [illegible]
کو [illegible] ، [illegible] فارسی کی عبارت میں کہیں غالب کا [illegible]
[illegible] غالب ہی ۔ [illegible] اپنے ایک خط میں اس نسخے [illegible] جہانگیر نگری کا مجموعہ کہا تھا ۔ اس کا [illegible]
[illegible] ۔ ان خطوں کا کسی کے [illegible] مستبعد نہیں ۔ اس کے ساتھ مکاتیب [illegible]
ایک مجموعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے [illegible] غالب کا ذکر کیا تھا (رسالہ [illegible] ص ۱۶۸ میں یہ
کہ اس مجموعے کے ایک خط کا [illegible] الفاظ [illegible] ہیں ۔ الغرض ایک [illegible]
غلطیاں بہت ہیں ۔ [illegible] اس لیے [illegible] صحیح چھپنے کا امکان زیادہ ہے

میں نے انسٹی ٹیوٹ سے متعلق نئی اسکیم کے بارے میں اپنا خیال انتظامیہ کمیٹی کے جلسے میں ظاہر کر دیا تھا،
اور آپ نے کہا تھا کہ اردو انسٹی ٹیوٹ اور اردو لائبریری سے بھی اس سلسلے میں کام لینے کا خیال ہے،
لیکن قواعد کو دور کر کے [illegible] ~~[illegible]~~ میں قواعد کو غور سے پڑھا لیکن طریقہ کوئی
بات اس میں

اردو انسٹی ٹیوٹ سے متعلق جو اسکیم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی گورنری کے زمانے میں بنائی گئی تھی، اور
جس کے لیے ایک کمیٹی بھی بنی تھی، مالی مشکلات کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا۔ سال گزشتہ ایک
[illegible] ~~[illegible]~~ آپ کی ایک نمائندہ [illegible]
کی موجودگی میں [illegible] یہ تجویز بھی پیش کی کہ اردو لائبریری ادارۂ تحقیقات اردو کے سپرد
کی جائے، لیکن اس پر بھی عمل نہ ہو سکا، حالانکہ یہ لائبریری کئی برس سے [illegible] حالت میں ہے۔ سال گزشتہ
[illegible] آپ سے مل کر [illegible] کہا کہ اسکیم پر کم از کم جزوی ہی عمل ہو، آپ نے کچھ جواب
تو نہ دیا، لیکن گورنمنٹ کی طرف سے ۱۲۰ روپے ملا، جس کا ملنا نہ ملنا برابر ہے۔
اب جو تجویز ہے اس سے سابق اسکیم کا خاتمہ ہو جاتا ہے، مجھ کو کوئی شکایت نہیں، لیکن مجھے
اس صورت میں ~~[illegible]~~ مجھے [illegible] کرنا ہے کہ اس صورت میں بھی [illegible]

[illegible] گزشتہ جلسے میں محبوب عالم صاحب نے [illegible] کیا تھا [illegible]
اردو کی ترقی کے لیے اس [illegible] ایک معقول رقم ملے گی، اور اس سلسلے میں [illegible]
میں نے [illegible] ~~[illegible]~~ ان سے کہا کہ [illegible] اور بتایا کہ [illegible]
ادارۂ تحقیقات اردو سے متعلق [illegible] کی بنیادی اسکیم موجود ہے اور [illegible]
[illegible] کہ اگر کوئی اسکیم [illegible] تو اس میں [illegible] لیکن [illegible]
قبل اس کے کہ میں اس اسکیم کے متعلق کچھ لکھوں جس پر کل غور کیا جائے گا، مجھے ادارے کی [illegible]
[illegible] اس کے متعلق اسکیم آپ کی بنائی ہوئی ہے، [illegible] کے بارے میں اس [illegible]
[illegible] آپ کو یہ یاد ہے کہ میں نے اردو لائبریری کو [illegible]
[illegible] گورنر۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی غالب تحقیقات اسکیم

الف — دیوانِ غالب صاحب، قیاس ہے کہ دیوانِ غالب صاحب، مجموعۂ اشعار، یعنی ایڈیشن "تبرکاتِ غالب" کا تذکرہ ہیں۔ نولکر: جلیم ... نئی بات، ص ۹۷ تا ۲۰۰ — ایک ڈراما، "اس کو کہا جاتا ہے جو حافظ غلام غالب کی اور ... دیوانِ غالب صاحب (= دنع ص ج)

یہ کمیشن ... کی اعدادی ... جلیم: یعنی ... ذع ص" وغیرہ ... نہیں یعنی" ان صاحب کا مقدمہ عدالت میں دریش ہے۔ ج: مولوی کا یہ کیا ثبوت ہے کہ اشعار الواہ لوں ہیں؟ ذع ص" صادق۔ نہیں تھے" ج: خدا گواہی کے لیے نہیں آ سکتا، دعویٰ ثابت کر سکے تو جیل جائے گی۔ دلیل ہی یہ کہ ان کا دماغی توازن ٹھیک نہیں۔ جج نے اسے مان لیا اور انہیں رہا کر دیا۔ ایک سپاہی انہیں اور جج کو جیل میں چھوڑ کر الگ ... دکھا دیتا ہے۔ ذع ص" کا رکھنا جلدی... ہم نکلے"

دیوانِ غالب صاحب، ڈراما سے ضروری نوٹ

یاس کا وطن پٹنہ تھا، یہاں کے مستند اہلِ زبان سے کہ وہ بیتاب سے اگر دی کار سے اصلاح لیا کرتا تھا۔ لکھیے یہ بھی کہ وہ کسی دولتمند باپ کا بیٹا تھا۔ بہت ہی جھگڑالو تھا، اور علوم جدیدہ سے مطلقاً واقفیت نہ تھی ہوتی؟ تو یہ بھی لکھتا کہ انگلش کسی سے معافی نہیں طلب کرتی۔

غالب کے ناقد یاس یگانہ کے بارے میں

[illegible]

غالب بحیثیت محقق کے سلسلے کی یادداشت

چھی (لفظ عـ تا ... بر کئی میں ... قرآن ... [illegible]

اسلام عہد ... [illegible] ... اور قرآن عربی ... اس کا مادہ زبان [illegible]

[illegible]

[illegible] ... سے قبل اس کا مادہ ... مگر [illegible]

[illegible]

[illegible] ... وہ اس فارسی ...

[illegible] ... کیا کہ ... [illegible] ... قرآن عربی

[illegible] ... اگر غالب ... [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... فارسی ... [illegible]

مباحث میں ان کا ... [illegible] ... مستعمل ہونا

غالب بحیثیت محقق، کے سلسلے میں

[illegible] ... 21

[illegible] ... 52

[illegible]

[illegible]

[illegible] 296

[illegible] 125

[illegible] 127

[illegible] 126

[illegible] 124

نادرات غالب ے ایک یادداشت

(۱) ایک ماخذ میں ہے کہ خواجہ حاجی غالب کے پر دادا کے بیٹے تھے ص ۹۱۔ یہ کسی ماخذ میں نہیں
یہ البتہ ہے کہ وہ رستم خاں غالب کے پر دادا کے بھائی کے پوتے تھے۔ غالب کو اس میں قطعی انکار تھا
اور واقعی اس کو تسلیم کرنے میں بڑی قباحتیں ہیں (۲) نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر جنگ
شہرت ص ۴۷ (۳) قلب علی خاں ص ۱۳۲ (۱۳۱ ص) امین الدین احمد شمس الدین احمد خاں کے
سوتیلے بھائی تھے ص ۵۰ جس کے معنی یہ کہ ماں مشترک نہ تھی [illegible] حالانکہ یہ دونوں ایک باپ
احمد بخش خاں کے بیٹے تھے [illegible] (۵) امیر خسرو کو [illegible] ۳۸ رسنگ ہے (۶)
اولاد آدم مصنف کے نزدیک فرخ فال ہے ص ۳۴۔ اس کا علم نہیں نہ بتایا ہے کہ فرانسیسی نہیں
انگریزی ہے یہ واضح نہیں کی لکھے ہیں (۷) قمار بازی کا مقدمہ نواب وزیر علی خاں کی کچہری میں
پیش ہوا تھا اور اس میں غالب کو سزا ہوئی تھی ص ۸۰ یہ قول ناظر فراق کا ہے مگر مصنف نے ان کا حوالہ
نہیں دیا۔ خود غالب کے [illegible] جو باغ دو در میں ہیں کہ [illegible] ہونا مرجح ہے۔ اس کے
قطع نظر فراق دہلوی کی حیثیت ہی کیا تھی قطع الاعتبار ہیں انھیں داستان طرازی کا شوق ہے (۸) غالب
کلکتہ میں والسرائے کے دربار میں حاضر ہوتے تھے ص ۵۹۔ غالب جس زمانے میں کلکتہ گئے تھے وائسرائے
بنگال کہاں تھے جو غالب ان کے دربار میں شریک ہوتے (۹) اس سے واقف ہو ص ۵۹ پر وہ
گورنر جنرل تھے وائسرائے تھے (۱۰) غازی الدین حیدر بادشاہ کا لقب ملاحظہ شنکر کے ہیں
کہ اختیار کیا ص ۵۲

( ) کرنل برون ص ۱۰۸ صحیح کرنل برن ( ) حاکم محمود کا فارسی ص ۱۱۰ = حکیم محمود خاں
( ) بنوق بیہالتی کی جگہ حقی لقنو ص ۱۹۵ ( ) مولانا سید محمد واجد علی شاہ دربار
کے ایک امیر ص ۹۲ ( ) Talaa T ص ۶۰ Talaatalm
جواب ہے وہ [illegible] ( ) بائز [illegible] ( ) [illegible]
باوری کی [illegible] کتاب میں کئی [illegible]
خیابان ص 35 [illegible]

(۱۱) [illegible] لاہوری کے حوالے [illegible] غلط ہے
اور [illegible] شیخ علی حزیں مراد ہیں (۱۲) غالب نے فن [illegible]
[illegible] باوجود اس کے کہ ان کا میلان اس کی طرف تھا ص ۲۶ غالب
نے [illegible] ایک شیعی [illegible] وہابیت کی طرف اس کی بات
[illegible] غالب کی [illegible] زیادہ تر [illegible] ص ۲۳

غالب پر کسی مضمون / کتاب کی تنقید

نکات کی ترتیب اسی طرح ہے یعنی جو اصلاً موجود نہیں ہیں وہ کے بعد ملتا ہے

بنام ایزد بخشندۂ بخشایشگر مہربان، الٰہی کرم گستر ای کردگار اجابت کن دانش و جنبش ما
درما چگونہ گشتہ پنہان ز دانش ما آگاہی ببیورد درما دلا ... یابی از دانش
گسترید بنمود زافزونی بہ نام ... ـــــــ ... ۶۱۱ ... مجموعہ
اشعار ... تمام

دیوان موبد سے انتخاب

گیارھویں صدی ہجری کے فارسی گو شاعر موبد کا دیوان پانچ چھ سال قبل کتب خانۂ خدا بخش پٹنہ کے لیے بمبئی کے ایک زردشتی سے جو کتابوں کے دو صندوق لے کر پٹنہ آئے تھے اور جن کا پیشہ کتب فروشی نہ تھا، دوسری کتابوں کے ساتھ خریدا گیا تھا۔ یہ نسخہ

دیوان موبد کے بارے میں

امیراللغات و نوراللغات و مہذب اللغات میں یہ بکسرۂ ثانی ہے مگر سند کے شعر میں یہ بطور قافیہ نہیں ہے کہ یہ معلوم ہو سکے کہ شاعر کے نزدیک ز کی حرکت کیا ہے۔ غیاث اللغات میں ز مکسور ہے اور یہی ایزدی آخر میں برہان قاطع و فرہنگ رشیدی میں بھی حوالہ ہے۔ ان دونوں میں کسرہ ہو تو بھی [illegible] نہیں [illegible] گئی ہیں۔ کوئی ایرانی فرہنگ بشمول فرہنگ معین و لغت نامہ دہخدا [illegible] ایسی نہیں جس میں ز مکسور ہو حرکت [illegible] کوئی فارسی ایسا نہیں ملا جس میں ایزد ایسے لفظ کا قافیہ [illegible] کا ز ماقبل [illegible] مکسور ہو۔ شاہنامہ فردوسی کا شعر ذیل جس میں ایزد قافیہ سپہبد ہے [illegible] (اذیت [illegible] غالب) [illegible] ملاحظہ [illegible] جواب [illegible] نقل [illegible] لفظ [illegible] ہے

[illegible] میں لاحقہ [illegible] جو [illegible] میں [illegible] کا [illegible] (بالفتح) [illegible] لفظ میں [illegible] اردو [illegible] تو اس کا کوئی ایسا شعر جو [illegible] میں ایزد مکسور ہو [illegible] مفتوح یاد آتی کہ ایک شعر میں ہے

امیراللغات و نوراللغات میں تو ایزد فارسی ہے۔ مہذب اللغات میں [illegible] مہذب کے حاشیے [illegible]

امیراللغات و مہذب اللغات [illegible] عالم تابع طالع [illegible] ایزد [illegible] حروف [illegible] کے عدد ترتیب [illegible] ہے۔ امیراللغات میں تو حوالہ [illegible] مہذب اللغات [illegible] یہ بات غیاث اللغات و فرہنگ رشیدی میں ہے۔ [illegible] فرہنگ رشیدی [illegible] کی کتاب کا نام [illegible] اس [illegible] آج تک [illegible] یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس فرہنگ میں یہ بات کہاں سے لی گئی ہے۔ [illegible] ایزد [illegible] حروف [illegible] چنانچہ ترجمان البلاغہ [illegible] عالم کے تابع [illegible] بات کسی [illegible] ایزدی [illegible] بالفتح [illegible] کے ایک [illegible] جس [illegible] (فرہنگ معین) [illegible] (آصفیہ) [illegible] صورت میں [illegible] اپنی کتاب کا نام [illegible]

لفظ ایزد کی تحقیق

"یہ نکتہ" حافظ کے بعد وجود میں آیا ہے۔ اور "ایزد" حافظ کے سیکڑوں سال قبل سے فارسی میں مستعمل ہے۔ اس کی قدیم ترین سند شعر رودکی ہے۔ جو لغت نامۂ علی اکبر دہخدا سے نقل کیا جاتا ہے :

اس شعر میں "ایزد" دال مہملہ نہیں، ذال معجمہ سے ہے۔ میں نے ذال فارسی سے متعلق بحث "غالب اور ذال فارسی" میں کی ہے (یہ آجکل میں شائع ہوا تھا، اور بعد کو "گنجینۂ غالب" میں شامل ہوا) اور اس کے بعد ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے ذال فارسی پر ایک مقالہ لکھا تھا، جو پاکستان کے ایک مجموعۂ مقالات میں شامل ہے۔ تا ایران کے کل فضلا مثل دہخدا، فروزنی، پور داود، محمد معین وغیرہ فارسی میں وجود ذال کے قائل ہیں۔ ایک مقالے میں جو مدت ہوئی اردو ادب میں شائع ہوا تھا، ایک گمنام ایرانی کا قول اس کے خلاف شائع ہوا تھا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایرانی اصلی ہے، یا فرضی، ہو بھی، تو کچھ فرق نہیں پڑتا، کچھ ہم پر گرگ نہیں۔

لفظ "ایزد" کے بارے میں کچھ مزید

— انتہا (و) "اثر" کردیدہ قصور نارسائی سے پھل پھول کمال انتہا کا "صابر"

— استشہاد "سودا" "زاہد جای کرشت بیچ اس کا استشہاد" سے "ہو بنی پر اسی کلام خدای استشہاد" ے

— اخراز "سودا" "وہ کش نہیں آتا تمھارا اخراز" ے

— اشتغال "ناسخ" "خوش آتا نہیں مجھ کو کچھ اشتغال" ے

— — — استفادہ و استمداد استشارہ "امیر"

— استغرا (و) "امیر" "بلفظ لوتقش استغرا سی رہ گئے" ے

— اندمال "امیر" "امید اندمال زخم تو توٹی ہے" ے

— انضمام "امیر" "بعد سلام محبت) انضمام" ے

الفاظ کا استناد

- خوب افسوس" وہ شبنم کا کرشمہ کسی خوب کا ہے۔ وہ گل سا بدن اُس میں پھوٹا ہوا" خوب کی جمع
خوباں حسینوں کے لیے استعمال لیکن خوب کا جس طرح یہ افسوس میں ہے ہمیں اور نظر نہیں آیا
- ناکاری، مؤنث ناکارہ لیاقت اردو۔ افسوس کم ہنگی باتیں کلام کی ناکا رہاں بہت ہے۔
- ناخواندی مؤنث ناخواندہ لیاقت اردو

رمندی مؤنث شرمندہ لیاقت اردو

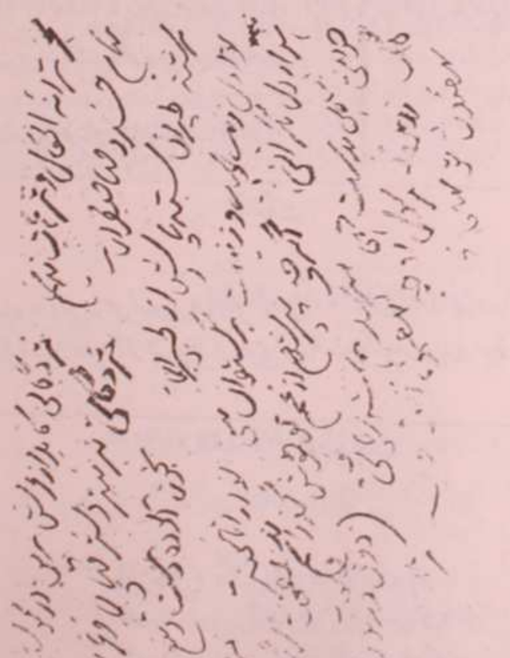
لغظیات

- نزباہ: وابی نہ سمجھ سوز کر پیمان کو نوائے یار سے جو تجھ سے کیا عہد سو نزباہ کریگا
- ڈھنڈاہٹ: عارض کو تیرے پہنچے کب اس کی ڈھنڈاہٹ سے پیار ہے ہزار مہر تو ہم گل بلانا

لغظیات: نزباہ، ڈھنڈاہٹ

فائزہ (غ ۱۲۱۲ھ) عربی = دائرہ (
"فادر ہے اس میں یہ "قافیہ خمیازہ (ہے) ف اکبر
باب زای فارسی۔ سند میں شعر بھی ہے کہ یہ
خوردہ بغائزد بیار گرا گشتہ ہے "بغائزد" فائزین
کے وجود پر شہادت۔ معیار میں فائز ہے اور فائزہ
ہے اور برہان جامع میں بھی یہ دونوں ہیں۔
معین میں ان دونوں کے علاوہ فائزیدن بھی۔

لغظیات



الفاظ اور طرق استعمال کے سلسلہ میں کسی فارسی شاعر سے انتخاب (پنسل سے)

دیوان یکرو (رنگ گرد آبرو) مرتبہ پروفیسر شمیم انہد لے نا - فرہنگ آصفیہ میں نہیں : ۱ معنی "وہ موم بنی نرم دل کرد بتاں کا" ص ۱ ۲ یوں "یا لعل پہ تیرے ہے یہی رنگ یوبیاں کا" ۳ جیسے "ہوتا ہے جبیں پر کے آگے حال کتاں کا" ص ۱ ۴ اگر ص ۱ ۵ یعنی "سب درد ہوئی حاف ہیں کو سبب اس کے ص ۱ ۶ نمانا "اگر ہیں قصداً غالم رے دل کو ستانے کا ۷ سب کیا ہے سبھی مجھ سی نمانے سی بہانے کا" ۸ اپنی "نہ ہو دی کیوں کے گردوں پہ صدا دل کی بلند اپنی" ص ۲ ۸ یکرو ۹

فرہنگ آصفیہ کے نقائص کے جائزہ کے سلسلے میں یکرو کی لغظیات

— خوب اصنوس، وہ شبنم کا کرشمہ کسی خوب کا ہے — وہ گل سا بدن اس میں بھیگو تا ہوا" خوب کی جمع خوباں حسینوں کے لیے مستعمل لیکن خوب کا جس طرح یہ افسوس میں ہے ہمیں اور نظر بھی آیا نہ ناکاری، مونث ناکارہ بسیاق اردو۔ افسوس کہ ہنگی باتیں کام کی ناکار بہت ہے

— ناخواندی مونث ناخواندہ بسیاق اردو

بمنندی مونث شرمندہ بسیاق اردو

لغظیات : میر شیر علی افسوس کے دیوان سے چند الفاظ کی سند

— نرم شانہ میر، الہ پہ نرم شانہ کو تکیہ میں بھی دیو

— خمار کھینچنا میر، آنکھوں کو دیکھ اس کی آخر خمار کھینچا [illegible]

شراب
کھلتا ہو کیف جو پیو جتنا ادویہ ایجاد [illegible]

— ایدھر اُدھر [illegible] میرا [illegible] آنکھیں جنہوں میں اس کی کہ ایدھر آسے ہوتو نا [illegible] ادھر
— کیا ہیں آنکھوں میں [illegible] ١٥٥ — تصنیع کچھ [illegible] تیار [illegible] رحمت میرا زندگانی [illegible]

— [illegible]

— باز خواہ میر، از خواجوں کی میرا گو اس عیش کے [illegible] ١٦٧

— [illegible] صفحہ میں بھی اور ایسا ہیں ہیں: — عیار ہیں ١٥٥ — تصریح [illegible] ١٤٥ — انتظار [illegible]
— عادت سخن ١٢٢ — قادر سخن ٢٠٦ — اسلوب [illegible] ١٦١ — [illegible] ٢١٥ — بیعت [illegible]
٢٢٥ — تغیرہ ٢٢٧ —

— [illegible] آنکھوں میں بھی میرا [illegible] اوڑھ پر [illegible] ١١٣ —
— [illegible] آنکھوں [illegible] میرا مستی میں ہم کو [illegible] ٢٠١
— [illegible] صفحہ میں بھی میرا ٢٠٢
= لاگنا = لگنا میرا فرمایا لاگے [illegible] اس کی جواب میں ٢٠٣ ٢١٦
— مردود میرا خون خشک افسردہ [illegible] ٢٠٦
— [illegible] مسخرہ سب [illegible] ٢١٢ پر [illegible]
— [illegible] ایک کتاب میں [illegible] پہ رقیب ٢١٩ تیری [illegible] سے [illegible]
— [illegible] میرا گریباں [illegible] ٢٢٣ [illegible]
[illegible]
[illegible] میر، کیا [illegible]
— [illegible] [illegible] ٢٢٤

—— اُسترہ، ستر، ستوُرہ، استردن (ع ۱۳۲۳ تا ۱۳۲۹) بوزن
کفن (برہان) "بلغت پہلوی" ہرگز نہیں لغت ۱۸ اور ۱۳ بحر ستر اور ۱۲ پر [illegible])
[illegible] اور ستور [illegible] [illegible] قطعۂ سعدی "آن شنیدستی کہ روزی تاجری
در بیابانی بیفتاد از ستور — گفت چشم تنگ دنیا دار را — یا قناعت
پر کند یا خاک گور" استردن بھی برہان میں [illegible] اور ۱۳ جمع لغت ۱۸ (
) [illegible] بھی ثابت کہ لوگ ستور پر چڑھا کرتے تھے اور اس کی
ت مضموم ہے۔ ستور یا تکی بھی ہو سکتی ہیں (حرکت ابجد کہ داخل قافیہ
نہیں) اس لئے ہم کسی خاص حرکت کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی فرہنگ بھی
نہیں جس میں استر لغت ۱۸ ہو، اب برہان کی [illegible] — یہی [illegible]
تو حرکت داخل قافیہ نہیں، اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ مسعودی یا طیان
مرغزی کا ایک شعر جس میں اکثر قافیہ پیوستن لواو مفتوح ہے
نیست جانم شاد و چو اکثر — بجز [illegible] کنم چو کیف (جہانگیر
دو نسخہ کتابوں میں) — اسی طرح [illegible] عنصری "بجای موکب گوہر نہاد
بہا ستر ہے، [illegible] "ببلکہ [illegible] ہمیں [illegible]" ولی و
رامین "تواند گوہر ہمی مانی با استر" ہے — قصائد سنائی "بار [illegible] ستر
بہا شتو استر [illegible]" — انوری "درپی اشتر [illegible]"
(خرائتی ہے) [illegible] — ، [illegible] فرہنگ [illegible] میں ہے:
از [illegible] استر [illegible] تو با استر ہے — چون تو [illegible] [illegible]

استر جس فرہنگ میں ہے، [illegible] ہے [illegible] میں درج [illegible] جانی ہو
[illegible] پر [illegible] ہیں [illegible] آخر [illegible] بت آخر [illegible] در حماقت
چو [illegible] — [illegible] ہمچو اشتر [illegible] — [illegible] زبان میں انوریہ
چار پایان خود مثل [illegible] و [illegible] اور ستور (س ساکن ت مفتوح ہمزہ
لغت [illegible] [illegible] [illegible] چار پایان [illegible] مثل ستور [illegible] استر [illegible]
[illegible] (لغتنامہ ہے) یہ لفظ فارسی میں استور و ستور ہوگیا ہے
[illegible] ستور [illegible] ولی و رامین "[illegible] ستور [illegible] [illegible]" ہے [illegible]
۵ — سے کو [illegible] ہے = [illegible] دیکھو ستور فارسی

اُستر، ستر، ستور اور استردن کے بارے میں

— ایمان :۔ رحم علیخان، مولد فتح آباد صاحب تذکرۂ گلشن و مطلع الشعرا وغیرہ، موت فتح آباد ۱۲۲۶ھ (دلی)

— انور :۔ شاہ علی اکبر بن حیدر علی رفیق عمدۃ الملک امیر خان عالمگیری (متوفی ۱۱۰۹ھ) ایک مدت تک باپ کے ساتھ کابل میں رہے اس کے بعد نظم آباد آگر تکیۂ آغا حسینا میں گوشہ نشین ہو گئے۔ آغا حسینا کی بیٹی ان کی منکوحہ تھی۔ تذکرہ میں ایک موت ۱۱۵۵ (خوشگو) مصحفی نے لکھا ہے اس میں عربی کے بہت آنا لکھا ہے

— انجم :۔ محمد علیخان بن صاحب حسین فلک کے شیخپورہ ضلع مونگیر کے شاگرد غالب، موت ۲۵ شوال ۱۳۰۸ھ آہ غروب انجم از ڈاکٹر کلیم جواد (بیاض جابر علیخان)

— امیر الدین علی شہر نگار فارسی کے استاد باقر آگاہ تھی انہی کے رقعات کا مجموعہ "رقعات امیری" ۱۲۰۷ میں مرتب کیا تھا، اور انہی سے اس کا مسودہ لکھوا چاہتے تھے۔ امیر الدین علی اردو کے عارف مدراس سعی کے کرور ہیں شام کو ۱۸ ذیقعدہ ۱۲۸ کو راہی عدم ہوئے کے مدفن نا پر لکھے بار ان لبسوی کوار سلام از آگاہ۔ تھی کے ۲ قطعے تاریخ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے عمر ۸۶ سے زیادہ نہ تھی بروز جمعہ سنہ مذکور کی ۱۱

— انور :۔ مرزا اسد اللہ بیگ شمس الدولہ کلیات تاریخ میں قطعہ دیل
انور علی از فیل بیفتاد و مرد ہر کس کہ شنید گفت بہم افسوس
تاریخ وفات او نوشتم تاریخ "افسوس ای ستم ہجوم افسوس"
مصرع آخر کے بچے ۱۲۲۸ مرحوم ہے اور اسی سے بنی نکلتا ہے۔

شاید شعرائے اردو کی انسائیکلوپیڈیا کا کوئی منصوبہ ذہن میں رہا ہو

— آشفتہ، میرزا محمد صالح، اصلاً ایرانی۔ ان کے والد میرزا محمد زماں "داروغۂ توپخانۂ صوبۂ کابل" تھے۔ آشفتہ لاہور آئے اور (ظ) یہیں ۱۱۷۲ میں فوت ہوئے (حاکم)

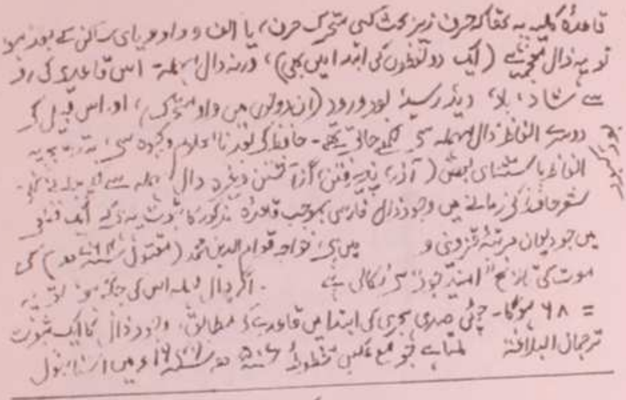
ارسلان خان، خ خوشحال خان بہادر فتح جنگ کی نسل سے خان بن عبداللہ خان چنگیزی کاشغری از اعاظم امرائے عالمگیری م ۲۴ ربیع ۱۱۲۱ (معصر)

امام قلی آتو خ آخوخان "سر آورد یا القدری" "در ہنگامی کہ حضور میرفت در صوبہ اکبرآباد بود کی تاختہ کشتہ شد" (سماع)

سردار بیگ خ احتشام خان تخمیناً سرداری خان بن باقی خان چیلہ از امرای عالمگیر م ۱۱۰۳ (مآثر محمم)

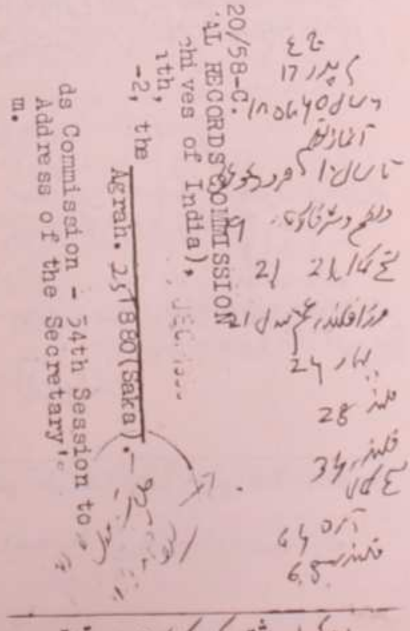
میر میران خ امیر خان بن خلیل اللہ خان بن میر میران نعمت اللہی یزدی، م کابل ۲۷ ربیع ۱۱۰۹ عمر ۶۵-۶۰ از اولاد گنز (نجم سماع مآثر)

شاید شعرائے فارسی کی انسائیکلوپیڈیا کا کوئی منصوبہ ہند میں رہا ہو



۴۴ قاعدۂ کلیہ یہ تھا کہ حرف زیر بحث کسی متحرک حرف، یا الف و واو و یای ساکن کے بعد ہو تو یہ ذال معجمہ ہے (ایک دو لفظوں کی ابتدا میں بھی)، ورنہ دال مہملہ۔ اس قاعدے کی رو سے شاد، باد، دید، رسید، بود، ورود (ان دونوں میں واو متحرک)، اور اس قبیل کے دوسرے الفاظ ذال معجمہ سے لکھے جاتے تھے۔ حافظ کے بعد [illegible] الفاظ با استثنای بعض (آذر، پذیرفتن، گزاردن، گنبذ [illegible]) دال مہملہ سے [illegible]۔ حافظ کے زمانے میں وجود ذال فارسی بموجب قاعدہ مذکور کا ثبوت یہ ہے کہ ایک قطعہ میں جو دیوان مرتبۂ قزوینی و [illegible] میں ہے، خواجہ قوام الدین محمد (مقتول ۷۶۴ھ) کی موت کی تاریخ "امید جود" سے نکالی ہے۔ اگر دال مہملہ اس کی جگہ ہو تو یہ = ۶۸ ہوگا۔ چھٹی صدی ہجری کی ابتدا میں قاعدے کے مطابق واو و ذال کا ایک ثبوت ترجمان البلاغہ [illegible] ملتا ہے جو مع عکس مخطوطہ ۵۰۷ھ در ۱۹۴۹ء میں استانبول

ذال معجمہ کے بارے میں



ان کی یادداشتیں کیسے کیسے کاغذ پر ہوتی تھیں

سید اسداللہ ... سیادت ... از علمای معروف ... و شعرای عالمگیر ...
در ... (مجمع ...)

محمد جان آتش خان بن محمدیان بیگ (م ح ۱۰۶۰) روز ...
از امرای عالمگیر در ... کرناٹک بیجاپور م ۱۱۱۰ (مجمع ...)

امانت خان میر محمد حسین بن میرک معین الدین امانت خان
خوافی، ... در حکومت ... ۱۱۱۱ (...)
...

ناصر علی سرہندی م دہلی ۵ یا ۶ ۱۱۰۸ - تحفۃ ...
۶، ۹، مادہ تاریخ آہ از رحلت ناصر علی [۱۱۰۵]
(دیوان ... شرفا ...)
... ایضاً تحت سنہ ۱۱۲۰ "ناصر علی سرہندی ...
دریں سال رحلت کرد (... دیوان علی از ...)"



آوارۂ گرد اشعار

افعی زلف تو رسنا نہیں بن جان لیے ۱ کیا ہی بلا اد

یہ مطلع امیر اللغات و تہذیب اللغات دونوں میں تحت "اف ترا کا"
سے مندرج ہے لیکن، دراصل میر امامی اسد دہلوی کا ہے اور ان کے نام
امیر مینائی کے تذکرے میں جس کا اختتام غالب کی ولادت سے قبل ہوا تھا، موجود
رامپور کے متوسل تھے، اور اسی تذکرے کا ایک نسخہ کتب خانہ ریاست میں تھا۔ اور
یہ رامپور میں لکھی گئی تھی۔ تعجب ہے کہ ایک ایسا شعر جو نہ غالب کی طرز کا ہے
یعنی بہو جودی کہ امیر نے غالب کی طرف منسوب کر دیا۔ نہ معلوم اس کی کیا سند
بہتر ہے کہ ان کی ماخذ تحقیق حیرت انگیز ہے۔ مؤلف تہذیب اللغات نے بھی
انھوں نے اسی کی سند پا کر اور کتاب کا اس انتساب کر لیے

۲ کبھی

تو تو بھول گیا ... لا درس ... فراق میں
فرہنگ آصفیہ ... میں غالب کا یہ مشہور شعر مصحفی کے نام درج ہے کہ
... مصحفی کی طرف اس کا انتساب نہیں کیا، مصحفی کے کسی دیوان

آوارۂ گرد اشعار

افعی زلف تو رسنا نہیں بن جان لیے — اف ترا کاٹا نہ جیے

امیر مینائی کی امیر اللغات کے حصۂ اول میں جو رامپور میں جس وقت امیر متوسلین ریاست تھے
غالب کے نام مندرج ہے، اور تہذیب اللغات میں بھی انھیں کے نام سے ہے (ہر دو تحت "اف ترا کاٹا
نہ جیے")

آوارہ گرد اشعار کا ابتدائی ڈرافٹ

لیکن تمہاری شاعری "ہے — یار سے ہوا شاہ دکھنوی سے منسوب ہو جای
جوانی سے زیادہ وقت پیری جو غنی ہوتا ہے ملکر کنارے چراغ ہے جب خاموش ہوتا ہے

تمہارا دیدہ جو دیدار کا آستین پکڑی — بر رنگ نقش قدم ہم نے بھی زمین پکڑی
محمد عابد دل کا مطلع ہے (حسن ہے "شوق") لیکن مجموعہ
میں بنام محمد عابد جو نقش ہے نگر نگار — ہے میں جو یہ مرقوم ہے کہ قائم نے بھی
تو فرزند کے نام سے لکھا ہے غلط محض ہے۔

اٹھا دے کوئی کسی نے پھونکے میری آستین پکڑی — بر رنگ نقش پا اس دیدہ جب میں نے زمین پکڑی
یہ اندراج اشعار — گلشن بیخار کو مجموعہ م میں لکھا بدایونی کے نام

…سے منسوب ہے

تھکا ہے منزلوں کا یا پیاس ہاں سے ملاتا ہے الٰہی خیر بھیجو نامہ بر کچھ سست آتا ہے
حاجت
ہر گز قاصد کی سری

IDARA - E - TAHQIQAT - E - URDU

(URDU RESEARCH INSTITUTE)

Birla Mandir Road, Patna-4

ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ ۴

Ref. No. [illegible] Date. ۹ اکتوبر [illegible]

شفیق محترم، خوشی ہوئی عمر دراز پا کر اور اردو کی خدمت کرتے ہوئے

خط اور رسالہ کتابیں ملیں۔ دلی شکریہ

میری صحت پانچ برس سے خراب ہے۔ اس کا اثر قوتِ ارادی پر بہت ہوا ہے اور کسی قدر حافظہ بھی متاثر ہے۔ غالب اور صفیر بلگرامی پر میرا مضمون خدا بخش لائبریری جرنل میں شائع ہوگا۔ آپ نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس پر اضافہ [illegible]

میں نے [illegible] ایک رسالہ [illegible] نکالا تھا۔ اس کے [illegible] میری طویل علالت کی وجہ سے بند ہو گیا۔ [illegible] آپ کے پاس [illegible]

[illegible]

تخلیقی ادب کے ایک شمارے میں [illegible] کے متعلق بہت کچھ [illegible]

کہ اس شخص نے ایک ضخیم کتاب [illegible] کی مخالفت [illegible]

[illegible] مشہور ہو جائیگا [illegible]

یہ کتاب دکھائی [illegible]

[illegible]

[illegible] کتاب [illegible]

[illegible]

[illegible]

آپ [illegible] بہت [illegible] غالب [illegible]

[illegible] امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے

مخلص

قاضی عبدالودود

۱۔ علمی ادب [illegible] میں [illegible]

مکتوب بنام شفیق خواجہ صاحب ([illegible])

بخدمت

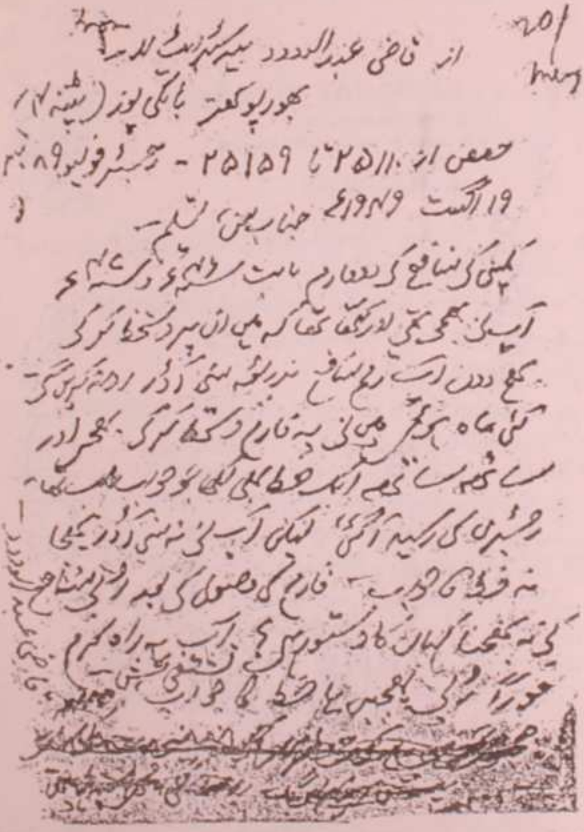
جناب مشفق خواجہ

کراچی،

محمود شیرانی ۱۸۸۰ء صد سالہ تقریب ولادت

BIHAR URDU ACADEMY, PATNA-16

مشفق خواجہ صاحب والے خط کا لفافہ



از قاضی عبدالودود بیرسٹر ایٹ لا

بھور پوکھر بانکی پور (پٹنہ ۴)

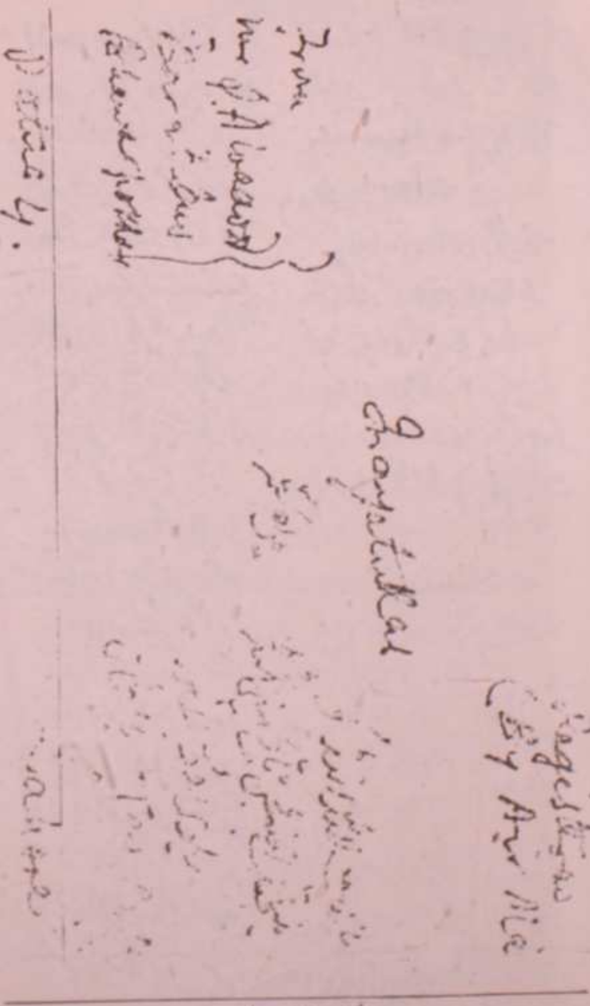
حصص از ۲۵۱۱۰ تا ۲۵۱۵۹ - رجسٹر فولیو ۸۹ نمبر

۱۹ اگست ۱۹۴۹ء

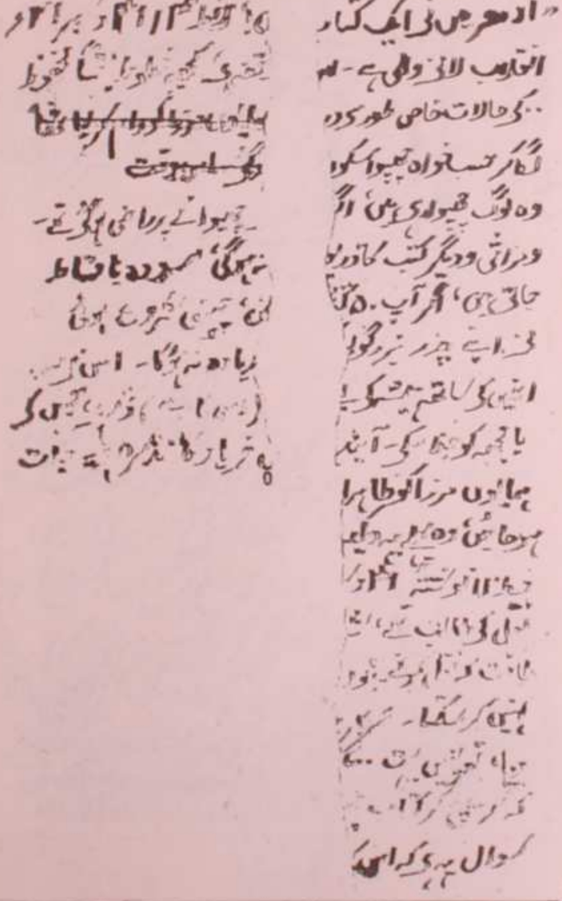
جناب من تسلیم۔

[illegible]

ایک خط



ایک لفافہ پر پتا



کسی کے نام کسی خط کا ایک ٹکڑا

شفیق کرم

آپ کا خط ملا۔ میر ضاحک دہلوی پر آپکا اقتباس

اس قسم کے مقالوں میں ہے دوسروں نے ضاحک سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا

ناگزیر ہے۔ اس مضمون میں اغلاط طباعت بہت ہیں۔ میرے پاس کوئی نسخہ

محفوظ ہے اسکی تصحیح کر کے آپ کو بھیجدونگا۔

مثنوی میں میری ایک ... گلزار ارم ... ۱۱۹۳ھ کی تصنیف ہے

... گلزار ارم کو گلدستہ لکھا ہے اور اسے تاریخی ہے ... اسکے ...

فیض آباد کے ذکر میں ... اشارہ کیا گیا ہے جو اس وقت

... جب وہ ... فیض آباد آئی تھی ... آپ اس پر

... خود لکھا ہے ... میں ...

میرا خیال ہے کہ جس وقت ... اسکی عمر ...

... ۱۱۷۳ھ ...

[illegible]

ایک خط (بنام ؟) بسلسلۂ ضاحک و میر حسن، کاغذ کے نچلے حصہ میں اس خط کے اوپر جو شاید کبھی بھیجا نہ جا سکا، کچھ یادداشتیں شروع ہو گئی ہیں

جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار

ڈی ڈی
۵ جون

امید ہے کہ آپ تو سکون میں، آپ نے آل کے مطابق
کی منطق گفتگو جلد ہوتی تو اچھا تھا
الحمداللہ آپ کے دیئے تحفہ کا فروخت ہی۔
کتاب الابنیہ اور گفتگو اہم ہے اسکی ردجا ودعا کے لیے والسلام
شکریہ قاضی عبدالحکیم

مکرمی تسلیم - مزاج گرامی

آپ کا خط موصول ؟
بے چینی سے منتظر رہے
کسی وقت زحمت فرمائیں
تبادلہ خیال کی تمنا ہے
مد دل سے گی
نہایت احترام
بیدار

بنام بیدار

آج ۵ بجے رات کو [illegible] کہ دارالعلم [illegible] ۔ لکھا ہے [illegible]
میں گھنٹے [illegible] لگ گئے ۔ [illegible]
فہرست ۵ [illegible] میری ایک [illegible]
کا [illegible] جواب ۔
[illegible] نہیں دیا اردو [illegible]
[illegible] اگر واپس [illegible] تو [illegible]

قاضی عبدالودود
[illegible]

33 1/2

بنام بیدار

۲۴ نومبر [illegible]

جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار
۵ دن ہوئے کہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ
آپ ایگزیکٹو کمیٹی کا جلسہ فوراً منعقد کرائیں
جہاں تک [illegible] مستعفی کر [illegible] مگر
اس وقت تک نہ [illegible] ہوئے [illegible]
سلسلے میں کوئی کارروائی [illegible]
جلسہ [illegible] بجے [illegible]
[illegible]
[illegible]

بنام بیدار

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بنام بیدار

کرشن چندر کی یہ کتابیں مطلوب ہیں: [1] جنگل کی جنگلی، [2] دادی کی نہر، [3] مبند رکی
ہم کے بعد زرگاؤں کی رانی —

وڈہاؤس کی یہ کتابیں: [1] The White feather, [2] Tales of St Austins, [3] Eggs, beans & crumpets,
[4] Mike, a public school story اور

آج اس وقت تو لائبریری بند ہوگی، براہ مہربانی کل ورنہ پرسوں ہی کتابیں بھیج دیں مگر وہ نہ بھیجیں جو پچھلے ماہ آ گئی ہیں۔ اور
Piccadilly Jim بھی نہ بھیجیں۔

اردو ناول بھی بھیجیں، مگر کرشن چندر کی کوئی کتاب نہ ہو۔
سلام، کیا آپ وطن جا رہے ہیں؟
ہم دونوں جاتی ہیں

[illegible]

قاضی عبدالودود

[illegible]

[illegible]

اب [illegible]

میں آج کل میری [illegible]

لیکن [illegible] بھیں کو

بچا [illegible] ہے [illegible]

کو [illegible] ہے

تذکرہ [illegible] سے جو کچھ نقل

[illegible] کیا تھا نقل [illegible]

مہربانی [illegible] دیا ہے اور [illegible]

اردو [illegible] میں [illegible]

[illegible]

لیک [illegible]

[illegible]

شکریہ

میں آج کے جلسے میں شرکت نہ کر سکوں گا

سات بجے گھر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے - قاضی عبدالودود

دار السلام پٹنہ تک آپ کا فون نہیں آتا

جاسوسی دنیا

عمار رکشٹ

بالکٹ واپس ہیں۔

براہ مہربانی ۳ ناول (ان ناولوں میں سے جن کو ناموں کے ساتھ پنسل سے نشان لگا ہوا ہے) بھیج دیں - فہرست جاری ہے

مسز ودود

پی جی ووڈ ہاؤس کے ۳ ناول واپس ہیں - اس کے دو دوسرے ناول براہ مہربانی بھیج دیں مگر Pickwick papers اور دو ناول جو میں ایک بار دیکھ لیے واپسی کے بعد دیکھے ہیں نہ بھیجیں - شکریہ

قاضی عبدالودود

بنام بیدار

پہلے رقعہ میں مسز ودود کی طرف سے بھی چند سطریں (بخط قاضی صاحب)

(۱)

جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار

[illegible]

شکریہ

قاضی عبدالودود

(۲)

جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار

براہ کرم مسودہ قاضی عبدالودود [illegible] ڈاکٹر صاحب حامل ہذا کو مرحمت [illegible]

قاضی عبدالودود

(۳)

[illegible]

قاضی عبدالودود

(۴)

[illegible]

قاضی عبدالودود

(۵)

قاضی عبدالودود کی فائل متعلق انتقاد طلب کرکے مرحمت [illegible]

(۶)

[illegible]

(۱) تا (۵) رقعات بنام بیدار

(۶) ایک یادداشت

خدابخش

○ خدابخش نامه

● ——— دکتر محمد حسین تسبیحی

○ آشنایی با کتابخانهٔ عمومی خاورشناسی خدابخش

● ——— دکتر محمد حسین تسبیحی

دکتر محمد حسین تسبیحی (رها)
ایران پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف پرشین اسٹڈیز
اسلام آباد، پاکستان

خدابخش نامه

نشان علم و عرفان شد خدابخش   سر هر کشور جان شد خدابخش
کتب خانه ازو آباد گشته   بهارستان نیکان شد خدابخش
حدیث و فقه و حکمت با قرائت   همه تفسیر قرآن شد خدابخش
بُود گنجینهٔ اشعارِ زیبا   مثال گنج پنهان شد خدابخش
ببین آن شاعران صف در صف   غزل گویان خوبان شد خدابخش
همه آن نسخه های خوب و نایاب   چو دُرِّ بحر عمان شد خدابخش
بود جز نل یکی گنج سخن در   چو گوهر در بهاران شد خدابخش
تصاویرش بُوَد خوب و فریبا   چو خورشید درخشان شد خدابخش
خطوطِ شاعران و خوشنویسان   سرای خوشنویسان شد خدابخش
تواریخ دل انگیز و شکوفان   سندهای فراوان شد خدابخش
برای خدمتِ مردانِ اسلام   کمالِ عشق انسان شد خدابخش
کمر بسته به تعلیم و تعلّم   نهال باغِ نعمان شد خدابخش
صفاتِ مردمی را زندگی داد   محبّت را گلستان شد خدابخش
همه آثار و عرفانِ الٰهی   خزاین را شبستان شد خدابخش
گر از یعقوب و یوسف عشق جویی   تو گویی ماهِ کنعان شد خدابخش
چو گنج داستان های ادیبان   ادب را نکته گویان شد خدابخش
نشان از گلشنِ حسنِ صداقت   بهارستانِ ایمان شد خدابخش
جهانِ عشق و عرفان را وفا بود   مسلمان خدادان شد خدابخش
دلش غرقِ محبّت های اسلام   عزیزِ هر مسلمان شد خدابخش

خدا رحمت کند او را همیشه | غریقِ لطف رحماں شد خدا بخش
وجودِ او سراسر شوقِ عرفاں | به عرفاں روحِ یزداں شد خدا بخش
کتاب آئینهٔ احوالِ انساں | همان آئینِ انساں شد خدا بخش
کتب خانه بُوَد نور علیٰ نور | از آں نورِ درخشاں شد خدا بخش
نوادر را ببیں در آں نمایاں | نوادر را نمایاں شد خدا بخش
هنرهای جهان پاکِ اسلام | خزاین را نگهباں شد خدا بخش
بُوَد عابد رضا بیدار و دانا | از او چوں گوستاں شد خدا بخش
به خلق خوش بود چوناں فرشته | به پاکی چوں شهیداں شد خدا بخش
به تاریخ و ادب یکتا مسلماں | یکی مهدِ دبستاں شد خدا بخش
برایَ جذبهٔ حق و حقیقت | کلیم طورِ عمراں شد خدا بخش
کمالِ مردم دانا در او بود | سخن گوئیَ فقیراں شد خدا بخش
ز بهرِ عاشقانَ علم و فرهنگ | به میداں شیر غرّاں شد خدا بخش
بُوَد پتنه مکان علم و ایماں | چو هندستاں صفاهاں شد خدا بخش
نسیم شهرِ پتنه مشک بُو شد | ابو ریحانِ ایراں شد خدا بخش
بُوَد پتنه یکی شهرِ بزرگاں | دل و جانِ بزرگاں شد خدا بخش
صبا از کوچهٔ پتنه گذر کن | ببیں آنجا غزل خواں شد خدا بخش
الٰهی کن نصیبم تا ببینم | همانجا که شگوفاں شد خدا بخش
سراسر خاکِ هندستاں بگردم | صفای پاکبازاں شد خدا بخش
به هر جایی بود آثارِ ایماں | چو جبرئیل پیک شاهاں شد خدا بخش
نگر بر کاروانِ علم و حکمت | چراغِ راهِ آناں شد خدا بخش
گلستانِ همه عشاق دانش | گل خوشبوی نازاں شد خدا بخش
یکی از رازهای عشقِ الله | بدان الله گویاں شد خدا بخش
مسیرِ او به سوی درگهِ حق | به آنجانب شتاباں شد خدا بخش

الٰہی در بہشت عنبریں باد — چو طوبیٰ نخل ایماں شد خدا بخش
درودِ من بود بر بارگاہش — مسلمانِ جہانداں شد خدا بخش
صبا از من بگو با شہرِ پٹنہ — سفیرِ نوجوانان شد خدا بخش
بہ ایراں گشتہ مشہورِ بزرگاں — بہ کرماں ماہ ملماں شد خدا بخش
تمام مثنوی گویانِ تاریخ — اساس قصہ ہاشاں شد خدا بخش
اگر از شمس و از رومی بخواہی — ہمہ شورِ نیستاں شد خدا بخش
اگر آثارِ سعدی را بجویی — حکایاتِ گلستاں شد خدا بخش
گلستاں را بداں چوں کاغذ زر — زر و گوہر بہ داماں شد خدا بخش
نصیحت نامۂ سعدی اثر بخش — سخن را گنج شاداں شد خدا بخش
فراواں جنگِ اشعار و غزل را — ببیں ہمچوں حدی خواں شد خدا بخش
چو از فردوسی و شہنامہ پرسی — بداں کاخِ سخنداں شد خدا بخش
نظامی آں حکیم خمسۂ عشق — یکی از خمسہ خواناں شد خدا بخش
بود خسرو شہِ موسیقی و شعر — برای او ثنا خواں شد خدا بخش
اثر از ابن سینا گر بجویی — شفای جسم و ابداں شد خدا بخش
بجو از فخر رازی علم و حکمت — مباحث را ادب داں شد خدا بخش
رباعی ہای خیام و ریاضی — بداں اختر شناساں شد خدا بخش
بہ طب و فلسفہ او را محبت — طبیب دردمنداں شد خدا بخش
خراماں و شتاباں تعلیم — چو دریای خروشاں شد خدا بخش
خوشا آں درگہِ عشاق ہندو — بہار خوش چیناں شد خدا بخش
محققِ عاشق و یار خدا بخش — کہ خورشید خراساں شد خدا بخش
سرہا از عاشقانِ درگہِ او — کہ غمخوارِ ادیباں، شد خدا بخش

دکتر محمد حسین تسبیحی (رها)

آشنایی با کتابخانهٔ عمومی شرق شناسی خدابخش

آن روزها که در دانشکدهٔ ادبیات دانشگاه تهران مشغول تحصیل بودم، بسیار علاقه‌مند بودم که سانسکریت و اردو بخوانم. استاد زبان و خط سانسکریت مرحوم پرفسور ایندوشیکهر بود. استاد اردو مرحوم دکتر سید باحیدر شهریار نقوی بود. من هر دو درس اردو و سانسکریت را می‌خواندم. آقایان دانشجویان فقط برای نمره گرفتن آمده بودند. من که با علاقه و عشق وافر می‌خواندم و مطالعه می‌کردم، گاهی مورد تمسخر و استهزا واقع می‌شدم. زبان و خط سانسکریت را خوب یاد گرفتم و همین طور زبان و خط اردو را نیز یاد گرفتم و در امتحان نمرهٔ خوب گرفتم.

کتاب راهنمای سانسکریت تألیف آقای پرفسور ایندوشیکهر بود که از طرف ادارهٔ انتشارات دانشگاه تهران چاپ و منتشر شده بود. به همین ترتیب کتاب راهنمای اردو نیز تألیف آقای دکتر سید باحیدر شهریار نقوی چاپ شده بود، و این هر دو کتاب درسی بودند.

اما من که علاقه‌مند بودم بیشتر مطالعه کنم و به زبان و ادبیات و تاریخ سانسکریت و اردو آشنا گردم، همواره از استادان ارجمند چیزهایی می‌پرسیدم و پاسخ‌هایی می‌شنیدم. مرحوم پرفسور ایندوشیکهر شوق و عشق مرا به سانسکریت دریافت و گفت:

"شما باید با من به کار ترجمهٔ "شکونتلا" اثر کالیداس بپردازی و در این راه به من کمک کنی، هم خودت چیزی یاد می‌گیری و هم برای من فایده دارد."

کار ترجمهٔ "شکونتلا" داستان زیبای هندی آغاز گردید و خیلی زود به پایان انجامید و از طرف بنگاه ترجمه و نشر کتاب (سابق) چاپ شد. من که باز هم می‌خواستم چیزهایی بهتر و بیشتر بفهمم و یاد بگیرم، از مرحوم پرفسور ایندوشیکهر درخواست کردم که مطالبی دربارهٔ هندستان و شهرهای آنجا و کتابخانه‌ها و موزه‌ها و مراکز علمی و دانشگاهی برای من بیان کند. ایشان با گشاده‌رویی مطالبی بسیار ارزنده برای من بیان کردند و من کوشش می‌کردم که آنها را یادداشت کنم. چون علاقه‌مند به کتاب و کتابخانه بودم، بیشتر آنچه مربوط به کتابخانه‌های سرزمین هند بود، یا می‌نوشتم و یا به خاطر می‌سپردم.

اکنون که این مطالب را می نویسم، درست ۳۵ سال از آن تاریخ گذشته است یعنی در سال ۱۹۵۶ء میلادی برابر با ۱۳۳۵ھ ش من در دانشکدهٔ ادبیات دانشگاه تهران درس می خواندم آن کتابخانه ای را که استاد مرحوم ایندوشیکهر دربارهٔ آن بسیار گفت و گو کرد کتابخانهٔ عمومی شرق شناسی خدابخش بود، او گفت این کتابخانه در شهر پتنه قرار دارد و کتاب های فارسی بسیار در آن گردآوری شده است. مالک کتابخانهٔ خدابخش، مردی ثروتمند و مال دار است. او کتاب های چاپی و خطی در کتابخانهٔ خود گردآوری کرده است او همیشه می گوید که : ؎ " ز بهر روشنی دل مرا ندیم کتاب "

خدابخش همان خانهٔ خود را که مانند یک کاخ باشد، به صورت کتابخانه درآورده است و از دور و نزدیک، کتاب فروشان ثابت و سیار برای او کتاب می آورند و او می خرد و در قفسه های کتابخانه اش قرار می دهد. البته کسانی هم که علاقه مند به کتاب باشند، به کتابخانهٔ خدابخش مراجعه می کنند و گنجینه های علوم و فنون و ادب و فقه و اصول و زبان و فرهنگ هند و تاریخ و روزنامه و مجله و غیرهم در اختیار آنان قرار می گیرد و از آن ها بهره مند می شوند.

این اطلاعات را دربارهٔ کتابخانهٔ خدابخش از مرحوم پرفسور ایندوشیکهر شنیدم و یادداشت کردم. سپس در کلاس های درس استادان ایرانی همواره می شنیدم که فلان نسخهٔ خطی ارزنده در کتابخانهٔ خدابخش موجود است. مثلاً مرحوم استاد عبدالعظیم خان قریب گرگانی می گفت :

" اصل کتاب "کلیله و دمنه" در کتابخانهٔ خدابخش در هندستان موجود است !! "

اما مرحوم استاد ایندوشیکهر می گفت :

" اصل کتاب "کلیله و دمنه" "پنچاتنترا" می گویند یعنی "۵ فصل" که به زبان سانسکریت می باشد و ممکن است در کتابخانهٔ خدابخش باشد "

در کلاس درس مرحوم استاد دکتر محمد معین، مرحوم استاد بدیع الزمان فروزانفر، مرحوم استاد جلال الدین همائی، مرحوم استاد ابراهیم پورداود و نیز در کتاب های آنان همواره سخن از کتابخانهٔ خدابخش به میان می آمد و عاشقان کتاب و کتابخانه را به هیجان در می آورد.

روزها و ماه ها و سال ها گذشته است و روزگار من با کتاب و کتابخانه می گذرد و بارها اتفاق افتاده که نامه هائی به کتابخانهٔ خدابخش بنویسم و چون به زبان فارسی مکاتبه می کنم، پاسخ نیز به زبان فارسی

دریافت می دارم.

به تازگی نامه هایی برای دریافت مجلهٔ ارزندهٔ "جرنل" به جناب آقای استاد دکتر عابد رضا بیدار مدیر
و سردبیر مجلهٔ جرنل نگاشتم و یک قصیدهٔ فارسی تحت عنوان خدابخش نامه نیز ارسال داشتم، خوش بختانه این قصید
که در حدود یک صد بیت دارد مورد پسند استاد عابد رضا بیدار واقع شد و در نامهٔ خود نوشتند "خوب است، خیل
خوب، آن را در جرنل چاپ می کنیم" این است که با ایما و اشارهٔ جناب آقای عابد رضا بیدار، شوق و عشق خود
را به کتابخانهٔ خدابخش نظم کرده ام و به نثر مطالبی را به قلم آورده ام.

باری کتابخانهٔ عمومی شرق شناسی خدابخش در سرتاسر ایران مخصوصاً و در سرتاسر جهان عموماً
مورد توجه و احترام ویژه می باشد و در کشور پاکستان نیز این کتابخانه شهرت فراوان دارد. بنابراین دانشمندان
و محققان از شش جهت جهان چهره های خود را به سوی کتابخانهٔ خدابخش گردانیده اند و دیدگان خود را به نوادر
خطی و چاپی آن دوخته اند همواره با نامه و تقاضانامه ها درخواست کتاب چاپی و مجلهٔ جرنل و فهرست های آن
کتابخانهٔ ارجمند را دارند و نیز برای فتوکپی یا فتو استیت و میکروفیلم از نسخه های خطی مورد نیاز درخواست می
کنند. به همهٔ این درخواست ها و نامه ها، پاسخ مثبت داده می شود و در حقیقت خدمات علمی و تاریخی و ادبی
کتابخانهٔ خدابخش زیر نظر استاد عابد رضا بیدار به بهترین طریقه و سریع ترین زمان در اختیار جهان علم و ادب
قرار می گیرد مثلاً "نسخهٔ خطی کلیات "ابوالبرکات منیر لاهوری" در کتابخانهٔ خدابخش موجود است و محفوظ و مضبوط
کتابخانهٔ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان برای میکروفیلم آن نامه نوشت. بسیار زود آن را تهیه کرده
و ارسال داشتند. "فرهنگ زفان گویا" که اخیراً از طرف کتابخانهٔ خدابخش چاپ و نشر شده است، واقعاً
شاهکار است. منتخب تذکرهٔ بسیار مهم "صحف ابراهیم". افست کردن مجله ها و عکس های تاریخی و اسناد
و مدارک ادبی و هنری و فلسفی و طبی و غیرهم، خدمت بزرگ به عالم بشریت خاصه به شناخت هندستان به سرتاسر
جهان است. کتابخانهٔ خدابخش گنجینهٔ میراث عظیم مردم هندستان است.

انتشارات کتابخانهٔ خدابخش مشتمل بر فهرست های فارسی و عربی و اردو و انگلیسی و هندی می باشد
که خدمت بزرگی برای شناختن گنجینه های خدابخش می باشد. دیگر رساله ها و کتاب های تاریخی و ادبی
است، مانند "طلسم هوشربا" که یک اثر عظیم داستانی اساطیری و تاریخی است در ده جلد ضخیم. این آثار
ارزنده، همهٔ فرهنگ و تمدن بشری را در بر دارند و به ویژه میراث عظیم مردم هندوستان است که با چاپ و نشر

آنجا فواید انتخابه همرجهانیان می رسد.

مجلۂ سیرل که تاکنون ۵۶ شماره از آن چاپ شده است، درحقیقت یک دائرة المعارف بزرگ دانش، وعرفان وتاریخ وهنر هندستان مخصوصاً وجهان اسلام عموماً می باشد، این مجلۂ را هرکسی که می خواهد هندستان را بشناسد وهرکس که می خواهد جهان اسلام را بشناسد، بناچار باید داشته باشد وآنرا مطالعه کند واز آن بهره مند گردد.

دانشمندان ایرانی ومراکز علمی ودانشگاه های ایران وپاکستان از این کتابخانۂ خدابخش درهندستان فواید علمی وبهره های تاریخی می گیرند، بدین جهت مسؤولان این کتابخانه، باید مورد تشویق وتمجید قرار گیرند از جمله استاد دکتر عابد رضا بیدار که باقلم توانائی او، جان ودل ما توانائی می گیرد وبانوشته های او چشم ما روشن می شود، پاینده باد کتابخانۂ خدابخش. زنده باد استاد عابد رضا بیدار.

●●

سہ ماہی مجلہ

فکر و نظر

جس میں

- علوم قرآن و حدیث
- فقہ
- کلام
- تصوف
- اسلامی تاریخ
- تعلیم و تدریس
- فلسفہ سائنس
- ادبیات
- معاشیات
- عمرانیات
- سیاسیات
- ثقافت و تمدن
- قانون و اصول قانون

پر

اسلامی نقطہ نظر سے مقالات شائع کیے جاتے ہیں

ادارہ تحقیقات اسلامی

اسلام آباد (پاکستان)

جہانِ سرسید

○ تائیدِ محمدؐ و القرآن ترجمہ اپالوجی فار محمدؐ اینڈ قرآن

○ جان ڈیون پورٹ صاحب

جہاں نامہ سرسید / یا سرسید انسائیکلوپیڈیا کے عنوان سے سرسید پر سارا مواد یکجا ہو جانا چاہیے۔ اس کا آغاز سرسید کے بارے میں جو کچھ اس لائبریری میں ہے اس سے کیا جا رہا ہے۔ ابھی اس میں کسی نظم و ترتیب کا خیال نہیں رکھا جا رہا ہے۔

آج کی پیشکش میں سرسید کے جذبۂ ایمانی کی ایک شاندار جھلک ہے۔ جب انھوں نے اپنی سب جمع پونجی خرچ کر کے، گھر کے برتن تک بیچ کے "اسلام کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا اور دوسرے اہم کام انجام دینے کے ساتھ ساتھ انگریزی میں ایک غیر انگریز کی بہت اہم کتاب اسلام اور قرآن کی سچائی پر گواہی کے طور سے اپنے خرچ پر چھپوائی تھی۔ حالی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

"جان ڈیون پورٹ کی کتاب کا چھپوانا۔ لندن ہی میں سرسید نے جان ڈیون پورٹ کی کتاب 'اپالوجی فور محمد اینڈ قرآن' کو جو انھوں نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں لکھی تھی، خود اپنے روپے سے چھپوایا تھا۔ سرسید کے خطوں سے جو سید مہدی علی خاں کے نام ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ لندن کا کوئی پبلشر اس کتاب کے چھاپنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا اور خود مصنف کو اس قدر استطاعت نہ تھی کہ اپنے روپے سے اس کو چھپوا کر شائع کرے۔ سرسید نے وہاں پہنچ کر جب اس کتاب کے مضامین سنے تو انھوں نے فوراً اپنے پاس سے روپے کی تدبیر کر کے وہ کتاب جھٹ پٹ چھپوا دی اور اس کی کئی سو جلدیں ہندوستان بھیجوا دیں۔ یہاں اس کا ایک اردو ترجمہ مولوی عنایت الرحمن خاں صاحب دہلوی نے اور دوسرا مولوی ابوالحسن نے کیا اور دونوں ترجمے چھپ کر شائع ہو گئے۔"

(مطرب)

تائید المحمد والقرآن

ترجمہ

اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن

مصنفہ

جان ڈیون پورٹ صاحب

حسب خواہش

کتب خانہ اسلامی پنجاب لاہور

لاہور سٹیم پریس لاہور میں طبع ہوئی

دیباچہ

اس کتاب کی تصنیف سے میری غرض یہ ہے کہ آنحضرت کی وقائع عمری پر جو جھوٹے الزامات اور بے انصافانہ بہتان ہوئے ہیں اُن کو دفع کروں اور یہ ثابت کروں کہ آپ فی الحقیقت خلق اللہ کے بڑے مربی اور نفع رسان تھے۔ وہ مصنف جنہوں نے تعصب مذہبی کے سبب سے اُس حق عبادت واحد مطلق کے شہرہ پر داغ لگایا ہے اُنہوں نے یہی نہیں ظاہر کیا کہ ہم نا منصف اور اُس عدل سے خالی ہیں جس کے اتباع کے واسطے حضرت عیسیٰ نے اس قدر شد و مد سے تاکید فرمائی ہے بلکہ انہوں نے یہ خیال کرنے میں بھی غلطی کی ہے کیونکہ ادنے تفکر میں اُن کو یقین ہو جاتا کہ عیسائیوں اور زمانہ حال کے عقلاء کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ نبی اور اُس کے مقولوں پر نکتہ چینی کریں بلکہ مشرقی لوگوں کا طریقہ ہے یا یوں کہ آنحضرت کو ایک ایسا شارع مذہب اور مقنن ملت خیال کرنا چاہیے جو عرب میں عیسوی سنہ کی ساتویں صدی میں ظاہر ہوئے اور تب اگر ہم یہ نہ کہیں کہ آپ ایسے ذہین تھے کہ دنیا میں آپ کا نظیر پیدا نہیں ہوا تو اس میں بھی شک نہیں کیونکہ آنحضرت ملک ایشیا کے سب میں بڑے نامی اور گرامی آدمی تھے۔ جب ہم اس بات کا خیال کریں کہ آپ کی پیدائش سے پہلے عرب کا کیا حال تھا اور وہ آپ کے بعد کیسی ہو گئی اور علاوہ اس کے اس بات پر بھی غور کریں کہ آپ کے مسلموں کے گروہ اور دلیل کے دل میں کیسا جوش پیدا کیا اور قائم رکھا تو اس صورت میں ایسے بزرگ آدمی کی صفت اور شمار ذکر کرنا بہت بڑی نا بے انصافی ہوگی اور آپ کی رسالت کو اتفاق پر محمول کرنا خدائے عزوجل کی قدرت اور حکومت پر شبہ کرنا ہے۔ القصہ مؤلف کو یہ بھی اقرار کرنا چاہیے کہ چند جگہ اس کو اپنی رائے اور الفاظ پر بھروسہ نہ تھا اس لئے اس نے اور مصنفین کی رائے اور خیالات کا استعمال کیا ہے۔ اور اس مقام پر اس نے بکمال اقرار کیا ہے اور شکر گذار ہے

جے ڈیون پورٹ

وقائع عمری محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام سلاطین اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں کہ جس کی وقائع عمری آنحضرت کی وقائع عمری سے زیادہ تر مفصل اور سچی ہو۔ فی الحقیقت اگر ہم آپ کی سوانح عمری کو ان عجوبات سے مبرا کریں جو ایشیائی مورخوں نے آپ کی طرف منسوب کئے ہیں تو کوئی بات ناقابل یقین باقی نہیں رہتی آپ کی ولادت کے زمانے میں اکثر عرب کے حصے غیر قوموں کے زیر حکومت تھے۔ کوہستانی عرب کے تمام شمالی حصے اور ملک شام و فلسطین و مصر بادشاہان قسطنطنیہ کی عملداری میں تھے اور خلیج فارس کا کنارہ الجزیرہ اور جو جزیرہ نما ئے عرب کے جنوبی حصے خسروان فارس کی قلمرو میں شامل تھے بحر قلزم کی ساحل کا ایک حصہ کہ مقط … کے جنوب تک عیسائی بادشاہان حبش کا ماتحت تھا صرف کر اور وسط کے دشوار گذار ملک آزاد تھے اکثر اہل عرب کا مذہب ان کے حکام کے موافق تھا۔ چنانچہ جہاں اہل یونان اور اہل حبش تھے وہاں عیسائی مذہب کا غلبہ تھا اور جہاں فارس والوں کی عملداری تھی وہاں مذہب منوچہر و مجوس پایا جاتا تھا اور … جو دو ذہبی مذہب عقائد میں بالکل مختلف ہیں باقی سب مقاموں میں بت پرستی کا نہایت زور تھا۔ زمانہ سلف میں اہل عرب ایک خدا یعنی خالق آسمان و زمین کی پرستش کرتے تھے مگر آخر کار انہوں نے وہ پرستش چھوڑ دی اور بتوں کے واسطے جنہیں وہ خدا کے بیٹے کہتے تھے مندر بنائے اور یقین کرنے لگے کہ یہ شیاطین سیاروں اور ستاروں میں رہتے ہیں اور زمین پر حکمرانی کرتے ہیں سب جگہ یہ ہی دیوتا نہیں پائے جاتے تھے ہر ایک قوم اور ہر ایک خاندان کے خاص خاص دیوتا اور اوتار تھے۔ اور ان پر انسان کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ اہل عرب کو نہ عقبے کا اور نہ دنیا کے مخلوق ہونیکا یقین تھا وہ … کی خلقت کو زمانہ کی گردش سے اور آیندہ کے معدوم ہونے کو انجام وقت سے منسوب کرتے تھے عیاشی اور قزاقی کا بہت بازار گرم تھا۔ اور چونکہ موت کو ہستی کا انجام محض خیال کرتے تھے۔ لہذا زندگی کی بہودی … تھے نہ بدی کی سزا اسی طرح کی بیہودہ اعتقادی بد مذہبی ان یہودی اور عیسائیوں میں بھی پائی جاتی تھی جنہوں نے یہاں مدت سے سکونت اختیار کی تھی اور زور پکڑا تھا۔ یہودیوں نے ان … کر بخت نصر سے اس سرزمین میں پناہ لی … ہر ایک کو آزادی حاصل تھی پناہ گزین بھی عیسائی لوگ۔ بھی۔ … اور …

… عیسائی … پانچویں صدی میں پیدا ہوا تھا … حضرت عیسیٰ … خدا … ذات … ایک … میں … ہے۔

ہیرین کے مذہب والوں کے ظلموں اور تکرار سے بچنے کو یہاں آ چھپتے تھے۔ مذہب عیسائی سے زیادہ اُس زمانہ[۱] میں کوئی چیز باشتریح خراب نہ تھی وہ دونوں شاخیں مذہب عیسائی کی جو ملک ایشیا اور افریقہ میں پھیل گئی تھیں اُنھوں نے طرح طرح کی بدعتیں اور بداعتقادیاں اختیار کر لی تھیں وہ ہمیشہ باہم مباحثہ اور مناقشوں میں مصروف رہتے تھے اور ایران اور سیلون اور قسطنطنیہ اور یونین مذہب والوں کی تکرار سے نہایت دق تھے اُن کے پادریوں کی بے اعتدالی اور عہدوں کی فروخت اور جہالت نے مذہب عیسائی کو بڑا دھبہ لگا یا تھا اور عیسائی لوگوں کو نہایت بدرویہ کر دیا تھا عرب کے جنگلوں میں جاہل اور مجنون راہب بکثرت تھے اور بیہودہ خیالوں اور منصوبوں میں اپنی اوقات بسر کیا کرتے تھے اکثر اِن لوگوں کے غول کے غول شہر میں آ کر اکٹھے ہوتے تو بات اہل شہر کو تکرار کے ذریعہ سے سکھایا اور منوایا کرتے تھے نہایت ذلیل بُت پرستی نے اُس سادی پرستش کی جگہ چھین لی تھی جس کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدا تعالیٰ قادر مطلق اور بے مثال اور نفع رساں کی بندگی کا حکم کیا ہے اہل عیسائیوں نے اپنے خیال میں ایک نیا اولمپس[۲] قائم کر لیا تھا اور اُس کو اپنے مذہب کے ولیوں اور شہدا اور ملائکہ سے آباد نہیں کرتے تھے جیسا بُت پرست اپنے دیوتاؤں سے اولمپس کو آباد سمجھتے تھے اس زمانہ میں ایسے بھی عیسائی تھے جو جوزف کی بی بی[۳] میں دیوتی[۴] کے صفات قائم کرتے تھے تبرکات اور کھنچی اور منقشی تصویروں کو وہی لوگ پوجتے تھے جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ تم اپنی طرف زندہ خدا سے کیا کرو اسکندریہ اور حلب اور دمشق میں مذہب عیسائی کا یہ حال ہو رہا تھا کہ پیغمبر کی ولادت کے زمانہ میں تمام آدمیوں نے اپنے مذہبوں کے اصول چھوڑ دیئے تھے اور لاانتہائی جھگڑوں اور فروع میں مصروف رہتے تھے اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ ہم اپنے اپنے مذہبوں کی اُس پہلی خدا تعالیٰ کی خالص پرستش بھول گئے ہیں

ف۱ اُس زمانہ کے پادری لوگوں کی بدروشی سے عوام الناس سے بہت دل برداشتہ ہو گئے تھے اُن کی طرح کوئی ... روایات اور جھوٹے لوئیاں اور معجزات اور پادریوں کی بدچلنی اور عہدوں کی فروخت نے اُن لوگوں کی آنکھوں میں مذہب عیسوی کو کم قدر کر دیا تھا ۔ مؤلف

ف۲ ایک پہاڑ کا نام ہے جو یونان میں واقع ہے اور جسے اہل یونان اپنے دیوتاؤں کا مقر خیال کرتے ہیں ۔ مترجم

ف۳ جوزف کی بی بی حضرت مریم سے مراد ہے۔ عیسائی لوگ کہتے ہیں کہ حضرت مریم جوزف نجار سے منسوب ہو چکی تھیں مگر ابھی نکاح نہیں ہوا تھا کہ حضرت عیسیٰ پیدا ہو گئے ۔ مترجم

ف۴ اُس عیسائی فرقہ کو جو حضرت مریم میں دیوی کے صفات قائم کرتے تھے مریمی ... کہتے ہیں ... کا یہ قصد تھا کہ مسئلہ تثلیث میں بجائے روح القدس کے حضرت مریم کو داخل کریں ۔ مؤلف

ممالک اسلامیہ کے سفرنامے

○ سراج وہاج یعنی سفر حجاج

— حافظ شاہ محمد سراج الیقین

یہ سفرنامہ سعودی عرب کا جو قصبہ کرسی (اودھ) کے محمد سراج الیقین صاحب نے لکھا ہے جنھوں نے بغرض حج ۳ر شوال ۱۳۲۳ھ [= جمعہ یکم دسمبر ۱۹۰۵ء] کرسی سے اپنا سفر شروع کیا، لکھنؤ پہنچے، وہاں سے دس پہر گزار کے بمبئی پہنچے وہاں کی چار مساجد اور بازار تفصیل سے دیکھیں پھر قرنطینہ کی آزمائش سے گزرے۔ مولانا صادق الیقین (فرزند) بھی ساتھ تھے۔ یہ مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد تھے۔ فرزند کا انتقال حج کے دوران ۳ محرم الحرام ۱۳۲۴ھ کو ہوا۔ ۱۳۲۴ھ [= ۱۹۰۶ء] میں سفر تمام ہوا۔

صادق الیقین (فرزند) کی ملاقات کو آنے والوں میں مولانا خلیل احمد (سہارن پور)، مولانا اسحاق (مدرسہ اسلامیہ دہلی)، محمود الکافی، حاجی عاشق الہی (میرٹھ)، سید احمد (مہاجر مدینہ) کا ذکر کیا ہے۔ (ایک جگہ الگ سے مولانا محمد اشرف علی تھانوی مدظلہ کا ذکر بھی کتاب میں ملتا ہے)۔

ہدیہ روزبوری شریف ملک احمد حسین صاحب

وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا

الحمد للہ والمنۃ

کہ رسالۂ انیقہ و جمانۂ منیفہ المسماۃ بہ

سراج وہاج

یعنی

سفر حجاج

مولفہ زبدۃ الواصلین نخبۃ الکاملین آیۃ من آیات رب العالمین حضرت الحاج الحافظ شاہ محمد سراج الیقین لازالت شموس فیوضہ بازغۃ و نجوم افادتہ لامعۃ

باہتمام

راجی رحمۃ ارحم الراحمین محمد فخر الدین

مطبع فخر المطابع واقع لکھنؤ محلہ وکٹوریہ گنج طبع شد

Price Rs. 3/-

۳۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

ہزاروں لاکھوں کروروں بیحد و بیشمار حمد و ثنا اوس توانا یزدان کو لائق و سزاوار کہ جسنے اپنے بندۂ ناتوان ہیچمدان عاجز و مسکین فقیر **محمد سراج الیقین** غفر اللہ ذنوبہ و ستر عیوبہ کو بحالت یاس عالم ضعیفی مین کہ ستر برس کے قریب سن ہو پہنچا ہے حرمین شریفین کے سفر کی توفیق عطا فرمائی فقیر کے دل مین دفعتہً خود بخود اوس جاے مقدس کی حاضری کا ذوق و شوق بعنایت الٰہی و امداد نامتناہی اور حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی توجہ قلبی و کشش باطنی سے پیدا ہوا مسبب الاسباب حقیقی نے بے شان و گمان ایسا اسباب فراہم و مہیا فرمایا کہ فقیر مطمئن خاطر ہو کر تیسری شوال روز پنجشنبہ ۱۳۲۳ ہجری کو مع اپنے خلف الصدق برخوردار با وقار عالم و فاضل محدث کامل مولوی حاجی قاری حکیم شاہ محمد صادق الیقین مدعمرہ اور نور الابصار عالی تبار نواسۂ فقیر مولوی محمود العافی سلمہ و اہلیہ و صبیہ فرزند موصوف الصدر فقیر و میر صادق علی صاحب و حاجی رحیم و گلاب گدی

روانگی بمبئی

وغیرہ گئے کہ سب ۸ شخص فقیر مین اپنے وطن مالوف سے منھ موڑ کر آل و اولاد و اعزا اقربا
دوست و احباب کو اللہ تعالی اجل شانہ جامع المتفرقین کی حفاظت و نگہبانی مین
چھوڑ کر راہی منزل مقصود ہو کر لکھنؤ پہونچا محلہ صحبتیا باغ مین اپنے دوست حافظ سیتا
صاحب کے دولتخانے پر شب کو قیام کر کے جمعہ کے روز علی الصباح اسٹیشن چار باغ پر دو بجکر
دس منٹ پر روانہ ہوے برخوردار منشی ابو الحسن صاحب کے حسن انتظام سے ریلوے ڈاک گاڑی کا
ایسا معقول اہتمام ہوا کہ کسی طرح کی تکلیف مجھے اور میرے ہمراہیون کو نہین پہونچی
سکنڈ کلاس کے جسکو دوسرا درجہ کہتے ہین دو ٹکٹ ستائیس ۲۷ ستائیس ۲۷ روپیہ کے اس
فقیر اور برخوردار مولوی محمد صادق الیقین کے واسطے لئے گئے جو کمرہ مخصوص اس حاجی اور
برخوردار موصوف کے لئے علحدہ دیا گیا وہ کمرہ نہایت نفیس صاف ستھرا جسپر تین میز
خوب کشادہ دو چوڑے لگے ہوے اور گدے چرمی نہایت نفیس اوسپر بچھے ہوے دو میز
ہم دونون کے نامزد کی گئین یعنی انپر سواے ہمارے کوئی شخص بیٹھ نہین سکتا تھا تیسرا
میز جو خالی تھا اوسپر دو مسافر بیٹھ سکتے تھے اس سے زیادہ کی اجازت نہ تھی مگر بعنایت
الہی دو مسافر بھی برابر نہین بیٹھے اکثر اوقات وہ میز خالی ہی رہا جس سے فقیر کو نہایت
آرام ملا اس کمرہ مین غسل خانہ پاخانہ نہایت صفائی کے ساتھ تھا غسل خانے مین
ایک آئینہ جلتی لگا ہوا ایک تسلہ نہایت نفیس ایک تپائی پر جڑا ہوا اوس مین
نل لگا ہوا جسقدر جی چاہے پانی لیجئے پیجئے وضو کیجئے نہائیے اطمینان سے نماز و وظیفہ
پڑھیے غرضکہ کسی چیز کی تکلیف و تنگی نہین اگرچہ بظاہر ہم دونون شخصون کے کرایہ مین دونا
روپیہ صرف ہوا مگر آرام بہت ملا اور حساب لگانے سے زیادہ نقصان نہین ہوا تین
آدمی اور متعلقین خاص مین سے فقیر کے ہمراہ تھے فی کس چودہ چودہ روپیہ کرایہ انکا دینا پڑا

دوسرے برخوردار منشی ابوالحسن کے اس خوش اسلوب انتظام سے بڑا آرام یہ ملا کہ دومن
اسباب بجنسہ ہمکو دیدیا گیا جیسا کہ اس درجہ کا قاعدہ ہے اور اسباب جو باقی رہا وہ زیادہ
نہ تھا تھوڑا ہی محصول اُسکا دینا پڑا پھر لطف اور راحت یہ ہوئی کہ اسباب ہماری ساتھ ہی
برک مین بمبئی پہونچا اور جسوقت وہان ہم گاڑی سے اوترے اُسیوقت اسباب ملگیا مال
گاڑی مین اگر اسباب آتا تو معلوم کئی روز مین وہان پہونچتا اور اُسکے انتظار مین سخت تکلیف
ہوتی۔ بہر تقدیر بعنایت الٰہی نہایت آرام و آسایش کے ساتھ لکھنؤ سے دش پہر کے
عرصے مین بمبئی پہونچے اس شہر کے سات راستہ والی مسجد مین جو بمبئی کی مسجدون مین
نامی مسجد ہے حاجی داؤد صاحب سیٹھ کی ہے فقیر مع اپنے ہمراہیون کے مقیم ہوا فقیر کے
دوست ہم وطن میان عبدالعزیز ملقب بہ مانئی صاحب اس مسجد کے مؤذن ہین اور جناب
سید حاجی امداد حسین صاحب فقیر کے دوست و عنایت فرما و ہم وطن اس مسجد
شریف کے وقفی مکانات مین سے دو کمرہ مین بکرایہ مقیم ہین ان دونون صاحبون کے
یہان موجود ہونے سے فقیر کے آرام و آسایش کا ایسا اسباب مہیا و فراہم ہوا کہ فقیر
اُسکا شکریہ ادا نہین کرسکتا بالکل یہ معلوم ہی نہین ہوا کہ ہم کسی غیر ملک یا شہر مین
آئے ہین سیٹھ صاحب کا دستور ہے کہ چوتھے پانچوین روز مسجد شریف کے معاینہ اور
دریافت حال کے لیے تشریف لایا کرتے ہین آج اسوقت نوین شوال روز چہارشنبہ کو
ہنگام تحریر ان سطور کے تشریف لائے فقیر سے ملاقی ہوئے فقیر اُنکی ملازمت سے اور وہ فقیر کی
ملاقات سے بہت خوش و محظوظ ہوے سیٹھ صاحب کے مزاج مین انکسار و خاکساری
بہت ہے دیندار آدمی معلوم ہوتے ہین اس مسجد شریف کے ملحقات مین جو مکانات اور دوکانین
وغیرہ ہین قریب ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کے کرایہ اُنکا آتا ہی مجھسے فرمایا بخیال اسکے کہ میرے بعد

خدا جانے کیا معاملہ پیش آئے مین نے اس رقم کو وقف کر کے مسجد کے نامزد کر دیا ہی
اب یہان یعنی مسجد شریف کے تعلقات مین سے جو کچھ ہی سب اللہ تعالیٰ کا ہی میرا کچھ
بھی نہین ہی اس قسم کی باتون سے اونکی دینداری ظاہر ہی سیٹھ صاحب موصوف کی
مسجد جس مین فقیر مقیم ہی نہایت خوش نما بارونق باکیفیت فرحت افزا پُر فضا ہی شیشہ
آلات وغیرہ سے خوب سجی ہوئی ہی ہر طرح سے اسکا اہتمام و انتظام نہایت عمدگی اور
خوش اسلوبی کے ساتھ ہی اسکے صحن مین ایک حوض نہایت خوشنما دہ در دہ بنا ہوا ہی
اور وسط حوض مین ایک فوارہ لگا ہوا ہی وہ خود بخود ہمہ وقت چلا کرتا ہی جسکو دیکھنے سے
دل کو فرحت و تازگی حاصل ہوتی ہی اس حوض کے اندر گلابی رنگ کی مچھلیان مائل
بسرخی بکثرت پلی ہوئی ہین جسوقت وہ مچھلیان پانی پر تیر کے آتی ہین عجب کیفیت
دکھاتی ہین اس مسجد شریف مین ایک مسافر خانہ ایک مدرسہ و حجرے بھی ہین فقیر مع
اپنے دیگر ہمراہیون کے مسافر خانہ مین مقیم ہوا اور برخوردار مولوی محمد صادق الیقین صاحب
نے مع اپنے ایک رفیق خادم کے حجرے مین قیام کیا کل مسجد شریف کا انتظام و نگرانی
وغیرہ میان عبد العزیز صاحب مؤذن ملقب بہ بانکی صاحب کے متعلق ہی اس مسجد
شریف کے امام عبد الخالق صاحب نہایت نیک بخت مسکین صفت دیندار آدمی
ہین امامت کے سوا مدرسہ مین لڑکون کو قرآن مجید کا درس دیا کرتے ہین سید حاجی
امداد حسین شاہ صاحب جنکا ذکر خیر اوپر ہو چکا ہی انکے پاس دو کمرے ملحقات مسجد شریف
سے آٹھ روپیہ کرایہ پر ہین ایک مین خود رونق افروز رہتے ہین اور ایک مین متعلقین شاہ صاحب
موصوف نے اپنا ذاتی کمرہ فقیر کی ہوا در پردے کیواسطے خالی کر دیا جس سے انتہا درجے
آرام ملا اور بالکل عالم مسافرت نظر نہین آیا فقیر اور فقیر کے متعلقین کی خاطر داری

اور مہمان نوازی مین ہمہ وقت موجود و مصروف رہتے ہین اور کل بار کھانے وغیرہ کا
اپنے ذمہ لیا ہی فقیر ہرچند معذرت کرتا ہی سماعت نہین فرماتے ایک ہفتہ اسی تواضع
مدارات مین گذرا ہی۔ یہان شہر بمبی کے مساجد مین چار مسجدین بہت نامی ہین خصوصًا
جامع مسجد اور حاجی زکریا سیٹھ مرحوم کی مسجد اور حاجی اسمٰعیل حبیب کی مسجد اور کھانڈوالی
جماعت کی مسجد۔ فقیر پہلے جامع مسجد مین حاضر ہوا اللہ اکبر اس مسجد مقدس کے دیکھنے سے
خداوند تعالی کی قدرت کا ایک نمونہ پیش نظر ہو جاتا ہی آنکھون مین نور دل کو سرور دماغ کو
فرحت جسم و جان کو تازگی اور قوت ایسی حاصل ہوتی ہی کہ جسکا اظہار بیان اس حیطۂ ان
کے امکان سے قطعًا خارج ہی ماشاء اللہ عجب صفائی عجب وضع عجب کیفیت عجب دلچسپی ہے
عمارت ایسی خوشنما اور پر تکلف ہی کہ جسکے دیکھنے سے حیرت و تعجب ہوتا ہی یہ چارون مسجدین
اپنے اپنے طور پر جداگانہ مرتب و مسجع ہین سب مین ایک ایک درجہ نیچا اور ایک ایک اوپر ہے
خصوصًا جامع مسجد کا درجہ بالا نہایت مسجع اور پر فضا ہی اور یہ سب مسجدین شیشہ آلات وغیرہ
سے خوب مرتب و آراستہ ہین مینا کاری اور لاجوردی کام اندر کے زینے اور چھتوں مین ایسی
خوشنمائی اور خوبصورتی اور پختگی کے ساتھ بنا ہوا ہی کہ جسکے دیکھنے سے دل کو نہایت درجے
فرحت و مسرت حاصل ہوتی ہی فقیر نماز عصر کے وقت جامع مسجد مین حاضر ہوا نماز
باجماعت امام صاحب کی اقتدا مین ادا کی جماعت نیچے اوپر دونون درجون مین کثرت کے
ساتھ ہوتی ہی فقیر کی موجودگی مین امام صاحب نے نیچے کے درجے مین امامت فرمائی تھی
جب تک وقت باقی رہتا ہی نماز کا سلسلہ منقطع نہین ہوتا اس مسجد شریف کے امام صاحب
شافعی المذہب ہین فقیر جب مسجد سے باہر چلا ہی اسوقت امام صاحب سے ملاقات ہوئی
سلام و مصافحہ کے بعد بڑے اخلاق اور خندہ پیشانی سے مزاج پرسی فرمائی اور دعا کے

خواستگار ہوے یہ امام صاحب ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پاتے ہین اس مسجد شریف مین پچاس
دوکانین ہین ہر دوکان کا کرایہ پچاس روپیہ ماہوار آتا ہی بجز ایک دوکان کے کہ اُسکا کرایہ
تیس یا چالیس روپے ہین یہ سب آمدنی مسجد شریف مین صرف ہوتی ہی بارھوین شوال
روز شنبہ مین نے عبد العزیز بانگی صاحب سے بنابر رفع شک پوچھا کہ یہان کی جامع مسجد مین دوکانین
کسقدر ہین کہا پچاس اور فی دوکان کا کرایہ پچاس روپیہ ماہوار آتا ہی پھر کہا کہ دوکانون کے
علاوہ مسجد کے مکانات و باغات وغیرہ اس قدر ہین جسکا بائیس لاکھ روپیہ سالانہ
آتا ہی حاجی عبد الرحیم صاحب سیٹھ فقیر کے پاس ہی بیٹھے ہوے تھے بولے کہ نہین اس سے
زائد آتا ہی اللہ اکبر یہان کے روپیہ کی کوئی حد و انتہا نہین ہی پھر مین نے سیٹھ صاحب سے
پوچھا کہ اسکے مہتمم اور نگران کون صاحب ہین فرمایا کہ گیارہ مشاور اور ایک ناظر ہین کے
مشورہ اور صلاح سے اسکے سب کام انجام پاتے ہین بالمختصر یہ فقیر ان چارون مسجدونکی
زیارت سے مشرف ہوا اور دلکو اسقدر مسرت بی پایان حاصل ہوئی کہ جسکی انتہا نہین افسوس
ہی کہ ہمارے شہر لکھنؤ مین باوجود اس امارت و دولت کے یہان کی ادنی مسجد کے مقابلہ مین
ایک مسجد بھی نہین نہ زمانہ شاہی مین تھی اور نہ اب ہی اس شہر کی عام عمارات اور تمام
مقامات ایسے عالیشان دلچسپ بارونق ہین کہ لکھنؤ کی عمارات شاہی بھی انکا مقابلہ نہین
کرسکتین اس شہر کو ہر گلی و کوچہ بازار ہی جہانتک چلے جائیے بازار ہی بازار نظر آتا ہے
آدمیونکی وہ کثرت اور اژدحام کہ اللہ اکبر ہر چیز اس کثرت کے ساتھ ہی کہ جسکی انتہا نہین
یہان بہت سی بازار مارکیٹ کہلاتے ہین مساجد کی سیر کے وقت اثنا راہ مین ایک بازار
مارکیٹ واقع تھا عبد العزیز بانگی صاحب نے فرمایا کہ ذرا یہ بھی دیکھتے چلئے غرض جب وہان
پہونچا تو دیکھا کہ میوہ جات خوراکہات بقولات وغیرہ کی اسقدر کثرت ہی کہ جسکی انتہا نہین

اگر ہمارے تمام شہر لکھنؤ کے میوہ جات اور بقولات وغیرہ یکجا کیے جائین تب بھی اُس کے
مقابلہ کو نہ پہونچین ہر چیز ایسی صفائی اور خوشنمائی اور قاعدہ و قرینہ کے ساتھہ رکھی ہوئی ہے
جسکی دلچسپی کا لطف دل ہی جانتا ہو مساجد کے ذکر کے ذیل مین مین نے بچشم دیدہ
شہر کی عمارات وغیرہ کا یہ تذکرہ کردیا ورنہ شہر کے دیکھنے کی نہ مجھے خواہش اور آرزو نہ تھی
اور نہ میرا یہ قصد تھا کہ شہر کے حالات اپنے سفرنامہ مین داخل کرون مین اپنے اس سفرنامہ
مین وہی حالات درج کرونگا جو میرے اصلی مقصود کے متعلق ہونگے اس شہر بمبئی مین تین
چیزین عنقا صفت ہین ایک ہاتھی دوسرے بندر تیسرے نداف یہان دو عجائب خانے
قائم کیے گئے ہین ایک مردہ جانورون وغیرہ کا اور ایک زندہ جانورون کا خدا جانے
کہان کہان کے ملکون اور جنگلون سے انواع اقسام کے جانور زندہ منگا کے اس عجائب خانے
مین رکھے ہین منجملہ اون عجائبات کے ایک ہاتھی بھی ہے لوگ ہاتھی و بندر کو مثل اور
عجائبات کے تعجب کی نظر سے دیکھتے ہین اکثر لوگ اوس ہاتھی پر سوار ہو کر شہر و بازارون مین
بطریق سیر و تفریح جاتے ہین جو کرایہ جس مقام کا مقرر کردیا گیا ہے وہ دیتے ہین - نداف
اس شہر مین اسوجہ سے عنقا صفت ہے کہ سردی یہان ایسی نہین ہوتی کہ جسکے لیے روئی دار
کپڑے کی ضرورت ہو اسیوجہ سے اس شہر مین کوئی نداف نہین رہتا میان عبد العزیز صاحب
بیان کرتے ہین کہ ایکبار مین نے بہت بڑے اشتیاق سے ایک فرد رزائی کی لکھنؤ سے
منگائی استر و مغزی وغیرہ لگا کر جب بھرنیکو بھیجا تو کوئی نداف کہین نہ ملا ایک شخص نے
دو روپیہ بھرائی اس شرط پر مانگے کہ مجھسے جیسی بن سکے گی بھر دونگا مگر اچھی بُری
پسند ناپسند کا ذمہ دار نہین ہوتا - عبد العزیز کہتے ہین مین نے اُس رزائی کو یونہین ادھر
ڈالا - مین اپنے وطن مین سُنا کرتا تھا کہ بمبئی مین آم ہمیشہ بکا کرتے ہین ایک روز مین نے

بچشم خود دیکھا بازار مین رکھے ہوے تھے قیمت پوچھی گئی ایک آم کے دو آنہ بتائے آج یوم
سہ شنبہ ۱۵ شوال کو یمانی صاحب نے دو آم مجھے دیے ایک مین نے کھایا ایک مولننا
مد عمرہ کو دیا آج ۱۹ شوال روز شنبہ کو ہم سب لوگ بعد نماز صبح قبل طلوع آفتاب شہر بمبی سے
قرنطینہ کو روانہ ہوئے چونکہ شہر کی آبادی بہت دور تک ہی اسوجہ سے آٹھ بجے کے قریب
اوس مقام پر پہونچے جہان قرنطینہ کا انتظام و اہتمام ہوتا ہی دیکھا تو صدہا حجاج اوس
مقام پر موجود اور بکثرت لوگ چلے آتے ہین المختصر جب سب لوگ آگئے تب ایک وسیع
مکان جو چارون طرف سے گھرا ہوا ہی اور دو جانب پھاٹک اوس مین لگے ہوے ہین
سب کو اوسکے اندر جانیکا حکم ہوا جب ہم سب لوگ اوسکے اندر داخل ہو گئے تب دونون
جانب کے پھاٹک بند ہو گئے معلوم ہوا کہ اب بھپارہ دیا جائیگا پھر ہم سب لوگ قطار قطار
بٹھائے گئے دو تین انگریز باقی سب ہندوستانی یہ لوگ جس جماعت کے نزدیک آتے تھے
اوس جماعت کے لوگ کھڑے ہو جاتے تھے وہ سب کے کرتے اوٹھا اوٹھا کر شکم و سینہ دیکھتے
تھے اور ایک چھاپا سینے کے کپڑے پر سرخ رنگ کا دیدیتے تھے اوسی مقام پر ایک انجن
چل رہا تھا اوس سے دھوان برآمد ہوتا تھا معلوم ہوا کہ بھپارہ دینا اسی کو کہتے ہین ایک
ڈاکٹر انگریز اپنا دفتر لیے ہوے سامنے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا تین شخصونکو طاعون کا شبہ
کرکے اوس ڈاکٹر کے پاس لے گئے اوسنے سبکے کپڑے اوتروا کر خوب غور سے دیکھا دو
شخصون کو اوسیوقت بری کر دیا ایک صاحب ہمارے ساتھی بری نہین ہوے مگر بعد کو
سنا گیا کہ وہ بھی بری ہو گئے الحمد للہ علی ذلک پھر ہم سب لوگونکو حکم ہوا کہ باہر چلے جاؤ
ہم سمجھے کہ نجات ملگئی اوسی مکان کے برابر دوسرے مکان کا پھاٹک تھا اوسکے اندر
جانیکو حکم ہوا جب وہان پہونچے تو دیکھا ویسا ہی ایک مکان چارون طرف سے گھرا ہوا ہی اور

اوس مین دوسری جانب پھاٹک لگا ہوا ہی اور سپاہی پہرے پر کھڑا ہی دیکھلا اندیشہ ہوا
کہ شاید پھر کوئی نئی بات یہان بھی ہوگی مگر بعنایت الہی کچھ نہین ہوا تھوڑی دیر کے بعد کہا
کہ باہر چلے جاؤ اب یہانسے اوس مقام کو جیسے جہان اہالیان قرنطینہ کے لیے مکانات بنائے
گئے ہین اوس مقام پر سمندر کی کشتیون پر سوار ہوکر جانا ہوتا ہی غرضکہ ایک کشتی پر یہ فقیر مع اپنے
ہمراہیون و دیگر حجاج کے ساڑھے نو بجے کے قریب سوار ہوا جس کشتی پر یہ فقیر سوار تھا اوس سے
پیشتر فقط ایک ہی کشتی گذری تھی لوگ دوسیر چار پے بچھے اب ہماری کشتی بھی چلی مگر تھوڑی
دور چلکر دونون کشتیان رک گئین دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ جب سب کشتیان بھیجا
ہولین گی تب ساتھ ہی سب کی روانگی ہوگی اس انتظار مین ڈیڑھ بج گئے نماز ظہر کشتی پر
بدشواری ادا کی گئی بالمختصر جب سب کشتیان آگئین تو ایک دخانی جہاز کے ذریعہ سے
روانہ ہوئے چار بجے کے بعد پار اوترے دریا کے کنارے استنجے وغیرہ سے فراغت کرکے
نماز عصر ادا کی یہانسے وہ مقام جہان قرنطینہ کے مکانات بنے ہوے ہین کچھ کم ایک میل
کے فاصلے پر ہی وہان ہوکے پہنچے ہی قبل اسکے کہ مکانات کے اندر داخل ہوں نماز مغرب
کا وقت آگیا مکانات کے باہر ہی نماز مغرب ادا کی گئی بعد فراغ نماز مکان کی تلاش و جستجو مین
چلے بہزار دشواری ایک مکان ملا فقیر مع اپنے سب ہمراہیون کے کہ سب گیارہ نفر تھے
اوسی مکان مین مقیم ہوا یہانکے مکانات بانس کی چٹائیون سے بنائے گئے ہین انتظام یہانکا
اچھا ہی بہشتی مشکون مین پانی لیے ہوے برابر موجود رہتے ہین صفائی کا بڑا خیال ہی بجز ایک
مقام کے پانی ہر جگہ گرانیکے غسل وضو وغیرہ کی ممانعت ہی باورچی خانے متعدد وسیع موجود
ہین پاخانے مردانے زنانے بہت صفائی کے ساتھ بنے ہوے ہین صبح و شام دونون وقت
صاف کرنے کے بعد پانی سے دھولے جاتے ہین بازار بھی موجود ہی ضروریات کی سب چیزین

حالات قرنطینہ

دستیاب ہوتی ہیں ایک مسجد بھی بانس کی چٹائیوں کی مع غسلخانہ موجود ہی بہر حال آرام
کا انتظام پورے طور سے کیا گیا ہی بیسویں شوال روز یکشنبہ کو جہاز میں سے ایک صاحب نے
یہاں انتقال کیا انا للہ و انا الیہ راجعون یہ صاحب امپور افغان کے رہنے والے قصور کے
شوہر مرض ضیق النفس میں گرفتار ضعیف آدمی تھے اُسی مرض میں انتقال ہوا بیچارے
گھر بار فروخت کر کے ہجرت کی نیت سے چلے تھے موت یہاں کی لکھی ہوئی تھی خداوند تعالے
نے مراد انکی پوری فرمائی اگرچہ بظاہر نامراد رہے مگر باطن میں دل شاد ہوئے میں نے
اپنے حضرت پیر و مرشد برحق سے سنا ہی فرماتے تھے کہ جو کوئی صدق دل اور نیت خالص سے
حج کے واسطے نکلتا ہی اور اثنا راہ میں بدون حج کے مرجاتا ہی تو خداوند تعالی ہر سال
ایک حج کا ثواب تاقیامت اوسکو عطا فرماتا ہی اور جو کوئی بعد حج بوقت مراجعت
اثنا راہ میں مرتا ہی اوسکو ایک ہی حج کا ثواب ملتا ہی دریا کے گھاٹ ورقطنیہ کے کانات
کے اثنا راہ میں ایک بزرگ کی درگاہ واقع ہی مزار پُر انوار کی عمارت نہایت عمدہ بنی ہوئی
ہی درمیان میں گنبد اور چاروں طرف چار صحنچیاں واقع ہیں اور قبر شریف پر شامیانہ بہت عمدہ
پر تکلف تنا ہوا ہی اور کچھ شیشے آلات وغیرہ بھی ہیں سُنا گیا ہی کہ دو سو برس کا زمانہ گذرا ہی
اسم شریف آپ کا بابا پیر مشہور ہی لوگوں کا بیان ہی کہ بہت بڑے کاملین سے تھے۔ اکیسویں شوال
روز دوشنبہ کو بعد نماز عشا ہمارے قافلے کے جہاز میں سے ایک صاحب نے بڑی دہوم
سے مولود شریف کیا بسکٹ اور کھجوریں تقسیم کیں عنایت الٰہی ہمارے قافلے میں بڑے بڑے
نامی گرامی علما و فضلا بزرگان دین تشریف رکھتے تھے جنکی وجہ سے بڑی رونق و برکت
و آبادی اور موجب تقویت کا ہی اس مقام پر واضح ہو کہ حضرت مولٰنا رشید احمد صاحب
گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کہ شریعت و طریقت دونوں کے فی زمانناجامع ایسے گذرے ہیں

کہ شاید یہانسے تا عرب کوئی نہ گذرا ہو حضرت ممدوح علیہ الرحمہ کی توجہ و شفقت ہمارے
برخوردار مولوی شاہ محمد صادق الیقین کے حال پر اس درجہ تھی کہ ایک روز بیساختہ فرمایا
مجھمین اور مولوی صادق الیقین مین کچھ فرق نہین اور یہ تو اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے
دیکھنے والونمین مولوی صادق الیقین بہت اچھے ہین اللہ اکبر جس شخص کی ایسی تعریف
ایسا بزرگ فرمائے اوسکے اچھے ہونےمین کیا شک ہی جب ہم لوگ بمبئی پہونچے جناب مولنا
خلیل احمد صاحب جو کہ حضرت مولنا ممدوح کے شاگرد رشید اور خلیفۂ اول اور مدرسہ سہارنپور
کے افسر مدرس ہین جسوقت آپنے سنا کہ مولوی صادق الیقین آئے ہین فورًا ملاقات کو
تشریف لائے اور بکمال شفقت و عنایت کے ساتھ بہ تعظیم و تکریم پیش آئے یہ جناب ممدوح
بہت بڑے عالم و فاضل محدث و درویش کامل جامع صفات حمیدہ و بکمالات محمودہ ہین
جناب مولوی حکیم محمد اسمٰعیل صاحب گنگوہی ملقب بہ حکیم حمیری یہ بھی عالم و فاضل محدث
کامل ہین فن طبابت مین فی زمانہ اپنا نظیر نہین رکھتے تھے ہمارے برخوردار موصوف کی
ملاقات کو آپ بھی تشریف لائے اور بکمال شفقت و عنایت پیش آئے اسیطرح سے بڑے بزرگ
عالم و فاضل درویش کامل مثل مولنا محمد اسحاق صاحب مدرس مدرسہ اسلامیہ دہلی شریف
و مولوی حاجی عاشق الٰہی صاحب رئیس میرٹھ و مولوی سید احمد صاحب مہاجر مدینہ منورہ
و مولوی عبد الہادی صاحب واعظ ساکن مدراس بہت بڑے عالم و فاضل اور واعظ ہین
وعظ انکا نہایت عمدہ بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ گھنٹون بیان فرماتے ہین باایں ہمہ
اوصاف آپ کبھی براہ ادب ہمارے برخوردار ممدوح کے برابر نہین بیٹھے اور اس درجہ ادب
کرتے ہین کہ جسکی انتہا نہین اسیطرح سے جو حضرات سنتے ہین کہ مولوی صادق الیقین آئے
ہین برابر تشریف لاتے ہین اور بکمال محبت و عنایت بہ تعظیم و تکریم پیش آتے ہین آج تک سوسین

شوال روز چہار شنبہ کو تمام مرد و مستورات کا معائنہ ہوا مردون کی قطار قطار علیحدہ اور عورتونکی
قطار قطار الگ بٹھائی گئی پیشتر عورتون کی گنتی ہوئی انمین سے جس قطار کی گنتی ہوجاتی تھی
اوس سے کہہ دیتے تھے کہ چلے جاؤ حتی کہ دفعہ دفعہ سب عورتین چلی گئین بعد کو مردون کی
گنتی شروع ہوئی جس قطار والونکی گنتی ہوتی تھی اونکے شکم و سینہ کا کپڑا ہٹا کے برائے نام
معائنہ کرکے کہتے تھے کہ چلے جاؤ غرضکہ بعنایت الٰہی آسانی کے ساتھ تھوڑی دیر مین نجات
ملگئی اس مرتبہ حجاج مین عورتونکی بڑی کثرت ہے مین نے ہر وقت معائنہ و غور کیا تو میرے
خیال مین عورتین مردون سے کچھ ہی کم ہونگی بعد معائنہ آج ہی ہم سب یہانسے روانہ ہوکر
جہاز پر پہونچے دیکھا تو تینون درجے آدمیون سے اسقدر پُر ہین کہ کہین قدم رکھنے کی جگہ نہیں
ہے فقیر اور برخوردار مولوی محمد صادق الیقین کے لیے دو ٹکٹ چھتری کے حیدرآبادی ٹکٹ
مجرا دیکر جو انیس لیرہ پر بڑی رعایت کفایت کے ساتھ بہم پہونچائے گئے قرنطینہ سے
جب جہاز پر جانے لگے تو جہاز کے سب ٹکٹ آمد و رفت کے قلمدان مین اس خیال سے رکھ
لیے گئے کہ جہاز پر پہونچنے کے ساتھ ہی ٹکٹ کا معائنہ ہوگا وہ قلمدان رومال مین بندھا ہوا میرے
نواسے کے ہاتھ مین تھا کشتی سے جب وہ مجھے جہاز کے زینے پر چڑھانے لگے تو قلمدان اونکے
ہاتھ سے چھوٹکر دریا مین گر گیا اونھون نے فوراً زینے سے جھک کر قلمدان پر ہاتھ ڈالا تو بفضل
الٰہی رومال کا کونہ ہاتھ مین آگیا اور قلمدان نکل آیا خدائے تعالیٰ نے بڑی خیر کی ورنہ اگر
ٹکٹ ضائع ہوجاتے تو نہ معلوم کیا دقت اور زحمت پیش آتی جب ہم چھتری پر پہونچے
تو دیکھا کہ وہان بھی قدم رکھنے کی جگہ نہین ہے خیال تھا کہ شاید کرایہ زائد ہونیکی وجہ سے
لوگ یہان بہت کم ہونگے مگر اللہ اکبر یہان بھی اسقدر کثرت ہے کہ بجز آدمیون کے کچھ نظر
نہین آتا اب حجاج اس جہاز مین نو سو سے زیادہ ہین بہزار جستجو خداوند تعالیٰ کی عنایت سے

مجکو اور برخوردار موصوف کو کپتان جہاز کے کمرے کے برابر تھوڑی جگہ ملگئی ہمارے جہاز کا
کپتان اگرچہ انگریز ہی لیکن نہایت سیدھا بے نفس آدمی ہی ہر شخص سے بے تکلف
بخندہ پیشانی پیش آتا ہی خصوصاً چھوٹے چھوٹے بچون سے بڑی محبت کرتا ہی فقیر کی
پوتی رقیہ کا ہاتھ پکڑ کر اکثر اخلاص کی باتین کیا کرتا ہی مجھے اکثر اسکا اندیشہ رہتا تھا کہ
ہر وقت اس انگریز کا سامنا ہی ایسا نہو کہ کوئی بات اسکی میرے مزاج کے خلاف ہو مگر
بعنایت الٰہی کبھی کوئی بات اسکی میرے مزاج کے خلاف وقوع مین نہین آئی الحمد للہ علی
ذٰلک۔ فقیر کو جو جگہ ملی ہی اس جگہ پر جناب مولنا خلیل احمد صاحب مقیم تھے آپنے براہ عنایت
اپنی جگہ فقیر کو عنایت فرمائی اور آپ اُس مقام پر تشریف لے گئے جہان آپکے اہلخانہ حضرتا
اور صاحبزادی وغیرہ مقیم تھین یہ سب پاس و لحاظ ہمارے برخوردار مولنا صادق الیقین کا
ہی ورنہ ایسے مقام پر ایسی رعایت بہت دشوار بلکہ ممکن ہی نہین ہوئی جناب حکیم مولنا
محمد اسحٰق صاحب اور برخوردار موصوف اور فقیر کا بستر ایک ہی جگہ پر پاس ہی پاس ہے
ایک وز مین نے اپنے برخوردار ممدوح سے پوچھا یہ کیا باعث ہی جو ستارے کرسی مین جس
مقام پر نظر آتے تھے باوجودیکہ کرسی یہانسے ہزارہا کوس پر ہی مگر وہ ستارے یہان بھی
اوسی مقام پر نظر آتے ہین کچھ سمجھ مین آتا ہی برخوردار موصوف نے جواب دیا کہ وسعت آسمان
کیوجہ سے تمام ستارے ہر جگہ سے ایک مقام پر نظر آتے ہین مولنا اسحٰق صاحب نے فرمایا کہ
اسکے علاوہ بڑے ستارونمین سے ایک ایک ستارہ دنیا کی آبادی کے برابر ہی یہ سُنتے ہی مجھ فقیر کو
فوراً یقین آگیا کہ واقعی یہی امر ہی جہلا و عوام الناس ایسی بات پر یقین نہین لاتے اور خداوند
تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دھیان نہین کرتے اللہ تعالیٰ جیسا خود بڑا ہی کہ اوسکی بڑائی اور
بزرگی کی کوئی انتہا نہین ہی ویسے ہی اُسکے کارخانے بھی ایسے عظیم الشان ہین کہ جسکی

حد و پایان نہین ہی یہان عقل کو دخل نہین ہی سچے دل اور سچے عقیدے کے ساتھ اللہ تعالے
کی قدرت پر نظر کرنا چاہیے یہ ویسی ہی بات ہی کہ ایک روز جناب مولنا محمد اشرف علی
صاحب تھانوی عم فیضہ سے مین نے پوچھا حدیث شریف سے ثابت ہوتا ہی کہ قوم
یاجوج و ماجوج کوئی مشغلہ نہین کرتے تو پھر انکی بسر اوقات اور معاش کی کیا صورت ہی
فرمایا کہ مین نے اپنے اوستاد جناب مولنا محمد یعقوب صاحب سے سُنا فرماتے تھے کہ ایک
سانپ ہر روز آسمان سے گرتا ہی اور یاجوج و ماجوج کی تمام قوم اوسی کو کھاتی ہی اب
خیال کرنا چاہیے کہ قوم یاجوج ماجوج تمام دنیا کے آدمیون سے ہزارون لاکھون حصے
زائد ہی اسلیے کہ اونکے یہان پیدایش برابر ہوتی ہی اور مرتا کبھی کوئی ایک بھی نہین
پس اونکی کثرت کی کوئی حد و نہایت نہین ہو سکتی اور وہ سانپ ایسا درازقامت ہوتا
ہی کہ اونکی قوم کے تمام لوگ اوسی کو کھاتے ہین اور ہر شخص اوسکو اپنی جگہ پر موجود پاتا ہی اگر
ایسا نہو تو ہر شخص کا ایک جگہ پر پہونچنا کبھی ممکن ہی نہین ہی یہ فرماکر جناب مولنا صاحب
ممدوح نے ارشاد کیا کہ جناب باری تعالی نے آسمانون کے اوسطرف ایک دریا عظیم الشان
ایسا پیدا کیا ہی کہ اگر اوسکی ایک لہر اسطرف آجائے تو ساتون آسمان اور ساتون طبقے
زمین کے بہ جائین- خدا شاہد ہی کہ سُنتے ہی ان دونو باتون کے فوراً مجھے یقین آگیا اور
اسکے سچائی پر بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے عوام الناس ایسی باتون پر یقین نہین لاتے
حالانکہ عوام مین مین بھی ہون خواص مین نہین ہون لیکن مجھے اللہ تعالی اور اوسکے رسول
علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد اور حضرات علمای دین کے فرمانے پر فوراً یقین کامل
آجاتا ہی- اب اللہ تعالی کی عنایت اور اوسکے فضل و کرم کو دیکھنا چاہیے فقیر ایک مدت دراز
سے عارضۂ دوران سر اور درد سر مین برابر مبتلا رہتا ہی اور ضعف دل و دماغ اس درجہ ہے

کہ جسکی انتہا نہین مگر با این ہمہ بعنایت الٰہی مجھ فقیر کو جہاز کا تکان اور دوران اور متلی خیر د
مطلق نہین ہوئی قبل روانگی اس سفر مقدس کے درد سر اور دوران سر کی شکایت
اور بھی زیادہ ہوگئی تھی مگر اللہ تعالیٰ جل شانہ وعم نوالہ کے فضل وکرم سے وہ معمولی
شکایت بھی اسوقت تک کہ آج چوتھا روز ہی فقیر کو نہین ہوئی امید ہی کہ اللہ تعالیٰ
اپنے فضل وکرم سے آیندہ بھی محفوظ رکھے برخوردار مولوی محمود العانی فقیر کے نواسے اور فقیر
کی بہو اور پوتے اور حاجی رحیم اور گلاب گدی یہ سب بہت زیادہ دوران سر اور متلی
مین مبتلا ہوے اب بعنایت الٰہی سب کو تخفیف ہی اور برخوردار مولٰنا کو فقط ایک ہی
بار متلی ہوئی۔ اور جناب مولٰنا محمد اسحٰق صاحب کو تو سر اوٹھانا دشوار ہوگیا اور میر
صادق علی صاحب کو مطلق دوران کی شکایت نہین ہوئی سنا گیا ہی کہ ہمارے
قافلے کے علاوہ اور جو قافلے آنے والے تھے اور برابر چلے آتے ہین انکے سوا تیس ہزار حجاج
بمبئی کے راستے سے بیت اللہ شریف کو جا چکے ہین جمین کے متصل جاوہ مسلمانون کا
ایک ملک ہی وہانسے حجاج کے قافلے بکثرت آتے ہین معتبر آدمی کی زبانی سُنا گیا ہی کہ
وہان کا یہ دستور ہی کہ جو شخص پہلے حج نکرے اوسکا عقد نکاح نہین کیا جاتا سبحان اللہ
دینداری اسکا نام ہی دشمنان دین جو رخنہ اندازیان اس سفر مین مسافرون کیواسطے
کر رہے ہین اس سے اونکا منشا خاص یہ ہی تاکہ کوئی مسلمان حج کے لئے نجائے یہ خیال
خام اونکا محض غلط اور بے سود ہی ہر رخنہ اندازی کی ایک فکر نہین اگر کوئی ہزار فکرین
کرے جب بھی تا قیامت کوئی فکر و تدبیر سد راہ نہین ہو سکتی مسلمان ہزارون تکلیفین
اوٹھائینگے مگر سفر بیت اللہ شریف سے کبھی باز نہ آئینگے۔ جہاز کے پاخانے باوجود
متعدد اور بکثرت ہونے اور غلاظت کے نیچے جانیکے متعفن اور بدبودار بہت ہوتے ہین

اسکی کیفیت کوئی ہمارے میر صادق علی صاحب سے پوچھے چونکہ فقیر کی طبیعت غلاظت و
بدبو کی متحمل نہین ہوتی اسوجہ سے پانچ روز برابر گذر گئے فقیر پاخانہ نہین گیا آج برخوردار
مولوی محمود العافی مد عمرہ نے سالار قافلہ صاحب سے یہ کیفیت بیان کی اونھون نے
براہ مزید عنایت فقیر کو فرست کلاس کے پاخانے مین جانیکی اجازت دلوادی اللہ تعالے
کی محض عنایت بندہ نوازی ہی فسٹ کلاس فقیر کے بسترے سے بہت ہی نزدیک ہے
فقیر اوسکے اندر گیا تو دیکھا کہ نفیس اور پر تکلف جگہ ہی۔ اس جگہ کے پاخانے کی صفائی
اور عمدگی کو کیا پوچھنا فقیر نے باطمینان وہان قضای حاجت سے فراغت حاصل کی اللہ
تعالی اسکی جزای خیر دارین مین قافلہ سالار صاحب کو عطا فرمائے آمین ثم آمین
آج پچیس شوال روز ہفتہ کو ایک دریا شب کے وقت آنے والا ہی جسکے تلاطم عظیم کا زور
وشور سنا جاتا ہی امید ہی کہ جناب باری تعالی اس دریا کی تکان سے بھی بچائے اور
باسانی تمام پار لگائے سنا ہی کہ ایک شبانہ روز مین وہ دریا طی ہوتا ہی اسی سمندر مین
ملا ہوا ہی نام اوس دریا کا سقوترہ ہی اسوقت ۲۶ شوال روز یکشنبہ سنا جاتا ہی کہ وہ دریا
شروع ہو گیا اس دریا مین سرخ رنگ کے جانور گلاب کے پھول کے بعینہ ہمشکل کثرت سے تیرتے
نظر آتے ہین۔ آج ۲۹ شوال روز سہ شنبہ کو خدا خدا کر کے وہ دریا ختم ہوا اس دریا نے
اپنے ہیجان کے دوران مسافرون سے کسی کو چھوڑا نہین ہے شاید کوئی متنفس بچگیا ہو
چھ سات پہر تو ایسی شدت رہی کہ سر اوٹھانا دشوار ہو گیا فقیر کو بعنایت الٰہی بالکل
متلی نہین ہوئی مگر دوران سر مجھے بھی ہوا مگر بہت کم یہان جہاز پر کوئی چیز نہین ملتی ہی
بکری کا گوشت ایک روپیہ سیر ملتا ہی آج فقیر کے دستار خوان پر پکا ہوا سالن بکری کا
ایک دوست لائے تھے فقیر کے کھانے مین بھی آیا یہان تمامی بیون مین فرعیان مین نے

دریاے شور

دیکھی ہین یقیناً فروخت ہوتی ہونگی قیمت کا حال مجھے معلوم نہین ہوا ہمارے جہاز کے کپتان باوجود انگریز ہونیکے نہایت بامروت آدمی ہین اور مزاج مین بہت ہی بے تکلفی اور سادگی ہی ہر شخص سے باخلاق پیش آتے ہین مسافرونمین سے اگر کوئی کسی شخص کو ستاتا ہی اور کپتان کے پاس استغاثہ لاتا ہی تو آپ خود تحقیقات حال کرتا ہی ہمارا البتہ کپتان کے کمرے سے ملا ہوا ہی فسٹ کلاس کے مکانات کپتان کے کمرے کے نیچے ہین جسکا فی کمرہ سوا سوا سو روپیہ پڑتا ہی جناب مولانا محمد اسحٰق صاحب اور جناب مولوی عاشق الٰہی صاحب میرٹھی اور برخوردار مولوی محمود العافی کی رسائی سے کپتان نے ایک کوٹھری کی اجازت انکو دیدی فقیر کل بھی وہان بیٹھا لیٹا سویا تھا اور آج بھی اوسی کوٹھری مین بیٹھکر روزنامچہ جہاز کا تحریر کیا ہی مجھ ایسے غریب فقیر کو ایسی جگہ کا ملنا یہ سب عنایت و بندہ نوازی پروردگار عالم کی ہی الحمد للہ ثم الحمد للہ آج دوسری ذیقعدہ یوم جمعہ کو بھی بارہ بجے دسوین دن ہمارا جہاز عدن کو پہونچ گیا افسوس ہے کہ کوئی عدن کو جانے نہین پاتا اسوجہسے ہم لوگ شہر عدن کے دیکھنے سے ناکام رہے صرف ایک مینار نظر آتا ہی معلوم نہین کہ وہ مینار کسی مسجد کا ہی یا کسی اور عمارت کا عدن کے دوکاندار ہر قسم کے اشیا لیکر کشتیون پر جہاز کے نیچے آتے ہین بہت اچھا بازار لگا ہوا ہی یہانکے تربوز ایسے شیرین اور خوش ذائقہ اور لذیذ اور خوش رنگ مثل شہاب کے ہوتے ہین کہ ہندوستان مین کبھی ایسے تربوز نہ دیکھے نہ کھائے عدن سے خشکی کی راہ سے بھی بیت اللہ شریف کو راستہ گیا ہی دو ماہ مین مسافت طی ہوتی ہی ملک عرب یہین سے شروع ہی عدن ہمارے حضرت سلطان ظل اللہ کی عملداری مین ہی ایک زمانہ دراز سے انگریزونکے پاس ٹھیکے مین رہتا ہی سنا گیا ہی کہ انگریزون نے اس شہر مین قلعے بہت مستحکم کثرت کے ساتھ بنائے ہین آج تیسری

جہاز کا عدن کو پہونچنا

قرنطینہ کامران

ذیقعدہ یوم ہفتہ کو گیارہ بجے شب کے وقت یعنی شب یکشنبہ کو جہاز ہمارا چھوٹ گیا آج
پانچوین ذیقعدہ یوم دوشنبہ کو جہاز ہمارا کامران مین آگیا مگر چونکہ قرنطینہ کے مکانات
رُکے ہوے ہین اسوجہ سے آج ہمارا اوترنا جہاز سے ملتوی رہا انشاء اللہ تعالیٰ کل کسی
وقت ہم سب جہاز سے اوترکر قرنطینہ کے مکانات مین داخل ہوجاینگے اللہ تعالیٰ کا شکر
ہے کہ قرنطینہ مین داخل ہوتا ہم لوگون کا آج ہی سے شمار کیا جائیگا آج چھٹی ذیقعدہ روز سہ شنبہ
دس بجے کے بعد دن کو ہم سب کامران کے قرنطینہ مین داخل ہوگئے ابتک قرنطینہ تو
فقط برای نام ہی تھا وہان سُنا گیا تھا کہ کپڑے اوتارے جائینگے اور بھپارا دیا جائیگا مگر
یہ کچھ بھی وہان نہین ہوا یہان تو خدا کی پناہ پہونچتے ہی ہم سبکو ایک ایک تہہ بند پاک کپڑے
اوتروا لئے گئے ہم سبکو دفعہ دفعہ کرکے تین مکانون مین جانا ہوا تیسرے مکان مین جب پہونچے
وہان کی چھت مثل چلنی کے بنا رکھی ہے اوس سے پانی برسایا جب ہم خوب بھیگ لیے انگریزی
صابون ہمارے تمام جسم پر ملا گیا پھر خوب پانی برسایا جب ہم لوگ خوب نہا لیے تب
خشک تہہ بند باندھنے کو ملے اور جو کپڑے ہم لوگون کے بدن سے اوتارے گئے اور جس قدر
کپڑے مثل بچھونے اور پارچہ سرمائی وغیرہ کے ساتھ تھے اون سبکو بھپارا دیا گیا جب وہ باہر
نکلکر آئے تو اسقدر گرم تھے کہ ہاتھ رکھنا دشوار تھا اور عجیب قسم کی بدبو نہایت ناگوار تھی
خیر اس زحمت کے بعد خدا خدا کرکے نجات ملی یہان کے مکانات جنکو بارک کہتے ہین نہایت
وسیع اور کشادہ ہین ایک ایک بارک مین تیس تیس چالیس چالیس آدمیون کے قریب مقیم
ہوتے ہین جب بھی کشمکش نہین ہوتی یہ جگہ تو ایسی دلکشا اور فرحت افزا ہے کہ سبحان اللہ
ہر بارک کے سامنے میدان وسیع لب دریا عجب کیفیت نظر آتی ہے یہ سب برکت ہے نور ارادت
ہمارے حضرت سلطان ظل اللہ کی عملداری کی ہے اللہ تعالیٰ اُسکو دوام اشمس القمر

خیرخواہانہ عرضداشت

سلامت باکرامت رکھے خیرخواہانہ عرضداشت بحضور حضرت سلطان
ظل اللہ خلداللہ ملکہ شہر بمبئی مین انگریزون کی جانب سے پانچ روز کا جو قرنطینہ قائم کیا گیا ہی
اُسکے بارہ مین ہم کچھ نہین کہتے بجز اسکے کہ سکوت اسلم ہی کامران ہمارے حضرت سلطان
ظل اللہ من اکرمہ اکرمہ اللہ خلداللہ ملکہ و مد ظلہ کے خاص عملداری مین ہی مسلمانونکے افلاس
اور محتاجی کا حال اظہر من الشمس ہے بیچارے خدا جانے کس کس فکر و تدبیر سے زاد و راحلہ بہم
پہونچاکر محض اللہ تعالی کی خوشنودی اور حرمین شریفین کی زیارت کے ذوق و شوق مین
ایسا سفر دور و دراز لق و دق عظیم الشان اختیار کرتے ہین یہانکا قرنطینہ دس روزکا بلا وجہ
جیسا کچھ مسلمانون کے نقصان اور انواع و اقسام کی زحمت اور مصائب کا باعث ہوتا ہی وہ
ظاہر ہی اسکے علاوہ ۸ روپیہ نقدفی کس دینا پڑتے ہین ہمکو اپنی اس بدنصیبی پر سخت رونا آتا ہی
ایسی حالت ایسے وقت ایسے سفر مین ہماری سرکار والا اقتدار سے ہماری دستگیری و استعانت
فرمائی جائے نہ کہ معاملہ بالعکس ہوتا ہی اسکو بجز اپنی بدنصیبی کے اور کیا کہا جائے۔ چھٹی
ذیقعدہ کو ہم سب لوگ قرنطینہ کے مکانات مین داخل ہوے ساتوین کو صبح کے وقت بعد
طلوع آفتاب ڈاکٹر ہماری فرودگاہ پر آیا ایک جمعدار اور ہمارے قافلہ سالار صاحب
محمد سراج اوسکے ساتھ یہ ڈاکٹر عیسائی مذہب قوم ترک سے معلوم ہوتا ہی اور جمعدار مسلمان
ہین ڈاکٹر نے سبکی نبضین دیکھین تیسرے پہر کو تین بجے کے وقت بنابر تحصیل زر قرنطینہ پھر
یہ تینون شخص آئے جس بارک مین ہم سب لوگ فروکش تھے اندر آکر کرسی پر ڈاکٹر بیٹھا اور
زر قرنطینہ طلب کیا جو لوگ پیشتر روپیہ قرنطینہ کا داخل کر چکے تھے اونھون نے رسیدین پیش
کردین منجملہ اونکے یہ فقیر بھی تھا اور جنھون نے پیشتر روپیہ داخل نہین کیا تھا اور صاحب زر
تھے اونھون نے روپیہ حاضر کردیا فی کس ۸ روپیے لیے گئے اور جو لوگ مفلس تھے اونھون نے

اپنے افلاس کا عذر پیش کر کے کہا کہ ہم مسکین ہین بعد تحقیقات دریافت حال اُنکو فیس
قرنطینہ معاف کی گئی ڈاکٹر خود تلاشی لیتا تھا کمر و بازو و گلو وغیرہ ٹٹولکر دیکھتا تھا ایک
صاحب سے جب وہ طلب کیا تو اونھون نے اپنا افلاس ظاہر کر کے کہا کہ مین مسکین ہون
ڈاکٹر نے اونکی تلاشی کے لیے کمر مین ہاتھ ڈالا ایک ڈبیا مثل تعویذ کے کپڑے کے اندر اُسپر موم جاَمہ
لگا ہوا نظر آئی پوچھا یہ کیا چیز ہے کہا تعویذ ہے ڈاکٹر نے اوسکو کھولڈالا اوسکے اندر سے گنی
گنتیان یعنی اشرفیان برآمد ہوئین ڈاکٹر نے ایک گنی لے لی باقی اونکے حوالے کین وہ بیچارے
سخت نادم و محجوب ہوے اور دیگر اشخاص کی تلاشی مین سختی کا باعث ہوا ہر تقدیر معلوم
ہوا کہ جو لوگ درحقیقت مفلس ہوتے ہین اونکو فیس قرنطینہ معاف کر دیجاتی ہے ایک
صاحب اپنے کو مفلس قرار دیکر برابر سوال کرتے پھرتے تھے بروقت تلاشی کے اونکی بی بی کی
کمر سے سات سو روپیہ کی اشرفیان برآمد ہوئین دنیا کی حرص لوگونکے دلونمین ایسی سمائی
ہوئی ہے کہ ایسے وقت اور ایسے سفر مین بھی لغویات سے باز نہین رہتے اللہ تعالیٰ اپنی
پناہ مین رکھے۔ یہان کامران مین قبلہ مکرمہ خاص اوتر جانب ہے جہاز پر ہمکو چارون سمت
نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا یعنی قبلہ شریف کبھی مغرب کبھی مشرق کبھی جنوب کبھی جانب
شمال واقع ہوا اور جدہ شریف مین بالکل جانب مشرق یعنی پورب طرف قبلہ شریف
واقع ہے سب لوگ ہمیشہ پورب طرف نماز پڑھتے ہین تو ذیقعدہ کو یہان یعنی قرنطینہ
کامران مین جمعہ واقع ہوا اشتل بارک کے ایک مسجد بھی بوریہ کی بنادی گئی ہے اوسی مسجد مین
حیدرآباد دکن کے ایک عالم صاحب نے جنکا نام نامی واسم گرامی سید صوفی ہے نماز جمعہ
پڑھائی بعد نماز جمعہ وعظ بھی فرمایا سُنا گیا ہے کہ وعظ بہت عمدہ ہے ہفتہ کے روز شب کے
وقت جناب مولوی صاحب نے پھر وعظ کہا یکشنبہ کو شب کے وقت جناب مولوی عبد الہادی

صاحب مدراسی نے وعظ فرمایا برخوردار مولوی محمود العافی مدعمرہ انکی وعظ کے بہت
بڑے مداح ہین مولوی صاحب ممدوح صوف نے کئی گھنٹے وعظ بیان فرمایا لوگ بہت خوش
ہوے ۔ مولویصاحب بہت کم عمر ہین نہایت درجہ نیکبخت اور با اخلاق مزاجین خاکساری
بجد ہی ۔ ہمارے برخوردار مولٰنا کو بہت مانتے اور بڑا ادب کرتے ہین فقیر سے بھی بڑی محبت
و اخلاق کے ساتھ پیش آتے ہین مولویصاحب ممدوح صوف کے والد ماجد اور ایک بھائی اور
ایک بیٹا کم عمر ساتھ ہی ایک روز ہم سبکی دعوت بھی کی یہان ایک دریائی جانور مارا گیا
جسکی ایک منھ سات دمین ہین فقیر تو اُسکے دیکھنے کو نہین گیا مگر اور بہت لوگون نے
دیکھا اور تعجب کیا الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ ہمارے قافلے مین بہت بڑے بڑے عالم و فاضل اور
درویش کامل رونق افروز ہین حیدرآباد کے ایک درویش نہایت بزرگ پاکیزہ صورت
تشریف رکھتے ہین دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ نوّے برس کی عمر ہے مگر بعنایت الٰہی
بخوبی چلتے پھرتے ہین شہر لکھنؤ مین کوئی بزرگ مولٰنا محمد اسحاق صاحب گذرے ہین
اُنکے آپ خلیفہ ہین آپ کا نام مین نے دریافت کیا معلوم نہین ہوا اگر مین خود اُنسے
دریافت کرتا تو معلوم ہو جاتا مگر نوبت نہین آئی فقیر سے بہت اخلاق کے ساتھ پیش
آتے ہین باوجود فصل سرما ہونیکے بمبئی سے یہان کامران تک سردی برائے نام ہوتی ہے
بمبئی مین کچھ سردی تھی بھی مگر جہاز پر اور یہان کامران مین تو یہ حال ہے کہ اول شب مین
لوگ برہنہ رہتے ہین یعنی چادر کی بھی ضرورت نہین ہوتی پچھلی شب مین کسیقدر ضرورت
ہوتی ہے بعض بعض شب مین یہ فقیر فقط ایک چھوٹی لنگی اوڑھے رہا اور سردی نہین معلوم
ہوئی پچھلی شب مین مین نے کبھی کوئی کپڑا سادہ یا روئی دار اوڑھ کر نماز تہجد یا وظیفہ
نہین پڑھا فقط سادہ شلوکہ اور سادی صدری پہنے رہا مگر کبھی سردی مطلق نہین معلوم ہوئی

ذکر دریائی جانور عجیب

حال آنکہ یہ مہینہ ماگھ کا ہی ۲۴ ذیقعدہ روز چہارشنبہ ہم لوگ قرنطینہ سے نجات پاکر جہاز پر آگئے
ہان خوب یاد آیا قرنطینہ سے ہم لوگونکی روانگی کے روز ڈاکٹر حسب معمول جب معاینہ کے لیے آیا
سبکو دیکھکر چلا گیا دو ڈھائی گھنٹے کے بعد معلوم ہوا کہ اب کوئی بڑا ڈاکٹر آتا ہی ہم سب لوگ
حسب الحکم اپنی اپنی بارکو نسے باہر آکر اور صفین جما کر کھڑے ہوے دیکھا تو وہی ڈاکٹر جو روز معاینہ
کے لیے آیا کرتا تھا آرہا ہی اور مولوی محمد سراج سالار قافلہ حسب دستور اسکے ہمراہ ہین قریب آکر پوچھا
کہ آپ سب لوگ ہمسے راضی و خوش ہین کسیطرحکی تکلیف تو آپکو نہین ہوئی کہا گیا کہ ہم سب خوش
ہین یو دیکھکر چلا گیا یہ سب اقبال ہمارے حضرت سلطان ظل اللہ کا ہی واقعی کہ ہم ان کے قرنطینہ مین
ہم لوگونکو کسی نہج کی تکلیف نہین ہوئی اور نہ کوئی امر خلاف مزاج واقع ہوا قربان جائیے اپنے
مالک حقیقی کے ایک روز ہمارے برخوردار مولوی محمد صادق الیقین کو بخار کی حرارت تھی ڈاکٹر نے
معائنہ کے وقت جب کلائی پر ہاتھ رکھا بوجہ محسوس ہونے حرارت کے ذرا غور کے ساتھ دیکھا او
گرفتہ کے گریبان مین بھی ہاتھ ڈالا مگر کچھ کہا نہین چلا گیا سنا گیا تھا کہ جب یہان کوئی کسی مرض
مین گرفتار ہوتا ہی تو اسکو قرنطینہ سے باہر دریا کے کنارے دلوا دیتے ہین اور کوئی آدمی وہان جانے
نہین پاتا اسوجہ سے مجھے دوسرے روز کے لیے دغدغہ تھا کہ اگر خدا نخواستہ اسنے کل بھی حرارت پائی
تو خدا جانے کیا معاملہ پیش آئے اب دوسرے روز جب ڈاکٹر آیا مین نے اسی اندیشہ سے جناب باری
تعالی مین دعا مانگی اور دس رکعت نماز کی منت کی کہ یا الٰہی ڈاکٹر کے شر و فتنہ سے میرے فرزند
مولوی محمد صادق الیقین کو بچانا اور اپنی پناہ مین رکھنا اب ذرا اسکی بندہ نوازی اور کریمی و
رحیمی کو دیکھنا چاہیے کہ ہماری ساری جماعت کو اوسنے حسب دستور معاینہ کیا جب برخوردار
موصوف کے نزدیک آیا نہ انکی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور نہ انکی کلائی پر ہاتھ رکھا یونہین چلا
گیا مین نے اللہ تعالی کا شکر ادا کیا اور اوسیوقت دس رکعتین نماز کی ادا کین ایک روز

برخوردار موصوف کو پھر بخار آگیا۔ مجھے اندیشہ ہوا جب اکثر آیا مین نے پھر دعا کی اور نمازین
مانین اس پر وردگار اللہ تعالی کے فضل و کرم اور بندہ نوازی کو دیکھیے کہ ہم لوگونکی جماعت ایک
سرے سے آیا اور دوسرے سرے پر چلا گیا مگر کسی شخص کی کلائی پر بھی ہاتھ نہین رکھا مین نے
خداوند تعالی کا شکر بجا لا کر نمازین ادا کین۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ آج ۸ تاریخ روز یکشنبہ کو
ہم سب لوگ جہاز سے اوتر کر جدہ شریف مین آگئے یہان یہ دستور نکالا ہے کہ سب مسافرونکو
ایک مکانمین نظربند کر دیتے مین جب فی کس تین روپے چھ آنے لے لیتے ہین تب شہر کے اندر
جانے دیتے ہین اوسوقت بڑا ہنگامہ اور ازدحام ہوتا ہے اور بدون دیے کسی کو چارہ نہین
ہوتا الا وہ شخص جو بالکل مفلس اور محتاج ہو جسکو یہان مسکین کہتے ہین۔ اللہ جل شانہ نے اس
سفر مقدس مین ہر قسم کے کامونمین ایسی ایسی مدد و استعانت فرمائی کہ جسکی حد و نہایت نہین ہے
یہان یہ دستور ہے کہ جہاز سے اوتر کر روانگی کیوقت ایک تلاطم عظیم ہوتا ہے اسیوجہ سے اسباب کی
بالکل بے ترتیبی ہوتی ہے ملاح وغیرہ جو اسباب پاتے ہین جس کشتی مین چاہتے ہین اوٹھا کر ڈالدیتے
ہین بعد کو مسافر بیچارے کشتیون سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنی شناخت اور نشان کے موافق
اسباب نکالتے ہین مسافرونکو اسمین بہت بڑی دقت و زحمت ہوتی ہے اکثر اسباب تلف بھی
ہو جاتا ہے یہان جدہ پہونچکر جب اسباب اوٹھایا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک بورہ کپڑون کا جس مین
برخوردار مولوی صادق حسین صاحب کا لبادہ اور اونکی اہلیہ کا ایک سیاہ لحاف و زیور کا
ایک دستہ قیمتی بارہ روپے کا تھا گم ہو گیا ہر چند تلاش و جستجو کی گئی مگر کہین سراغ نملا آخر تب
جناب باری تعالی مین عرض و معروض کر کے ایک سو بیس رکعت نماز نذر مانی بالکل ملیوس ہو گئے
بعد بورہ اسباب کا مل گیا ان باتون کا اظہار و بیان فقط اللہ تعالی کے شکران نعمت پر ہے
اسپر کسی اور قسم کا خیال و گمان نکرنا چاہیے۔ یہان جدہ شریف مین ہر قسم کے مصارف کی

ورود [illegible] ہوا

کوئی حدوبایان نہین ہی جس مقام پر جہاز کا لنگر ہوا تھا وہان سے جدہ شاید دو میل ہو
میرے خیال مین اس سے زیادہ نہوگا جسکے اد تروائی نی کس ساڑھے پانچ چھو روپیہ لیے گئے
جدہ سے مکہ مکرمہ جانیکے واسطے تین قسم کی سواریان یہان ہوتی ہین ایک تخت روان
دوسرے شغدف تیسرے شبری تخت روان تو مخصوص اہل دول و امراء کے لیے ہی یہان
مسافرونکی بڑی آرام وراحت کی سواری شغدف ہی اور اسی کی کثرت زیادہ ہوتی ہی
اسکے بعد شبری اور جو لوگ بالکل کم مایہ ہوتے ہین وہ لوتہین او نٹونکے بچھڑ پر کجاوے
یا بوریون پر بیٹھ لیتے ہین فقیر کے یہان دو شغدف مطوف صاحب کی معرفت خرید کیے
گئے کسی کی یہ مجال نہین کہ کوئی خود اپنے طور پر خرید کرسکے اور صورت شغدف کی یہ ہوتی ہی
کہ جیسے ہمارے یہان بانس کی چارپائیان یا قوفسے بنی ہوئی ہوتی ہین بان کا نس کے بالونکے
ہوتے ہین بہت ہی مضبوط بان انکی پٹیان اور سیرو دے لکڑی کے نیچے اوپر دونون جانب کے
ہین۔ دو شغدف کی قیمت مطوف صاحب نے تیس روپیہ لے لی یہ دونون کھٹولے جنکا نام
شغدف ہی اونٹ کی پیٹھ پر ایک اِس جانب اور ایک اُس جانب ہوتے ہین اور ایک کھٹولے
پر ایک آدمی سے زیادہ نہین بیٹھ سکتا اور بنہ او سپر بجز اوڑھنے او بچھونے کے کسی قسم کا اسباب
بڑو رکھندیتے ہین شمس التواریخ مین لکھا ہی کہ اگر کسائی شغدف کی عمدہ طور پر ہوگی
تو منزل پر بہت آرام وراحت کے ساتھ پہونچنا ہوگا ورنہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا
واقعی مجھے تو شغدف پر سوار ہوتے ہی چھٹی کا دودھ یاد آگیا شغدف کی کسائی بدؤونکے
اختیار مین ہوتی ہی مگر وہ کسی حال مین کسی کی کچھ سماعت نہین کرتے دونون وقت کا
کھانا اور انعام پر انعام لیتے چلے جاتے ہین مگر ذرا بھی مروت ولحاظ نہین کرتے ایک شبری
دو روپیہ کو حاجی رحیم کے واسطے میر صادق علی صاحب کی شراکت مین خریدی گئی

اب ذرا خیال کرنا چاہیے جدہ شریف سے مکہ مکرمہ پوری دو منزل ہے فقیر کے دوست ہم وطن
یعنی قصبۂ گھسی خاص کے رہنے والے حاجی عظیم اللہ صاحب بیان فرماتے ہیں تیس برس کا
زمانہ گذرا جب میں بیت اللہ شریف گیا تھا اُس زمانہ میں جدہ سے مکہ معظمہ کا کرایہ شغدف
والے اونٹ کا پانچ روپیہ تھا اور برخوردار مولوی محمد صادق الیقین صاحب جب پہلی بار
بیت اللہ شریف گئے ہیں جسکو تیرہ ۱۳ برس کا زمانہ گذرا شغدف والے اونٹ کا کرایہ دس
روپیہ تھے اور اب ہمارے وقت میں شغدف والے اونٹ کے سینتیس روپیہ آٹھ آنہ دینا پڑے
ہیں چنانچہ فقیر کے یہاں دو اونٹ بلا شرکت غیرے کرایہ کیے گئے جسکے چھتر روپیہ دینا پڑے
اللہ اکبر ایک وہ وقت تھا کہ پانچ روپیہ دینا پڑتے تھے پانچ سے دس ہوے دس سے سینتیس
ہو گئے حاجی رحیم بخش کے لیے شبری والے اونٹ کا کرایہ جو میر صادق علی صاحب کی شراکت
کیا گیا ستر روپیہ دینا پڑے ایک حافظ صاحب نابینا دیوبندی نے اپنے واسطے ایک
خالی اونٹ کرایہ پر لیا اس اونٹ پر ہمارے یہانکے دو بورے ہلکے ہلکے رکھ دیے گئے
اوسکے چھ روپیہ دینا پڑے جدہ شریف شہر نہایت پُر رونق اور خوب ہی آبادی ہے یہانکے
مکانات چار چار پانچ پانچ سات سات درجوں کے بڑی شان و شوکت کے ساتھ بنے
ہوے ہیں کل عمارت یہانکی بالکل پتھر کی ہے اینٹ کا کہیں نام و نشان نہیں ہے ایک
تو تعمیر مکان میں نے یہاں دیکھا اسقدر عالی شان اور بلند کہ میری نگاہ پورے طور سے
وہانتک نہ پہونچ سکی سارے مکانکی تعمیر مثل دیوارونکے لکڑیوں پر ہے ایسا خوبصورت
اور عالیشان مکان میں نے اپنی ساری عمر میں کہیں نہیں دیکھا یہان کل مکانونکے
درجے مثل برآمدے کے لکڑیوں پر قائم کیے جاتے ہیں اور لکڑی بھی یہان نہایت عمدہ
خوش رنگ اور خوشنما ہوتی ہے اور اس کام کے کاریگر بھی یہان ایسے اوستاد ہیں کہ

ہندوستانمین شاید کہین ہون لکڑی کو ایسی صفائی سے گھڑتے اور ایسا کام مینت بناتے ہین کہ لکڑی مین جان ڈال دیتے ہین شہر بمبئی مین بھی واقعی بڑی بڑی عالی شان عمارتین نہایت خوبصورت و خوشنما بنی ہین مگر یہانکی عمارتین وہانکی عمارات پر بھی فوق لے گئی ہین یہانکا بازار خوب ہی آباد اور ہر چیز کی بے انتہا کثرت ہی مگر سب چیزین گران تسبیحات کی تو یہان وہ کثرت ہی کہ اللہ اکبر ایک سے ایک عمدہ تسبیح نظر پڑتی ہی دیکھکر دل کو بیقراری ہوتی ہی اسکے لیے زر کثیر درکار ہی تربوزونکی یہان وہ کثرت اور کھان ہی کہ جسکی انتہا نہین تربوز یہانکے ایسے لذیذ اور خوش ذائقہ و لطیف اور خوش رنگ ہوتے ہین کہ جسکی انتہا نہین ایسے تربوز ہندوستانمین نہ دیکھے نہ سُنے کھانیکا کیا ذکر وہ مذکور گودا ایسا سرخ جیسے بعینہ شہاب کا رنگ خربوزے بھی یہان بک رہے ہین برخوردار مولٰنا نے ایک خربوزہ منگایا دو آنہ کو ملا نہ بہت خوش ذائقہ اور نہ بدمزہ - جدّہ ماجدہ حضرت حوّا علیہا السلام کا مزار پُر انوار شہر کے باہر نصف میل کے فاصلہ پر واقع ہے فقیر وہان حاضر ہو کر زیارت سے مشرف ہوا یہ فقیر حقیر ناچیز عاجز و ہیچکارہ و ہیچمدان ضعیف و ناتوان اس لائق کہان تھا جسکو یہان حاضری کی نوبت آتی یہ سب فضل و کرم اُسی توانان یزدان کا ہی جو ہر کام مین ہر مقام پر اپنے بندونکی مدد و استعانت فرماتا ہی حضرت جدّہ ماجدہ کی قبر شریف ساٹھ ہاتھ کی مشہور ہی اور یہ بھی بلا اختلاف ثابت ہی کہ حضرت جد امجد آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا علیہا السلام کا قد مبارک تیس گز کا تھا مگر یہ نہین معلوم کہ جس گز سے آپ کا قد شریف تیس گز کا مشہور ہی اُس گز کی مقدار کیا تھی اور معلوم نہین کہ حضرت حوّا کا قد جو ساٹھ ہاتھ کا مشہور ہی اُس ہاتھ کی مقدار کیا تھی یہ مینے اسلیے کہا کہ آپکا مرقد مقدس ساٹھ ہاتھ سے بہت زاید نظر آتا ہی آیندہ اللہ اعلم بالصواب - یہان پر یہ جان لینا چاہیے کہ مکہ معظمہ کے چارون طرف میقات کی حدین مقرر

ہین جب اُن مقامات پر پہونچنا ہوتا ہی تو وہین سے احرام باندھا جاتا ہی احرام عمرہ ہو
خواہ احرام حج بمبئی کے جہاز پر آنے والونکے لیے حد میقات یلملم پہاڑ سے مقرر ہی اگر کوئی
شخص یلملم پہونچنے سے دو ایک روز قبل احرام باندھ لے تو جائز بلکہ بہتر ہی جب ہم سب
لوگ یلملم کے متصل پہونچے تو احرام عمرہ باندھا گیا وہانسے دو ہی ایک روز کے عرصہ مین
جہاز جدہ پہونچ جاتا ہی جدہ سے مکہ مکرمہ دو دن کی راہ ہی درمیان مین ایک منزل پر قیام
ہوتا ہی دوسرے روز مکہ معظمہ پہونچ جاتے ہین مثلاً اگر صبح کو روانہ ہوے تو شام کو منزل پر
پہونچے شب کو قیام کیا صبح کو پھر روانہ ہوے اوسی روز نماز عصر کے وقت مکہ شریف مین
داخل ہو گئے اور اگر شام کو چلے تو صبح کو منزل پر پہونچے تمام دن قیام رہا شام کو پھر چلے صبح کو
مکہ مکرمہ پہونچ گئے یہ تفصیل مین نے اسلیے کی کہ قافلہ کبھی شام کو روانہ ہوتا ہی اور کبھی
صبح کو ہمارا قافلہ صبح کو روانہ ہوا شام کو منزل پر پہونچا شب بھر قیام رہا تھوڑی رات
باقی رہے یعنی قبل نماز فجر پھر روانہ ہوا نماز عصر کے اول وقت ہم سب مکہ معظمہ مین داخل
ہو گئے اور نماز عصر وہین ادا کی یہانتک راستہ مین کوس اور میل وغیرہ کا کہین نام ہی
نشان نہین ہی اسوجہ سے منزل کا حساب نہین ملتا کہ فلان مقام فلان منزل سے اسقدر
فاصلہ پر ہی اور نہ چوکیون کا ایسا انتظام ہی جس سے کوسون کا پتہ ملسکے چوکیان برائے نام
ہوتی ہین گھانس پھوس ڈالکر کچھ آڑ کر لیتے ہین اس راستہ مین سائل بحد و بکثرت ملتے
ہین خصوصاً چھوٹے چھوٹے بچے یہانتک سائلونمین لطف مین نے یہ دیکھا کہ مثلاً ایک
ذراسی روٹی دو انگل کی مقدار مین اُنکی گود مین پھینک دی جائے تو اسقدر دعائین دیتے
ہین کہ جنکی انتہا نہین مجھے اپنی کم مایگی پر سخت افسوس آتا ہی اگر مجھ مین قدرت ہوتی تو کسی
سائل کو خالی پھرنے نہ دیتا کیا کرون سخت مجبور ہون رو کر رہجاتا ہون اس راستہ مین

جا بجا سرکاری چوکیان بھی مسافرون کی حفاظت کے لیے بنی ہین کوئی چوکی پہاڑ کے اوپر
کوئی نیچے اون چوکیون مین ہماری سرکار والا اقتدار کے ملازم ترکی رہتے ہین اون کا
یہ دستور دیکھا کہ ایک ایک دو دو نان پاؤ ہاتھ مین لیکر راستہ مین کھڑے ہوتے ہین جس
مسافر کو ضرورت ہوتی ہے دے لیتا ہے جدہ شریف اور مکہ معظمہ کے اثنا راہ مین جس منزل پر
قیام ہوتا ہے وہان بھی بلا وجہ فی کس ایک ایک روپیہ دینا پڑتا ہے ہم سب لوگ بعنایت
الٰہی اکیسوین ماہ ذیقعدہ بروز چہار شنبہ نماز عصر کے اول وقت مکہ معظمہ مین داخل ہوکر
شرف زیارت سے بہرہ ور ہوے یہان پہونچتے ہی مطوف صاحب کو ساڑھے ستائیس
روپیہ بلا شرکت دیگر ہمراہیون کے ہمکو بذات خود دینا پڑے تیس روپیہ دو کوٹھریان ہمراہیون
کی شرکت مین کرایہ لی گئین جس مین سولہ روپیہ ہمکو دینا پڑے چونکہ فقیر کو اونٹ کی سواری پر
شغدف یا شیری پر کبھی سوار ہونے کی نوبت نہین آئی تھی و نیز بوجہ کمزوری و عالم
ضعیفی کے نہایت درجہ ہلکان ہوا سارا جسم چور چور ہوکر رگ و ریشہ مین درد پیدا ہوگیا
اسی وجہ سے مکہ مکرمہ پہونچتے ہی طبیعت بہت ہی مضمحل ہوگئی برخوردار نور الابصار مولوی
محمد صادق الیقین صاحب کی طبیعت تو جہاز ہی پر ناساز ہو چکی تھی اور ضعف بہت زیادہ
ہوگیا تھا بوجہ ضعف و نقاہت کے طواف و سعی صفا و مروہ کے لیے برخوردار موصوف
نے شیری پر سوار ہوکر پنجشنبہ کے روز حرم محترم شریف مین حاضر ہوکر اوسی شیری پر طواف
و سعی دونون سے فراغت حاصل کی فقیر اول وقت کی حاضری سے بوجہ تکان سواری کے
حاضری سے مجبور رہا تیسرے پہر کو فقیر نے بھی بسواری شیری طواف و سعی سے فراغت
حاصل کی لیکن ایسے مقامات متبرکہ پر سواری پر سوار ہوکر حاضری دینا طبیعت کے بہت ہی
خلاف و سخت موجب ندامت و خجالت کا تھا وہان سے مکان پر آکر احرام عمرہ شریف

کھول ڈالا تیسرے روز فقیر نے بدشواری تمام حرم محترم شریف مین حاضر ہو کر نماز جمعہ ادا
کی ہفتہ کے روز کہ چوتھا دن حاضری کا تھا فقیر کو بڑی شدت سے زکام ہوا بخار و درد سر
کی ایسی ترقی ہوئی کہ غذا بالکل چھوٹ گئی نماز بیٹھ کر ادا کرنا دشوار ہو گیا دس بارہ روز تک
حالت بہت ہی ابتر رہی حتی کہ زمانہ حج شریف کا بہت نزدیک آ گیا حج ہی کی برکت سے
دو چار روز پیشتر صورت افاقہ کی ظاہر ہوئی مگر نقاہت و ضعف بہت تھا آٹھوین
ذی الحجہ جمعہ کے روز ادائے حج کے لیے عرفات پر جانے کا حکم ہوا عرفات شریف مکہ مکرمہ سے
سات کوس کے قریب ہی ہمارے یہان دو اونٹ شغدف والے کرایہ پر کیے گئے جسکا بیالیس
روپیہ کرایہ دینا پڑا ایک اونٹ پر فقیر مع برخوردار نور الابصار مولوی محمود العافی مد عمرہ
اور ایک اونٹ پر برخوردار عالی تبار مولوی محمد صادق الیقین صاحب مع اپنی اہلیہ اور ہمشیرہ
رقیہ سوار ہو کر عرفات کو روانہ ہوئے مکہ مکرمہ سے منا تین کوس کے قریب ہوا اُسدن
شب روز وہین قیام ہوا مکہ معظمہ سے تا منا لکھو کھا آدمی بسواری شغدف و شبری دنقہ
آتے تھے اور بعض خالی اونٹ پر سوار اور بعضون کے سواری مین حمار تیز رفتار اور بعض
پا پیادہ صبح کو ہفتہ کے روز نوین تاریخ عرفات کو روانہ ہوئے اوس اژدحام اور ہجوم کو
کیا پوچھنا عام طور پر مشہور تو یہ ہے کہ حج شریف مین نو لاکھ دو ہزار نو سو ننانوے آدمی
ہوتے ہین اور خاص طور پر چھ لاکھ کی روایت سُنی گئی ہے چھ لاکھ کیا کم ہین حضرت شریف
مکہ مع اپنی فوج و ساز و سامان احرام باندھے ہوئے رونق افروز ہوئے شریف صاحب
کے اسپ ہای عربی مع ساز و عراق جنہر زین پوش کارچوبی زردین نگار پڑے ہوئے زیور
نقرئی و طلائی سے آراستہ جلوس مین ہمراہ شریف صاحب بذات خود فٹن پر سوار
ہمراہی مین سوارون کے پرے قطار قطار ایک جانب فوج سلطانی حضرت شاہ مصر کی

طرف سے محمل شریف کے ہمراہ جسکے اندر غلاف مقدس خانہ کعبہ رکھا ہوا محمل شریف
پر جوبہائے کار چوبی زرنگار پڑی ہوئی ترک لوگ سلاحون سے مسلح عربی گھوڑون پر
سوار کیسے کیسے گھوڑے خوبصورت چست و چالاک تیز رفتار بخدا یہ جشن شوکت سلامی
کا ایسا لطف دکھا رہا ہی کہ جسکا ایک شمہ بھی قید تحریر مین نہین آسکتا بالمختصر اسی
شان و شوکت کے ساتھ سب حضرات عرفات شریف پر پہونچے اور مناسک حج ادا
کیے بعد فراغت حج کر اب تھوڑا دن باقی ہی حضرت شریف صاحب سوار ہوے
سلامی وغیرہ سب لوگ بعد غروب عرفات شریف سے منا کو واپس چلے یہان یعنے
عرفات شریف پر شبکو قیام کرنیکا حکم نہین ہے عرفات مقدس پر نماز ظہر و عصر ملا کر
پڑھی جاتی ہی اثنا، راہ مین یعنی درمیان منا اور عرفات کے مزدلفہ واقع ہی اس شبکو
مزدلفہ مین قیام ہوا یہان نماز عشاء و مغرب ملا کر پڑھی جاتی ہی یہانکی شب بیداری کو
افضل شب قدر ست فرمایا ہی مزدلفہ مین شب کے وقت کثرت اور ہجوم حضرات حجاج کا وہ ود
لطف دکھا رہا ہی کہ اللہ اکبر دوکانون ہر شی کی کثرت سے کیسی کیسی آراستہ کہ جن مین
طرح طرح کے کھانے اور مٹھائیان ادھر ادھر رکھے کیسے کیسے نفیس کہ جسکے دیکھنے سے روح کو
فرحت اور دل کو روحانی قوت حاصل ہوتی ہے صبح کو دسوین تاریخ یکشنبہ کے روز
منا مین پہونچے نماز عید الضحےٰ یہان بھی پڑھی جاتی ہی یہان پہونچکر ہر شخص کو دم دینا ہوتا ہی
فی کس ایک بکری یا دنبہ دیا جاتا ہی جنکو زیادہ وسعت ہوتی ہی وہ قربانی بھی کرتے ہین حجامت کے بعد
سب کے احرام کھل گئے تھوڑا دن رہے رمی جمار کو سب لوگ چلے منا مین تین مقام
پر تین دیوارین بنی ہوئی ہین وہان جا کر سب لوگ سات سات کنکریان ان دیوارون پر
مارتے ہین پہلے روز ایک ہی مقام پر پھر دوسرے تیسرے دن یعنی گیارھوین بارھوین کو

ہر سہ مقام پر کنکریاں مارتے ہین گیارھوین تاریخ یکشنبہ کے روز صبح کے وقت ہم
سب لوگ کھڑی سواری مکہ معظمہ کو روانہ ہوے دُو اونٹ اون اُونٹون کے علاوہ
جنکا کرایہ بیالیس روپیہ دیا گیا چھ روپیہ پر تا مکہ مکرمہ کیے گئے ایک اونٹ پر فقیر اور
برخوردار مولوی محمود العافی اور دوسرے اونٹ پر برخوردار عالی تبار مولوی شاہ محمد
صادق الیقین صاحب مع اپنی اہلیہ اور دختر مسماۃ رقیہ کے بسواری شغدف مکہ معظمہ
ہوپنچے حرم محترم شریف مین حاضر ہوکر پہلے طواف بعد ازان صفا مروہ کے درمیان
دوڑ کر اوسیوقت منا کو واپس ہوے تھوڑے دن لیے وہان ہوپنچکر تین جگہ کنکریان
مارین اور شبکو وہین منا مین مقیم ہے مناسک حج تا این ہین دو شب کا قیام بھی داخل ہے
بارھوین تاریخ سہ شنبہ کو دوپہر کے وقت سب لوگ ایکدم سے مکہ مکرمہ کو روانہ ہوے اثنا
راہ مین رمی جمار کے لیے حاضری کی ضرورت تھی اللہ اکبر اوسوقت کے اژدحام اور ہجوم
اور کثرت حجاج کا حال قید تحریر مین نہین آسکتا اونٹو نکا ریلا گدھے خچرون کے کثرت سے
جو لوگ پا پیادہ تھے اونکے پامال ہوجانیکا ازبس اندیشہ تھا حال آنکہ فقیر کا اونٹ مع
سواری شغدف موجود تھا مگر برخوردار مولوی محمود العافی کی راے بوجہ لاعلمی کے یہ ہوئی
کہ رمی جمار سے فراغت حاصل کرکے اونٹ پر سوار ہولین گے اس اژدحام کا خیال نہ تھا
برخوردار مذکور نے فقیر کو حاجی میر صادق علی صاحب کے ہمراہ کردیا اور خوردار مولوی محمد
صادق الیقین صاحب کے اونٹ کے ہمراہ رمی جمار کے لیے چلے گئے قریب تھا کہ فقیر
اونٹون اور گدھون اور مردمان پا پیادہ کے درمیان مین دبکر پامال ہوجاے خداوند
تعالی جزای خیر دے میر صاحب موصوف کو کہ اونھون نے فقیر کا ہاتھ نہ چھوڑا اور
حکمت عملی سے بچا لا کر ایک ہوٹل والے کی دوکان پر کھڑا کردیا دوکاندار و نکا یہ حال کہ

کسی کے گھڑے ہونیکے روادار نہین ہوتے مگر جو شخص اونکے یہانتک چلا جائے پی لے اوس سے مزاحمت نہین
کرتے بہر تقدیر فقیر نے بھی جاکے پی اور میر صاحب موصوف نے بھی اسوجہ سے دہین ہوٹل مین تھی
دیر تک بیٹھے لگڑے رہے وہان برخوردار مولوی محمد صادق الیقین صاحب اور مولوی محمود العانی
فقیر کے گم ہونیسے از بس پریشان اور شکستہ خاطر ہو کر آبدیدہ ہورہے تھے برخوردار مولوی محمود العانی
نے باوجود اس ہجوم اور اژدحام عظیم کے خدا جانے کسقدر چکر لگائے انجام کار جب کسیقدر اژدحام
کم ہوا تو فقیر نے میر صاحب سے کہا کہ اب چلیئے ہا فسے تھوڑی دور پر پہنچے حاجی رحیم بخش ملے اور کہا کہ آپکو
تلاش کرتے کرتے ہم سب لوگ حیران و پریشان ہوگئے یہ کہکر کہا کہ مین جاتا ہون مولوی محمود العانی کو
تلاش کر لاؤن آپکی تلاش مین سرگردان ہین یہ کہکر حاجی رحیم بخش چلے گئے سامنے سے آتے ہوئے برخوردار
مولوی محمود العانی نظر آئے اُنھون نے مجھے نہین دیکھا مین نے انکو دیکھکر آواز دی یہ بیچارے بہت ہی
پریشان تھے مجھے دیکھکر کہا کہ ماموں صاحب آپکے فراق مین از حد پریشان ہوکر رو رہے ہین غرضکہ فقیر
برخوردار مولوی محمود العانی کے ہمراہ نور الابصار مولوی محمد صادق الیقین کے پاس پہونچا انتظار مین بقرار
تھے مجھے دیکھکر بہت خوش ہوے پھر اُسی مقام پر نماز ظہر ادا کرکے بیت اللہ شریف کو روانہ ہوئے
کچھ دن باقی تھا کہ مکہ مکرمہ مین داخل ہوگئے مسجد الحرام ایسی وسیع اور عالی شان مسجد ہے باوجودیکہ
لکھوکھا آدمی نماز کے وقت ہوتے ہین خصوصاً نماز جمعہ مین بحید و بیشمار آدمیونکا مجمع ہوتا ہے
تاہم جگہ خالی رہتی ہے درمیان مین صحن اور چارو نطرف مکانات نہایت خوشنما عالی شان شاہانہ
عمارت کے ساتھ بنے ہوے ہین ایک معجزہ اس مسجد مقدس کا مین نے کئی مرتبہ کی حاضری مین بغور
دیکھا الکھوکھا کبوتر جنگلی اس مسجد شریف کے اندر رہتے ہین مگر بیٹ کا کہین کسی جگہ نام و نشان نظر
نہین آتا بیٹ کا کیا ذکر کبھی کوئی پر بھی گرا ہوا مین نے نہین دیکھا ایک روز یہ فقیر نماز جماعت کے انتظار
مین بیٹھا ہوا تھا سامنے ایک ذرا سا پر نظر آیا بے اختیار دل نے چاہا کہ اُٹھا کر آنکھون سے لگاؤن مگر

نوبت نہ آئی اس مسجد تقدس مآب کے اخراجات بکثرت ہین پچاس خواجہ سرا صرف مطاف کی
صفائی اور روشنی اہتمام اور نگرانی کے لیے معین و مقرر ہین اُنمین سے کسی خواجہ سرا کی تنخواہ پانچ اشرفی
سے کم نہین ہے اور اُنکے افسر صاحب تیس ۳۰ اشرفی پاتے ہین جسکے ساڑھے چار سو روپیہ ہوے اس
مسجد شریف مین نماز پنجگانہ اور نماز جمعہ پڑھانیکے لیے نتو ۹۰ امام مقرر ہین اور سب ماہوار جیش قرار
پاتے ہین ماہوار کے علاوہ ہر جمعہ کو جن امام صاحب کی نماز جمعہ پڑھانیکی باری ہوتی ہے انکو
خلعت فاخرہ عنایت ہوتا ہے جس مین دوشالہ اور عمامہ اور پارچہ ہای بیش قیمت ہوتے ہین جسپر
ممبر شریف پر امام صاحب کھڑے ہوکر خطبہ پڑھتے ہین وہ ممبر اکتیس ۳۱ برس کے عرصہ مین طیار کیا
گیا ہے اور ایک بہت بڑی صنعت اُسمین یہ ہے کہ کاریگر نے سورج کی رفتار کو ایسا قابو مین کیا ہے کہ
اُسپر ایک چھوٹی سی گمزی ہشت ہات کی رکھی ہوئی ہے اُسکا سایہ وقت مقرر خطبہ کے خطیب پر
ہر فصل اور موسم مین رہتا ہے ادہر اُدہر ڈھلتا نہین کہ اُسپر دھوپ آجاے کیا مجال کہ کسی موسم
مین خطیب پر دھوپ آسکے اللہ ری کاریگری عقل کچھ کام نہین کرتی حرم شریف کے اندر ایک ہزار
ہانڈیان شیشے کی روشنی کیواسطے آویزان ہین ہر ہانڈی کے لیے نیم آثار روغن زیتون مقرر ہے
اور روغن زیتون آٹھ آنہ سیر کے حساب سے آتا ہے اب خیال کرنا چاہیے کہ ایک ہانڈی کے لیے
چار آنہ کا روغن ہوا ہزار ہانڈی کی ہزار چونیان ہوئین ہزار چونی کی پانسو اٹھنی اور پانسو اٹھنی
کے ڈھائی سو روپے ہوے اللہ اکبر ڈھائی سو روپیہ روز کا فقط تیل جلتا ہے اسیطرح سے انواع
طرح کے اخراجات عظیم الشان ہین خاص بیت اللہ شریف کی چھت پر ایک گز کا لغاز نالہ سونیکا
لگا ہوا ہے اُسکو میزاب رحمت کہتے ہین اس نالہ کا پانی جس مقام پر گرتا ہے اُس مقام کو حطیم کہتے
ہین یہ مقام یعنی حطیم خاص داخل بیت اللہ شریف ہے اسی مقام پر حضرت اسمعیل ذبیح اللہ اور آپکی
والدہ ماجدہ حضرت بی بی ہاجرہ علیہما السلام کا مزار پُر انوار ہے حلقۂ حرم محترم شریف کے اندر کئی سو پیغمبر

علیہم السلام کے مزارات مقدس تر میں وزہیں مکہ معظمہ کا ہر گلی کوچہ بازار ہی ایسا دلچسپ و پر رونق
شہر نگاہ سے نہیں گذرا یہاں کے مکانات شاہانہ عمارت کے ساتھ بنے ہوئے ہیں ایسی عمارت کسی شہر میں میرے
دیکھنے میں نہیں آئی ایک ایک مکان سات سات درجہ کا ایسا بنا ہوا ہے کہ میری نگاہ وہاں تک
پہونچ نہ سکی کیسے ہو حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مکہ میں دینا دولتون کی
دولت ہے یہاں کے مکانات میں رسم برآمدہ بہت ہے نکلے اوپر کے سب درجوں میں برآمدی کاٹھ کی نہایت
خوشنما اور خوبصورت مثل کمرہ کی ہوتے ہیں یہاں کے نجار لکڑی کی تراش و خراش میں بے مثل و بے نظیر ہیں
جنت کا کام دل کا ویل بوٹا جالی نہایت درجہ خوشنما بناتے ہیں یہاں کوئی دروازہ و کھڑکی
لواڑ ایسے نہیں کہ جنمیں دلی دل کا واور منبت کاری ہو لکڑی بھی یہاں کی ایسی عمدہ و نفیس صاف و
خوش رنگ ہوتی ہے کہ ہندوستان میں ایسی لکڑی دیکھنے میں نہیں آئی بعض لکڑی مثل صندل
سرخ کے اور بعض لکڑی مانند صندل سفید کے ہوتی ہے کل بازار یہاں کے نہایت آباد و پر رونق
و دلچسپ ہیں باوجودیکہ یہاں مکہ معظمہ میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی جدہ سے تا مکہ مکرمہ کوئی
درخت یا کسی قسم کی گھانس نگاہ سے نہیں گذری بالکل ریگستان اور ہر جانب پہاڑ ہی پہاڑ
نظر آتے ہیں اس راستہ میں کوئی تالاب بھی یا ہری نگاہ سے نہیں گذرا و علی ہذا مکہ مکرمہ سے تا عرفات
شریف کہ قریب سات کوس کے فاصلہ ہے ایسا ہی نظر آیا مگر با ایں ہمہ اسکو معجزہ کہیے یا کرامت کوئی
چیز ایسی نہیں کہ مکہ مکرمہ میں نہ ملتی ہو اور سب چیزیں تر و تازہ میسر آتی ہیں قسم بقولات اور افواکہ
سے جو چیزیں ہندوستان میں ہوتی ہیں وہ سب یہاں موجود آلو بھنڈی بیگن لوکی گول کدو مولی گاجر
شکر قند ساگ پالک ساگ خرفہ ہرا پودینہ ہرا دھنیا بڑی جوار کے ہرے بھٹے بیر جیسے ہندوستان میں
جنگلی ہوتے ہیں چھوٹے چھوٹے گول گول نہایت خوش ذائقہ اور شیرین پیلی ایسی تر و تازہ اور
پتے ہرے کچھور کہ جسکے دیکھنے سے دلکو فرحت حاصل ہوتی ہے اور بعض بعض گھانس اور پتیاں

ایسی ہری اور سبز نظر آتی ہین کہ جنکے دیکھنے سے ازبس تعجب و حیرت ہوتی ہے اور میوہ جات کی
تو یہان کہان ہی ہر قسم کا میوہ بافراط ملتا ہے خصوصاً انار کی وہ کثرت کہ ہر مقام پر ڈھیر لگے رہتے ہین
دو پیسہ کو ایک انار آتا ہے یہانکی اشیاء خوردنی مین سے تین چیزین مجھے بہت پسند آئین اول تو تربوز
ایسے تربوز خوش ذائقہ شیرین ہندوستان مین کبھی نہ کھائے نہ دیکھے گودا نہایت سرخ جیسے شہاب کا
رنگ اصلی یہانکے تربوز کھانے سے دل کو نہایت فرحت اور تازگی حاصل ہوتی ہے دوسرے شکر قند
بھی یہانکی نہایت لذیذ شیرین اور خوش ذائقہ اور خوش رنگ ہوتی ہے تیسرے یہانکی خمیری روٹی بہت
دبیز اور ملائم اور نہایت بامزہ ایک روٹی ایک آنہ کو آتی ہے ایک روٹی مین ایک آدمی بخوبی
آسودہ ہو سکتا ہے اور میرے واسطے تو نصف روٹی کافی ہے ایک روٹی مین دونون وقت شکم سیر ہو سکتا
ہون تربوز بعدن سے شروع مین جدہ شریف و مکہ مکرمہ اور ینبوع وغیرہ مین اسقدر کثرت سے
ہوتے ہین کہ جس بازار و گلی کوچہ مین دیکھیے برابر ڈھیر لگے ہوے ہین میرے خیال مین اسکی
فصل یہان دوازدہ ماہ ہوتی ہے مجھے یہان آئے ہوے ڈھائی ماہ سے زیادہ عرصہ گذر گیا ہے جب سے
ابتک بکثرت ایک حالت پر بک رہے ہین مکہ مکرمہ کی سبھی بازار خوب آباد و گلزار ہین ایک بازار مین
اتفاق سے یہ فقیر جا پڑا دیکھا تو اللہ اکبر سارا بازار ایسا آراستہ اور گلزار ہے کہ مین نے ایسی آراستگی کے
ساتھ کبھی کوئی بازار نہین دیکھا ہر شے ایسی خوش اسلوبی اور خوشنمائی اور ترتیب کے ساتھ رکھی ہوئی ہے
کہ جسکے دیکھنے سے دلکو اسقدر فرحت و مسرت حاصل ہوتی ہے کہ جسکی انتہا نہین یہ بازار حرم محترم شریف
سے بہت قریب ایک گوشہ مین ہے غرضکہ شہر مکہ ہر طرح سے جائے سرور و نور علی نور ہے یہان پر واضح ہو کہ
مین نے اپنے سفرنامہ مین مناسک و مسائل حج دو وجہون سے نہین لکھے اول تو مجھے مسائل کے
لکھنے کی لیاقت ہی نہین ہے دوسرے حج کے مسائل و تحقیقات مین اکابر علماء و مشاہیر فضلا کے
رسائل بکثرت تالیف و تصنیف ہو کر طبع و شائع ہوے ہین خصوصاً حضرت مولٰنا رشید احمد صاحب

گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ زبدۃ المناسک کل ضروریات و مسائل حج مین ایسا جامع
و مستند ہے کہ اب کسی دوسرے رسالہ کی تالیف و تصنیف کی ضرورت ہی باقی نہین رہی حق
یہ ہے کہ وہ رسالہ وقت پر بڑی بڑی علماء کرام کے کام آتا ہے۔ برخوردار عالی تبار فخر خاندان عزت افزا
دودمان سیدی عالم و فاضل سندی محدث سندی جانشین چند ین اولیاء کاملین حاجی کرمین
زائر حرمین شریفین طے کردہ شدہ جملہ مراحل و منازل درویشی از فیضان صحبت حضرت مولانا رشید احمد
صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ و مولوی شاہ محمد صادق الیقین صاحب کی علالت العارضہ جیش
روز بروز ترقی کرتی رہی حتی کہ بعد فراغت حج بالکل صاحب فراش ہو گئے چوکی پاخانہ کی
چارپائی کے برابر لگادی گئی انجام کو مرض نے اسقدر طول کھینچا کہ چوکی پر بھی جانا بدون استعانت
کسی دوسرے شخص کے دشوار ہو گیا افسوس صد ہزار افسوس کہ تیسری محرم الحرام روز شنبہ
۱۳۲۴ ہجری کو بوقت شب دس بجے کے قریب خیر البلاد مکہ معظمہ مین جان بحق تسلیم ہوے
انا للہ وانا الیہ راجعون اس حادثہ قیامت خیز و سانحہ وحشت انگیز سے یہ فقیر ضعیف بعمر ہفتاد سالہ
زندہ درگور ہو گیا کسی مصرف کا نہین رہا مکانکی عزت و رونق جاتی رہی دروازہ ویران ہو گیا آمین
شک نہین برخوردار مرحوم و مغفور کو اللہ تعالی نے جہان اور بہت سے مراتب علیا عطا فرمائے تھے
وہان ایک مرتبہ اعلی یہ بھی عطا فرمایا کہ ایسے مقام مقدس مین انکا انتقال ہوا جہانکی موت کی لوگ
تمنا وارزو رکھتے ہین مولوی محمد سعید صاحب مہتم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ و حافظ قاری عبداللہ
صاحب جنکا نظیر کوئی قاری مکہ معظمہ مین نہین ہے قاری عبدالرحمن صاحب اکثر اکابر جانشاب
مہاجر و غیرہم کے اہتمام سے جنازہ اٹھایا گیا حرم محترم شریف کے اندر ملتزم مقدس کے
متصل جو خاص بیت اللہ شریف کا دروازہ ہے اسکی دیوار متبرکہ سے ملا کر رکھا گیا حنفی مصلے کے
حضرت امام صاحب نے نماز ظہر ادا کر کے جماعت کثیرہ کے ساتھ انکے جنازہ کی نماز پڑھائی

جنت المعلےٰ ہیں جو مکہ مکرمہ کا بہت بڑا نامی گرامی گورستان ہے مدفون ہوئے قبر کے لیئے اعلیٰ درجے کی جگہ ملی جو شعبۃ النور کے نام سے مشہور ہے اسی گورستان میں ہمارے حضور سرورعالم صلے اللہ علیہ وسلم کے اجداد کرام مدفون ہیں اسی گورستان میں حضور کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضور کی بی بی صاحبہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ونیز افراد ہیں ان حضرات کے علاوہ اکابر علما و مشاہیر فضلا کی مزارات بکثرت ہیں اسی گورستان میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر اور جناب مولنٰنا رحمۃ اللہ صاحب مہاجر بھی مدفون ہیں جنکا مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں مشہور و معروف ہے جنکو برخوردار موصوف مرحوم کی خوش نصیبی ہیں کوئی شک نہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و عنایت سے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل و تصدق میں اور حرم محترم معظم و مکرم کی برکت سے اونکی مغفرت فرمائے اور مقام اعلیٰ پر پہونچائے آمین ثم آمین بجرمۃ طٰہٰ ویٰسین حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے نزدیک صاحب اولاد وہی شخص ہے جسکی اولاد اسکے سامنے دنیا سے اٹھ جائے فقیر کی چھ اولادیں فقیر کے سامنے دنیا سے اٹھیں تین عین عالم شباب میں اور تین کم سنی میں پس یہ ہیچکارہ اپنے مولا آقا مالک حقیقی کے نزدیک صاحب اولاد ہوچکا ہے اسلیئے کہ اللہ تعالیٰ سچا اور اسکا ارشاد سچا اور اللہ تعالیٰ کا رسول سچا اور اسکا ارشاد سچا برحق ہے یہ بھی حدیث شریف سے صحیح طور پر ثابت ہوچکا ہے کہ اولاد صالح و معصوم خصوصاً بچہ کچا یہ سب جناب باریتعالیٰ میں ہٹ کرکے اپنے والدین کو بخشا مینگے اللہ تعالیٰ انکی خاطر سے انکے والدین کو بخش دیگا کچا بچہ وہ کہ ماں کے پیٹ میں مرکر پیدا ہو یا پیدا ہوکر چندہی عرصے میں فوت ہوجائے۔ بوجہ ضعف و نقاہت و نیز بوجہ اسکے کہ جنت المعلےٰ شہر مکہ معظمہ سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے اس ذرہ بیمقدار فقیر برخوردار مرحوم و مغفور کے جنازے کے ہمراہ نہ جاسکا حرم محترم سے

نماز جنازہ کے بعد فرودگاہ پر واپس آیا نوین محرم الحرام روز شنبہ کو برخوردار مرحوم کی فاتحہ
خوانی اور زیارت کے لیے مزار پر گیا خوب جی کھولکر آنسوؤنسے رویا اور فاتحہ پڑھکر رخصت ہوا
اور کہا کہ اب انشاء اللہ تعالی حشر مین ملاقات ہوگی بعد ازان دیگر مزارات پر حاضر ہوکر فاتحہ
خوانی کی اور زیارات سے شرف اندوز ہوا اور جو کچھ ہوسکا پڑھکر تمام گورستان کے اہل قبور کو
ایصال ثواب کیا اور رخصت ہوکر اپنی فرودگاہ پر چلا آیا اس گورستان مین حضرت عبد الرحمن
بن حضرت ابی بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہما رونق افروز ہین حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالی
عنہا کا قبہ شریفہ نہایت خوشنما اور پر تکلف شیشہ آلات اور فرش وغیرہ سے خوب سجا ہوا ہے
آپکا مزار پر انوار آہنی کٹہرے کے اندر ایسی اونچائی پر ہے کہ ہاتھ وہان بہونچ جاتا ہے کٹہرا شریفہ
جالی دار سنہرے کام سے منقش ہے اور مرقد مقدس چادرہای زربفت اور دوشالہ ہای قیمتی سے
مخفی ہے اس قبہ شریف کے اندر حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ مدفون ہین یہ بزرگ
بڑے اولیاء کاملین متقدمین سے گذرے ہین حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مادر مشفقہ حضرت
بی بی آمنہ رضی اللہ تعالی عنہا کے مزار مقدس کا قبہ شریفہ بھی آپکے قبہ شریف کے متصل نہایت
پر تکلف شیشے آلات وغیرہ سے خوب سجا ہوا انوار الہی کی تو رہی خدا شاہد ہے کہ یہ تمام گورستان روشن
و پر نور ایسا جامی سرور ہے کہ جسکا ایک شمہ قید تحریر مین نہین آسکتا خوشا نصیب روز بے تقدیر
اُس شخص کی جو وہان جگہ پائے اور مدفون ہو برخوردار مرحوم و مغفور کے انتقال کے چوتھے روز
فقیر بھی بعارضہ بخار علیل ہوا چونکہ زمانہ حرم محترم کے داخلہ کا قریب آگیا تھا یعنی دسوین
محرم الحرام کو داخل ہوتے ہین اور نیز بوجہ بخار کے گیارھوین محرم تک مکہ معظمہ مین قیام ہا
فقیر جس روز مکہ معظمہ پہونچا اوسی روز برخوردار مولوی محمد صادق الیقین صاحب نے مجھسے کہا کہ
جو کچھ روپیہ آپ لائے تھے وہ سب صرف ہوگیا اب نہ ہم مدینہ منورہ جاسکتے ہین اور نہ وطن کو

یہ سنتے ہی فقیر کے ہوش باختہ ہوگئے کہ اگر خدانخواستہ مدینہ طیبہ کی حاضری نہوئی تو کچھ بھی نہوا خداوند تعالیٰ کے بھروسہ پر صبر کرکے بیٹھ رہا پھر کبھی اسکا نام بھی زبان پر نہیں آیا کہ ہمارے پاس خرچ نہیں ہے اب ذرا تائید و استعانت غیبی کو ملاحظہ فرمائیے کہ جناب مولوی رحیم بخش صاحب خوگر ریاست بہاولپور میں کسی عہدہ جلیل القدر پر مامور ہیں بلا تعرف شناسائی تشریف لائے اور دس اشرفی برخوردار موصوف کو نذر دیں اور چلے گئے پھر ایکروز جناب محی الدین خانصاحب جلندھری بلا تعرف و شناسائی تشریف لائے اور برخوردار موصوف کو کچھ روپیہ نذر دیے اور چلے گئے پھر ایک وزیری رئیس صاحب معروف تشریف لائے اور دو اشرفی فقیر کو نذر دیں ایک عالم صاحب تشریف لائے ایک اشرفی برخوردار موصوف کو نذر دی پھر ایک عالم صاحب تشریف لائے برخوردار موصوف کو دس روپیہ نذر دیئے ایک شاہ صاحب تشریف لائے سات روپیہ فقیر کو نذر دیے بعد انتقال برخوردار مرحوم و موصوف پھر وہی رئیس صاحب جلندھری تشریف لائے اور فقیر کو تین اشرفی نذر دیں اور فرمایا کہ آپ عازم مدینہ منورہ ہیں اور خرچ کی قلت ہے لہذا یہ قلیل زاد راہ وہانکے لیے حاضر ہے اسیطرح سے خداوند تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل و تصدق میں درخاص اس سفر مقدس کی برکت سے بے شان گمان سامان زادراہ مہیا فرمایا یہ سب تصرف باطنی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا اور برخوردار مرحوم موصوف کی برکت تھی یہ سب لوگ جنھوں نے شراکت فرمائی حضرت مولانا ممدوح رحمۃ اللہ علیہ کے مرید و معتقد تھے ورنہ اس نیم زیچکارہ کو وہاں کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ تو کون شخص ہے برخوردار مرحوم کے انتقال کے چوتھے روز یہ فقیر بعارضہ حبش علیل ہوا چونکہ زمانہ حرم محترم کے واخلے کا قریب آگیا تھا یعنی دسوین محرم الحرام کو داخلی ہوتی ہی و نیز بوجہ حبش کے گیارھوین محرم تک مکہ معظمہ میں قیام رہا بارھوین تاریخ پنجشنبہ کے روز بحالت مرض حبش بہ نیت سفر مدینہ مکرمہ فقیر مع برخوردار مولوی حاجی محمود العانی وغیرہ ہم جدہ شریف کو روانہ ہوکر دوسرے روز جدہ

پہونچگیا بعنایت الٰہی اثناء راہ مین بوجہ مرض لاحقہ کچھ ایسی تکلیف نہین ہوئی مگر جدہ پہونچنے کے دن
پیچش مین اس درجہ ترقی ہوئی کہ عالم یاس پیدا ہو گیا اور خیال گذرا کہ شاید یہین جدہ ہی مین
جمعہ کے روز جدہ پہونچا تھا اسی پیچش کیوجہ سے سہ شنبہ تک وہان قیام رہا چہار شنبہ کو اُسی حالت
علالت مین اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس پر بھروسہ کر کے جہاز پر سوار ہوا چھ پہر مین جہاز ینبوع
پہونچ گیا ینبوع بھی بہت اچھا شہر خوب آباد ہے بازار مین لوگون کا اسقدر اژدحام ہوتا ہے
کہ راستہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے ہر قسم کی چیزین اس شہر مین بھی ملتی ہین یہانکی عمارت استرکاری
بہت کم ہے اسوجہ سے مکانات ننگے معلوم ہوتے ہین بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ شہر
تو آباد ہے پنجشنبہ کو ینبوع پہونچا تھا شبکو وہین قیام رہا صبح کو جمعہ کے روز وہانسے روانگی ہوئی
شہر سے باہر آکر قیام ہوا اُس روز تمام دن و تمام شب وہین رہنا پڑا صبحکو ہفتہ کے روز وہانسے
روانگی ہوئی ینبوع سے تا مدینہ منورہ دو اونٹون کا کرایہ مع آمد و رفت کچھ کم سو روپیہ قرار پایا
ینبوع سے چلکر پہلی منزل سات پہر مین ختم ہوتی ہے اس منزل مین چار پہر کے راستے تک صاف ریگ کا میدان نظر آتا ہے اور
پہاڑ و پتھر وغیرہ کہین نظر نہین آتے اس میدان کی زمین خوب ہموار و صاف ہے ایسا نظر آتا ہے کہ جیسے
پختہ سڑک خوب صاف و ہموار ہوتی ہے نشیب و فراز سے قطعاً مبرا ببول کے درخت کہین کہین
نظر آتے ہین ینبوع سے باہر آکر عین شہر کے کنارے ایک تالاب بھی نظر آیا جسمین پانی بھرا
ہوا پایا ورنہ جہاز سے اوتر کر جدہ شریف سے مکہ مکرمہ تک تالاب پانی کہین نظر نہین آیا غرضکہ
چار پہر کے بعد پہاڑ و پتھر کی آمد شروع ہوئی اور راستہ بہت ہی ناہموار و دشوار گذار تھا خصوصاً
نماز عصر کے وقت سے تا مغرب اسقدر کثرت سے پتھر زمین پر نظر آئے کہ راستہ چلنا دشوار ہو گیا بعد
نماز مغرب وہ کثرت کم ہو گئی کچھ خیال مین نہین آتا کہ خداوند تعالیٰ یہ پتھر آسمانسے برساتا ہے
یا زمین کو حکم ہوتا ہے کہ وہ اُگل دیتی ہے اپنے کارخانہ کو اللہ تعالیٰ ہی جانے اور کون جان سکتا ہے

یہاں عمل کو دخل مطلق نہیں ہے اس راستہ میں رنگ برنگ کے پہاڑ و پتھر نظر آئے کوئی پہاڑ
بالکل سبز زمرد کے رنگ کا کوئی بالکل سیاہ کوئی گلابی کوئی سفید علی ہذا ہر قسم کے پتھر سبز و
سرخ نیلے اودے سیاہ زمین پر بچھے ہوئے ہیں غرضکہ یہ منزل بعنایت الٰہی سات پہر میں
طے ہوئی بیر سعید ایک مقام ہے وہیں یہ منزل ہوئی ہے اس مقام پر بازار بھی ہے ضروریات کی
سب چیزیں ملتی ہیں یہاں سے چلکر دوسری منزل تین پہر کی ہوتی ہے حمزہ ایک مقام ہے
وہاں قیام ہوتا ہے یہ مقام پہلی منزل کے مقام سے زیادہ آبادی ہے بازار اسکا بہت اچھا ہے پھر
درمیان میں دو منزلیں چار چار پہر کے کچھ کم و بیش ہوتی ہیں ان دونوں منزلوں پر آبادی وغیرہ کچھ
نہیں ہے صرف پانی ملتا ہے بلکہ ان دونوں منزلوں میں سے ایک منزل پر پانی بھی نہیں ہے دور سے
لانا پڑتا ہے اسیوجہ سے ان دونوں منزلوں کے نام دریافت نہو سکے پانچویں منزل جسمیں مدینہ منورہ
پہونچ جاتے ہیں پورے پانچ پہر کی ہے ہملوگ پہر رات رہے چلے اور عین نماز فجر کے وقت مدینہ منورہ
کے شہر پناہ کے پھاٹک پر آگئے ان منزلوں کے درمیان اکثر مقامات آباد اور باغات کھجوروں کے
ملتے ہیں اور کچھ شادابی نظر آتی ہے ایک مقام پر مولیوں کے کھیت خوب سبز و ہرے نظر آئے الحمد للہ
ثم الحمد للہ کہ پچیسویں محرم روز پنجشنبہ کو قریب طلوع آفتاب ہم سب لوگ مدینہ منورہ میں داخل
ہو کر نعمت و دولت دوجہانی سے بہرہ یاب و شرف اندوز ہوئے فقیر بوجہ نادرستی طبیعت ضعف
و نقاہت و کسل راہ کے اُس روز غسل اور تبدیل لباس سے مجبور تھا اسوجہ سے پنجشنبہ کے روز
حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے دربار دولت سرای خاص میں حاضر نہو سکا جمعہ کے روز
اول وقت غسل و تبدیل لباس کرکے دس بجے کے بعد مزار مقدس مسجد نبوی علیہ التحیۃ و الثنا
میں حاضر ہو کر دولت پابوسی و شرف زیارت سے بہرہ یاب ہوا اللہ اکبر اس بارگاہ جلال و دبدبہ
شاہنشاہی کے کوئی حد و اندازہ ہو سکتا ہے دین و دنیا دونوں کے شاہنشاہ کا دربار عالی جاہ

انسان کی کیا حقیقت جہان ملائکہ مقربین ہمہ وقت دست بستہ حاضر رہتے ہین کسیکی کیا مجال کہ جو
اس دربار عالی وقار کی ثنا وصفت مین قلم اٹھا سکے یا ایک شمہ قید تحریر مین لا سکے حضور کی مسجد
مقدس کی شرف و کرامت کا حال بجز اللہ تعالیٰ جل شانہ کے اور کون جانسکتا ہے دین و دنیا دونو نکی
دولت مالا مال ہے کرورہا روپیہ اسکی تعمیر و طیاری مین صرف ہوا ہے ایک محقق ابرار متقی پرہیزگار
کی زبانی فقیر نے سنا فرماتے تھے کہ مسجد مقدس نبوی مین اٹھارہ کرور روپیہ صرف ہوا ہے اور روپیہ کا
سواد ور وپیہ بھر کا ہوتا ہے اسکا حساب لگانا چاہیے کہ کسقدر روپیہ ہوا حضرت سلطان عبد المجید
خانصاحب جو فی زماننا سلطان روم ہین آپکے جد امجد کہ اُن حضرت کا نام نامی و اسم گرامی بھی
عبد المجید خان تھا انھین حضرت نے مسجد مقدس نبوی کی تعمیر سر تو سے کرائی ہے تخت الثری سے
بنیاد قایم کی گئی ہے لکھو کھا بلکہ کرورہا روپیہ کا سونا اور جواہرات اسمین جڑا ہوا ہے لاکھون
روپے کے شیشہ آلات اور جھاڑ وغیرہ سے جو بالکل سونے و چاندی سے بنائے گئے ہین مسجد شریف
آراستہ ہے ساری مسجد مقدس کے کل درجو نمین ہزارہا روپے کے ادنی قالین استنبولی ایک سے
ایک عمدہ و نفیس بیش قیمتی بچھے ہوئے ہین مسجد مقدس کی وسعت یہانسے خیال کرنا چاہیے کہ
ہزارہا آدمی پنجگانہ نماز مین رہتے ہین خصوصًا جمعہ کے روز مسجد کثرت آدمیونکی ہوتی ہے تاہم مسجد شریف
بہت خالی رہتی ہے اس مسجد اقدس مین قبلہ رُخ گیارہ درجے اور داہنی جانب چار درجے پشت پر
اور بائین طرف دو دو درجے ہین بائین جانب کے دونون درجے مستورات کے لیے کٹہرہ آہنی نہایت
پر تکلف لگا کر علیحدہ کر دیے گئے ہین عورتین اُسی مین باطمینان تمام نماز و وظیفہ پڑھا کرتی ہین
مسجد شریف کا ہر ایک درجہ نہایت خوشنما اور پر تکلف بنا ہوا ہے قرآن مجید چھتون اور دیوارونمین
نہایت خوشخط طغرا مین لکھا ہوا سونے سے منقش ہے ساری مسجد شریف سنگ مرمر اور سنگ موسے
سے تعمیر کی گئی ہے مگر یا این ہمہ معلوم نہین کسوجہ سے مسجد مقدس کے صحن شریف مین تو ادستر کاری

ہی اور نہ پتھر جما لئے گئے ہین بالکل خالی زمین ہی وعلی ہذا مکہ معظمہ مین بھی مسجد الحرام کے
صحن مین کہین تو پتھر جمے ہوے اور کہین سنگریزے بچھے ہوے ہین یقیناً اسمین کوئی مصلحت
ضرور ہی مگر صحیح طور پر دریافت نہین ہوا یہانکے دیگر مزارات و مقامات کی زیارت سے بھی
فقیر بہرہ ور اور شرف اندوز ہوا خلیفہ ثالث سیدنا حضرت عثمان بن عفان ذو النورین
رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ و حضرت امام نافع شیخ القراء و سیدۃ النساء
حضرت فاطمہ زہرا و سر مبارک حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم و حضرت بی بی حلیمہ دائی
حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم وغیرہم کی زیارت سے فقیر شرف یاب و بہرہ اندوز ہوا اور تمام
جنت البقیع کے مزارات پر انوار کی زیارت سے شرف حاصل کیا اور فاتحہ خوانی کرتا رہا اور جبل احد
جہان حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار پر انوار مدینہ طیبہ سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے
حاضر ہو کر فاتحہ پڑھا اور آپکی مسجد مقدس کی زیارت کی اور نماز پڑھی اور جو حضرت شہداء جہان
رونق افروز ہین اُن سب کے مزارات پر حاضر ہو کر شرف دو جہانی حاصل کیا اور فاتحہ پڑھا مسجد مقدس
قبا مین بھی حاضری کا اتفاق ہوا اور جو جو مقامات وہان زیارت گاہ ہین اُن سبکی زیارت بعنایت
الٰہی حاصل کی مدینہ منورہ زیادہ بڑا شہر ہی اور نہ بہت چھوٹا مکانات پختہ عالیشان یہان بھی بنے
ہوے ہین یہانکی رونق و نورانیت کی کوئی حد و پایان نہین ہے اور کیسے نہو جو شہر تخت گاہ شاہی
دنیاوی ہوتے ہین اُنکی شان و شوکت کا حال معلوم ہی اور یہ شہر تو سلطان دو جہان کا تخت گاہ ہے
اُسکی شان و شوکت کا کیا کہنا اس شہر مین رواج خشت خام کے مکانات کا بھی ہی بکثرت بڑے
بڑے عالیشان مکان کچے اینٹون کے بنے ہوے ہین یہانکی خام اینٹین ہماری یہانکی پختہ اینٹون سے
زیادہ مستحکم و پائدار ہین وجہ اسکی یہ ہی کہ یہانکی مٹی مین بالکل ریتا پتھر کا ہوتا ہی جب اینٹین بنکر
پانی مین تو خشک ہونے پر مثل پتھر کے ہو جاتی ہین پتھر مین چکناپن ہوتا ہی اور یہ اینٹین بالکل

زیارت مزارات مدینہ منورہ

گھڑ گھڑی ہوتی ہین فقیر مع اپنے ہمراہیونکے مدینہ منورہ مین انیس ۱۹ روز مقیم رہا افسوس صد ہزار افسوس
کہ آج تیرھوین تاریخ ماہ صفر روز یکشنبہ کو سب لوگ بعد نماز مغرب فرودگاہ مدینہ منورہ سے چلکر شہر پناہ
کے پھاٹک پر شب کو مقیم ہوے اور چودھوین تاریخ دوشنبہ کے روز اول ہی وقت وہانسے سوار ہوے اور
چھٹے روز ہفتہ کو کچھ دن چڑھے ینبوع پہونچ گئے دوسرے روز یکشنبہ کو اول وقت جہاز پر سوار ہوے چھ پہر مین
جہاز جدہ شریف پہونچ گیا چوبیس ۲۴ گھنٹے جہاز یہان ٹھیرا رہا دوشنبہ کے روز بارہ بجے کے قریب بمبئی کو روانہ ہوا
اب ہم سب لوگ اپنے وطن ہندوستان کو جا رہے ہین اللہ تعالی ہم سبکو اپنے فضل و کرم اور اپنے حبیب رسول
اکرم علیہ الصلوۃ والسلام کے طفیل و تصدق مین مع الخیر و العافیت اپنے اپنے گھرون پہونچائے اور
جملہ مسافر و کیا رہے بخیریت تمام ملائے آمین ثم آمین بحرمت طہ و یسین خداوند تعالی کا شکر و احسان
ہے کہ جدہ شریف سے ہمارا جہاز بارھوین روز بخیریت تمام آرام و راحت کے ساتھ بمبئی پہونچ گیا اس مرتبہ
عند المراجعت بفضلہ تعالی جہاز پر کسی کو کسی طرح کی تکلیف نہین ہوئی جہاز کی تکان وغیرہ سے سب کو
اللہ تعالی نے بچا لیا باوجودیکہ دریای سقوترہ کا تلاطم عظیم مشہور و معروف ہے اور جاتے وقت ہم لوگ اوس کا
زور و شور دیکھ چکے تھے مگر اس مرتبہ بعنایت الٰہی یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ سقوترہ کب آیا اور کب ختم ہو گیا غرض
مع اپنے ہمراہیونکے تین روز بمبئی مین مقیم رہا چوتھے روز وہانسے روانگی ہوئی بوجہ ہجوم و کثرت [illegible]
ایک مقام پر تمام روز قیام کرنا پڑا اسوجہ سے چوتھے روز جمعہ کے دن نماز ظہر و عصر کے درمیان لکھنؤ
پہونچکر نماز مغرب وہان قیام رہا نماز مغرب سے فراغت کرکے اپنے مکان [illegible] کو روانہ ہوا [illegible] بجے
کے قریب غریب خانہ پر پہونچا اور بعنایت الٰہی سبکو بخیریت تمام پایا اور سجدات شکر جناب باری تعالی
مین بجا لایا فقط تتمہ سفر حرمین شریفین واضح ہو کہ اس تمام سفر مقدس مین جناب باریتعالی نے اپنے اس بندہ
گنہگار کے تمام کامو مین ایسی مدد و استعانت فرمائی کہ جسکی حد و نہایت نہین ہے خصوصاً معاملہ
زاد راہ مین جسکی تفصیل کیفیت و بیان کو ہو چکی ہے دوسرے فقیر کے عاصیہ بخشش مین برخوردار مولانا مرحوم کا

انتقال عارضہ پیچش مین ہوا انکا انتقال کا جو تھا روز تھا کہ فقیر بھی اس عارضہ مین بحالت مکہ معظمہ
گرفتار ہوا گیارھوین محرم الحرام تک مکہ معظمہ مین قیام رہا بارھوین تاریخ فقیر اللہ تعالی کی ذات
مقدس پر بھروسہ کرکے مدینہ منورہ کو روانہ ہوا اللہ اکبر ذرا اس بندہ پروری پر غور کرنا چاہیے قاعدہ
ہے کہ قافلہ کسی حال مین نہین رکتا اور نہ اونٹ والے کسی حال مین کسیکی شنوائی کرتے ہین چاہے کوئی
گر کر مری کبھی کچھ انکو پروا نہین ہوتی مجھے خیال تھا کہ بجز اسکے کہ تمام کپڑے بچھونا دغیرہ نجاست مین
آلودہ ہو اور کوئی چارہ نہوگا مگر قربان جائیے اپنے مالک حقیقی کے جسکے قبضہ قدرت میں سب کچھ
ہے فقیر جب تک اونٹ کی پیٹھ پر سواری شغدف پر سوار رہتا تھا اثناء راہ مین کبھی قضای حاجت کی
ضرورت نہوتی تھی ینبوع سے چلکر پہلی منزل سات پہر مین ختم ہوتی ہے بعنایت الٰہی اس تمام منزلین
مجھے ضرورت قضای حاجت کی نہین ہوئی اسیطرح سے تمام منزلین جناب ارحم الراحمین نے فرمایا
اور حال یہ کہ پیچش بدستور سابق موجود قیام گاہ پر ہوتی جہان اونٹ کی پیٹھ سے نیچے آیا پیچش کا
غلبہ ہوا فورا قضای حاجت کی ضرورت ہوئی ذرا توقف مین یہ معلوم ہوتا تھا کہ اجابت ملازم ہو
جائیگی جس مقام پر جبتک قیام رہتا تھا خدا جانے کئی مرتبہ قضای حاجت کی ضرورت ہوتی تھی
یہ تائید غیبی محض اسی سفر مقدس کی برکت سے تھی منجملہ اور استعانت کے ایک یہ ہے کہ مجھے چند سال سے ایک
عارضہ یہ ہوگیا کہ جہان دس بارہ روز گذرے اور غسل کی حاجت ہوئی تو ناف سے دونون فوطون تک ایسا
درد پیدا ہوجاتا ہے جس سے مجھے سخت بیچینی اور تکلیف ہوتی ہے تا وقتیکہ غسل کی احتیاج نہو درد نہین جاتا
اس سفر مقدس کی برکت و کرامت کو دیکھیے پانچ ماہ سے کچھ زائد مجھے سفر مین گذرے بعنایت الٰہی
کبھی ایک روز بھی اس درد کی شکایت نہین ہوئی اور نہ غسل کی حاجت غریب خانہ پر پہونچکر چند عرصہ
کے بعد پھر وہی شکایت موجود ہو گئی فصل سرما مین بوجہ خشکی کے اور فصل گرما مین بوجہ گرمی کے جیسا
ہر شخص کا دستور ہے میرے دونون پانوں کی ایڑیان کھرکھری ہوجاتی ہین اور میل چڑھ جاتا ہے اسوجہ سے مجھے

ہر ماہ مین چار پانچ مرتبہ جھاڑو دینے پاؤن دھولانیکی نوبت آجایا کرتی ہو ان مقاماتکی خاک پاک کی برکت سے
تمام سفر مین اگرچہ تب بھی مجھے پاؤن دھولانیکی ضرورت نہین ہوئی سبحان اللہ کیا برکت و کیا کرامت ہو
اُن مقامات مقدس کی خاک پاک مین جب کوئی مصیبت اس سفر مین مثلاً آندھی پانی کی پیش
آتی تھی تو مین یہ پاک بارگاہ سے عرض کرتا تھا کہ ہم سب تیری راہ اور تیرے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی
راہ کے مسافر ہین خداوند تعالیٰ اُس مصیبت کو رفع دفع فرما دیتا تھا ان باتونکے علاوہ تائید غیبی کا
حال ان اوراق مین جابجا قلم بند کردیا ہی ناظرین اگر بغور ملاحظہ فرماوینگے تو خیال مین آجاویگا واضح ہو
اس سفر مقدس مین جو کچھ صرفہ ہو وہ کرایہ مطوفین یا حضرت شریف صاحب کی تواضع و مدارات کا
ہو کرایہ کا بھی سب روپیہ حضرات مطوفین لے لیتے ہین کچھ برائے نام اونٹ والونکو دیتے ہین مطوفین کا بیان
جو کرایہ روپیہ مین سے ہمکو کچھ قدر قلیل ملجاتا ہی باقی سب روپیہ حضرت شریف صاحب لیتے ہین ایک
معتبر راوی کا بیان ہی کہ شریف صاحب کو اٹھارہ ہزار کی تنخواہ حضرت سلطان روم کے یہانسے ملتی ہی
اور سال مین کرورہا روپے حجاج سے وصول ہوتے ہین اللہ اکبر کوئی حد و انتہا ہوسکتی ہی اس آمدنی
کی یہ سب برکت و نصرت اُسی مقام محمود کا ہی کہ خداوند تعالیٰ نے وہانکے متوسلین کو دین و دنیا دونونکی
دولت سے مالامال فرمایا ہی حدیث شریف مین وارد ہوا ہی کہ مکہ دین و دنیا دونونکی دولت ہی پھر کیسے تھے
مصارف راہ روز بروز ترقی پاتے جاتے ہین جہاز بمبئی سے جب جدے پہونچتا ہی تو وہانسے کشتیپر
سوار ہوکر پار جاتے ہین دریا سے تا جدہ انتہا دو میل کا فاصلہ ہوگا جسکی اوترائی فی کس حضرات
مطوفین چھ چھ روپے لیتے ہین حاجی عظیم اللہ صاحب فقیر کے دوست خاص ہماری بستی کے رہنے
والے فرماتے ہین بیس برس کا زمانہ گذرا جب مین حج کو گیا تھا اس زمانہ مین جدہ سے تا مکہ معظمہ
کہ دو منزل کا فاصلہ ہی شغدف والے اونٹ کا کرایہ پانچ روپیہ تھا اور ہمارے برخوردار مولوی [illegible] مرحوم
جب پہلی مرتبہ حج کو گئے ہین جسکو تیرہ ۱۳ سال کا زمانہ گذرتا ہی کہتے تھے کہ اُس زمانہ مین جدہ شریف سے

تا مکہ مکرمہ شغدف والے اونٹ کا کرایہ دس روپیہ تھا اور اب ہم سب لوگو نکو فی شتر یعنی شغدف والے اونٹ کا
کرایہ ساڑھے سینتیس روپے دینا پڑے اللہ غنی از کجا تا کجا زمین سے تا آسمان فرق ہوگیا فقیر کے یہان جدہ سے
تا ینبوع جہاز کے ٹکٹ مدینہ منورہ جاتے وقت فی کس ڈھائی روپیہ کے حساب سے سوا گیارہ روپیہ کو خریدے گئے
ینبوع سے تا مدینہ منورہ شغدف والے اونٹ کا کرایہ جسپر یہ فقیر مع اہلیہ اپنی ہوا اور پوتے کے سوار تھا چھتیس روپے
دینا پڑے اور جس اونٹ کی خالی پشت پر یعنی جسپر دو بورے مال کے رکھے ہوے تھے اسپر برخوردار مولوی حاجی
محمود العافی اور حاجی رحیم بخش سوار ہوئے اسکے کرایہ کی بابت پندرہ روپیہ دینا پڑے مدینہ طیبہ سے واپسی کے وقت
تا ینبوع جس اونٹ پر شغدف تھا اسکے سینتیس روپیہ اور دوسرا اونٹ خالی پشت والا یعنی جسپر بورے رکھے تھے
پندرہ روپیہ پر کیا گیا اور اسیطرح مین بمبئی سے لکھنؤ ریل گاڑی کا کرایہ ہم چاروں آدمیونکا چھیالیس روپیہ دیا گیا اسباب
جو بمبئی سے پارسل مین روانہ کیا گیا تھا اسمین سب ملاکر کم و بیش بارہ روپیہ صرف ہوے جاتو نکو فقیر جب لکھنؤ سے
بمبئی کو روانہ ہوا ہی تو سب ملا کر تخمیناً کچھ اوپر پانسو روپیہ ہون گے یقیناً اس سے زیادہ نہوں اب ذرا
اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ اور تائید غیبی کو ملاحظہ فرمائے کہ چہار آدمیوں یہ بضاعت قلیل اور یہ عظیم الشان سفر
یہان مکان پر پہونچ کر حساب جو قلمبند کیا گیا تو چھ سو ساڑھے پچپن روپے فقط کرایہ اور حضرات مطوفین
کی تواضع مین صرف ہوے مزدوری مین بھی روپیہ زیادہ صرف ہوا اسکا حساب قلمبند نہین کیا
اور دیگر اخراجات اور مصارف انواع و اقسام کے علاوہ برین ان مقامات متبرکہ اور شہر مقدس
کی برکت و کرامت بعنایت الہی اور حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل مین فقیر کے شامل حال تھی
ورنہ یہ قلیل بضاعت ان کثیر مصارف کے لیے کیسے کافی ہوسکتی تھی جب اللہ تعالی کی مدد و استعانت
اسکے بندونکے شامل حال ہوتی ہے تو اسیطرح سے سب کام انجام پاتے ہین دیکھنے اور سننے والے حیرت مین آجاتے ہین فقط

مصارف کرایہ و اخراجات سفر وغیرہ

تمت

مین نے حسب فرمائش جناب حافظ محمد سراج الیقین صاحب اس رسالہ کو اول سے آخر تک لکھا واقعی یہ رسالہ زائرین
بیت اللہ کو جانے والے ایک بیش بہا رہبر کا کام دیگا اور اسکے مدد سے ہر قسم کا رفعت دیکھیگی خاکسار حبیب احمد لکھنوی عفی عنہ

مراسلات

○ خدابخش لائبریری جرنل، ۵۔۶۲ کے بارے میں

- جناب نورالحسن راشد
- جناب محمد جرجیس کریمی
- جناب عبدالرؤف خاں
- ڈاکٹر ضیاالدین ڈیسائی

جرنل کے بارے میں آپ کی تنقیدوں، فرمائشوں اور
مشوروں کے ہم ہمیشہ منتظر رہتے ہیں؛

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست

— ادارہ

جناب نورالحسن راشد
مولویان۔ کاندھلہ۔ مظفر نگر۔ یوپی

خدابخش لائبریری جرنل کی تازہ اشاعت (۵-۶۲) کے بعض مندرجات پر چند گذارشات درج ذیل ہیں۔

(۱)

دریابادی کا اپنی تصنیف سے انکار: "فلسفۂ اجتماع" مولانا دریابادی کے زمانۂ الحاد کی ایک گستاخانہ اور ملحدانہ تحریر تھی، اسکی اشاعت کے بعد مولانا کے خلاف سخت ردعمل کا اظہار ہوا، اسکی تردید میں مضامین مسلسل چھپے اور ایسے خیالات رکھنے والے شخص کے دائرہ اسلام سے خارج ہونے کا فیصلہ ہوا، یہ سب بلا وجہ نہیں تھا بلکہ خود مولانا دریابادی کے بقول:

"کتاب کی گویا سطر سطر میں زہر کوٹ کر بھر دیا تھا اور ٹھیک مستشرقانہ انداز میں یعنی سیرت نبوی اور قرآن پر کوئی ظاہری حملہ کیے بغیر دونوں کے متعلق تفصیلات تصریحات ایسی لکھ دی تھیں کہ جن سے دونوں کی پوری بے وقعتی ذہن میں بیٹھ جاتی تھی۔" (آپ بیتی ص ۲۷۰)

"فلسفۂ اجتماع" سنہ ۱۹۱۶ء میں پہلی مرتبہ چھپی اور اس کی طباعت کے صرف چار سال بعد ۱۹۲۰ء کے آخر میں مولانا اس کو اپنی فہرست تصانیف سے خارج کرنے کا اعلان کر چکے تھے۔ مولانا پر یہ احساس ندامت ہمیشہ طاری رہا کہ اس کتاب میں مولف نے حدود سے تجاوز کیا تھا، اس کا پیرایۂ بیان غلط اور اس کی فکر نادرست تھی، اسی احساس کے اظہار کے لیے اس کتاب سے برأت کا اعلان مولانا بار بار کرتے رہے، مولانا کی متاخر تالیفات و تحریرات میں جہاں کہیں اس کا ذکر آیا ہے مولانا نے اس کتاب سے اپنی بےزاری کا اظہار کیا ہے، آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

"اللہ سے پناہ مانگتا ہوں اس کتاب اور اس دور کے دوسرے کفریات سے۔" (ص ۲۷۰) مکتوبات علامہ سید سلیمان ندوی کے حواشی میں اور مختلف موقعوں پر اس سے برأت اور توبہ کا تذکرہ ہے۔ "فلسفۂ اجتماع" سے برأت اور بےزاری کے حوالے سے ایک مضمون خاصا مفصل غالباً صدق جدید میں چھپا تھا، پروفیسر کمال الدین ہمدانی صاحب کے نام مولانا کا یہ مکتوب مولانا کی اس موضوع پر تحریرات کی ایک اور تصدیق ہے۔

(۲)

قضیہ بابری مسجد کے پس منظر میں حدیقۂ شہدا کی اشاعت ایک تقریباً گم نام دستاویز کی بازیافت ہے لیکن

حواشی اور متعلقہ گوشوں کی تفصیلات کے بغیر اس کی افادیت محدود ہے، اگر بجائے خلاصے کے مکمل نسخہ اور اس کے ساتھ پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم کی اس موضوع پر وہ تحریر جو ان کی کتاب جنگ آزادی واقعات و شخصیات (کراچی) میں شامل ہے شریک اشاعت ہوتی تو اس واقعہ کی جزئیات اور حدیقۂ شہدا کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے کی ایک اور معاصر دستاویز جو نسبتاً اجمالی ہے لیکن اس کی غیر معمولی تاریخی اہمیت ہے مولانا فضل حق خیرآبادی کا ایک خط ہے جو اس واقعہ کے چند دن بعد مولانا نے اپنے شاگرد مولانا نور الحسن کاندھلوی کو لکھا تھا۔ اس خط کی نقل مولانا خیرآبادی کے مکتوبات بنام مولانا نور الحسن کاندھلوی میں شامل ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ حالانکہ مولانا خیرآبادی کا جہادؔ بنو ہانی گرگ کے مخالفین میں شمار ہے، اور کہا جاتا ہے کہ مولانا نے سید امیر علی امیٹھوی کے خلاف فتویٰ صادر کیا تھا لیکن مولانا کے اس مکتوب سے اس حادثہ پر مولانا کے رنج والم اور دلی احساسات کا صاف اندازہ ہوتا ہے۔

(۲)

مرآۃ العلوم کے مسامحات کے تحت "تاریخ قادریہ" (ہینڈلسٹ ص ۳۷، ۱۹۰) کا ذکر آیا ہے، یہ کتاب اگرچہ "تاریخ قادریہ" کے نام سے متعارف ہے مگر اس کا صحیح نام "تحائف رشیدیہ" ہے، اس کا ایک خطی نسخہ مکتوبہ ۱۱۹۳ھ رضا لائبریری، رامپور میں ہے، ایک اور نسخہ جو مؤلف کے قلم سے بتایا جاتا ہے۔ چند سال پہلے تک کیرانہ میں تھا، بعد میں پاکستان چلا گیا اب لاہور میں ہے۔ پاکستان میں "تحائف رشیدیہ" کے کم از کم دو نسخے اور معلوم ہیں۔

"تحائف رشیدیہ" کے دو ترجمے بھی ہوئے ہیں، پہلا تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں اور دوسرا ۱۳۰۵ھ میں کیا گیا مؤخر الذکر نصیر الدین احمد عثمانی پانی پتی کی یادگار ہے، اس کے تقریباً نصف حصے کی نقل ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

شیخ عبد الرشید قادری کا آبائی وطن بھیکم پور، عظیم آباد، پٹنہ ہے، جہاں شاہ عبد الرشید کے والد شاہ نظر محمد قادری مقیم تھے۔ شاہ نظر محمد قادری فاضل شخص اور سلوک و معرفت میں شاہ غیاث الدین فتح محمد سے مجاز تھے، ان کی ۵ رجب ۱۱۵۸ھ (اگست ۱۷۴۵ء) کو بھیکم پور، پٹنہ میں وفات ہوئی۔

شاہ عبد الرشید ۱۱۰۸ھ (۹۷-۱۶۹۶ء) میں تولد ہوئے، چودہ سال کی عمر میں وطن سے دہلی آئے، بعد میں شاہ غیاث الدین محمد کی خدمت میں کیرانہ پہنچے اور تمام عمر ان کی خدمت میں گزار دی اور ان کے خلیفہ و جانشین ہوئے۔ دہلی کے قیام میں سلسلۂ مجددیہ کے نامور مرشد شاہ عبد الاحد وحدت شاہ گل سے خاص استفادہ کیا۔ تریسٹھ سال کی عمر میں ۵ محرم الحرام ۱۱۷۱ھ (ستمبر ۱۷۵۷ء) کو شاہ عبد الرشید کی کیرانہ میں وفات ہوئی، اپنے پیر و مرشد کی خانقاہ (محلہ قدم رسول، کیرانہ، ضلع مظفر نگر۔ یوپی) میں دفن کیے گئے۔

شاہ عبدالرشید نے متعدد تالیفات یادگار چھوڑیں ان میں سے "تحائف رشیدیہ" نسبتاً متعارف ہے، اس کے علاوہ "تذکرۃ الصالحین" اور "فقر نامہ" ان کی اہم تالیفات میں شمار کی جاسکتی ہیں ایک اور کتاب "مجمع الاسرار" ہے مگر یہ میری نظر سے نہیں گزری، اس کا شاہ عبدالرشید نے "تذکرۃ الصالحین" میں ذکر کیا ہے۔ (یہ تمام معلومات شاہ عبدالرشید قادری کی تحریرات خانقاہ قدم رسول کیرانہ کے بعض کاغذات اور اہل کیرانہ پر غیر مطبوعہ مآخذ سے اخذ کی گئی ہیں)

(۴)

"ابتدائی دور کے ہندستانی مسلمان اور قرآن پاک کے تراجم پر ایک نظر": ابتدائی دور کے ہندستانی مسلمان اور قرآن پاک کے تراجم ہندستان کی اسلامی علمی تاریخ کے نہایت اہم اور قابل قدر موضوعات ہیں جن کی اہمیت اور ان پر وسیع علمی تحقیقی کام کی ضرورت محتاج بیان نہیں۔ خدا بخش لائبریری جرنل کی تازہ اشاعت شمارہ ۶۲ میں جب اس موضوع پر جناب ڈاکٹر انصار اللہ صاحب کے مضمون کے عنوان پر نظر پڑی تو بہت مسرت تھی کہ موصوف نے اپنے معمول کے مطابق اہم مفید معلومات نادر مآخذ سے فراہم کی ہوں گی مگر افسوس ہے کہ مضمون کے مطالعہ سے یہ توقع پوری نہیں ہوئی، یہ مضمون اپنے بیشتر مندرجات میں ڈاکٹر احمد خاں کی کتاب پر اعتماد کی وجہ سے متعدد اغلاط پر مشتمل ہے اس کی اکثر اطلاعات ناتمام، بے ثبوت اور محل نظر ہیں، فاضل مضمون نگار سے معذرت کے ساتھ بعض تفصیلات پیش خدمت ہیں۔

قاضی محمد معظم سنبھلیؒ (؟) کا ترجمۂ قرآن مجید ہندستانی زبانوں میں قرآن پاک کے تراجم کی روایت کا آغاز نہیں ہے بلکہ اس ترجمہ کے عہد کو برصغیر کی زبانوں میں تراجم قرآن کے ایک نئے دور خصوصاً اردو میں (دکنی اس سے مستثنیٰ ہے) ترجموں کا پیشرو قرار دیا جاسکتا ہے، بحیثیت مجموعی برصغیر کی یا ہندستانی زبانوں میں تراجم قرآن پاک کی روایت بہت پرانی ہے، شمالی ہند کی زبانوں میں پہلا ترجمۂ قرآن پاک تیسری صدی ہجری میں راجہ مہروک کی فرمائش پر مرتب کیا گیا تھا۔ ۲۷۰ھ (۸۸۳ء) میں الورا (الور واقع سندھ) کے راجہ مہروک کی فرمائش پر منصورہ کے امیر عبداللہ بن عمر نے عراق کے ایک فاضل منصور کو جو ہندستان میں پلا بڑھا تھا اور ہندستان کی مقامی مختلف زبانوں سے واقف تھا اسلامی تعلیمات کی وضاحت و تشریح اور قرآن پاک کے ترجمے کے لیے راجہ مہروک کے پاس بھیجا تھا، راجہ نے اس شخص سے قرآن پاک کا اپنی زبان میں ترجمہ کرایا جو تین سال میں مکمل ہوا تھا۲؎۔ شمالی ہند میں اس کے

۱؎ قاضی محمد معظم سے منسوب ترجمہ کا راقم سطور کو علم نہیں مگر اس انتساب میں بظاہر کچھ غلطی ہے لیکن ہے ترجمہ قاضی محمد معظم نابھوی (وفات ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء) کا ہو۔ نابھوی کی تفسیر قرآن کا تذکرہ لوگوں نے ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلوی ص ۳۵۱ ج ۶، حیدرآباد، ۱۹۵۷ء، مگر مولوی رحمن علی کا یہ بھی اطلاع ہے کہ یہ تفسیر سکھوں کے ہنگامہ میں جل گئی تھی، ترجمہ تذکرہ علمائے ہند مع حواشی و تحقیق پروفیسر محمد ایوب قادری ص ۵۳۸، کراچی: ۱۹۶۱ء

۲؎ معروف عالم سیاح متعدد مورخین نے قدیم مستند مآخذ کے حوالے سے اس ترجمہ کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً دیکھیے: عرب و ہند کے تعلقات، مولانا سید سلیمان ندوی ص ۲۲۰-۲۲۱ (اعظم گڑھ: ۱۹۳۰ء)

پہلے کسی ترجمہ کا ہنوز انکشاف نہیں ہوا۔ نیز دکنی میں بھی قرآن کریم کے متعدد ترجمے ہوا گرچہ جزوی ترجمے ہیں قرآن کریم کے مکمل ترجمے نہیں لیکن قاضی محمد معظم کے ترجمہ سے پرانے ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے قرآن پاک کے متعدد دکنی تراجم کا تعارف کرایا ہے[1] ان میں سب سے پرانا ترجمہ دسویں صدی ہجری کے آخر یا شروع گیارھویں صدی ہجری کا ہے مگر یہ تمام ترجمے جن کا مولوی عبدالحق نے ذکر کیا ہے جزوی تراجم ہیں لیکن اسی دور تقریباً دسویں صدی ہجری کے آخر یا شروع گیارھویں صدی ہجری میں شمالی ہند میں قرآن پاک کا ایک مکمل عمدہ ترجمہ ہندوی یا بھاشا میں ہو چکا تھا۔ اور اس ترجمہ کے نسخے تیرھویں صدی ہجری کے تقریباً وسط تک موجود تھے، ایسا ہی ایک ترجمہ اس وقت کے ممتاز عالم اور مرشد حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی ($\frac{۱۲۰۸ھ}{۱۷۹۳-۹۴ء}$ تا $\frac{۱۳۱۳ھ}{۱۸۹۵ء}$) کی نظر سے گزرا تھا۔ حضرت مولانا نے جو علوم قرآن کے مایۂ ناز عالم اور بھاشا سے واقف تھے اس ترجمہ کی عمدگی کی تعریف فرمائی ہے۔[2]

ترجمہ قرآن پاک کے لیے جہانگیر کی جس فرمائش کا تو زک جہانگیری کے حوالے سے انصار اللہ صاحب نے ذکر فرمایا ہے۔ یہ فرمائش میر سید محمد رضوی احمد آبادی گجراتی (م ۱۰۴۵ھ۔ ۳۶-۱۶۳۵ء) سے کی گئی تھی میر سید رضوی نے اس فرمائش کی بہت اہتمام سے تعمیل کی اور صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کے الفاظ میں :

"ترجمۂ قرآن شریف بعبارت خوب ترتیب دادہ"[3] (قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی عبارت میں کیا ہے۔)

اگرچہ ہر پہلو سے قرین قیاس یہی ہے کہ یہ ترجمہ فارسی میں ہوا ہو مگر پروفیسر محمود خان شیرانی کا خیال ہے کہ "یہ ترجمہ ریختہ (اردو) میں ہوا تھا"[4] اگر تحقیقی طور پر اس خیال کی تصدیق ہو جائے تو یہی ترجمہ اُردو میں قرآن پاک کا سب سے پہلا ترجمہ اور اُردو کی نثری روایت کا سر آغاز ہے۔

برصغیر میں قرآن پاک کے فارسی تراجم کا عمل میر سید محمد رضوی کے ترجمہ قرآن پاک سے بہت پہلے سے جاری تھا فارسی میں مختلف تفسیریں لکھی گئیں اور متعدد ترجمے کیے گئے مثلاً تفاسیر میں قاضی شہاب الدین عمر دولت آبادی (م ۸۴۹ھ۔ ۱۴۴۵ء) کی مصنفہ تفسیر قرآن "بحر مواج" محتاج تعارف نہیں۔ تراجم میں مخدوم نوح ہالائی (م ۹۹۸ھ ـ ۱۵۸۹ء) کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] پرانی اردو میں قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ یہ مضمون مختلف رسالوں میں کئی مرتبہ چھپا ہے، ایک مرتبہ الگ سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوا ہے۔ پیش نظر اشاعت مشمولہ "قرآن نمبر" ماہنامہ معارف پاکستان کراچی ۱۳۸۸ھ ہے۔ ص ۲۲۶ ج ۱۔ نیز ماہ نامہ نظام، کانپور۔ قرآن نمبر ص ۲۱۹ (کانپور ۱۹۶۲ء)؛ [2] تذکرہ مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ملاحظہ ص ۲۳۳ (طبع سوم، لکھنؤ۔ بلا سن) ـ

[3] مآثر الامراء، فارسی ص ۲۳۲ ج ۳۔ (کلکتہ۔ ۱۸۹۰ء)۔ [4] حافظ شیرانی کے یہ الفاظ پروفیسر محمد ایوب قادری نے مقالات شیرانی، مرتبہ مظہر محمود شیرانی ص ۲۲-۲۵ ج ۲ (لاہور ۱۹۶۶ء) کے حوالے سے نقل کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو ترجمہ اُردو مآثر الامراء ص ۳۲۷ ج ۳۔ (لاہور: ۱۹۷۰ء)

متعدد فارسی تراجم غیر متعارف ہیں اور ان کے مترجمین کی تحقیق نہیں ہے۔ فارسی ترجموں میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ترجمۂ قرآن کریم فتح الرحمن کو جو ہندستان میں فارسی تراجم کا خاتم اور گویا ناسخ بھی ہے، جس قدر مقبولیت اور اعتماد و اختصاص حاصل ہوا وہ بلاشبہ شاہ صاحب کا ذاتی کمال اور منفرد صفت ہے جس میں کوئی اور مترجم شاہ صاحب کا شریک نہیں۔ اس ترجمہ کو منجانب اللہ ایسی مقبولیت عطا فرمائی گئی کہ فارسی تراجم میں پورے برصغیر میں اسی ایک ترجمے سے استفادے اور اس کی نقل و اشاعت کا سلسلہ جاری رہا، فارسی کے اس سے پہلے ہندستانی تراجم آہستہ آہستہ گم نام و بے نشان ہو گئے۔

انصار اللہ صاحب فرماتے ہیں: "یہ بات عام طور سے تسلیم کی گئی ہے کہ قرآن پاک کا اولین ترجمہ وہ ہے جو شاہ رفیع الدین نے ۱۲۰۰ھ - ۸۶-۱۷۸۵ء میں کیا تھا[۱]" حالانکہ حضرت شاہ رفیع الدینؒ سے منسوب ترجمۂ قرآن کا حضرت شاہ عبد القادرؒ کے "موضح قرآن" سے پہلے مرتب و قلم بند ہونا صرف ایک مفروضہ ہے، جس کا ثابت کرنا آسان نہیں۔ راقم سطور کی معلومات[۲] کے مطابق حضرت شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن کی "موضح قرآن" سے سبقت و اوّلیت کی کوئی معمولی سے معمولی شہادت، معتبر اولیت کیا ایسا قرینہ بھی موجود نہیں جس کے ذریعہ ترجمہ منسوب بہ شاہ رفیع الدین کی "موضح قرآن" پر اولیت معلوم ہوتی ہو، بلکہ حضرت شاہ رفیع الدین سے منسوب ترجمہ کے متعلق یہ طے ہونا باقی ہے کہ اس ترجمے کا شاہ رفیع الدین سے انتساب کس حد تک درست ہے؟ کیا واقعۃً یہ ترجمہ شاہ رفیع الدین کا ہے؟ مختلف قرائن و شواہد کی بنا پر اس معروف ترجمہ کے شاہ رفیع الدین سے انتساب میں راقم سطور کو شک ہے۔ تفصیلات کا یہ موقع نہیں۔

انصار اللہ صاحب نے مولانا لطف اللہ لکھنوی کی مؤلفہ تفسیر سورۂ فاتحہ کو "اردو کا سب سے پہلا یا قدیم ترین مطبوعہ ترجمۂ قرآن لکھا ہے[۳]" یہ بھی درست نہیں۔ مولانا لطف اللہ بن عبد اللہ حنفی لکھنوی (وفات ۱۲۹۷ھ - ۱۸۸۰ء)[۴] اپنے وقت کے مشہور عالم، فقیہ اور مناظر تھے۔ ان کی متعدد تالیفات ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور و متعارف یہی تفسیر سورۂ فاتحہ ہے جس کا انصار اللہ صاحب نے ذکر کیا ہے۔ تفسیر سورۂ فاتحہ کا صحیح نام "مظہر العجائب" ہے اور یہ کتاب اسی نام سے متعارف ہے، اس کا اصل موضوع شیعہ صاحبان کے عقائد و نظریات کی تردید ہے۔

تفسیر مظہر العجائب ۱۲۸۲ھ (۶۶ - ۱۸۶۵ء) میں مرتب ہوئی۔ "مرغوب دل" (اعداد: ۱۲۸۲ھ) اس کا تاریخی نام ہے۔ مؤلف نے خاتمہ کے ایک شعر میں اس کا ذکر کیا ہے، کہتے ہیں:

پاک شرستوں کی ہو محبوب دل اس کی تو تاریخ ہے "مرغوب دل"[۵]

۱؎ ۲؎ خدابخش لائبریری جرنل (۹۲ - ۵) صفحہ ۶۱۔ ۳؎ ترجمۂ الطاف — صفحہ ۲۰۷ تا صفحہ ۲۰۸ ج ۲۔ (ایچ آباد: ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۹ء) - نیز شمس العارفین مولانا سراج الیقین کرسوی۔ (کرسی، ضلع بارہ بنکی) صفحہ ۳ (طبع اوّل ہردوئی ۱۳۳۳ھ)۔ ۵؎ مظہر العجائب (تفسیر سورۂ فاتحہ) صفحہ ۲۰۹ طبع اوّل۔

تالیف کے تقریباً ایک سال بعد ۱۲۸۳ھ کے غالباً آخری مہینوں میں (۱۸۶۷ء) مطبع صدیقی[1] میں مظہر العجائب[2] کی طباعت شروع ہوئی جو ۱۲۸۴ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی سرورق (ٹائٹل) پر آغاز طباعت کی تاریخ درج ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

"وسنة الطبع من الهجرة فی المطبع الصدیقی الف ومائتان وثلث وثمانون ۱۲۸۳ھ"

سنہ اختتام کی تصدیق قطعات تاریخ سے ہو رہی ہے جو کتاب کے آخر میں شامل ہیں منجملہ ان کے ایک مصرعۂ تاریخ یہ ہے:

"چھپی اچھی تفسیر ام الکتاب ۱۲۸۴ھ"

تفسیر سورۂ فاتحہ کی جس طباعت کا ڈاکٹر احمد خان نور انصار اللہ صاحب نے ذکر کیا ہے ممکن ہے وہ اس کا دوسرا یا تیسرا ایڈیشن ہو۔

یہاں ہوا یہ ہے کہ ڈاکٹر احمد خان نے سنہ تیرہ سو تیرہ کو بارہ سو تیرہ پڑھا اور سنہ ۱۲۱۳ھ کی عیسوی سنہ سے مطابقت کر کے اس غلط فہمی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا، اس قسم کی ڈاکٹر احمد خاں کی یہ واحد فروگذاشت نہیں ہے بلکہ ان کی کتاب میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں تفسیر سورۂ یوسف از حکیم محمد اشرف کاندھلوی[3] کے سنہ طباعت ۱۲۱۹ھ۔ ۱۸۰۴ء کا تذکرہ بھی اسی قسم کی فروگذاشت کا ایک نمونہ ہے۔

تفسیر سورۂ یوسف کے سنہ تالیف کا حکیم محمد اشرف نے صراحۃً ذکر نہیں کیا اور تفسیر سورۂ یوسف کا کوئی ایسا اشارہ و قرینہ بھی نہیں ملتا جس کی مدد سے سنہ تالیف کا کچھ اندازہ کیا جا سکے مگر اس کثیر الاشاعت کتاب کے بعض ناشرین نے اس کی تاریخ تالیف

---

[1] اس اشاعت پر مطبع صدیقی کا محل وقوع درج نہیں، ممکن ہے یہ مطبع صدیقی بریلی کا ہو جو ملوکہ مولانا محمد احسن نانوتوی۔ [2] مظہر العجائب (یا تفسیر سورۂ فاتحہ) صفحہ اوّل و صفحہ ۲۰۶ جو اس اشاعت کا آخری صفحہ ہے۔ [3] مولانا حکیم محمد اشرف خلف مولانا امام الدین بن حکیم شیخ الاسلام کاندھلوی۔ تاریخ ولادت معلوم نہیں، تعلیم اپنے ماموں چچا خاتم مثنوی مولانا روم، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (وفات ۱۲۴۵ھ۔ ۱۸۲۹ء) سے حاصل کی، طب پڑھی اور ریاضی و معالجات میں کمال حاصل کیا۔ مجموعہ کلام؛ فارسی میں غیبت کی مثنوی کے جواب میں ایک مثنوی اور تفسیر سورۂ یوسف علمی تحریریں یادگار چھوڑیں مگر ان کا سب سے اہم علمی کارنامہ طب و معالجات پر ایک معرکہ آرا کتاب "بحر العلاج" کی ترتیب و تالیف ہے یہ کتاب معالجات پر ایک دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے اس کا خطی نسخہ ہمدرد طبی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ہمدرد یونیورسٹی، دہلی میں موجود ہے۔ تعلیم کے بعد اکثر وقت خانپور ضلع بلند شہر میں گزرا۔ وہیں ۳ ربیع الاول ۱۲۴۷ھ / ۱۲ اگست ۱۸۳۱ء کو وفات ہوئی، وہیں دفن کیے گئے۔ نزہۃ الخواطر کی قدیم طباعت (حیدرآباد: ۱۳۷۶ھ) میں حکیم محمد اشرف کا سنہ وفات ۱۲۰۳ لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے بعد کی طباعتوں میں درست ہے۔

ربیع الاول سنہ ۱۲۱۲ھ (اگست ستمبر ۱۷۹۷ء) لکھی ہے[1] مگر مختلف علامات و قرائن کی وجہ سے مجھے اس اطلاع کی تصدیق میں تأمل ہے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں حکیم محمد اشرف اپنے بڑے چچا اور جملہ درسیات کے استاذ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ کی خدمت میں تقریباً اوسط کتابوں کی تعلیم میں مشغول تھے[2]۔ اگرچہ زمانۂ طالب علمی میں شعر و سخن کے ذوق اور تالیف و تصنیف کی روایت رہی ہے مگر مفتی الٰہی بخش کا جس طرح کا حلقۂ درس و تربیت تھا اور ان کے طلبہ کے اوقات جس قدر مصروف گزرتے تھے اس میں ایسی مصروفیت و تالیف کا موقع ملنا دشوار تھا اس لیے خیال ہے کہ تفسیر سورۂ یوسف کی سنہ ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں تالیف کی اطلاع درست نہیں ہے، ممکن ہے یہ کتاب سنہ ۱۲۱۲ھ یا سنہ ۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء میں لکھی گئی ہو۔

تفسیر سورۂ یوسف کا سنہ تالیف اگرچہ محقق نہیں مگر سنہ ۱۲۱۲ھ میں اس کی طباعت کی اطلاع بہر صورت ناقابل تسلیم ہے۔ تفسیر سورۂ یوسف نیز ہندستان میں طباعت کے ابتدائی دور کی مطبوعات کے سنین طباعت کے تعین میں ہندستان میں مطابع کے آغاز اور مختلف شہروں میں اس کے پھیلاؤ اور درجہ بہ درجہ ترقی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو سنہ ۱۲۱۳ھ اور ۱۲۲۹ھ / ۱۷۹۷ء اور ۱۸۰۴ء میں بنارس اور لاہور میں ایسے مطابع کی موجودگی کا سراغ نہیں ملتا خصوصاً صدیقی پریس اور انقلاب اسٹیم پریس جیسے نام بھی انیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک تقریباً معدوم تھے اس لیے یہ تو طے ہے کہ سنہ ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء میں لاہور سے تفسیر سورۂ یوسف نہیں چھپی مگر یہ سوال جواب طلب ہے کہ تفسیر سورۂ یوسف سب سے پہلے کب اور کہاں چھپی تھی مجھے اس کا علم نہیں لیکن ڈاکٹر احمد خاں نے[3] تفسیر سورۂ یوسف کی قدیم دو طباعتوں کا ذکر کیا ہے جو سنہ ۱۲۴۸ھ - ۱۸۳۲ء اور سنہ ۱۲۵۳ھ - ۱۸۳۷ء کی ہیں۔

پہلی اطلاع غالباً جناب محمد عالم مختار حق کی مرتبہ فہرست تراجم قرآن سے اخذ کی گئی ہے[4] اور دوسری اشاعت کی جناب نصیر الدین ہاشمی کی ایک اطلاع سے ضمناً تصدیق ہو رہی ہے، ہاشمی صاحب نے ذخیرۂ سالار جنگ (حیدرآباد) میں موجود سنہ ۱۸۵۷ء

---

[1] مطبع گلزار احمدی مرادآباد سے تفسیر یوسف کا ایک ایڈیشن ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۱ھ - نومبر ۱۸۸۴ء میں چھپا تھا اور پانچ مہینے کے بعد اپریل ۱۸۸۵ء میں یہی طباعت دوبارہ شائع ہوئی اس کے آخر میں خاتمۃ الطبع میں ناشر نے لکھا ہے کہ: "نسخۂ تفسیر سورۂ یوسف منظوم نتیجۂ فکر بحر علم باکمال ناظم فصیح المقال مولوی محمد اشرف صاحب ساکن کاندھلا [illegible] ربیع الاول سنہ ۱۲۱۲ھ میں تصنیف فرمایا۔" گلزار احمدی کی یہ اشاعت ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔ فہرست مخطوطات [illegible] انور صدیقی [illegible] صـ۲۳ [illegible] ۱۹۸۷ء سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر سورۂ یوسف کا ایک نسخہ [illegible] مطبع [illegible] کی سنہ ۱۲۲۲ھ کی اشاعت [illegible] ہے۔

[2] مفتی الٰہی بخش کی خود نوشت تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۲۱۲ھ میں حکیم محمد اشرف ان کے حلقۂ درس میں شامل تھے۔ [3] قرآن کریم کے اردو تراجم، کتابیات صـ۱۲۰، اسلام آباد ۱۹۸۸ء [illegible] اصل کتاب "قرآن کریم کے اردو تراجم" [illegible] صـ[illegible] [illegible] صـ۱۵۳ مگر یہ مطابقت درست نہیں سنہ ۱۲۵۳ھ کی صحیح مطابقت ۱۸۳۷-۳۸ء ہے۔

[4] قرآن نمبر، سیارہ ڈائجسٹ لاہور، صـ۹۲۵ ج ۲۔

سے پہلے کی مطبوعات کے تعارف میں تفسیر سورۂ یوسف کے ایک نسخہ کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ :

"تفسیر سورۂ یوسف، حکیم محمد اشرف اس کے مؤلف ہیں۔ منظوم تفسیر ہے ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں محمد عبداللہ مجید پوری
کے اہتمام سے بمبئی میں طبع ہوئی ہے۔ طباعت کی تاریخ "کہا ہاتف نے تفسیر بدیع سورۂ یوسف" سے نکالی گئی ہے" [1]

یہ اشاعت جیسا کہ ذکر ہوا بمبئی کی سنہ ۱۲۶۴ھ کی ہے مگر اس کا جو فقرہ تاریخ ہاشمی صاحب نے نقل کیا ہے اس کے اعداد
۱۲۵۳ ہوتے ہیں جو اس کی علامت ہے کہ بمبئی کا یہ ایڈیشن تفسیر سورۂ یوسف کی کسی ایسی طباعت کی جوں کی توں نقل ہے جو ۱۲۵۳ھ
(۳۸-۱۸۳۷ء) میں چھپا تھا اور یہ طباعت مطبع محمدی بمبئی کی وہ اشاعت معلوم ہوتی ہے جس کا ڈاکٹر احمد خان نے ذکر کیا ہے۔

تفسیر سورۂ یوسف کی ایک اور قابل ذکر اشاعت مطبع قادری میرٹھ کی ہے جو حکیم محبوب علی کے زیر اہتمام ۱۸۴۹ء / ۱۲۶۵ھ
میں شائع ہوئی۔ محمد عتیق صدیقی کی اطلاع کے مطابق یہ ایڈیشن تین سو کی تعداد میں چھپا تھا اور تمام نسخے اسی سال فروخت ہو گئے
تھے [2] جو اس زمانہ میں کتاب کی مقبولیت کی نشانی اور اس کی غیر معمولی پذیرائی کی علامت تھی۔ برسبیل تذکرہ یہ اطلاع بے محل نہ ہوگی کہ
تفسیر سورۂ یوسف ستر بہتر برس تک اردو کی مقبول عام اور کثیر الاشاعت کتابوں میں شامل رہی۔ مطبع قادری کے مطبوعہ نسخوں کی ہاتھوں
ہاتھ فروخت سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اس کتاب کو قبول عام حاصل تھا۔ مطبع قادری سے شائع ہونے سے پہلے ہی تفسیر سورۂ یوسف
خاصی متعارف ہو گئی تھی اور اس اشاعت کے بعد تو اس کثرت سے چھپی کہ اس کے ایڈیشنوں کی جستجو آسان نہیں، کم سے کم پچاس مرتبہ
ضرور چھپی ہے ممکن ہے اس سے بھی زائد طباعت ہوئی ہو، ایک ایک مطبع اور کارخانۂ تجارت سے اس کے متواتر کئی کئی ایڈیشن
چھپے، مختلف اداروں سے دو دو تین تین طباعتوں کی تصدیق ہو رہی ہے اور مطبع منشی نول کشور سے تو پندرہ سولہ ایڈیشن چھپے
اور ظاہر ہے کہ ان تمام ایڈیشنوں کے مجموعی نسخوں کی تعداد لاکھوں میں ہوگی، جو اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر کا بے مثال ترجمہ قرآن پاک "موضح قرآن" (تالیف ۱۲۰۵ھ) بلاشک و شبہ پہلی مرتبہ مطبع احمدی
کلکتہ سے سید عبداللہ بن سید بہادر علی کے زیر اہتمام سنہ ۱۲۴۵ھ میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا اور اس اشاعت کے متعدد نسخے
مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں مگر ڈاکٹر احمد خاں اور انصار اللہ صاحب کا یہ قول کہ "موضح قرآن" اسی وقت دہلی سے بھی چھپا تھا [3]
قرین صحت نہیں علاوہ اس کے کہ اس طباعت کے وجود کا ابھی تک علم نہیں ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سنہ ۱۲۴۵ھ میں دہلی میں مطبع

---

[1] مضمون "کتب خانہ سالار جنگ میں اسلامیات سے متعلق ۱۸۵۷ء سے پہلے کی مطبوعات" ماہنامہ برہان دہلی، مارچ ۱۹۷۰ء ص ۱۵۳ — [2] صوبہ شمال و مغربی کے
اخبارات و مطبوعات، محمد عتیق صدیقی ص ۲۳۲ (دہلی، ۱۹۶۲ء) — [3] خدا بخش لائبریری جرنل (۷۲-۷۱) ص ۱۲۹، قرآن کریم کے اردو تراجم ص ۱۳۳ اور دلچسپ بات
یہ ہے کہ ڈاکٹر احمد خاں ایک موقع پر موضح قرآن، سید عبداللہ کی تالیف کی حیثیت سے بھی ذکر کرتے ہیں ملاحظہ ہو: قرآن کریم کے اردو تراجم ص ۱۱۳، ۳۵۵۔

احمدی نامی کوئی پریس یا تجارتی ادارہ موجود نہیں تھا[1]۔ دہلی میں مطبع احمدی کے نام سے سب سے پہلا مطبع ۱۲۶۵ھ میں قائم ہوا جو اوّل اوّل مولانا بشیر الدین سہارنپوری کا تھا بعد میں اس کی ملکیت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کو منتقل ہو گئی تھی اس مطبع نے مختلف موضوعات پر اعلیٰ درجہ کی درجنوں کتابیں شائع کیں مگر ان مطبوعات میں شاہ عبد القادر کا "موضح قرآن" شامل نہیں اگر مطبع احمدی نے "موضح قرآن" شائع بھی کیا ہو تو یہ طباعت ۱۲۷۰ھ کے قریب ہوئی ہوگی۔ دہلی کے اکثر مطابع خصوصاً اس مطبع احمدی کی مطبوعات اعلیٰ درجہ کی کتابت سے لیتھو پر چھپی تھیں کلکتہ کے مطبع احمدی کی بیشتر مطبوعات جس میں "موضح قرآن" بھی شامل ہے ٹائپ پر چھپی ہوئی ہیں اس لیے مطبع احمدی دہلی سے سنہ ۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۹ء میں "موضح قرآن" کی طباعت کی روایت لائق التفات نہیں۔ در اصل یہ غلط فہمی مولوی عبد الحق کے قلم سے چلی بعد میں قاموس الکتب اور دیگر مراجع میں جوں کی توں نقل ہوئی۔ غالباً یہی روایت ڈاکٹر احمد خان کے پیش نظر رہی ہے۔ بہر حال یہ روایت درست نہیں ہے۔

ڈاکٹر احمد خاں کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مطبع احمدی کو جس نے "موضح قرآن" کی سب سے پہلی اشاعت کا فخر حاصل کیا اور اس مطبع احمدی کو جس نے مدرسہ خادم الاسلام دہلی کے اشتراک سے سنہ ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء میں "موضح القرآن" سات الگ الگ حصوں میں شائع کی[2] ایک ہی ادارہ خیال فرماتے ہیں حالاں کہ ان دونوں میں نصف صدی سے زائد فاصلہ ہے اور ایک کا محل وقوع کلکتہ دوسرے کا دہلی ہے۔ یہ مطبع احمدی جس کا "موضح القرآن" کی طباعت میں حسب اطلاع ڈاکٹر احمد خاں اشتراک ہوا ہے سید احمد ولی اللّٰہی کا مطبع احمدی ہے اور سنہ ۱۳۰۸ھ تک دہلی میں قائم ہونے والے مطابع میں احمدی مطبع کے نام سے قائم آخری اشاعتی ادارہ تھا۔

ڈاکٹر انصار اللہ صاحب نے قرآن کریم کے منظوم مکمل تراجم میں سے مولانا نبی بخش حلوائی لاہوری اور شمس الدین شائق کے منظوم تراجم کو بطور خاص قابل ذکر کہا ہے لیکن یہ ذکر نہیں فرمایا کہ ان تراجم کی وہ کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ان کو اور ترجموں سے ممتاز اور قابل ذکر قرار دیا گیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یہ دونوں ترجمے قرآن پاک کے مکمل منظوم ترجمے ہیں لیکن مولانا نبی بخش کے ترجمہ کا اردو تراجم کی فہرست میں شمار درست نہیں، یہ مفصل ترجمہ پنجابی میں ہے اس کی ابتدا اس شعر سے ہوئی ہے:

---

[1] ملاحظہ ہو اختر شہنشاہی از مرزا محمد اشرف (لکھنؤ: ۱۸۸۸ء) اور ہندوستانی پریس از نادر علی خاں (لکھنؤ: ۱۹۹۰ء)

[2] تفسیر موضح القرآن کی یہ طباعت (۱۳۰۸ھ) جس کا ڈاکٹر احمد خاں کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے میری نظر سے نہیں گزری، مگر اس کا دوسرا ایڈیشن جو پہلے ایڈیشن کی طرح سات حصوں میں مطبع مدرسہ خادم الاسلام دہلی سے چھپا تھا (۱۳۱۳ھ) ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔ اس طباعت میں مطبع احمدی کا ذکر نہیں ہے۔

اسم اللہ دے نال شروع ہے جو بخشش دا سائیں   کامل مہر و محبت والا پالے آخر تائیں[1]

مولانا نبی بخش کی اس مفید خدمت کو تفسیر نبوی سے موسوم کیا گیا ہے اس کی شروعات سنہ ۱۳۱۰ھ میں ہوئی اور اکتالیس سال بعد سنہ ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۳ء میں حرف ختام مکمل ہوا۔ ڈاکٹر احمد خان اور ان کے اتباع میں انصار اللہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ تفسیر سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی تھی اگر اس سے جزوی طباعت مراد ہے تو یہ اطلاع صحیح ہے لیکن مکمل صورت میں یہ تفسیر سنہ ۱۳۵۱ھ کے بعد ہی شائع ہو سکی۔

قرآن پاک کے منظوم تراجم میں سب سے زیادہ لائق تعارف مولوی عبد السلام 'سلام' بدایونی کا ترجمہ یا تفسیر قرآن کریم "زاد الآخرۃ" ہے، جو قرآن پاک کا سب سے پہلا مکمل منظوم ترجمہ یا تفسیر ہے۔ زاد الآخرۃ کی سنہ ۱۲۴۴ھ / ۲۹-۱۸۲۸ء میں ترتیب شروع ہوئی اور پندرہ سال کی محنت و کوشش کے بعد یکم ذی قعدہ سنہ ۱۲۵۹ھ / ۲۴ نومبر سنہ ۱۸۴۳ء کو مکمل ہوئی۔ اس تفسیر کا نام 'زاد الآخرۃ' (اعداد: ۱۲۴۴) اس کے سنہ آغاز کی جانب اشارہ کرتا ہے، تاریخ اختتام کی خاتمہ کتاب میں صراحت ہے، دن، تاریخ، سنہ سب لکھا ہے، کہتے ہیں:

"شکر اللہ کہ چند سال کے بعد   روز آدینہ غرہ روز سعید
درمیان دو عید و عید سعید   ہو گئی ختم یہ کتاب مجید

چند اور شعروں کے بعد کہا ہے:

سالہا سال میں لکھی یہ کتاب   رکھ کے ملحوظ احتیاط کی داب
اس کے سال شروع کا منشا   ہے لقب زاد الآخرۃ اس کا
کاش اپنا وہ فضل فرما دے   کہ وہ عقبیٰ کا زاد ہو جاوے[2]
اور تاریخ اختتام کی ہے   ایک ہزار اور انسٹھ اور دو سے

یہ کتاب دو حصوں اور چار جلدوں پر مشتمل ہے، پیش نظر اشاعت زاد الآخرۃ کی پہلی مکمل طباعت ہے۔ جو مولوی محمد محمود بخش منصف کان پور کی امداد و اعانت سے مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ سے طبع ہوئی، اس ایڈیشن کی آخری چوتھی جلد ربیع الاول سنہ ۱۲۸۵ھ / جون سنہ ۱۸۶۸ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔

---

[1] ملاحظہ ہو: تذکرہ علماء اہل سنت و جماعت لاہور۔ از اقبال احمد صاحب فاروقی ص ۲۹۲–۲۹۳ (لاہور: ۱۹۷۵) تذکرہ اکابر اہل سنت از محمد عبد الحکیم شرف قادری ص ۵۲۵–۵۲۶ (لاہور: ۱۳۹۶ھ) تذکرہ علمائے پنجاب از اختر راہی ص ۷۷۳–۷۷۴ ج ۲۔ (لاہور: ۱۴۰۰ھ)
[2] تفسیر زاد الآخرۃ ص ۵۵۲ ج ۴ (نولکشور، لکھنؤ: ۱۲۸۵ھ)

ڈاکٹر احمد خان نے "زاد الآخرۃ" کا دو موقعوں پر ذکر کیا ہے اور دونوں اندراجات میں غلطی ہے، پہلے اندراج میں اس کا سنہ طباعت ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء لکھا ہے اور دوسرے اندراج میں اس تالیف کے سنہ ۱۲۴۴ھ میں مکمل ہونے کی صراحت ہے،[1] دونوں باتیں بے حقیقت ہیں اس کی سنہ ۱۲۴۴ھ میں تالیف مکمل ہوئی نہ طباعت۔

انصار اللہ صاحب کے مضمون میں عیسائیوں کے شائع کیے ہوئے تراجم کے تحت ایک ترجمہ کا مطبع بے نام دہلی کی اشاعت ۱۸۴۴ء کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے،[2] یہ اطلاع بھی شایان قبول نہیں ہے، یہ ترجمہ الہ آباد سے چھپا تھا اس ترجمہ کے متعلق قدیم ترین دریافت اطلاع گارساں دتاسی کی ہے، وہ اپنے پہلے خطبے میں کہتا ہے:

"اس قسم کی مطبوعات میں سب سے دلچسپ قرآن کا ایک ایڈیشن ہے جسے ایک پریسبی ٹیرین امریکن نے سنہ ۱۸۴۴ء میں الہ آباد میں طبع کرایا، اس کے شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں مسلمانوں کی غلطیوں اور عیسائی مذہب کے خلاف ان کے اعتراضوں کی تردید کی گئی ہے، متن کے ساتھ تفسیر بھی ہے جو اسی قسم کی ہے جو مراچی نے لکھی ہے۔"[3]

یہ صحیح ہے کہ ہندستان میں پادریوں نے قرآن کریم کے متعدد ترجمے کیے ہیں، شاہ عبدالقادر کی موضح قرآن کو رومن میں چھاپا ہے۔ ان ترجموں اور اشاعتوں کا تاریخی معلومات کی تکمیل کے لیے تذکرہ کرنا ضروری ہے مگر ان کی اس کارگزاری کو نیک کام کہنا کسی طرح بھی موزوں نہیں۔ عیسائیوں نے قرآن کریم کے حوالہ سے جو قلمی تحریری کام کیا ہے اس کا مقصد قرآن پاک کے صحیح مترجمین و مفسرین کے مقاصد سے بہت مختلف تھا اور خاصی حد تک نازیبا اور پست مقصد تھا، پادریوں کی ان کاوشوں کا مرکزی نقطہ یہی تھا کہ قرآن کریم کے منزل من اللہ کتاب ہدایت اور خدا کا آخری پیغام ہونے کی ہر صورت (معاذ اللہ!) تردید کی جائے اس کی صداقت و تعلیمات پر یقین و عقیدہ کو مسلسل کمزور کیا جائے اور اس کوشش کے نتیجہ میں مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے کی جد و جہد عام ہو سکے، یہ حقیقت ہے کہ مشنریوں کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا اور ان کے چھاپے ہوئے ترجموں اور تفاسیر قرآن کو مسلمانوں میں کبھی بھی پذیرائی اور قبول عام حاصل نہیں ہوا، تاہم اس میں شک نہیں کہ قرآن پاک کے ان تراجم و تفاسیر کی تالیف و طباعت میں جو ہندستان میں مشنریز اور پادریوں

---

[1] قرآن کریم کے اردو تراجم (کتابیات) ص۱۳۳ اندراج ۵۸، ص۱۰۵ اندراج ۵۸۔ [2] خدا بخش لائبریری جرنل (۹۲-۵) ص۱۱۱۔ ڈاکٹر احمد خان نے الہ آباد کے مطبوعہ اس ترجمہ کو تین الگ الگ جگہوں پر ذکر کیا ہے، ص۱۳۳ اندراج ۲۲۵، ص۱۳۳ اندراج ۲۲۹، ص۱۴۰ اندراج ۲۶۵، ان میں سب سے پہلا درست ہے مگر اسی کو انصار اللہ صاحب نے نظر انداز کیا ہے۔ [3] خطبات گارساں دتاسی ص۱۰ (اورنگ آباد: ۱۹۳۵ء)

کے ذریعہ شائع ہوئے مسلمانوں کی بھلائی اور خدمت قرآن کریم کا کوئی پہلو نہیں تھا اس لیے ان تراجم و تفاسیر کو نیک کام یا خدمت قرآن کریم لکھنا قرآن پاک کے صحیح تراجم اور تفاسیر کی گویا توہین اور نہایت حق تلفی ہے، جس کو کسی صورت گوارا نہیں کیا جاسکتا۔

اگر میرے محترم ڈاکٹر انصار اللہ صاحب پادری سلطان محمد پال یا پادری حاجی علی بخش کے تراجم قرآن خصوصًا موخر الذکر کی صرف تمہید ملاحظہ فرمالیتے تو شاید ان کا تذکرہ بھی مناسب خیال نہ کرتے ان کو نیک خدمت قرار دینا تو بہت دور ہے۔

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ڈاکٹر انصار اللہ صاحب کی اکثر فروگذاشتیں ڈاکٹر احمد خاں کی کتاب "قرآن کریم کے اردو تراجم" پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کی وجہ سے رونما ہوئی ہیں اگر انصار اللہ صاحب اس کتاب کے چند مندرجات کی بھی اپنے طور پر تصدیق و تحقیق فرمالیتے تو شاید ان کے مضمون میں اس کتاب کے اس کثرت سے حوالے نہ آتے اور اس پر ایسا اعتماد ظاہر نہ ہوتا، ڈاکٹر احمد خان کی اس کاوش کی تحقیقی استنادی حیثیت اسی سے واضح ہے کہ انصار اللہ صاحب کے مضمون میں اس کے جس قدر حوالے درج ہیں ان میں سے ایک دو مندرجات کے علاوہ تمام اطلاعات مشکوک و ناقابل اعتبار ہیں۔ خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر احمد خان کی اس کتاب کا تفصیل سے تحقیقی جائزہ لیا جائے تو تقریبًا ایک چوتھائی یا اس سے بھی کچھ زائد اندراجات غلط اور نظر ثانی کے محتاج نکلیں گے، طباعت کی اغلاط اور ایک ہی مؤلف ایک ہی کتاب کا کئی کئی جگہ غلط صحیح اندراج اس پر مستزاد ہے۔

●●

جناب محمد جرجیس کریمی
ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی
پان والی کوٹھی، دودھ پور، علیگڑھ

جرنل کا مطالعہ باعثِ صد افتخار ہے۔ آپ علم کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں، اس کے لیے علمی دنیا آپ کا احسانمند ہے (اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر فی الدین سے نوازے آمین) میں جرنل کا مطالعہ پابندی کے ساتھ کرتا ہوں۔ پچھلے شمارہ ۷، ۵-۶۲ کے مطالعہ کے دوران چند، حرفی و کتابتی غلطیاں نظر آئیں جن کو میں آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ جرنل کے کسی آئندہ شمارہ میں ان کی تصحیح کردی جائے گی۔ آپ کے جرنل کو بے شک اور دوسری صفات کی طرح اس صفت سے بھی متصف ہونا چاہیے کہ اس میں اس قسم کی معمولی غلطیاں بھی نہ ہوں۔ والسلام

قابل تصحیح غلطیاں یہ ہیں:-

ص۳۴۷ سطر۱۴ سورۂ ہود صحیح سورۂ ہود، ص۳۶۸ سطر۱۱ فوذو کامیابی۔ صحیح فوزو کامیابی، ص۳۹۰ سطر۵ ہم ان کے مسنون ہیں صحیح ممنون ہیں۔ ص۴۵۸ سطر۷ بہت تھوڑا سا "فرق" ہے صحیح "فرق" ہے۔ ص۵۴۶ سطر۱۹ علمی جامو صحیح علمی جامہ۔ ص۵۵۳ سطر۳ کرنے والے لوگ بلاسبہ وہ تھے۔ صحیح بلاشبہ۔ ص۵۵۵ سطر۳ ان کے تحقیقات کے جو نتائج اس تک پایۂ ثبوت صحیح تحقیقات اور پایۂ ثبوت۔ ص۶۶۰ سطر۱۰ اسوس یہ ہے صحیح افسوس یہ ہے۔ ص۶۷۷ سطر۱۱ گوروؤں کے اعداد میں پانچویں گورو کے بعد نویں اور دسویں لکھ دیا گیا ہے حالانکہ چھٹے اور ساتویں گورو ہونا چاہیے۔

••

جناب عبدالرؤف خان
حمیدیہ لائبریری، سوائی مدھوپور، راجستھان

● شمارہ نمبر ۷۵-۶۲ جدول ص ۱۵ پر جلال الدین میران شاہ کی تاریخ ولادت کے خانہ میں ۷۶۵ھ درج ہے مگر سال جلوس کے خانہ میں ۸۰۷ھ چنانچہ اسے ۸۰۷ھ ہونا چاہیے لیکن بوقت جلوس شاہ مذکور کی عمر ۳۸ سال ۴ شہر ۲ یوم بتلائی ہے باوجودیکہ عمر تقریباً ۴۱-۴۲ سال (۸۰۷-۷۶۵=۴۲) ہوتی ہے نیز سال وفات ۸۱۰ھ تک مدت عمر ۴۱ سال ۷ شہر ۱۰ یوم بتلائی گئی ہے بالفرض محال جدول کے اس خانہ میں درج تمام سنین کو درست تسلیم کرلیا جائے تو میران شاہ کی مدت حیات تقریباً ۴۵ سال (۸۱۰-۷۶۵=۴۵) ھوتی ہے۔ اگر ہم میران شاہ کا سال ولادت ۷۶۹ تسلیم کرلیں تو پیچیدگی رفع ہوسکتی ہے۔ تادم تحریر تلاش کے باوجود مجھے میران شاہ کا سال ولادت نہ مل سکا۔

● ص ۱۶ پر شہنشاہ اکبر کی ولادت کے خانہ میں "درسہار امرکوٹ کے بجائے" درحصار امرکوٹ" نیز شاہجہاں کے کالم میں سنہ پیدائش ۱۰۰۰ھ ہونا چاہیے اور شاہ جہاں ہی کے خانہ میں تاریخ وفات ۲۶ رجب ۱۰۶۷ھ نہ ہوکر درست ۱۰۷۶ھ ہے۔

● ص ۱۷ پر بہادر شاہ اول کے خانہ میں سال ولادت ۱۰۴۳ھ کے بجائے ۱۰۵۳ھ نیز عمر بوقت جلوس ۷۵ سال کے بجائے بحساب قمری سنہ تقریباً ۶۶ سال (بحساب سنہ شمسی تقریباً ۶۳ سال) اور وفات کا سنہ ۱۱۳۴ھ کے بجائے ۱۱۲۴ھ ہونا چاہیے۔ غالباً کاتب کی سبقت قلمی کے سبب ہر ایک شوشہ زاید ھوگیا ہے۔

● فرخ سیر (ص ۱۷) کی مدت سلطنت ۳ سال ۲ شہر ۲ یوم بتلائی ہے جبکہ مصنف کے درج شدہ سنین جلوس و وفات کی رو سے ۶ سال ۲ شہر ۱۸ یوم ہوتے ھے۔

● ص ۱۰۲ سطر ۹ پر "۳ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء" ثبت ہے جبکہ مذکورہ ہجری سنہ کے معادل ۷ جولائی ۱۸۳۷ء درست ہے۔

● ص ۱۳۱ پر نواب واجد علی شاہ کی معزولی (جو جمادی الآخر ۱۲۷۲ھ / فروری ۱۸۵۶ء میں ھوئی تھی) کا مادۂ تاریخ:

"مرگ انبوہ بہ از جشن نشاطے دارد" (۱۲۷۱ھ)

بتایا گیا ہے چونکہ مادۂ ضرب المثل سے بطور فال برآمد کیا گیا ہے اس لیے ایسی صورت میں خوبصورت و حسین مادہ کی خاطر تاریخ کو معمولی فصل زمانی کو روا رکھتا ہے۔ "غم گیرندہ" سے مکمل سال (۱۲۷۲ھ) برآمد ہوتا ہے مگر اس مادہ میں وہ بات کہاں جو "مرگ انبوہ ... دارد" میں مضمر ہے۔

• قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ص ۱۲ - ۱۳ پر بہادر شاہ کی وفات کا جو قطعہ ۳۰ اشعار پر مشتمل ہے اسے نواب علی مرداں خاں رعنا نے اپنے کلیات میں بھی ۳۰ اشعار کے ساتھ شائع کرایا ہے مگر بتغیر۔ چونکہ ان کا دیوان موسوم بہ کلیات نظام مطبع نولکشور لکھنؤ ہی سے ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا ہے جبکہ تواریخ نادر العصر ۱۸۶۳ء میں شائع ہوئی تھی چنانچہ نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول کے مصداق قطعہ میں ترمیمیں بھی کی ہیں اور ترتیب میں بھی معمولی تبدیلی۔ مثلاً جرنل کے شعر ۱۵ ص ۱۳ کو بالکلیہ تبدیل کر کے دیوان میں اس قرأت سے لکھا ہے:

• چو کشت غدر شد سر سبز از جور رسید از دستِ اہلِ غدر آلام

علاوہ ازیں آٹھ مصرعے یکسر تبدیل کر دیئے ہیں اور دیگر مصرعوں میں کم از کم نو دس الفاظ میں ترمیم۔ ص ۱۴ پر دیئے گئے چھ قطعات میں سے دیوان میں صرف چار کو قدرے تبدیلیٔ الفاظ کے ساتھ شامل کیا ہے جبکہ دو کو حذف کر دیا ہے۔ جرنل اور کلیات نظام میں چار قطعات کی قرأت کا فرق اس طرح ہے:

جرنل ۵۷ - ۶۲ ص ۱۴	کلیات نظام دیوان دوم ص ۱۹۷، ۱۹۸
قطعہ ۱ مصرعہ اول ۔ شادبیکس	شہ بیکس
• " " " چہارم ۔ گفت بشاشگفتہ غزال ارم	... تاریخ او ... ص ۱۹۸
• " ۲ " ثانی ۔ کہ بروی نام شاہی گشت اتمام	کہ براو ... راست ... ص ۱۹۸
" تاریخی شعر ۔ چنیں رعنا رقم زد سال فوتش	پے فوت بہادر شاہ غازی "
بہادر شاہ غازی خلد خرام ۱۲۷۹	چنیں رعنا رقم زد خلد خرام "
• قطعہ ۵ مصرعہ رابع ۔ سال فوتش بود ...	... سال فوتِ او کہ ...

(ص ۱۴) جرنل کے قطعہ ۳ و ۶ کو شامل کلیات نہیں کیا ہے۔

••

ص ۱۳ کے شعر نمبر ۱۵ سے مگر چوں صد فرود آخر شد آخر سن ۱۸۵۷ آں روز دانستم کہ آخر نشان شاہی ھم از کمپنی نام بود در دھر خورشید لب بام کو خارج کر کے دیوان دوم ص ۱۹۷ نمبر ۱۵ پر اس شعر کو لکھا ہے۔

ڈاکٹر ضیاءالدین ڈیسائی
۱۴، خورشید پارک، سرکھیج روڈ، احمد آباد

جرنل کے تازہ دو شمارے ملے، دونوں جلدیں اپنی نوعیت کی آپ ہیں، البتہ رطب کے ساتھ کچھ یابس بھی نظر آجاتا ہے لیکن وہ بہت کم ہے۔ آپ کے اس جرنل نے بلکہ آپ نے اس جرنل کا اجرا اور ادارت کرکے اس میں جو انفرادیت پیدا کی ہے وہ قابل فراموش نہیں۔

جلد اول میں ایک چیز نظر آئی جو غلط فہمی کا باعث بن سکتی ہے۔ شبیر احمد خاں صاحب غوری کا خط آپ نے شائع کیا ہے وہ بذاتِ خود ان کی اپنی غلط فہمی پر مبنی تھا۔ آپ نے ان کے خط کی نقل مجھے ارسال کی تھی اور میں نے وہ خط ملتے ہی ان کی خدمت میں عریضہ روانہ کرکے موصوف کی توجہ ان کی ہماری تاج محل والی کتاب کی عبارت کی غلط فہمی کی طرف مبذول کی تھی اور موصوف نے جواب میں اپنی تشفی ہو جانے کا مجھے لکھا بھی تھا، غوری صاحب محترم کا خط میرے پاس محفوظ تو ہوگا لیکن تلاش دردسر ہے۔ اگر آپ اُن سے ابشرطیکہ ان کے پاس محفوظ ہو اس کی نقل یا میرا ان کے نام خط حاصل کرکے کم از کم میرا خط شائع کرسکتے ہیں تو یہ نئی غلط فہمی "ہمارے غلط" دعوے کے علاوہ مذکورہ ڈائری کے وجود میں ہونے کی غلط اطلاع قارئین جرنل میں اور جرنل کے ذریعے دیگر حلقوں میں عام ہو جائے گی۔

البتہ مجھے یہ چاہیے تھا کہ میں غوری صاحب کے استفسار کا جواب براہ راست ان کو بھیجنے کی بجائے آپ کو بھیجتا، صحیح طریقہ تو یہی تھا، لیکن یہ نہ ہو سکا۔ بہر حال یہ چند سطریں محض وضاحت کے لیے قلمبند کی ہیں۔

●●

Notes

1.a I dedicated this article to Allama Mahmud Sherani who first introduced me to this unique manuscript of the Dastan. I was his guest in Tonk. I am also grateful to Prof.Ghulam Mustafa Khan who gave me useful suggestions concerning the legend. I also remember Qazi Abdul Wadood Sahib who helped me in various ways in my researches concerning the Persian legends.

1.b For these details and other versions of the work see the British Museum Catalogue of Persian Mss., Vol.II, pp.760-76.

2. "Bahr al-Sa'adat" has been mentioned in the "Kashf al-Zunun" (Istanbul, 1941, Vol.I, pp.224-25):-

(فارسی) للشیخ تاج الدین محمد بن محمد ابن ابراہیم الکازرونی الملقب بحاجی پارس و ہو فی مجلد (۲۲۵)

مرتب علی اثنی عشر بابا فی العبادت و الاخلاق فرغ من تالیفہ فی شعبان سنۃ احدی وتسمائۃ

3. cf. سیر الاولیاء ص ۴۶ بغایت خوش شد ۔

4. For the opinions of Sharar and Bahar see the essays collected by Dr.Abid Raza Bedar, under the title "Muqaddima-e Tilsm-e Hoshruba", (Khuda Bakhsh Library, Patna) for Sharar see p.103.

It may be presumed that it is after encountering some version of the Dastan like that of the Tonk manuscript that Bahar opined that the Dastan was originally written in India (p.125). The question of Abul Ma'ali's identity still remains unsloved. In this connection I am thinking of studying Dresden Manuscripts of the "Dastan-e Amir Hamza."

The episodes in the Dastan have been greatly modified in other versions. An example of divergence from this version is in connection with the birth of Amir Hamza and the attitude of Nushirvan towards it. Learning that the kingdom has its only enemy in Amir Hamza, Nushirvan proposes his arrest. Amir and Amr Ayyar are also shown opposed to the payment of tribute to Nushirvan. In the popular Sk. Ghulam Ali & Son's, Lahore undated Urdu edition both Amir and Amr Ayyar are especially looked after by the emperor's men as the future supporters of the Kingdom. We also see Amr Ayyar stooping to petty thefts and vulgar pranks. Further it is also noticed that Shahpal of Hindustan writes to Nushirvan to deal firmly with the devilish Landhur while in Urdu, Landhur is shown as averse to paying tribute to Nushirvan and should therefore simply needs to be reprimanded. There is also difference of version about Jamasnama. This is the book belonging to Buzurchimehr's father. It is kept with his tutor. In the Urdu legend the book is shown to be in the house of Buzurchimehr. But there is a cobra guarding over it. Again at variance with the Persian Amir's opposition to Suhail Yamni is explained to be motivated by his loyalty to Nushirvan. Another striking variation is the smashing invasion by Hisham bin Alqima of Madain and Nushirvan's deliberate exit from there. There are also variations regarding Qabad-i-Hezam Furush and the marriage ceremony of Nushirvan.

The dastan-writer has employed the expression "*Kar-i- Khayr*" with the Hindustani cannotation of marriage :-

چوں حمزہ التماس کارِ خیر کند بہ جواب دہم (داستانِ شانزدہم)

The word *ummid* in Hindustani usage has developed the meaning of pregnancy. In this sentence the same sense has been brought out :-

کہ در خانہ امیدواری شدہ است۔

The Dastan refers to Lukhnavti, the old capital of Bengal in the eighteenth section

"شاہزادگانِ لکھنوتی"

The Indian usage is also evidenced in expressions like.

(الف) زباں می داد

(ب) معلق زد سر بر زمیں آورد

(ج) بر و پائے یک دیگر افتادند

(د) سرش بگشت

(ہ) بیا تا مادر عقب ایشان شدہ برویم / و عقب برادران شدہ رفتند۔

The Hindi words like– برچہ ، چوبی جوگی ، چھپر ، have been used freely in the Dastan.

It is clear from the above that this Dastan was most probably written in the fourteenth century and that too by an Indian. The importance of this manuscript lies in that it takes the Dastan from the till now accepted age of its composition sixteenth century further back to the fourteenth century that is it establishes it oldness by about two hundred years. This endorses Maulana Sharar's view that the Dastan-i-Amir Hamza was avilable in the Tughluq period. This version of the Dastan also confirms the opinion of Malikush Shu'ara Bahar that the Dastan was originally written in India.[4]

وچندیں پہلوانان سیستانی شصت گاں ہفتادگاں ہزار جیتل مواجب تعین کرد۔

[Calcutta Edition, 1862, p.30]

Besides, there are several words and phrases which are Indian in usage. For example, the 10th Dastan refers to Nushirvan's joy in these words.

نوشیرواں بغایت خوش شد (داستانِ دہم)

At another place the Dastan has :-

دبخوشی وخرمی گذرانیدند

At both places the word "*Khushi*", meaning "joy" is in accordence with the Indian usage.[3] So also is case of حرکت meaning deceitful activity and Mischief :-

گفت اے عمر دیدی بکدام حرکت شاہان را ہیجان میکنند (داستانِ ششم)

نوشیروان مرابرائے حرکت فرستادہ است (داستان شانزدہم)

From : *harkat* the author has also constructed *purharkat* :-

وگفت اے شکم بزرگ مردے پرحرکتی داستان شانزدہم)

Here I may remind the readers that Shams Siraj Afif in his History has also used this word in this very sense :-

بالما آں تلنداں حرکت کردہ لشکر مارا بہ تعبیہ از درونِ حصار بیروں آوردہ درونِ حصار بیروں آوردہ

(تاریخ فیروزشاہی ص ۱۱۵)

The writer of the Dastan has also used غصہ in the sense of خشم

وعمر از غصہ ئی جوشیدودر دل می بود کہ معلم را چہ حرکت دہد

(داستان پنجم) .

This is comparable to what the fourteenth century Historian Ziya-i Barni has said in his history.

ودراں ایام غصہ سلطان محمد برخلق بیشتر بود ۔ ص ۵۱۳

Along with 'Bahr al-Saadat', under instructions from Allama Mahmud Sherani, in the summer of 1944, I examined an old manuscript of the "Dastan-i-Amir Hamza" preserved in the State Library, Tonk. (It is merged since 1961 in the Arabic and Persian Research Institute, Tonk).

The Dastan begins thus,

بنام خدائے عز وجل کہ آدمی را بر جمیع مخلوقات شریف گردانیده بلکہ اکثر از ہوام و سوام و حوش و طیور از قدرتِ خود مطیع او گردانیده صلوات والسلام علی النبی محمد و آلہ اجمعین اعلم الکل اہل البزم ہذا المجلس این قصہ امیر المومنین حمزہ ابن عبد المطلب مشتمل بر ہفتاد و سہ داستان است۔

It is adorned with Arabic quotations like

الفرار مالا يطاق من سنن المرسلين

(قال النبی علیہ السلام) العجلة من الشيطان والتانی من الرحمٰن

يفعل الله ما يشاء ويحكم ما يريد

Here is a specimen of the simple style of this Dastan

چون روز دیگر شد شاہ خاور بر تخت زمردی فلک جلوہ نمود۔ نوشیروان بر تخت جمشید بنشست بار داد و کل اصحاب دولت حاضر آمدند و کرسیہا و محلہا خود قرار گرفتند۔ امیر بر عادتِ قدیم بیامد و در کرسی جہان پہلوان تکیہ کرد۔ گستہم فروتر از امیر بنشست۔ طعام آوردند خوردند دور شراب گردان شد۔

transcribed in the 17th century. What is more important it has linguistic pecularities which lead us to infer that it was most probably written in India in the 8th century A.H./14th century A.D.

The Dastan has *Shistan* (شستن) for *Nashistan* (نشستن). This is also found in Amir Khusru and Ziya-i-Barni. *Guzasht* and *Kaghaz* have been written with *Dal-i-Muhmala* (Dotless *'Dal'* 'د') in the sixth Dastan. This clearly suggests that this manuscript is the copy of one which was written in the pre-Mughal period. We also come across "*Jital*" in the second Dastan. We here remember that Ziya- i-Barni in his "Tarikh-i-Feroz Shahi" has also used the word "*Jital*" in connection with payment fixed for some *Pahlevans* :

Dr. S. Naimuddin
'AIMAN'
Circuit House Road,
Amravati Camp,
Amravati-444602.

An Old Copy of The "Dastan-i-Amir Hamza"

The "Dastan-i-Amir Hamza" is one of the most popular legendary histories of "Amir Hamza", b. Abdul Muttalib. Rieu mentions three important copies of this "Dastan": "Jangnama-i-Amir Hamza", "Asmar-ul Hamza" and "Kitab-i-Rumuz- i-Hamza".[1] Its authorship, as Rieu points out, has been assigned by Fleisher to Abul Ma'ali while Khalil Ali Khan Ashk, the famous Urdu translator of this Dastan, attributes the authorship of this Dastan to some Mulla Jalal Balkhi. I am here referring, for the first time, to Al-Kazaruni's "Bahr al-Sa'adat," a Persian manuscript of the 10th century A.H./ 16th Century A.D., corroborating Abul Ma'ali as the author of this Dastan.[2] Al-Kazaruni seems to have read Abul Ma'ali's version. Alluding to it, he says that in the very introductory part of the Dastan-i-Amir Hamza, Abul Ma'ali has made it clear that he invented cock and bull story about Hamza to induce an insomnic Caliph to sleep. But it proved so ill-omened that the poor fellow died. Al-Kazaruni has even audaciously mocked at the historical Hamza as testified to in this passage :-

اما باید کہ چنیں اعتقاد کنی کہ ایں قصہ حمزہ ہمہ دروغ است بغیر از نام و بس اما آنچہ در سیرت حضرت رسالت
و در کتب حدیث و تواریخ آمدہ نیکو است اما تو اول ایں بدانکہ او ہم شیر پیغمبر بود ۔ و در چہل و پنج سالگی مسلماں شد و
در جنگ غزوۂ متین با لشکر اسلام بود و بسیار صحابہ از وے دلیر تر و پہلواں تر بودند و در غزوۂ احد بدست غلامے وحشی
نام شہید شد رضی اللہ عنہ و ابو المعالی کہ ایں دروغہا بہم بستہ در اول ایں قصہ صریح آورد کہ یکے از خلفائے بغداد رنجے
داشت و شب خوابش نمی گرفت من بر بالین او می نشستم و ایں دروغہا بری بافتم باشد کہ او در خواب رود و بہ شومی
ایں ہمہ دروغ او خود دراں رنج بمرد و من خود توبہ کردم ... اگر حمزہ ایں شجاعت داشتے کہ دراں قصہ دروغ می گویند
حضرت رسالت و ہمہ یاراں ... از کہ نبایستی کشتاں گریخت از دست جمع احاد روستائی وضیع کہ نہ پادشاہ
بودند ... نہ صاحب قراں۔

English but at the same time he used the term *Darul Harb* while giving a *Fatwa* on the religious status of the country under the British.

★

Again Muhammad Hidayatullah says that "without historical evidence to present Shah Abdul Aziz as heading a "Revolutionary Committee" to launch a *Jihad* for the liberation of India is mere imagination". But I again refute this statement. Shah Abdul Aziz after the death of his father continued his father's revolutionary mission, which had been influencing the Muslims all over India. Thousands of trained young people had devoted their lives for this purpose. The influence of his teachings even reached through Hijaz to Istanbul. Then Shah Abdul Aziz in his old age was in need of a young man for launching the second phase of his revolutionary movement. This young man was Syed Ahmad. He was of strong physique combined with the military training, gained during his association with Amir Khan of Tonk. He appointed him *Amir-ul-Jihad* of his central *Jama'it*, and Abdul Hayy and Muhammad Ismail were made *Moshirs*. It had been decided that for the whole *Jama'it* the decision of these three personalities would be, considered the order of Shah Abdul Aziz. Now he was the recognised leader of revolutionary committee for launching *Jihad* in the second phase of the Shah Waliullah's movement.

●

from his *Pir* Shah Abdul Aziz to set out for a religious tour of Delhi, Saharanpur, Merrut, Muzaffar Nagar, Deoband, Gangoh, Nanota, Kandhla and Lahari along with a few of his *Murids* and disciples.

*

Shah Abdul Aziz writes to his uncle, Shah Ahlullah, in one of his letters, about the tyranny and cruelty of the distruptive forces inside the country and he says :

"The city (life) has become upset (and unsettled) at the hands of the invaders and the barbarous". "They have killed many people and they have reduced every one to misery... Every year they raid our city, and disturb (and destroy) our peaceful life... Is there any protector for those who seek protection ? And is there any God-fearing and just helper ?".

It means that in spite of the religious involvement, they were a close observer of their country's politics and they were not only purely spiritual personalities but also political reformers. Syed Ahmad as a disciple of Shah Abdul Aziz followed the path of his *Pir* and struggled against the external and internal danger to peace and paramountcy.

*

Describing the career of Syed Ahmad as a reformer, Hidayatullah says that "the difference in the political attitude of Shah Waliullah and his sons is an indication that during the former's time there was still some hope of reviving and restoring Muslim political supremacy, while during the latter's time (early nineteenth century) all such hopes were out of question. Having accepted the political suzerainty of the Company government, Shah Abdul Aziz maintained a friendly relationship with the English. He allowed the Muslims to cooperate with the English Government. Further more, he permitted his son-in-law, Maulana Abdul Hayy, to accept service under the English". Though it was a fact that Shah Abdul Aziz tried his best to maintain good relations with the

PROF. SURRAYA DAR
Assistant Professor
Department of Arabic
Islamic University
Bahawalpur.

Syed Ahmad Shaheed

Hidayatullah in his book "Syed Ahmad" categorically states that "there is no historical evidence to show that Shah Abdul Aziz and Syed Ahmad struggled against the British and Sikhs during former's life time. The relationship between these two persons were purely spiritual"[1]. This seems to be in contradiction with the events of the time and the life style of Syed Ahmad

Syed Ahmad Shaheed after the death of his father at the age of eighteen, left his home, along with his seven close friends and some relatives and set for Lucknow to find out some ways and means to earn his livelihood. But, in fact, his main purpose was to join the centre of Shah Abdul Aziz at Delhi where he studied Quran, Hadith and other Islamic Sciences. Syed Ahmad was anxious to uplift the Muslims. He became all the more agile in the company of Shah Abdul Aziz who was also deeply critical about the deteriorating condition of the Muslims. For this purpose with the permission of Shah Abdul Aziz, his spiritual guide (*Pir*), he joined the services of Nawab Amir Khan of Tonk. He remained in his service for seven years. During this period, he suggested best proposals to the Amir of Tonk and explained to him his projects of reform. But he left the services of the Amir, who was inclined to conclude the peace agreement of 1817 with the East India Company. Syed Ahmad informed Shah Abdul Aziz through a letter in which he had explained the situation and his next move, one week before he left for Delhi. Syed Ahmad's only purpose was to see that the Muslims become Muslim in the real sense of the term and to prepare them to struggle in the way of God (*Jihad-fi-Sabilillah.*) He was invited by the people of distant areas to remove the prevalent evils. He got permission

1. *Muhammad Hidayatullah*, "Syed Ahmad" 1st ed. 1970, Lahore, p.83

of the second session he withdrew entirely from political life and tried to lose himself in his profession.

At any rate, a young, able and sincere leader of the Muslim League, Liaqat Ali Khan, who, with his bride, visited London in 1933, assured him that the League-minded Muslims badly needed his guidance. In the next two years he made several trips to India and attended the meetings of the Muslim League. In October 1934, the Muslims of Bombay once more elected him, in his absence, a member of the Central Legislative Assembly, and in October 1935, he returned to India for good and took up his residence again in Bombay. The last phase of his life, during which he gradually became an advocate of separatism and put into practice the idea of Pakistan, will be dealt with in the next chapter.

(**Source:** The Destiny of Indian Muslims
by S.Abid Husain, London, 1965)

John Simon as its chairman and six other members, none of whom was an Indian. All political parties in India, including Mr. Jinnah's Muslim League, took the appointment of the commission as a national insult and decided to boycott it. At the same time the Madras session of the Indian National Congress, which had accepted the Delhi proposals, also met the challenge of the Simon Commission by resolving that a conference of the members of the central and provincial legislatures and the representatives of all political parties in the country should be called, to prepare a new constitution for the country. This conference appointed in its first session a committee under the presidentship of Pandit Motilal Nehru to submit a report about the proposed constitution. As the conference ignored the Delhi proposals and decided to consider the communal question afresh, the Muslim League protested by refusing to take part in the Nehru Committee. The solution of the Muslim problem suggested by the committee in its report published in August 1928, was substantially different from the Delhi proposals. The All-Parties Convention held in Calcutta for the final consideration of the report dealt a severe blow to the nationalist movement among the Muslims, from which it was never able to recover fully. In the course of the meeting, the biggest Congress Muslim leader, Maulana Muhammad Ali, was harassed to such an extent that he not only left the meeting but practically left the Congress. The treatment meted out to the biggest non-Congress Muslim leader, Mr. Jinnah, was even worse. Not only were the amendments proposed by him, known as 'the 14 points of Jinnah,' rejected one by one, but he was also taunted with having no right to represent the Muslims. It broke his heart and hurt his pride and he gave up all hopes of Hindu-Muslim unity which was his life's mission. A Parsee friend of his says that on this occasion he saw the proud Jinnah weeping for the first time in his life !

The breaking up of Mr. Jinnah's family life had been going on for some years and a few days earlier had reached its climax with the passing away of his wife, Ratanbai Jinnah. Now his public life also appeared to him to be dreary and desolate. Thus in June 1930, he left India and settled down in London where he attended the two sessions of the Round Table Conference in 1930 and 1931 as a delegate. After the first session he had some hope that the Conference might lead to a positive result. But after the failure

Immediately after, he resigned his membership of the Congress. He had already left the Home Rule League. He continued to be a member of the Muslim League but had lost all interest in it.

Although in the new phase of national politics that had started in 1920, Mr. Jinnah's influence over the country generally as well as over the Muslim community had become much less than before, still almost all parties had full confidence in his patriotism and political acumen. Thus in March 1927, when thirty Muslim leaders, representing different political views, met in Delhi to consider the communal problem, they made Mr. Jinnah the chairman of the meeting, and the resolutions passed by it were on the whole in accordance with his point of view; that is, they proposed joint electorates with a number of safeguards for the Muslims.

The Indian National Congress accepted these proposals in its Madras session held in December 1927, and the resolution which was passed to this effect also guaranteed that every community would be given full freedom of religious faith and practice and no bill or proposal affecting the interests of a particular community could be introduced in any legislature until three-fourths of the elected members of that community agreed to its introduction.

It looked as if the communal question had once more been solved by mutual agreement between the Congress and the Muslims. But it was a mere illusion. The Delhi proposals of 1927 had the unanimous support of the Muslims but were bitterly opposed by a considerable section of the Hindus, especially in the Punjab and Bengal where most of them supported not the Congress but the Hindu Mahasabha and other communal organizations. As it happened, however, matters had taken an extraordinary turn, which forced the Congress to seek the cooperation of all sections of the people in drafting a new constitution for the country; and in its attempt to get the maximum agreement for the proposed constitution it had to modify the Delhi proposals.

A little earlier, the Central Assembly in Delhi had passed a resolution that a Round Table Conference should be convened in which representatives of the British Government and the Indian people should meet and consider the constitutional question of India. The British Government completely ignored this resolution and, on its own initiative, announced in November 1927, the appointment of a commission to look into the Indian question with Sir

Indians with the administration of the country and finally to give it autonomy within the British empire. Next year came the announcement of the Montague-Chelmsford reforms, proposing to increase the number of elected members in the councils and to enhance their powers. The moderate sections in the Congress and the League welcomed these proposals, but the extremist majority rejected them and insisted on their demand for responsible government.

So far Mr. Jinnah was guiding the Muslim League along the path of constitutional politics which it pursued in cooperation with the Congress. In 1919, however, there were new developments which swept the Congress into a storm of popular agitation that burst with great violence. It changed from a constitutional to a revolutionary body, and to some extent dragged the League with it. Mr. Jinnah, who had so assimilated the liberalism of Lord Morley and the constitutional ways of the British that they had become 'a part of his life,' found it difficult to get along with this stormy phase of politics.

Mr. Jinnah himself bitterly resented the repressive policy of the British Government. He was utterly dissatisfied with the Reforms Act of 1919 and had protested against the Rowlatt Acts by resigning from the Imperial Legislative Council as soon as they were passed. He had also expressed his distress and resentment against 'the spoliation of the *Khilafat*' and the atrocities in the Punjab.

Up to this point he was with the Congress and the semi-religious and semi-political Muslim organizations. But the 'desperate' course of non-cooperation was entirely against his cautious and temperate nature, and he utterly disliked it. He had sensed that, even in his Muslim League, many members had been affected by the prevailing climate in the country, and he was prudent enough not to force his views on his colleagues but to advise them to decide for themselves after full deliberation. In December 1920, when the Congress had formally accepted the policy of non-cooperation at its Nagpur session, Mr. Jinnah was the only person to oppose it.

achieving anything. Shortly afterwards the first World War started in Europe.

Mr. Jinnah had joined the Muslim League in order to bring it closer to the Congress. In December 1915 he took the initiative in holding the annual session of the Muslim League in Bombay simultaneously with that of the Congress. A little earlier the British parliament had passed the Reforms Bill, to which we have referred above, under the name of the Government of India Act, 1915, but it was rejected both by the Congress and the League. A joint committee of the two organizations was considering the demands to be made on behalf of the Indian nation and the special concessions to be given to the Muslim community. The recommendation of the committee which was endorsed both by the Congress and the League in their Lucknow session, was that India should be given the status of an autonomous dominion within the British empire and some specified safeguards should be provided for the Muslims. According to the recommendations of the committee, the proportion of seats for Muslims in the legislatures of the Punjab and Bengal where they were in majority, was to be a little less and in other provinces a little more than their proportion in the population. Another important provision was that if a non-official proposal came before the central or a provincial council and the Hindu or Muslim members of the council concerned thought that it affected the interests of their community and three-fourths of them were opposed to it, then it should be dropped.

The special importance of the Lucknow Pact in history of the national movement was that for the first time the National Congress formally recognized communal politics and came to an understanding with the League. Its importance in the life of Mr. Jinnah was still greater. He had succeeded in uniting the educated, middle class Hindus and Muslims and was acknowledged by both to be their respected and trusted leader.

While the moderate Congress and League were making their demand for national autonomy in a constitutional manner, the extremist Home Rule League was carrying on a public agitation and some secret societies were resorting to terrorism, to achieve their respective purposes. Under the pressure of all these developments, the Secretary of State for India, Mr. Montague, declared in 1917 that the British Government wanted to gradually associate

Dr. Abid Hussain

Jinnah Saheb

Muhammad Ali Jinnah (1876-1948) entered the field of Indian politics in 1906, the year in which Badruddin Tyabji died. He was, like Tyabji, a successful lawyer and had like him won the respect and confidence of all the residents of Bombay, irrespective of class or community at the early age of 30 years. He joined the Indian National Congress under the guidance of Dadabhai Naoroji. In 1910 he was elected a member of Viceroy's Legislative Council as a representative of the Muslims of Bombay, where, along with Gokhale, he supported the Congress point of view in all legislative matters. In 1913 he had for the first and last time in his life established close relations with a fellow human being to which the term of friendship could be applied. The man was Gopal Krishna Gokhale whose charming personality cast its spell over him. In April 1913 he accompanied Gokhale on a voyage to England for rest and change and returned after spending the spring and summer months in that country. There he met Maulana Muhammad Ali and Syed Wazir Hasan and was persuaded by them to join the Muslim League in order to "bring the policy of the League into line with the progressive and national aims of the Congress."

This was the beginning of a new phase of his life. He was now a trusted leader of both the Congress and the League. In 1914 he was sent to England as an ambassador of the Indian nation to represent its views about the bill which was under consideration for introducing political reforms in India. In those days, however, the atmosphere was not favourable for political reform on account of the unrest in Ireland and the tension in Europe. Therefore, the bill was postponed and Mr. Jinnah had to come back without

Muslim majority areas were in Pakistan. That automatically meant a partition of the great provinces of the Punjab and Bengal". This is the first time that the inner history of the partition of India had been revealed by the highest authority. It had not yet seen the light in India; and I am glad to be able to print the authorised text.

Lord Mountbatten continued: "When I told Mr. Jinnah that I had their provisional agreement to partition, he was over-joyed. When I said that it logically followed that this would involve partition of the Punjab and Bengal he was horrified. He produced the strongest arguments why these provinces should not be partitioned. He said that they had national characteristics and that their partition would be disastrous. I agreed, but I said how much more must I now feel that the same considerations applied to the partitioning of the whole of India. He did not like that, and started explaining why India had to be partitioned, and so we went round and round the mulberry bush until finally he realised that either he could have United India with an unpartitioned Punjab and Bengal or a Pakistan, and he finally accepted the latter solution. Well, it was the same old tale - better to rule in hell all by oneself than serve in heaven and share the glory with others. That was just like Jinnah that he was, and lived his life.

Of Jinnah the communalist - as of Jinnah the nationalist- I could write "much and long". But I hope I have said enough on both these aspects of his life, to indicate my points of view, which, I submit, are correct and well-founded. Jinnah, a Khoja - that is a descendant of Gujarati Hindu converted to Islam - with all his talents, intellectual gifts, high position at the Bar and in the public life of the country, needed a wholly different treatment from what was meted out to him at the Nagpur session of the Congress, in 1920, and at later stages of the controversy. As Mahatmaji wrote in one of his articles in Harijan:- "Have inquired as to why the Muslim community in India, as a whole, is so keenly interested in the affairs of Muslim countries abroad, and no appreciable proportion of it takes any active interest in the internal political life and advancement of the country. The Musalmans take less interest because they do not yet regard India as their home, of which they must feel proud. Many regard themselves, quite wrongly, as belonging to a race of conquerors. We Hindus are in a measure to blame for this aloofness on the part of the Musalmans. We have not come to regard them as an integral part of the nation. We have not set out to win their hearts.

(Source: The Hindustan Review, Jan. 1948, Jan. 1949)

That was Jinnah all over. And all his life he was a man intensely conscious of his high attainments, a man who never allowed himself to be sat upon, by any one in any sphere of activity - be it law, politics, or social life.

Jinnah could never bring himself to play the second fiddle to another; he must be at the helm or nowhere. Better to rule in hell than serve in common with others in Heaven was evidently his ideal; better to be the first Governor-General of a moth-eaten, divided-apart, truncated state of Pakistan than a Governor of the largest state in the Federation of Union of India or even its Governor-General. The astonishing feature of Jinnah's success was that he had been, during the last twelve years of his life, the acknowledged leader of Islam in India, for the fascination of a "homeland for Muslims" was too strong for them to resist when inflamed by Jinnah with religious zeal or fanatical frenzy. And so Jinnah, driven by the logic of events into a tight corner, accepted a State not only parcelled out into two parts with more than a thousand miles apart from each other, but with the provinces of Bengal and the Punjab cruelly bifurcated much against his wishes. The main cause of Jinnah's success was: one Man, one Voice, one Theory, and one Objective—Pakistan-against the wobbling of the Congress party which with its declaration of the acceptance of the principal of self-determination, could not help conceding it to those provinces or parts of provinces, which having a clear Muslim majority were entitled to secede from the Indian Union, on that principle...

❊

Fresh light is thrown on the subject in the course of an address delivered by Lord Mountbatten at the Royal Empire Society (London), in October, 1948, in the course of which the last British Viceroy had thus lifted the veil: Mr. Jinnah made it abundantly clear from the first moment that, so long as he lived, he would never accept a United India. He demanded partition, he insisted on Pakistan. On the other hand, Congress being violently opposed to any form of partition, had stood for keeping a United India and up to the time I went out it had never been indicated that they might consider anything else. But when I saw Pandit Nehru and Mahatma Gandhi and others, they agreed that if it was not possible to keep a United India without a civil war-and I was convinced that the Muslim League would have fought for Mr. Jinnah had made that very clear - they would accept partition. But they did insist that partition must also ensure that no non-

provided its programme and policy correspond to our own. We are willing to work as equal parties for the welfare of India". Yes as an equal party but not as one toeing the line of the Congress party. Here was a clear and specific challenge; but so impervious the Congress was then to anything not in entire accord with, or rather in absolute submission to its own views, that Jinnah's statement, and the underlying propositions it conveyed, were totally ignored, and treated as beneath notice. Tact (as had fortunately reasserted itself in the formation of the Central Government at Delhi by the inclusion of non-Congressmen) had at that time become conspicuous by its absence in Congress leadership in its dealings and relations with Jinnah...

That Jinnah's having been kept out of the sole leadership of the Congress was the real and the only cause of his disappointment, frustration, and unpatriotic demand for the partition of India can admit of no doubt. He could easily persuade himself to be accommodating to Indian clothes, Indian language, and Indian style of sitting - all which he did, later, as the life President and perpetual leader of the Muslim League. Men who came in contact with him, some of whom I shall quote in the concluding part, understood the position clearly. The Congress leaders saw him only from a distance until September, 1944, when Gandhiji approached him personally with the Rajagopalachari formula for Pakistan, by which time matters had gone far, and it was too late. And even Mahatmaji kept on reminding Jinnah of (what he disliked being reminded) his Hindu ancestry, for did not Jinnah frequently indulge in the boast that he and his Indian co-religionists had learnt democratic principles thirteen centuries back, as if they had all come to India from the deserts of Arabia. The Mahatma's nineteen visits to Jinnah's house, in 1944, failed in their object, as on almost each occasion Jinnah was reminded of what he was, very sore about his Hindu descent...

The problem of Jinnah's conversion from nationalism to communalism is a study in Pathology of the Super-Ego which is regarded by psychiatrists as an incurable disease. It had apparently appeared in him early enough, but it went from bad to worse as years passed. From the time of his early career at the Bar, it was discernible; for when a Judge of the Bombay High Court said to him: "Remember, Mr. Jinnah, you are not explaining points to a third class magistrate", in a flash came the reply: "My Lord, allow me to tell you that you are not addressing a third class pleader". No, there was nothing third, or even second class about Jinnah, in any shape or form. His was a vaulting ambition to be everywhere the first and foremost or nothing.

than the Congress, as worth notice; for he declared that "the parties that mattered in India were the Congress and the British, and others should line up with the Congress, if they intended to survive", which proved, in the long run, a wholly wrong estimate of, at any rate, Jinnah's Muslim League. The Congress had also declared, later, that it had accepted office (as Ministers in the Provincial Governments) not to work the Reform Act of 1935, but to wreck the new constitution established, by working it from within, which estimate also proved as wrong as that of the Muslim League being beneath notice. These, and similar other acts and declarations, had helped Jinnah materially, who scored a signal and substantial triumph over the Congress party in the Central Legislature, in forcing them to reject unwisely the Federal part of the Constitution embodied in that Act, and to declare about the Macdonald Communal Award that the Congress neither rejected, nor accepted it, whatever that might mean.

All this sitting on the fence, and much more similar to these assertions and actions, had emanated from the leaders of the Congress party at that time, by reason of the undiscerned but stubborn fact that they had persistently refused to associate themselves with the administrative or legislative work of the then Government, either by taking office in the Executives, or by getting themselves elected to the Legislatures. There only British rule in all spheres of life. The Congress party had forgotten - or rather failed to learn - that the essence of political and parliamentary democracy is a strong and well-organised opposition which must, and is bound to count and receive its due weight from the party in power in the consideration of every momentous issue, and every serious problem, whether the powers that be (as then) were the alien British, or (as nor) the nationalist Indians.

In dealing with all such matters Jinnah had a great advantage over the Congress party. He had been an active member of the Central Legislature since 1910 - not continuously but for the greater part of that time - and had thus come to gather considerable knowledge and experience of the working of parliamentary institutions, though he too suffered from the limitation that not having taken office in the Executive he was not fully conversant with the details of administrative system and methods. Accordingly Jinnah's answer to Pandit Jawahar Lal Nehru's challenge was to the following effect: "There is a third party, namely, the Musalmans. We are not going to be dictated to by anybody. We are willing to co-operate with any group of a progressive and independent character,

a leader like the new one, who was a conglomeration of asceticism, mysticism, pacifism, vegetarianism, teetotalism, non-co-operation, non-violence, charkha spinning, renunciation of the world, coupled with the intensely patriotic demand for the independence of India. Jinnah at once realised that in the struggle for absolute supremacy over the Congress with that sloppy vegetarian and confirmed teetotaler, the anglicised rival would soon go to the wall, and so the game was not worth pursuing. Jinnah then became co grievously disappointed, with his public activities in the country, that he settled down in London to practise before the Privy Council. But there is no doubt that he was merely biding his time and watching his chance to return to India at the earliest opportunity, as soon as a suitable occasion presented itself. Jinnah played the same part at that time as had been done by Baber's son. Humayun, when driven out of India by Sher Shah; and just as Humayun returned and won the kingdom he had lost, so did Jinnah return and succeed in carving out a good, bad, or indifferent Dominion for himself to rule over for his life.

The split in the then affairs of the Muslim League gave Jinnah the chance of his life to assume control over the advanced branch of that body, and then absorb its weaker section, which was at that time under the influence of His Highness the Agha Khan, and over which the latter had presided at its session held in Calcutta. This is quite clear from a study of the record of public affairs in the newspapers of the period, after the sulking Jinnah's return to India, and the solidarity of the Muslim League under him, and its growing strength and power, from day to day. The trouble was that Jinnah's growing popularity amongst Muslim masses, based as it was on absolute communal fanaticism, was over reckoned with seriously or given due weight, by the leaders of the Congress party. There were long series of correspondence between Jinnah and Dr. Rajendra Prasad, on the one hand, and Jinnah and Pandit Jawaharlal Nehru, on the other. But unlike the British ruling class in India who brought themselves to recognise the importance of Jinnah, and his party, with an obvious motive as a counterpoise to the Congress, the Congress leaders failed to take Jinnah and his League at its proper worth.

❁

Inexperienced at that time in the work of administration - for want of opportunities, as he was till then a more outside critic of it - Pandit Nehru refused to recognise any party in the country other

and circumstances known to me, which will, I hope, be taken by the reader to have been established in the course of this article.

My view of the matter is that Pandit Jawaharlal Nehru had misread the whole of Jinnah's character, as his own is, in almost every respect; just the reverse of it. From the very beginning of his career (which I surveyed in my last article on "Jinnah the Nationalist") I pointed out that the greatest craving of Jinnah's heart was to be the first and foremost in every walk and sphere of life, a case of Eclipse, first and the rest nowhere. So long as Congressmen gave him that chance, he was with them; but on the appearance, in 1920, of the new Congress leader, Mahatma Gandhi, Jinnah - as one of the shrewdest of men - at once discovered that, for more reasons than one, it would be absolutely impossible for him to retain that supremacy over the Congress which he had already obtained to a great extent, and which he fervently aspired to establish ever so much more, in fulness of time. The first indication of this spirit in Jinnah found expression in the proceedings of the annual session of the Congress itself, held at Nagpur in December, 1920; that is, after the holding of the special session in Calcutta in previous September, at which the non-co-operation resolution was declared to have been carried by a large majority. By that time Gandhiji had already acquired such mastery over the imagination of the vast majority of Congressmen that they had come to call him "Mahatma".

When, therefore, Jinnah referred to Gandhiji, in the course of his speech (opposing the non-co-operation resolution) as "Mr. Gandhi", there was a tremendous uproar, and the audience shouted at Jinnah to call Gandhiji "Mahatma Gandhi". This contretemps became quite a serious affair, as Jinnah would not submit to the dictates of the audience, or to its hectoring attitude; and the President, the venerable but aged and infirm Shri Vijayaraghavachariar, could not control the very tense situation - either the excited audience or the obdurate and recalcitrant Jinnah, who insisted on his parliamentary right to call Gandhiji "Mr. Gandhi". The incident is referred to, at some length, in the book called "Meet Mr. Jinnah" by Mr. A.A.Ravoof, and is recorded in detail in the Congress Report. That episode, rightly understood and discerningly appreciated, was the beginning of trouble, which led ultimately to the partition of India, and the creation of Pakistan.

Jinnah grasped it immediately that the predominance of Gandhiji over the Congress was to be wholly exclusive, and no one (not certainly the anglicised Jinnah) could successfully compete with

Jinnah's career had been a study in contrasts. When the Muslim League was formed, in 1906, he flatly refused to go to Dacca to join it. Instead, he preferred to attend the Congress session in Calcutta, where Dadabhai Nauroji, from the presidential chair, defined the national goal to be Swaraj. Jinnah did not actually join the Muslim League till 1913, when it had changed its original creed. His work in the Home Rule League, established by Mrs. Annie Besant, his share in promoting the Lucknow pact between the Congress and the League, in 1916, his courageous stand against Lord Willingdon's re-actionary regime in Bombay, made his name a household word in India. H.E. Mrs. Sarojini Naidu - now the Governess of the United Provinces - hailed him at that time as the "Ambassador of Hindu-Muslim Unity". But since 1940 - if not even sometime earlier - Jinnah talked of the "Muslim nation" and the "Hindu nation", and not only demanded division of the country into Pakistan and Hindustan, but lived to achieve it. History has seldom recorded a more unfortunate change, or a more untransformation, in the sphere of politics.

❁

The subject of Jinnah's defection from the Congress, and his slowly turning from an advanced nationalist to a rank communalist, has been discussed by various responsible persons during the last few years. It would be sufficient to quote here the views of the present Prime Minister of India in his well-known book (called "The Discovery of India") published in December, 1947, that is, while Jinnah was alive. He wrote at page 302 of his book: "Jinnah left the Congress, not because of any difference of opinion on the Hindu-Moslem question, but because he could not adapt himself to the new and a more advanced ideology, and even more so because he disliked the crowds of ill-dressed people talking in Hindustani who filled the Congress. His idea of politics was of a superior variety, more suited to the legislative chamber or to a committee room. For some years he fell completely out of the picture, and even decided to leave India for good. He settled down in England and spent several years there". Now, this passage is reprinted without any alteration in the book published in January, 1949, called "Nehru on Gandhi", from which it may be reasonably inferred that what is embodied above represents the settled conviction of Pandit Nehru, even after the establishment of Pakistan, and Jinnah's death. I wish I could bring myself to share that view as correct. But I fear I cannot do so, in the light of facts

Jinnah was so meticulous in dressing - no one ever saw a crease either on his coat sleeve or his trousers - that he would not place orders for them with any firms outside Saville Row; no, not even with a firm in Bond Street, while the suggestion of his going to a tailor in Regent, or Oxford Street, would have given him a big shock. It must be added that western clothes suited remarkably well Jinnah's slim and well-knit figure, far better than eastern, to which he betook himself deliberately as a Muslim Governor General of Pakistan, in August, 1947, though they did become him half so well as the western.

Latterly, since he became the acknowledge leader of the Muslim League, Jinnah betook himself on the League platform to the so-called Jinnah cap (an adaptation of the Iranian cap), an ill-cut sherwani and loose pyjamas, which hung loose and limp on him, and in which he did not look half so graceful or impressive as he did in the foreign style clothes, he had affected almost all his life. But though he changed his style of clothes as Governor-General he did not change his style of living in food and drink. When I met him at Delhi, in 1946, I found him free and easy at table, and as heterodox as ever. He continued in these respects a rationalist to the last, whatever the change in his political faith. In Mr. George Catlin's book (entitled In the Path of Mahatma Gandhi), published in 1948, we read as follows at page 271: "The dinner in the long room of Viceroy's House was a brilliant affair, with a formal and modest selection of wines from which Mr. Jinnah did not abstain" The dinner referred to was held in April 1947, when Lord Mountbatten was the Viceroy. Jinnah was never a teetotaller, nor protagonist of prohibition, as he was much too sensible not to enjoy, as well as he could, all the gifts showered by God on Mankind. For the rest, and even in his later years - apart from his politics - Jinnah was charmingly genial, full of urbanity and cheerful spirits, and his bon-mots, repartees, and anecdotes, kept the company in good humour. Outwardly he was, however, reserved, and even stern when dealing with public affairs.

Of Jinnah, his genuine patriotism as a nationalist till 1920, of his successful activities in various spheres of politics, I could write much and long, as I have barely touched the fringe of the subject. Some day I may unfold my own reading of what led to the severance of Jinnah's connection with the Congress, and to the creation, in the long run, of Pakistan, with all the attendant and inevitable evils which had followed in its train in both the new States. Viewed in this light,

old bachelor friends as the husband of one of the handsomest, most talented and most accomplished women in India. She presented Jinnah with a daughter, who was married some years back to the son of Sir Ness Wadia (Parsee-Christian millionaire) of Bombay. Jinnah objected, it was reported in the press, to his daughter's conversion to Christianity, but she preferred to follow her own good sense as she thought right and proper, in a matter of this kind, rather than the directive of her father. It is popularly believed that Ratan brought with her a large fortune, and that a great part of bequest of four millions left by Jinnah, to various institutions in India and Pakistan, consisted of his wife's dowry. These popular but unfounded impressions were mentioned, some years back, as facts in the earlier edition of a sketch of Jinnah's career, written by an admirer of his. But in the second revised edition, issued some months before Jinnah' death, in September last, they were omitted, and it was stated that Jinnah desired their omission as they were unauthorised. Any way, Jinnah's marriage with a Parsee millionairs's converted daughter who was perhaps an even more advanced nationalist than her husband-was a striking episode in his brilliant career as a nationalist leader.

❋

In my very large circle of friends, from all the Provinces, Jinnah was out-and-out the best dressed man in western style, ever since I met him in London, in 1892, and until the partition of India in August 1947, when he forsook his foreign dress for eastern, on all public occasions. But he paid, for more than five decades, particular attention to his wardrobe, which was extensive, and was supplied by the best and most expensive tailors, hosiers, hatters, and shoemakers of London. For his clothes he was most fastidious, and had long since limited himself to obtaining them from one of the smallest streets in London, called Saville Row, famous throughout the world for its half a dozen tailoring firms renowned for their accomplishment in sartorial art. One of these is Poole's - the Royal tailor - who would not take any order from any one unless he was introduced by some old customer. In the summer of 1914 - when Jinnah, I, and some others, were members of a Congress deputation in connection with the India Council Bill before the House of Lords, I dropped into Poole's to order "dress clothes", not knowing their practice about the introduction of new customers. When my measurements were taken and the order booked, I was asked very politely to give the name of my introducer. I was rather upset, but just then Jinnah walked in, and stood sponsor for me forthwith.

unity and independence of India, was as follows:- "The people should discard religious considerations and work for the greatness of united India". Thus observed the Wafdist leaders of Egypt. That also was evidently Jinnah's view, in 1936, as expressed in the extract quoted above from his Lahore address. But all things change in this world - even from Dr. Jekyll to Mr. Hyde. And so did Jinnah. But what he said, or did, afterwards should not blind fair-minded critics of his career to ignore his splendid work as a nationalist, until he plunged himself into communalism.

❊

Till he was nearly forty, Jinnah was heart-whole and fancy-free. But the year 1915 was memorable for romance in Jinnah's life. We were all at Darjeeling for a summer holiday. The Petits were there and so was Jinnah, also some other friends of his. Sir Dinshaw Petit was the second Baronet of that name, and his daughter Ratan Priya (whose pet name was Rutty) was with him. Soon after our arrival it began to be talked about that love was floating unseen in the exhilerating air of Darjeeling and its atmosphere was surcharged with the romance of a confirmed bachelor of forty, and an ever so much younger girl of sixteen. They had agreed to marry without obtaining even the formal permission of the parents of the bride, for love is like measles - all the worse when it comes late in life. Sir Dinshaw and Jinnah were great friends, but Cupid's dart had pierced the heart of Jinnah, and he had, with his usual tenacity of purpose, resolved to marry Ratan, come what may. Jinnah was at that time as much absorbed in his desire to marry Ratan, as he was (a quarter of century later) in his determination to found Pakistan. As good luck would have it, he succeeded in achieving both. Few people in this world were luckier than Jinnah. But neither the first, nor the second achievement was for Jinnah an easy task and an unmixed blessing.

The parents of Ratan, with a view to prevent Jinnah's marriage obtained an injunction from the Bombay High Court restraining the confirmed bachelor bridegroom from marrying his fiance, till she had attained majority. So the marriage had to be postponed for about a couple of years, but the course of true love did run smooth and, (in spite of the declaration of the inexperienced poet) the marriage was solemnized in due course, the bride having been converted to Islam—religion often being a cloak for a marriage of convenience, in high circles. Thereafter, for the few years left to her of her short span of life, Mrs. Jinnah was a great centre of attraction in social circles in Bombay, Delhi, and Simla; and Jinnah continued to be the envy of his

R. (looking triumphant at Jinnah): Look, Look, Maharaja Bahadur (turning Burdwan) at your Muslim colleague from Bombay, and see what he says and does. He knows no Arabic, Persian, or even Urdu. He never prays, and pays no regard to the rules of Shariat in the matter of Haram and Halal in food and drink. And you will kindly note Mr. Sinha (turning towards me)...."

I do not know what "Moulvi" Rafiuddin - a he called himself at that time—was going to ask me to note, for just then almost all the hon'ble members, who were discussing in the lobbies either politics, or other things than Jinnah, trooped into the Council Chamber, and the aid-de-camp to the Viceroy shouted at the pitch of his stentorian voice: "His Excellency". Rafiuddin disappeared at once; and we all took our seats. But the conversation between Rafiuddin and Jinnah had impressed me so much in favour of the latter's broad-midedness and strength of character that, on my return from the Legislative Council, I recorded it faithfully. It was, therefore, that in reply to Rafiuddin's letter (of 1st September. 1941) I wrote to him as follows:- "I remember the incident you have mentioned, and I fully recall the questions you put to Mr. Jinnah, and the answers, he gave you. Those questions and answers, if now published, will form most interesting reading" - a fact which will be borne out by the reader, now that I am issuing the text of them verbatim.

Similarly in the matter of religion, until he became a pronounced Muslim Leaguer, and a staunch communalist, I and other friends of Jinnah, lived under the impression that if not an agnostic, he was a deist, theist, or rationalist. That opinion was confirmed even so late as 1936, when addressing the members of the Dayal Singh College Union at Lahore, as their chief guest, Jinnah was reported to have said; "I feel myself among kindred spirit. This College does not believe in any creed. I too feel that the salvation of India lies in this non-sectarian feeling. It is this creed that I had in the past, which I have at present, and which I will have in future, the dearest in my heart". Could such noble sentiments be expressed more nobly, and with such emphasis and promise? When later at a press interview, in 1947, Jinnah gave expression to what he called his "surprised disgust" at the congratulatory messages received by Pandit Nehru from China, on the occasion of his assumption of office at New Delhi in 1946, the League-leader, evidently in a temper, advised Chinese leaders to mind their own business, and not to meddle in Indian affairs. But the message then sent by Egyptian leaders (like Nahas Pasha and Sidky Pasha) to Pandit Nehru who, according to them was working for the

replied to Sir Rafiuddin that I fully remembered the occasion and the incident mentioned by them. As regards the talk referred to by him, I should explain that ex-Minister Rafiuddin was the defeated rival of Jinnah's and had undertaken the long journey from Poona to Calcutta evidently with a view to establish that Jinnah (though elected through a "fluke") was unworthy of the position he had come to occupy as the sole representative of the Muslims of the Presidency of Bombay (than including Sindh) in the Imperial Legislative Council. The conversation between Rafiuddin and Jinnah was as I transcribe below from my dairy:

R. Mr. Jinnah, you claim to represent the Musalmans of the Bombay Presidency?

J. Who doubts it? Do you?

R. I regret that they should be represented by you, who know nothing of Islam, or the Prophet (on whom be peace), nor observe any Islamic injunctions.

J. What makes you say so? I know jolly well far more than you do.

R. You say you do; well, tell me whether you have any pretensions to know Arabic, or even Persian?

J. Why should I know either Arabic or Persian? I am neither an Arab, nor a Persian, but an Indian, and have thus no need to know the language of Arabia or Persia?

R. But do you know even Urdu?

J. Yes well enough to talk to my boy Chhokras, and Hammals. I haven't got to address courts or jurors in Urdu, and I don't see why I should know more tongue, Gujerati, fairly well.

R. But if you don't know Arabic, how can you offer your prayers?

J. Pray in Arabic? Why should I? I am not an impenitent sinner that I should be praying constantly to ask forgiveness for my sins? And that apart, surely God will understand me in whichever language I pray to Him.

R. And what about your dress, food and drink? Are in accordance with the rules of Shariat?

J. What has Shariat got to do with dress? Surely, the various peoples of different Muslim countries all dress differently. Even in India all the Muslims don't dress alike. As for food and drink, it is more a matter of personal taste, appetite, and digestion than of religious convention.

ask me to do so. I readily agreed, as I thought that Jinnah was right, and the privy Council Judges wrong in the view expressed by them on the subject. Accordingly, I followed Jinnah with a fairly long speech discussing the purely legal aspects of the Bill. My support was appreciated by all our colleagues, but particularly so by Jinnah. It is printed in the collection of my writings and speeches. This one incident will show how far we have retrogressed in co-operation since that time—due, unfortunately, to Jinnah's own lapse from nationalism.

The Allahabad session of the Congress was held in the Christmas week of 1910; and by that time Jinnah, I, and some other members of the Imperial Legislative Council, had worked for nearly one year, not as followers of any party, but under general guidance of the greatest political leader of that period, Gopal Krishna Gokhale, whose personality then towered head and shoulders above that of everyone else in the country. Gokhale who died in February, 1915, had long since been completely forgotten by his very grateful countrymen, who had installed other idols in his place. Mahatma Gandhi, in all his talks with me, always referred to Gokhale as his Guru; but Mahatmaji's Guru need not necessarily be our Guru: and so Gokhale is not, and has not been, since his death. Jinnah was fortunately cast in a different mould, which distinguished him from his average fellow-countrymen, and he always cherished the highest respect, regard and love for Gokhale, and after his death, for his memory. At a dinner given by me in honour of Sir William Wedderburn, the Congress President, at which almost all the great political leaders were present, Jinnah shone bright and resplendent, and we all felt that but a few years later he would be presiding over a session of the National Congress. But Fate had willed otherwise!

❋

At that time Jinnah was a staunch rationalist just as Gokhale was reputed to be a confirmed agnostic. In the course of a letter, dated 1st September, 1941, (from 2, Ganeshkhind Road, Poona) Sir Rafiuddin Ahmad, Ex-Minister, Bombay Government, who is fortunately still amongst us, wrote to me as follows:- "Will you let me know if you remember our meeting in Calcutta, in one of the rooms of the Imperial Legislative Council, during its first session in 1910, and whether you can still recall my questions to Mr. Jinnah about his religion on that occasion. I think the late Maharaja of Burdwan was also present in the room. The last time we met in Bombay, you had then reminded me of the incident, and had a hearty laugh over it". I

I was frequent visitor to Bombay at that time, Jinnah and I met often, and cemented further the bonds of our friendship

In December, 1906, a session of the Indian National Congress was held in Calcutta under the presidentship of Dadabhai Naoroji, who came all the way from London to take the chair, so as to be able to unite the conflicting views between what were then called the Moderates and the Extremists. During his stay in Calcutta, Dadabhai was the guest of the late Maharaja Bahadur of Darbhanga, and occupied the smaller of the two houses in the Middleton Street area. Jinnah, as Dadabhai's Private Secretary, was staying in the guest house. He was then just thirty. Tall, well-built, handsome, debonair, meticulously dressed in foreign style then so fashionable, enjoying the reputation of being one of the rising leaders at the Bar, he naturally attracted considerable attention in social and political circles in Calcutta, and enjoyed popularity amongst politically-minded people by reason of his advanced nationalism. He and I met in Calcutta as old friends, both in and outside the congress. Thereafter our friendly relations improved still further.

❈

Early in 1910 both Jinnah and I were elected, on the introduction of the Morley-Minto Reforms, to the Imperial Legislative Council—he from a constituency of only four voters (all members of the Bombay Legislative Council) and I, with the late Mr. Bhupendra Nath Basu (President of the Congress session, held at Madras, in 1914), as the representatives of what was then called the Bengal legislative Council—that is of the Legislature of West Bengal, Bihar and Orissa, after the Curzonian partition of Bengal, in 1905. The 1910 session of the Congress was held at Allahabad, and Sir William Wedderburn had come out to preside over it. I was still practicing in the High Court of Allahabad, and amongst the guests who stayed with me were Sir Ali Imam (the then Law Member), Mr. S.P. (afterwards Lord) Sinha, his predecessor, Jinnah moved at the plenary session of the Congress, in a forceful speech, a resolution condemning the introduction of separate electorates for Muslims in the Morley-Minto Reforms. And from that, in 1910, he retrogressed until he found his feet in the resolution on Pakistan, in 1940, and himself as its Governor General in 1947. But of that later.

Jinnah had introduced into the Legislature, at that time, his famous Wakf Bill, and was anxious to get the support of some non-Muslim colleague of his. He consulted Gokhale, who advised him to

two surveys, taken together, may present a faithful picture of Mr. Jinnah's whole career.

❋

The furture Quaed-e-Azam arrived in London, in 1892, aged sixteen, at a time when the Indians there were absorbed in canvassing for the election of Dadabhai Nauroji, to the House of Commons. The Marquess of Salisbury had, some time before, insulted India and the Indians by calling Dadabhai a "black man". Our indignation at this studied insult was then at the highest pitch, and we were, therefore, completely swept off our feet, if not mind, as coanvassers for Dadabhai. Jinnah, who was full of energy then, as till the end of his life, threw himself into the struggle with that zeal and enthusiasm which we had learnt to associate with his name for any cause which he took up. A particular area of the Central Finsbury constituency, which Dabadhai was contesting, was assigned to Jinnah, and the results that he achieved in it were astoundingly satisfactory, and justly redound to his credit. The rest of us did what we could. Our enthusiasm had run wild, and we ourselves ran a mock, when it was announced that Dadabhai had been elected. The banquet that was held in his honour in the gilded hall of the famous Holborn Restaurant, at which more than five hundred guests were present, owed its undoubted success mainly to Jinnah, who had been elected Secretary of the Organizing Committee of the function.

Thus Jinnah and I had become good friends before I returned home in 1893, soon after my call to the Bar. I used to meet him thereafter in Bombay in the chamber of Sir Pherozeshah Mehta, situated almost right opposite the High Court, which was (till Sir Pherozeshah passed away, in 1915) the great political rendezvous of Bombay. Here in the presence of Sir Pherozeshah, Mr. Chimanlal Setalvad, Mr. Dinshaw Wacha, and other political veterans, all young men (including Jinnah, myself, and others) had to be on our best behaviour for fear of being not only pulled up, but possibly dragged over live coals, by the uncrowned King of Bombay, as Sir Pherozeshah was justly called. His chamber, where young political hopefuls were herd with veterans in politics, was not a school for scandals, or even, for light talks; but something which may well be compared with a miniature Plato's Academy, since for nearly four to five hours daily Sir Pherozeshah and his colleagues discussed with juniors, and expounded to them, political philosophy, as it was understood in India, in the last decade of the nineteenth century. As

Jinnah As I Knew Him

by

Dr. Sachchidananda Sinha

Of the hundreds of Indian students in London, in the early nineties of the last century, two Gujeraties (Mr. Mohandas Karamchand Gandhi and Mr. Mohammad Alibhai Jinnah bhai Khojani) lived to carve their names in the annals of mankind, though each of them distinguished himself in a definitely separate sphere of his own. Mr. Gandhi (as he used to be called at that time) having matriculated in 1887, left for London in 1888. In my own circle of friends from Bihar, Mr. Syed Ali Imam (afterwards Sir Ali, Law Member of the Government of India, from 1910 to 1915) had sailed for London, in 1887. I left Calcutta for London in December 1889, and Mr. Muhammad Alibhai Jinnahbhai Khojani—known later by his shortername as Mr. M.A. Jinnah—arrived there in 1892. Mr. Ali Imam was called to the Bar in 1890, and Mr. Gandhi in 1891; I, in 1893, and Mr. Jinnah in 1897, as he did not attain majority till then. But as I arrived, in London, early in 1890, and returned to India in 1893, Mr. Gandhi, Mr. Ali Imam and Mr. Jinnah were each my contemporary for sometime, during my stay in London. And so I came in contact with all the three.

Each of them played a notable part on the Indian stage: Mr. Gandhi, as "the Mahatma" of world-wide fame, known all over the world for his saintliness, and preaching of non-violence; Mr. Jinnah as the first Muslim of genuine Indian birth, who succeeded (in the face of the most of the tremendous nationalist opposition) in carving out of India an independent Sovereign state for his co-religionists, and Sir Ali as a highly successful lawyer, judge, administrator, and man of affairs. I have survived the three to chronicle their work and achievements; which none can do better than myself, since no other person has had the same unique advantage of knowing each of them well enough, to describe the lights and shadows of their life. In the present sketch I shall record some of my recollections of Mr. Jinnah, as a nationalist. Time and health permitting, I shall sketch in another article, a survey of his career as a communalist' so that the

Jinnah As I Knew Him

Dr. Sachchidananda Sinha

Khuda Bakhsh Centenary Publications

First Published : 1948-49

Second Impression : 1993

Printed by Liberty Art Press (Proprieters Maktaba Jamia Ltd.) 1528 Pataudi House, Daryaganj, New Delhi and published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna.

J i n n a h

As I Knew Him

by

Dr. Sachchidananda Sinha

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA

C O N T E N T S

(Journal No. 75-77)

1992

Price Rs.75/-

Printer	: Liberty Art Press, 1528, Pataudi House, New Delhi
Publisher	: Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone: 650109, Telex: 22-430 KBL IN)
Editor	: Dr. A. R. Bedar
Annual Subscription	: Rs. 300/- (Inland) US$ 60 (Asian Countries) US$ 120 (Other Countries) Rs. 25/- Per Copy Price (this issue) Rs. 150/-

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

75—77

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

75—77

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA